# امام شاہ ولی اللہؒ

## اور

## ان کے افکار و نظریات



مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی

شاہ ولی اللہؒ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

# امام شاہ ولی اللہؒ
## اور
# ان کے افکار و نظریات

مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی



شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

نام کتاب : امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات

مرتب : مولانا مفتی عطاء الرحمن قاسمی

تعداد : ۵۰۰

قیمت : ۲۵۰/روپے

سن اشاعت : ۵/مئی ۲۰۰۴ء

کمپوزنگ : تبریز عالم قاسمی اقراء کمپیوٹر سینٹر، اوکھلا، نئی دہلی۔۲۵

آئی۔ایس۔بی۔این : 81-901848-1-4

مطبوعہ :

ناشر : شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ

N-80/C ابوالفضل انکلیو اوکھلا، نئی دہلی۔۲۵





Book Name : Imam Shah Waliullah Aur Unke Afkar wa Nazriyaat

Author : Maulana Mufty Ataur Rahman Qasmi

Edition : 5-May 2004

Price : 250/-

I.S.B.N. : 81-901848-1-4

Composing : Tabrez Alam Qasmi IqraComputer Centre, Okhla, New Delhi - 110 025

Published by : Shah Waliullah Institute
N/80-C Abul Fazal Enclave, Okhla,
New Delhi-110 025

# فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# مقدمۃ

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمد والہ وصحبہ اجمعین ومن تبعھم باحسان ودعا بدعوتھم إلی یوم الدین۔

اللہ تعالیٰ کا دستور اور معمول رہا ہے کہ جب شئون شریعت اور مقاصد شریعت میں دین اور اسلام کے نام پر کچھ ایسے غلط معتقدات ومخترعات در آجاتے ہیں، جن کی موجودگی میں دین الٰہی اور شریعت مصطفوی ﷺ کی شناخت وپہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ تو قدرت کی جانب سے ہر صدی کی ابتداء میں ایک دیدہ ور اور عہد ساز شخص کو بھیجا جاتا ہے۔ جو بلا خوف لومۃ لائم دین کو از سر نو زندہ وتابندہ کرتا ہے۔ اور شریعت میں داخل شدہ بدعات وخرافات اور شرک وکفر آمیز نظریات و معتقدات کی تطہیر کرتا ہے۔ اور اسی عہد آفریں وتاریخ ساز شخصیت کو مجدد کہا جاتا ہے۔

إن اللہ یبعث لھٰذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینا (ابوداؤد)

اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر صدی کے آغاز میں ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے، جو اس کے دین کی تجدید کرتا ہے۔

امت کے مجددین و مصلحین، (جنہوں نے تجدید واحیائے دین کے میدان میں کارہائے

نمایاں انجام دیئے ہیں) کی روشن وتابناک خدمات سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں، اور ان میں سے چند مجددین و مصلحین مندرجہ ذیل ہیں، جن پر امت کے سواد اعظم کا اتفاق ہے۔

امیر المومنین عمر بن عبدالعزیزؒ (التوفی ۱۰۱ھ) امام اعظم ابوحنیفہؒ (التوفی ۱۵۰ھ) امام دارالہجرۃ امام مالک بن انسؒ (التوفی ۱۷۹ھ) الامام الشافعیؒ (التوفی ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبلؒ (التوفی ۲۴۱ھ) حجۃ الاسلام امام غزالیؒ (التوفی ۵۰۵ھ) علامہ بن تیمیہؒ (التوفی ۷۲۸ھ) حضرت شیخ احمد سرہندیؒ مشہور بہ مجدد الف ثانی (التوفی ۱۰۳۴ھ) اور شیخ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ المحدث الدہلویؒ (التوفی ۱۱۷۶ھ)۔

شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کی ولادت ۱۱۱۴ھ میں ہوئی تھی، آپ کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم محدث دہلویؒ عہد عالمگیری کے ممتاز وسرکردہ علماء وفقہا میں تھے۔ آپ کا نام فتاوی عالمگیری کے مرتبین ومدونین میں سرفہرست آتا ہے۔

شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی صدی (جسے سیاسی بحران وانتشار کی صدی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا) کے جلیل القدر وعظیم المرتبت مجدد دین اور مصلح امت تھے، آپ ۱۱۴۴ھ میں حرمین شریفین کے قیام کے دوران ایک الہامی وبشارتی خواب دیکھا تھا، جس میں آپ کو یقین دلایا گیا تھا کہ گرد وپیش کے مفاسد وغلط رسوم کی اصلاح کے لئے آپ کو ایک مستقل ذمہ داری دی جائے گی۔ آپ بوسیدہ وکہنہ نظام کی جگہ نیا نظام قائم کرنے کا ذریعہ بنیں گے۔ بالفاظ دیگر ہندوستانی مسلمانوں کے تمام دینی علوم اور سیاسی واجتماعی تحریکات کے امام ومقتدی آپ ہی ہوں گے۔ تفہیمات الہیہ ص: ۱۲۱، ۱۲۰ ج ۱ میں ایک اشارہ ہے کہ اس کام کی تکمیل کے لئے انبیاء کی طرح صبر کرنا چاہیے۔ (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص: ۱۴۸)

حضرت امام شاہ ولی اللہ نے فیوض الحرمین میں لکھا ہے کہ

رأیتنی فی المنام قائم الزمان اعنی بذلک ان اللہ اذا اراد شیئاً من نظام الخیر جعلنی کالجارحۃ لاتمام مرادہ۔ (میں نے خواب میں اپنے آپ کو دیکھا کہ میں قائم الزماں (حضرت شاہ صاحب کی تحریروں میں شاہ صاحب خود اپنے لئے قائم الزماں اور وصی وغیرہ الفاظ استعمال کیا کرتے ہیں) ہوں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب بھلائی اور خیر

کے کسی نظام کو قائم فرمانا چاہتا ہے تو اس وقت مجھے اس مقصد کی تکمیل کے لئے گویا ایک آلہ اور واسطہ بناتے ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ کے مجددانہ و مصلحانہ کارناموں کو مندرجہ ذیل خاص عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

- اصلاح عقائد۔
- تحریک رجوع الی القرآن الکریم۔
- تحریک رجوع الی الحدیث۔
- تطبیق بین الفقہ والحدیث۔
- اسرار و حکم و مقاصد شریعت کی ترجمانی۔
- منصب خلافت کی تشریح اور رد رافضیت۔
- ہندوستان میں سیاسی بحران اور حضرت شاہ صاحب کی حکمت عملی۔
- امت کے مختلف طبقات کا احتساب اور ان کو دعوۃ اصلاح و انقلاب۔
- جماعت ولی اللہی کی فکری و تعلیمی تربیت۔

یہ حضرت شاہ ولی اللہ کی فکری و انقلابی تحریک کے جلی عنوانات و موضوعات ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں عہد اکبری کے مشہور روحانی بزرگ حضرت امام شیخ احمد سرہندی مشہور بہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد شیخ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے متوازن و معتدل افکار و نظریات اور معروضی تحقیقات و نگارشات کی بنا پر اسلامیان ہند کے جمیع مکاتب و مسالک کے مابین یکساں طور پر قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اور ہر مکتبۂ فکر کے اصحاب علم و بصیرت ان کو اپنا ملی قائد و رہنما اور روحانی پیشوا و مقتدی مانتے ہیں۔ اور ان کی ہمہ گیر و ہمہ جہت اور آفاقی شخصیت کی طرف اپنا ادبی انتساب کرنے پر فخر و سعادت کی بات سمجھتے ہیں، ایسی صورت حال میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامیان ہند وحدت کلمہ کی بنیاد پر حضرت امام شاہ ولی اللہؒ کے افکار و نظریات اور ہدایات و ارشادات کی روشنی میں طویل المیعاد منصوبے بنائیں اور مغربی اتحاد و زندقہ کے سیلاب کو روکنے کی جدو جہد کریں۔ مشہور مفکر

اور صف اول کے مجاہد آزادی مولانا عبید اللہ سندھی" فرمایا کرتے تھے کہ یوروپ سے الحاد ولا دینیت کا سیلاب آرہا ہے، وہ بہت جلد لوگوں پر چھا جائے گا اس کا دفاع کسی چیز سے اگر ہو سکتا ہے تو وہ صرف امام شاہ ولی اللہ کا فلسفہ ہے۔ آج ایک طرف یوروپ کے مستشرقین وملحدین قرآن وحدیث، فقہ اور تاریخ وثقافت کو مشکوک کرنے میں مشغول ہیں اور دوسری طرف برادران اسلام باہم دست وگریباں ہیں ایک دوسرے کو نیچا دیکھانے اور کمتر سے کمتر ثابت کرنے کے اپنے محبوب وپسندیدہ عمل میں مصروف ہیں۔ اور قرآنی ارشاد کے مطابق کل حزب بما لدیهم فرحون (ہر جماعت جو کچھ اس کے پاس ہے، اسی میں مست ومگن ہیں)۔

یہ کتنا افسوسناک معاملہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے انصاف واعتدال کی جو سیدھی راہ دکھائی تھی، اس سے ہماری بے اعتنائی وبے توجہی دن بدن بڑھتی چلی جارہی ہے، اساسیات دین اور ضروریات دین سے صرف نظر کرتے ہوئے، اختلافی وفروعی مسائل میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے فقہی مذاہب کی ترجیحات میں مشغول ہیں، حالانکہ مذاہب اربعہ اور دوسرے فقہی مذاہب ہماری ترجیحات کے قطعاً محتاج نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ خود امام شاہ ولی محدث دہلوی کو مقلد اور غیر مقلد ہونے کے خول میں بند کرنے کی کوششیں کررہے ہیں۔ حالانکہ شاہ صاحب اپنے رنگ ومزاج کے بزرگ ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کو انہی کی شخصیت اور ان کے افکار ونظریات کے تناظر میں دیکھنا چاہئے، ورنہ شاہ صاحب، شاہ صاحب نہ رہ پائیں گے۔

میری محدود معلومات کے مطابق ہندوستان کی تاریخ میں حضرت امام شاہ ولی اللہ تن تنہا ایک ایسے عالم دین اور ماہر رموز واسرار دین ہیں، جو ہندوستانی امت کے مختلف طبقوں، گروہوں، جماعتوں اور شخصیتوں کے درمیان یکساں طور پر لاقابل احترام ولائق تعظیم وتکریم ہیں اور صدیوں کے ماہ وسال کے گرد وغبار جمنے کے باوجود آج بھی ان کی ہمہ گیر وہشت پہلو شخصیت امت کے لئے باعث کشمکش وجاذب نظر بنی ہوئی ہے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ۲۳ رمارچ ۲۰۰۳ء کو امام شاہ ولی اللہ نیشنل سمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا اور باتفاق آراء یہ طے پایا کہ ہندوستان میں جتنے مکاتب ومسالک کے علماء، مشائخ اور دانشوران ملت موجود ہیں ان سبھوں کو امام شاہ ولی اللہ کی جامع شخصیت اور ان کے افکار

ونظریات کے گرد جمع کیا جائے اور قومی وملی اتحاد واتفاق (جو عصر حاضر میں عنقا ہے) کا ثبوت فراہم کیا جائے۔

تو مجھے یہ دیکھ کر بے حد اطمینان ہوا کہ اسلامیان ہند کے تمام طبقوں، جماعتوں، گروہوں اور شخصیتوں نے امام شاہ ولی اللہ نیشنل سمینار کے بروقت انعقاد پر خوشی ومسرت کا اظہار کیا۔ سمینار میں شرکت کرنے اور مقالہ لکھنے کا یقین دلایا۔ اور اس مجوزہ سمینار کو قومی وملی اتحاد واتفاق کی علامت قرار دیا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر حضرت مولانا محمد رابع حسنی صاحب مدظلہ نے لکھا کہ آپ کا عنایت نامہ ملا، جس میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ پر منعقد کئے جانے والے سمینار میں شرکت کی دعوت ہے۔ میرے لئے سعادت ومسرت کی بات ہے کہ اس حکیم اور مجدد شخصیت کے کارناموں پر اظہار قدر کے لئے منعقد کئے جانے والے اجتماع میں حاضری دوں......

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ سمینار خوب کامیاب اور مفید ہو۔

حضرت مولانا محمد رابع حسنی صاحب نے دوسرے خط میں تحریر فرمایا تھا کہ میں ایک شدید مجبوری کی وجہ سے سمینار میں حاضر نہ ہوسکوں گا۔ البتہ مقالہ مرتب کررہا ہوں۔ مکمل ہوتے ہی بھیج دوں گا۔ میں شاہ ولی اللہ سمینار کی کامیابی کے لئے دعاگو ہوں۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مہتمم اور مشہور عربی ادیب حضرت مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی صاحب ایڈیٹر البعث الاسلامی نے (جن کے برادر اکبر حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب سابق استاذ جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند قیام زمانہ طالب علمی میں میرے مشفق مربی رہے ہیں اور میری ذہنی وفکری ترتیب میں ان کا بڑا دخل ہے) نے تحریر فرمایا تھا کہ میری تمنا ہے کہ اس قابل قدر علمی سمینار میں شریک ہوکر معلومات میں اضافہ کروں آپ کی اس قدردانی اور دعوت نامے کے لئے دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں اللہ تعالیٰ سمینار کو ہر طرح سے کامیاب فرمائیں اور شاہ صاحب کی شخصیت کو مزید متعارف کرانے کا ذریعہ بنائیں۔

اتفاق سے حضرت مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی صاحب مدظلہ اپنی تمامتر خواہش کے باوجود

کسی مجبوری کی بنا پر سیمینار میں شریک نہ ہو سکے تھے البتہ آپ نے اپنا وقیع مقالہ برائے اشاعت بھیج دیا تھا جس کے لئے قلب ان کا شکر گزار ہے۔

میں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر جناب محمد حامد انصاری صاحب کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا تھا کہ جس میں درخواست کی تھی کہ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے شاہ ولی اللہ نیشنل سمینار میں شرکت کرنے اور مقالہ پیش کرنے کے لئے یونیورسٹی کی جانب سے ایک نمائندہ شخص کو بھیج دیا جائے تو جناب انصاری صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ:

امام شاہ ولی اللہ قومی سمینار میں شرکت کے لئے پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کو مامور کر دیا ہے۔ اسی دوران جناب حامد انصاری صاحب مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی مدت پوری کر کے یونیورسٹی سے رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد جناب ڈاکٹر نسیم احمد صاحب آئی اے ایس (جو پنجاب وقف بورڈ کے ایڈمنسٹریٹر رہے ہیں میری تصنیف "پنجاب و ہریانہ کی تاریخی مساجد" میں ان کا ذکر ہے، بورڈ کے حلقے میں مخلص و ایماندار آفیسر کی حیثیت سے مشہور رہے ہیں) مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر منتخب ہو گئے، میں نے نئے وائس چانسلر صاحب کو خط لکھا کہ سابق وائس چانسلر صاحب نے امام شاہ ولی اللہ سمینار کے لئے یونیورسٹی کی جانب سے ایک اسلامی اسکالر کو بھیجنے کی منظوری دی تھی۔ آپ سے ایک گونہ غائبانہ تعلق بھی ہے۔ از راہ کرم دو ماہر علوم ولی اللہی کو سمینار میں شرکت کی منظوری عنایت فرما دیں۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد پروفیسر عبد العلی صاحب چیئرمین شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا فون آیا کہ جناب وائس چانسلر صاحب نے مجھے اور پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب کو سمینار میں شرکت کرنے اور مقالہ پڑھنے کی ہدایت کی ہے۔ میرا مقالہ انگریزی میں ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ جس زبان میں مقالہ لکھیں مجھے کوئی اشکال نہیں ہے، چنانچہ پروفیسر عبد العلی صاحب اور پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی صاحب مسلم یونیورسٹی کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ پروفیسر عبد العلی صاحب نے اپنا مقالہ انگریزی میں اور پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب اردو میں پیش کیا دونوں کے مقالے بہت پر مغز و فکر انگیز ہیں۔

جامعہ ہمدرد (ہمدرد یونیورسٹی) کے وائس چانسلر جناب سراج حسین صاحب آئی اے ایس

(جنہوں نے ہمدرد یونیورسٹی کو اقلیتی کردار دلانے میں تاریخی رول ادا کیا ہے۔ اور یونیورسٹی کے حلقہ میں اپنی مستعدی وانتظامی صلاحیت کی بنا پر نیک شہرت رکھتے ہیں۔ اور انہیں ہمیشہ دینی وملی سرگرمیوں سے گہری دلچسپی بھی رہی ہے۔) کو شاہ ولی اللہ سیمینار میں شرکت کرنے کے لئے مدعو کیا گیا، جس کے جواب میں موصوف نے ایک فکر انگیز خط تحریر فرمایا اور شاہ ولی اللہ کے افکار ونظریات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ:

یہ جان کر مسرت ہوئی کہ آپ عالم اسلام بطور خاص مسلمانان ہند کے فکری رہنما حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی جامع شخصیت اور ان کے افکار ونظریات کو عام وتام کرنے کے لئے ایک روزہ نیشنل سیمینار کا انعقاد کر رہے ہیں آج جبکہ پورا سماج مسلکی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس موقع سے سیمینار کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مشہور ومعروف محقق واسلامی اسکالر مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب ناظم اعلیٰ دارالمصنفین اعظم گڑھ وایڈیٹر ماہنامہ معارف نے تحریر فرمایا تھا کہ

گرامی نامہ نے مفتخر فرمایا: یاد آوری اور دعوت نامے کے لئے سراپا سپاس ہوں یہ اطلاع بڑی موجب مسرت ہوئی کہ جناب والا، شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام حضرت شاہ صاحب پر ایک روزہ سیمینار کرنے والے ہیں، بڑا مبارک ارادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں آپ کو کامیاب کرے۔

حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب سجادہ نشین خانقاہ رحمانی مونگیر بھی سیمینار میں شریک ہونے کے لئے آرہے تھے وہ اتفاق سے راستہ میں ایک حادثہ پیش آجانے کی وجہ سے واپس ہوگئے البتہ آپ کا مقالہ آگیا تھا جو سیمینار میں پڑھا گیا، اور پسند کیا گیا۔

مولانا عبدالوہاب خلجی صاحب سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ اہلحدیث اور آل انڈیا ملی کونسل کے معاون سکریٹری جنرل نے لکھا تھا کہ:

آپ کا مرقومہ ۳۰ر۲ر۲۰۰۰ء کو ملا، مسرت ہوئی کہ آپ حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پر ایک ملکی سطح کا سیمینار منعقد کر رہے ہیں۔ اور پھر مجھے نہ صرف یہ کہ شرکت کی دعوت دی ہے۔ بلکہ حضرت شاہ صاحب کی حدیث فہمی، پر مقالہ قلمبند کرنے کی فرمائش بھی کی ہے۔

میں انشاء اللہ العزیز حسب خواہش مجوزہ عنوان پر اپنا مقالہ آخری فروری تک ارسال کروں گا۔..................

پروفیسر مولانا عبداللہ عباس الندوی صاحب سابق استاذ ام القریٰ مکہ مکرمہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی سرگرمیوں سے واقف رہے ہیں، مولانا موصوف اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ انسٹی ٹیوٹ کا قیام جن مقاصد کے پیش نظر عمل میں آیا ہے وہ قابل تحسین ہے، اللہ تعالیٰ مزید توفیقات سے آپ کو بہرہ مند فرمائے آپ نے مقالہ کا عنوان جو مجھے دیا ہے، وہ مناسب ہے۔

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے مہتمم مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب کا بھی مکتوب گرامی آیا تھا جس میں تحریر فرمایا تھا کہ:

اس اطلاع سے مسرت ہوئی کہ شاہ ولی اللہؒ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے علوم وافکار سے نئی نسل کو متعارف کرانے کے مقصد کے تحت نیشنل سمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے۔..........توقع ہے کہ یہ سمینار ہر اعتبار سے مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔ اور اس کے ذریعہ فکر ولی اللہی کی عصری معنویت اجاگر ہوگی۔ مقررہ موضوع پر مقالہ تحریر کرنے اور سمینار میں شرکت کی سعی رہے گی۔

ڈاکٹر مولانا شعاء اللہ خاں صاحب ایڈیٹر "ضیاء وجیہہ" رام پور کے معتدل فکر عالم دین ہیں، انہیں بھی دعوت نامہ بھی ارسال کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر شعاء اللہ خاں صاحب لکھتے ہیں:

آپ کا دعوت نامہ.........بسلسلہ انعقاد امام شاہ ولی اللہ سمینار، ایک قابل قدر اقدام ہے۔ جس کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اپنی نوعیت کا یہ منفرد اور وقیع سمینار ہوگا۔

الحمد للہ ۲۳؍ مارچ ۲۰۰۳ء کو صبح ساڑھے نو بجے آئی، سی، سی، آر، آزاد بھون، بالمقابل آئی، ٹی، او، نئی دہلی میں امام شاہ ولی اللہ نیشنل سمینار منعقد ہوا، یہ قومی سمینار نبیرہ بانی دارالعلوم دیوبند خطیب العصر حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند وصدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے زیر صدارت منعقد ہوا۔

دارالعلوم دیوبند فکر ولی اللہی کا مرکز ہے، فکر ولی اللہی کا ترجمان خاندان قاسمی ہے، مجھ سے بعض بزرگوں نے کہا تھا کہ اس باوقار شاہ ولی اللہ نیشنل سمینار کی صدارت کے لئے جس شخصیت کا

انتخاب کیا ہے، یہ انتخاب ہی حسن انتخاب بھی ہے۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت حسب پروگرام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب نے کی، دلی کے مشہور سماجی کارکن جناب چراغ الدین قریشی صاحب ایڈوکیٹ نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور مہمانان خصوصی اور مقالہ نگاروں اور سامعین حضرات کا پرتپاک استقبال کیا۔ اور کس بے سروسامانی اور کسمپرسی کے عالم میں یہ شاہ ولی اللہ نیشنل سمینار منعقد ہوا تھا۔ اس کا بھی اظہار کیا، خطبۂ استقبالیہ کے بعد میں نے ناظم افتتاحی اجلاس کی حیثیت سے اعلان کیا کہ:

امام شاہ ولی اللہ نیشنل سمینار کا افتتاح مفسر قرآن حضرت مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب (ناگپور) وخازن مسلم پرسنل لاء بورڈ فرمائیں گے، حضرت مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب مدظلہ نے اپنا کلیدی خطبۂ افتتاحیہ پڑھنے کے بجائے ایک جامع تقریر کی۔ جس میں شاہ ولی اللہ کی تفسیری خدمات کا تعارف کرایا، اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے ذمہ داروں اور اس کے علمی و تصنیفی کاموں کو سراہتے ہوئے حضرت مولانا نے فرمایا کہ اس قسم کے اداروں کے بقاء واستحکام امت کے بقاء ووجود کا موجب ہے، میں مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب کو ۲۲ رسالوں سے جانتا ہوں۔ اوران کے تحقیقی کاموں کا پرانا قدر دان ہوں۔ حضرت مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب کے خطبہ افتتاحیہ کے بعد برادرم فیضی عزیر ہاشمی صاحب ڈائریکٹر اطلاعات ونشریات دلی حکومت، وچیف ایگزیکٹو آفیسر دلی وقف بورڈ نے پنجاب وہریانہ کی تاریخی مساجد (جس کی ترتیب وتصنیف کے اصل محرک ہاشمی صاحب ہی رہے ہیں) ایک مطبوعہ نسخہ مولانا پاریکھ صاحب کو دیا، حضرت مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب نے پنجاب وہریانہ کی تاریخی مساجد کی رونمائی فرمائی۔ جناب ہاشمی صاحب نے کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات واحساسات کا اظہار کیا۔

کتاب کی رسم اجراء کے بعد جناب ایس ایم خاں صاحب پریس سکریٹری صدر جمہوریہ کو چند کلمات کہنے کی زحمت دی گئی۔ جناب خان صاحب نے نہایت شستہ زبان میں شاہ ولی اللہ دہلوی اوران کے افکار وخیالات ونظریات کو آج کے حالات کے تناظر میں ان سے استفادہ کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ میں شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی ہر قسم کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار رہوں گا۔

سامعین نے جناب ایس ایم خاں صاحب کی مخلصانہ پیشکش کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھا اور ان کے قومی وملی جذبہ کو سراہا، مجھے یہاں اعتراف کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس مجموعہ کی اشاعت میں جناب ایس ایم خاں صاحب کے اصرار کا بڑا دخل ہے۔ ان ہی کے ایماواشارہ پر کتاب کی اشاعت بڑی جلدی عمل میں آئی ہے۔

پروفیسر زاہد حسین زیدی صاحب وائس چانسلر روہیلکھنڈ یونیورسٹی نے شاہ ولی اللہ کی عبقری شخصیت اور آپ کے صاحبزادگان کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے موجودہ حالات میں ان کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ ایک جامع تقریر کی۔ جس کو سامعین نے بے حد سراہا۔

ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب سابق گورنر بہار و بنگال اور موجودہ رکن پارلیمنٹ نے کہا کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے سمیناروں اور پرگراموں میں عموماً شریک ہوتا رہتا ہوں۔ ہمیشہ انسٹی ٹیوٹ کے کاموں وعلمی سرگرمیوں سے دلچسپی رہی ہے۔

مولانا اصغر علی امام مہدی صاحب ناظم اعلیٰ کل ہند جمعیۃ اہلحدیث نے کہا کہ مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب سے میرے کئی رشتے ہیں وہ میرے بھائی اور میرے رشتہ دار ہیں، میرے علمی سفر کے دوست ہیں۔ ان کے صالح فکر وصحیح عقیدہ سے واقف ہوں شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اس باوقار سمینار کے انعقاد پر انہیں مبارکباد دیتا ہوں امید ہے کہ آئندہ بھی فکر ولی اللٰہی کو عام کرنے کی اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔

مولانا احمد علی قاسمی صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت نے کہا کہ شاہ صاحب کی شخصیت ملت اسلامیہ ہندیہ کے لئے ایک متحدہ ومتفقہ پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتی ہے مسلمانان ہند کو اسی مرکزی شخصیت کے گرد جمع ہوجانا چاہئے۔

مولانا انجینئر خادم حسین نقوی صاحب نائب صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت نے کہا کہ میں اسلامی جمہوریہ ایران میں ایک عرصہ دراز تک رہا ہوں۔ اور وہاں کی علمی وثقافتی سرگرمیوں کا عینی شاہد ہوں، میں بلا تامل کہتا ہوں کہ شاہ ولی اللہ کے افکار ونظریات پر یہ منفرد نوعیت کا سمینار ہے۔ اور الحمدللہ اس میں مختلف طبقات ومسالک کے اصحاب علم وبصیرت موجود ہیں۔

مولانا اسرار الحق قاسمی سابق ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند نے کہا کہ مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی کی علمی وانتظامی صلاحیتوں سے واقف ہوں، انہوں نے اہل علم کا اتنا بڑا مجمع جمع کر کے اپنی انتظامی

صلاحیتوں کا ثبوت فراہم کیا ہے، ہم لوگ ان کا شکر گزار ہیں۔

جناب عبدالصمد صمدانی ممبر پارلیمنٹ نے کہا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا شمار امت کی محسن شخصیات میں ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کو آئندہ بھی اس قسم کے باوقار سمینار کا انعقاد کرتے رہنا چاہئے۔

افتتاحی اجلاس کے اختتام پر صدر اجلاس حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب نے "ایک مختصر مگر جامع تقریر کی، اور حضرت امام شاہ ولی اللہ کے افکار و نظریات پر روشنی ڈالی اور شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے اس وقار سمینار کی انعقاد پر خوشی کا اظہار فرمایا۔"

شاہ ولی اللہ نیشنل سمینار کی دوسری نشست کی صدارت حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی مفتی دار العلوم دیوبند اور تیسری نشست کی صدارت حکیم محمد عرفان الحسینی رکن مجلس شوری امارت شرعیہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ نے کی۔ امام شاہ ولی اللہ نیشنل سمینار کو کامیاب بنانے میں مولانا محمد اسلام قاسمی صاحب، عظیم اختر صاحب، جناب خالد صابر صاحب، جناب محمد عتیق صدیقی صاحب، حکیم ظل الرحمن صاحب اور مولانا افتخار حسین مدنی صاحب نے ہر طرح کا تعاون کیا، سمینار کو کامیاب بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ میں ان تمام حضرات کا شکر گزار ہوں۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ ایک باضابطہ رجسٹرڈ ادارہ ہے، جس کے زیر اہتمام ضمائر القرآن، الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم جیسی قرآنی ضمائر اور قرآنی لغات پر دو ضخیم کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اب تیسری کتاب امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ جس پر اللہ کا شکر کرتا ہوں۔ یہ اللہ کا بڑا اکرام وانعام ہے کہ یہ مجموعہ مقالات زیورِ طباعت سے مزین ہو گیا۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے اس امام شاہ ولی اللہ نیشنل سمینار سے پہلے ۲۳ / مارچ ۱۹۹۹ء کو بچوں کا گھر دریا گنج، نئی دہلی میں "عہد وسطی کے آثار" پر ایک باوقار سمینار منعقد ہو چکا ہے۔ اب حال ہی میں ۲۷ / جنوری ۲۰۰۰ء کو انجمن ترقی اردو، (اردو گھر) نئی دہلی میں شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام محاضرات قرآنی پر ایک باوقار اجتماع ہوا ہے۔ اور اسی محاضرات قرآنی میں ضمائر القرآن کی رونمائی ہوئی ہے۔

اللہ کی ذات مسبب الاسباب ہے، جس نے ناممکن کو ممکن بنایا ہے۔ اسی پر بھروسہ کرتے

ہوئے دو اعلان کرنا چاہتا ہوں، ایک ۲۰۰۵ء میں الامام شاہ ولی اللہ بین الاقوامی سمینار منعقد کیا جائے گا، جس کے لئے ایک وقار کمیٹی جلد ہی تشکیل کی جائے گی۔ دوسرا ۲۰۰۵ء میں امام شاہ ولی اللہ ایوارڈ دیا جائے گا، یہ ایوارڈ ایسے اسلامی اسکالر اور عالم دین کو دیا جائے گا جو امام شاہ ولی اللہ یا ان کے علمی و روحانی خانوادہ پر تحقیقی کام کیا ہو۔

آخر میں مولانا عمید الزماں کیرانوی صاحب کارگزار صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند اور مولانا فرید الزماں کیرانوی صاحب کی تحریک و حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ اس مجموعۂ مقالات کی اشاعت کافی حد تک ان ہی کی تحریک و قدر افزائی کی مرہون منت ہے۔ اگر ان دونوں بزرگوں کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید اس کی اشاعت اتنی جلد نہ ہو پاتی۔ میں ان دونوں بزرگوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان دونوں کی علم نوازی و علم دوستی کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ میں اپنے عزیز تبریز عالم قاسمی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی کمپوزنگ میں نہایت ہی مہارت و عمدگی کا ثبوت فراہم کیا۔ اور کتابت کو عمدہ سے عمدہ بنانے بھرپور کوشش کی۔

عطاء الرحمن قاسمی
چیئرمین
شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ

# خطبۂ افتتاحیہ

حضرت مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب ناگپور☆

**نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد:**

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ "اور چلادے تم کو ان کے صحیح راستے پر جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں"۔ (۴۔النساء آیت ۲۶)

یعنی اللہ تعالیٰ تم سے پہلے کے صلحاء امت کے صحیح راستوں کی رہنمائی کی طرف تم کو متوجہ فرماتا ہے۔ نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا "وَاجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ" "اور آیندہ آنے والے لوگوں کی زبانوں پر میری دعوت کا چرچا صداقت کی بنیاد پر جاری رکھئے"۔ (۲۶۔الشعراء آیت:۸۴)

ان دونوں آیات سے معلوم ہوا کہ خاصانِ خدا اور اللہ کے مقبول ترین بندے جن میں اللہ کے رسولوں اور نبیوں کا مرتبہ سب سے بڑا ہے، ان کی آرزو رہی کہ سچائی کی بنیاد پر انہوں نے رضائے الٰہی کے تحت دعوتِ دین اور اصلاح کا جو کام کیا ہے اُسے دنیا میں بھلایا نہ جائے۔ اس کے لئے انہوں نے دعا بھی کی، یا الٰہی! ہمارا یہ دعوت واصلاح کا کام آنے والی نسلوں کی زبانوں اور آولمذوں میں جاری رکھئے اور ہمارا روشن کیا ہوا چراغ بجھنے نہ دیجئے۔

اوپر درج دونوں آیات میں یہ اشارہ ہے کہ ہم سے پہلے صلحاء امت اور مصلحین کے اہم کارناموں کی طرف ہم کو توجہ دینی چاہئے۔ انبیاء و مرسلین اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہوتے

☆ خازن آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ۔

ہیں، ان کی حیثیت اور مرتبہ عند اللہ اور عند الخلق سارے انسانوں سے زیادہ بلند و اعلیٰ ہوتا ہے، منصب رسالت پر فائز انسانوں کو مقبولیت کی اللہ کی طرف سے خاص سند رہتی ہے۔

انبیاء اور مرسلین کے جن تبعین کے کاموں کو اللہ نے پسند فرمایا ان کی تعلیمی یادگار اور ان کی خدمات کا نمونہ بعد میں آنے والوں کے لئے اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے۔ ہندوستان میں جن حالات میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو اللہ نے وجود کا جامہ بخشا اور بھیجا، اس زمانے کے جو حالات تھے، ان سے ہندوستان کے اہل علم خوب اچھی طرح واقف ہیں۔ میں اس خطبۂ افتتاحیہ میں اول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور بعد میں ان کے بلند پایہ اور بزرگ صاحبزادگان میں حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ رفیع الدینؒ ان تینوں بزرگان دین کی خدمتِ قرآن کا تذکرہ کروں گا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو "كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا" کے تحت اللہ نے وجود کا جامہ پہنا کر اس وقت بھیجا جب امت مسلمہ فی الہند طاقتور اور صاحب سلطنت ہونے کے بعد بھی ایران اور وسط ایشاء سے لائی ہوئی تہذیب وتمدن اور شرک کو اسلام کے ساتھ گڈمڈ کر چکی تھی۔ ہندوستان سے لگے بیشمار پڑوسی ملکوں کی تہذیب وتمدن اور مقامی ہندوانہ عقائد کا بھی امت پر سایہ پڑ چکا تھا۔ اس وقت مغلیہ سلطنت کا انتشار، آپسی مارا ماری بھی خوب عام ہو چکی تھی۔ شرک اپنی مختلف شکلوں میں جو سب سے پرانی اور خطرناک بیماری ہے ہندوستان میں مغلوں کے دور میں پھیل چکی تھی، غیر مسلم اور عجمی اقوام کے اختلاط کے سبب جاہل اور گمراہ صوفیوں کے مشرکانہ عقائد ورسوم اور رواج میں بھی امت مسلمہ الجھ گئی تھی۔ یہود ونصاری جیسے مشرکانہ عقائد حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں رکھتے تھے، ویسے ہی مشرکانہ عقائد امت مسلمہ فی الہند اولیاء اور صلحاء کے بارے میں رکھنے لگی تھی۔ بزرگان دین کی قبروں اور مزارات پر وہی حرکتیں ہونے لگی تھیں جو غیر مسلموں کی عبادت گاہوں میں جاری تھیں۔

تاریخ سے اُس وقت کے ان حالات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے بلکہ ہم آج بھی مشرکانہ عقائد کی تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہندوستان میں بت پرست اور دوسرے مشرکانہ ماحول سے نکل کر ایک خاصی آبادی مسلمان ضرور ہو چکی تھی لیکن عدم تربیت کی وجہ سے وہ

مشرکانہ عقائد اور رسومات کا بھی بڑا حصہ ساتھ لے کر اسلام میں داخل ہوئے تھے اور رفتہ رفتہ اس کا اثر مسلم معاشرہ پر بھی پڑنے لگا تھا۔ ان حالات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس دور میں اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو جس خدمت قرآن کا شرف بخشا وہ اللہ کی بڑی نعمت تھی، حضرت شاہ صاحبؒ نے ان امراض اور مفسدات کو دور کرنے کے لئے قرآن کا مطالعہ، تدبر، درس وتدریس، قرآن کے فہم اور معانی ومطالب کے عام کرنے کو سب سے اہم اور موثر علاج سمجھا اور یہ سمجھ قرآن مجید کی منشاء کے عین مطابق تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ حقیقت توحید اور حقیقت شرک کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن مجید اور سنت قائمہ سے زیادہ طاقتور و دلنشیں ذریعہ کا تصور نہ اس وقت ہو سکتا تھا اور نہ آج۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے صاحبزادہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے ''موضح قرآن'' کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے:

''بتانے والے بہتیرا بتائیں جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے، ویسا کوئی نہیں بتا سکتا، اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے کسی کے کلام میں نہیں''۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ عوام وخواص کی تعلیم وتربیت اور اصلاح عقائد واعمال کے لئے قرآن مجید کا ترجمہ کریں۔ اس وقت چونکہ امراء اور حکام کی زبان فارسی تھی اس لئے عوام میں بھی ایسے لوگوں کی اکثریت تھی جو اگرچہ فارسی بول نہیں پاتے تھے مگر سمجھ لیتے تھے۔ لہٰذا حضرت شاہ صاحب نے فارسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ فرمایا جس کی تکمیل ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۰ء میں ہوئی۔ ''فتح الرحمان'' نام کے اس ترجمہ سے الحمدللہ امراء اور حکام نے فائدہ اٹھایا۔ اس زمانہ میں راجے رجواڑوں اور مغلوں کی فوج میں سب تنخواہ دار کرایہ کے فوجی ہوتے تھے۔ فوج میں راجپوت بھی تھے۔ مسلمان اور برہمن بھی ہوتے، پسماندہ اقوام کے لوگ بھی ہوتے، ترک اور افغان بھی ہوتے اس لئے فوجیوں کی زبان ملی جلی کھچڑی زبان تھی۔ دھیرے دھیرے فارسی زبان نے اپنی جگہ چھوڑنی شروع کی۔ تو اس کی جگہ فوجیوں کی اس ملی جلی زبان نے لینی شروع کی۔ اسے اس وقت ہندی یا ہندوی زبان کہا جاتا تھا۔ زمانے کے ان انقلابی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت ولی اللہ محدث دہلویؒ کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے ضرورت محسوس کی کہ وہ اس لشکری زبان میں قرآن مجید کا

ترجمہ تحریر کریں جو کہ دھیرے دھیرے عوام کی زبان بھی ہوتی جارہی تھی۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اپنے اس خیال کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے۔

"اس بندۂ عاجز عبدالقادر کے خیال میں آیا کہ جس طرح ہمارے بابا صاحب، بڑے حضرت شاہ عبدالرحیم کے بیٹے سب حدیثیں جاننے والے ہندوستان کے رہنے والے نے فارسی زبان میں قرآن کے معنی آسان کر کے لکھے ہیں اسی طرح اس عاجز نے ہندی زبان میں قرآن مجید کے معنی آسان کر کے لکھے الحمدللہ یہ آرزو ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) میں حاصل ہوئی۔"

اللہ رب العزت نے حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے اس ترجمہ قرآن کو بڑی مقبولیت عطا فرمائی۔ اس زمانہ سے لے کر آج تک لوگ اس سے کسی نہ کسی طرح استفادہ کرتے رہے ہیں۔ بعد کے جن ترجمہ نگاروں نے ولی اللہی گھرانے کے ان تراجم قرآن کے دائرہ میں رہ کر صرف اردو زبان کے بدلتے ہوئے اسلوب کو سامنے رکھ کر نئے ترجمے کئے وہ کامیاب اور مقبول رہے اور جن ترجمہ کرنے والوں نے آزادی برتی وہ کامیاب اور مقبول نہ ہو سکے۔ بعد کے لوگوں سے غلطی یہ ہوئی کہ حضرت شاہ صاحبؒ اور اس زمانے کے لوگ جس زبان کو ہندی یا ہندوی کہتے تھے اُسے اردو زبان کا نام دے دیا اور بدلے میں اس کی ایک سوکن آ کھڑی ہوئی جو دیوناگری رسم الخط میں آج تک ہمارے سامنے ہے اور پوری مسلم قوم اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے اور نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ اسی کو کسی کہنے والے نے ان الفاظ میں کہا ہے:

"لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی"۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے بامحاورہ ترجمہ و تفسیر کی خوبیوں کے ہزاروں ہزار نمونے ان کے ترجمہ و تفسیر موضح قرآن سے پیش کئے جا سکتے ہیں جسے پڑھنے اور سمجھنے سے قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے کو شرک کی ہر چھوٹی بڑی قسم سے نفرت ہو جاتی ہے اور اللہ کی سچی محبت اس کی وحدانیت دل میں گھر کر جاتی ہے۔ مثالیں اور نمونے بہت ہیں طوالت سے بچنے کے لئے ہم صرف ایک مثال پیش کریں گے۔ ملاحظہ فرمایئے: سورۂ عنکبوت کی آیات نمبر ۴۱، ۴۲، ۴۳، اور ان کا ترجمہ:

"مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا، وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ، اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ

دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ، وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ، وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُھَا لِلنَّاسِ وَمَا یَعْقِلُھَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ"۔

کہاوت ان کی، جنہوں نے پکڑے اللہ کو چھوڑ کر اور حمایتی، کہاوت مکڑی کی، بنالیا اس نے گھر، اور سب گھروں میں بودا، سو مکڑی کا گھر، اگر ان کو سمجھ ہوتی نمبر:۱ (۴۱) اللہ جانتا ہے، جس کو پکارتے ہیں اس کے سواء کوئی چیز ہو، اور وہ زبردست ہے حکمتوں والا نمبر:۲ (۴۲) اور یہ کہاوتیں بٹھاتے ہیں ہم لوگوں کے واسطے اور ان کو بوجھتے وہی ہیں جن کو سمجھ ہے (۴۳)۔

آپ نے اصل عربی متن اور حضرت شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں ان آیات کا ترجمہ ملاحظہ فرمالیا۔ اب پڑھیے ان ہی کی زبان میں ان آیات کی سادہ اور دلنشین انداز میں تشریح و تفسیر:

نمبر۱۔ یعنی گھر اس واسطے کہ جان مال کا بچاؤ ہو۔ مکڑی کا جالا کہ دامن کے جھٹکے سے ٹوٹ پڑے، ویسا ہی ہے جو اللہ کے سوا کسی کو اپنا بچاؤ سمجھے۔

نمبر:۲۔ یعنی کبھی سننے والا تعجب کرے کہ سب کو ایک لکڑی ہانک دیا، بعض خلق بت پوجتی ہیں، بعضے آگ پانی کو بعضے انبیاء اولیاء کو یا فرشتوں کو۔ سو اللہ نے فرمادیا کہ اللہ کو سب معلوم ہیں، اگر کوئی کچھ کرسکتا تو اللہ سب کو یک قلم موقوف نہ کرتا اور اللہ کو کسی کی رفاقت نہیں چاہیے زبردست ہے، اور مشورہ نہیں چاہیے حکمتیں اسی کو ہیں"۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ نے عوام و خواص کے لئے جو ترجمہ اور تفسیر فرمائی ہے یہ ایک الہامی ترجمہ و تفسیر ہے کہ ہندوستان میں جس زمانہ میں یہ ترجمہ منظر عام پر آیا تاریخ بتاتی ہے کہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر حضرت شاہ صاحبؒ کو مارا پیٹا گیا اور آپ کی بے عزتی و بے ادبی کی گئی۔ جرم یہ تھا کہ آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ کیوں کیا؟ کیا قرآن مجید کا کہیں ترجمہ ہوسکتا ہے؟ ایسا الزام شاہ صاحبؒ کے خلاف پھیلا دیا گیا اور خوب مشتہر کیا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس سے پہلے آپ کے والد محترم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ پر ترجمہ لکھنے کے جرم میں قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ اس گھناونی حرکت میں اس دور کے علماء سوء اور قبر پرست مجاوروں کا ہاتھ تھا۔ اُس وقت کے ہندوستانی مسلمانوں کی شرکیہ حالت اور مشرکانہ عقائد و خیالات کو دیکھنا ہو تو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم کے صفحہ ۱۳۶ کو

دیکھیے۔ عنوان ہے "عقیدۂ توحید کی از سر نو تبلیغ و تشریح کی ضرورت"۔

"غیر مسلم و عجمی اقوام کے اختلاط، اسماعیلی و باطنی حکومت کے نفوذ و اثر، نیز جاہل و گمراہ صوفیوں کی تعلیم و عمل سے عام مسلمانوں میں مشرکانہ عقائد و رسوم کا رواج ہو چلا تھا، بہت سے مسلمان اپنے دینی پیشواؤں، مشائخ طریقت اور اولیاء و صالحین کے بارے میں اسی طرح کے غالیانہ اور مشرکانہ خیالات اور عقیدے رکھنے لگے تھے، جو یہود و نصاریٰ حضرت عزیرؑ و مسیحؑ اور اپنے احبار و رہبان کے متعلق رکھتے تھے۔ بزرگان دین کے مزارات پر جو کچھ ہونے لگا تھا، وہ ان سب اعمال و رسوم کی ایک کامیاب نقل تھی جو غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور مقدس شخصیتوں کی قبروں پر ہوتے تھے۔ اہل قبور سے صاف صاف استعانت و استغاثہ کا معاملہ ہونے لگا تھا۔ ان سے فریاد اور ان کی دوہائی دینے، سوال اور دعا کرنے کا رواج ہو گیا تھا۔ ان کی قبور پر بڑی بڑی مسجدیں تعمیر کرنے اور خود قبور کو سجدہ گاہ بنانے، ان پر سال بہ سال میلہ لگانے اور دور دور سے سفر کر کے وہاں آنے کا عام دستور تھا۔ کھلی قبر پرستی، خدا سے بے خوفی، اور صاحب مزار سے خوف و خشیت، اللہ اور شعائر اللہ سے استہزاء و استخفاف، بے باکی اور شوخ چشمی، بزرگوں کے ساتھ اعتقادِ الوہیت کے درجہ تک، مشاہد و مزارات کا حج اور بعض اوقات حج بیت اللہ پر اس کی ترجیح، حتیٰ کہ بغداد کی طرف منہ کر کے صلوٰۃِ غوثیہ پڑھنے کا رواج بھی بن گیا تھا۔ نام کے مسلم اچھے اچھے حکیم اور طبیب بھی جس طرح ہم آپ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اُسی طرح یہ بغداد کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے، ان کی یہ نماز "صلوٰۃ غوثیہ" کے نام سے مشہور تھی۔ اب کوئی ہمیں بتائے کہ یہ شرک تو کیا شرک کا بدترین مظاہرہ ہے جو ہندوستان میں رواج پکڑ چکا تھا۔ یہ نماز انبیاء والی وہ نماز نہ تھی جو اللہ کے لئے پڑھی جاتی ہے بلکہ یہ نماز شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے لئے پڑھی جاتی تھی۔ توبہ توبہ، پیروں کو، مرشدوں کو خدا بنا لینے کا اس سے بدترین مظاہرہ کسی اہل کتاب امت میں شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ کہیں کہیں مساجد کی ویرانی اور کس مپرسی اور مشاہد کے رونق و اہتمام اُس زمانہ کی جاہلانہ زندگی کے وہ خدو خال تھے جن کے دیکھنے کے لئے بہت دور جانے اور بہت غور سے کام لینے کی ضرورت نہ تھی۔

اس تحریر کے پڑھنے کے بعد آج کے دور کا ہر کوئی سمجھ دار مسلمان موجودہ ہندوستان بشمول کشمیر، اور پاکستان و بنگلہ دیش میں شرک و خرافات کے یہ سارے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ اللہ کا شکر و احسان ہے کہ حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ قرآن ہزاروں لاکھوں لوگوں کو شرک کے جنجال سے نکالنے کا سبب بنا ہے۔ اس عاجز کی معلومات کے مطابق انگریزوں نے حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ قرآن کو رومن اردو میں لکھوایا یعنی اصل عبارت تو شاہ صاحب کی تھی مگر انہیں انگریزی حروف میں لکھوایا گیا۔ یہ ترجمہ میری نظر سے گذرا ہے لیکن اب دیکھنے میں نہیں آتا۔

شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن مجید کا سب سے پہلے تحت اللفظ ترجمہ اردو میں فرمایا جو ایک طرح سے تلاوت کی ترتیب پر آپ سے آپ ''لغات القرآن'' بن گیا۔

اس ترجمہ کی یہ خوبی ہے کہ اس زمانے کی جو اردو تھی جسے ہندی یا ہندوی کہا جاتا تھا اس میں حضرت شاہ رفیع الدینؒ نے ایسا باکمال ترجمہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس ترجمے کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی نیز مخلوق کو قرآن مجید کے لفظی معنی سے اللہ تعالیٰ نے واقفیت عطا فرمائی۔ یہ شاہ رفیع الدینؒ کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

پھر ترجمہ میں انہوں نے اپنے زمانے کی زبان کا اسلوب استعمال کیا۔ مثلاً سورہ تحریم کی آیت نمبر ۵ میں ''ثَيِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا'' خاوند دیکھی بیویاں اور بن دیکھی بیویاں۔

حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا ''ثَيِّبٰتٍ'' کا لفظی ترجمہ اتنا وسیع ہے کہ بیوہ بھی اس میں شامل ہے اور طلاق شدہ بھی اس میں آ گئی۔ نیز ''ابکارا'' کا ترجمہ انہوں نے ''بن دیکھی'' کیا جسے ہم ''باکرہ'' یا کنواری کہتے ہیں۔ یعنی ''جس نے خاوند کو اب تک دیکھا ہی نہ ہو۔'' یہ اس وقت کا خاص اسلوب ہے، جس کی چاشنی اب تک باقی ہے۔ بعد میں بعض بے وقوف لوگوں نے شاہ صاحب کے اس ترجمے میں یہاں تبدیلی کی ''خاوند دیکھی'' کا ترجمہ ''رانڈ'' لکھ دیا۔ اور کوئی ایک سمجھ دار نکلا تو اس نے ''بیوہ'' کر دیا۔ دوسرا اس سے سمجھدار ہوگا تو اس نے ابکار کا ''کنواری'' ترجمہ لکھ دیا۔ لیکن شاہ رفیع الدین صاحبؒ کے اصل الفاظ وہی ہیں جو ہم یہاں آج سے ۲۵۰ سال پہلے کے اس ترجمے نے بعد کے ترجمہ نگاروں کو (چاہے وہ کتنے ہی بڑے عالم اور

فاضل کیوں نہ رہے ہوں) علمی رہنمائی فرمائی۔ پورے "قرآن مجید کی ایک ایک آیت کا ترجمہ آج کے دور میں بھی قرآن کے خادموں کے لئے لغت قرآنی کے ٹھیک ہماری زبان میں اردو ترجمہ کرنے کے لئے حضرت شاہ رفیع الدین ؒ کی یہ کوشش اللہ کا ایک غیبی انعام ہے، جو ہر دور کے اردو ترجمہ نگاروں کے لئے مشعل راہ ہے۔

شاہ رفیع الدین ؒ نے ۱۱۶۳ھ میں ولادت پائی۔ آپ نے ۷۰ سال کی عمر پا کر ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی۔ آپ کے ترجمے نے قرآن پاک کے ہندی زبان میں سمجھنے کے دروازے چاروں طرف سے کھول دیئے جسے ہم آج اردو زبان کہتے ہیں۔

ہماری اردو زبان کا آج سے دو سو برس پہلے ہمارے بزرگوں نے نام ہندی رکھا تھا اور اسے ہندوی بھی کہا جاتا تھا۔ جب ہم نے اپنی زبان کا نام "اردو" رکھا تو اس کی ایک "سوکن" آج کی ہندی پیدا ہو گئی جو "دیوناگری" رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ہم نے ترکی زبان کا یہ لفظ "اردو" لے کر اسے اپنی زبان کا نام مشہور کیا۔ دلہن ہندوستانی اور نام ترکی۔

اگر ہم اپنی اس "اردو" کو اول زمانے سے "ہندی" کہتے رہتے تو یہ نوبت نہ آتی۔

ہم اس سلسلے میں شاہ رفیع الدین ؒ کے مقدمے کے الفاظ ان کے شاگرد سید نجف علی کے بیٹے میر عبدالرزاق ؒ جو مشہور ہوئے فوجدار خاں کے نام سے ان کی تحریر سے نقل کرتے ہیں تاکہ بات واضح ہو جائے۔

کہتا ہے خاکسار میر عبدالرزاق بن سید نجف علی المعروف بہ فوجدار خان کہ بخدمت جناب عالم باعمل و فاضل بے بدل، واقف علوم معقول و منقول، خلاصہ علماء متاخرین مولوی رفیع الدین سے عرض کیا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ ترجمہ کلام اللہ تحت اللفظی آپ سے پڑھ کر ہندی میں لکھوں پھر آپ اس کو ملاحظہ فرما کر اصلاح دے کر درست فرما دیا کریں۔ چنانچہ آپ نے قبول فرمایا اور تمام کلام اللہ اسی طرح سے مرتب ہوا اور رواج پایا۔

(مطبوعہ ۱۲۷۲ھ بمطابق ۱۸۵۵ء، بحوالہ تفسیر رفیعی صفحہ: ۲)

قرآن مجید کے ان تینوں ترجمہ نگاروں، عالم باعمل بزرگان دین کا مختصر تذکرہ اللہ تعالیٰ نے کرا دیا، اس پر الحمدللہ کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے شاہ ولی اللہ صاحب

کے خاندان کے ذریعہ ہم عاصیوں، غافلوں کے لئے ہدایت کا سامان کیا، اس عاجز کو ولی اللٰہی خاندان سے خاص الفت اور عقیدت ومحبت اور روحانی شاگردی کا تعلق رہا ہے۔ ہم سب کے غلط عقائد کی اصلاح بھی انہی سے ہوئی ہے۔ غرض یہ ہے کہ امت اسلامی فی الہند پر ولی اللٰہی خاندان کا بہت احسان ہے۔ "هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ" کے تحت ہم سب کی طرف سے اور پوری امت کی طرف سے اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

"وَآتَيْنَاهُ أَجْرَهُ فِي الدُّنْيَا" کے تحت اللہ تعالیٰ نے اس خاندان کو عزت واحترام، عقیدت ومحبت سے خوب نوازا۔ اللہ کی ذات سے امید ہے کہ "وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ" کے تحت اس خاندان کے لوگوں کا صلحاء امت میں شمار فرمائیں گے۔ خاندان ولی اللٰہی کی شان میں بے ادبی ہوگی اگر ہم ان کی مزید دو خدمات کا ذکر نہ کریں۔ قرآن مجید کی خدمت تو خوب سے خوب تر ان تینوں بزرگوں نے کی۔ خدمتِ حدیث شریف میں بھی یہ خاندان بہت آگے ہے اور دنیا وآخرت میں عزت وعظمت کا مقام پا چکا ہے۔ ان بزرگان دین کی خدمت قرآن وحدیث کے سبب اللہ کے سچے دین، دین اسلام کی صاف ستھری تصویر امت مسلمہ فی الہند کے سامنے آئی۔ قرآن اور سنت کی تعلیم ونشر واشاعت کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے جو جدوجہد اور کوشش فرمائی وہ تو ہم سب پر عیاں ہے ہی لیکن ان کے چاروں بیٹے بھی ارکان اربعہ کی طرح دین کے ستون بن گئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب اور ان کے چاروں صاحبزادوں کا ہی فیض ہے کہ دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، مظاہر العلوم سہارنپور اور لاکھوں لاکھ چھوٹے بڑے مدارس عربیہ قائم ہوئے جن میں درس قرآن، حفظ قرآن اور درس حدیث کی خدمت انجام دی جارہی ہیں اور کروڑہا کروڑ انسان مستفید ہو رہے ہیں۔ ان مدارس عربیہ کے ذریعہ برصغیر میں توحید ورسالت کی ایسی بابرکت نہریں جاری ہوئیں کہ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّى سَلْسَبِيلًا جیسی جنت کی نہر کا نمونہ اللہ نے یہاں بھی دکھا دیا۔ ولی اللٰہی خاندان نے امت میں علم وحی ورسالت کو اللہ کی نصرت کے سہارے ایسا عام کیا کہ انشاء اللہ یہ دریائے رحمت مدتوں جاری رہے گا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے چاروں صاحبزادوں کی خدمتِ قرآنی اور حدیث نبوی کے نشر واشاعت کی جدوجہد کو لوگوں سے متعارف کرانے کے لئے

ہمارے رفیق حضرت مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب چیئرمین شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے "حضرت شاہ ولی اللہ کے افکار و نظریات" کے عنوان پر ۲۳؍مارچ ۲۰۰۳ء کو ایک باوقار امام شاہ ولی اللہ نیشنل سمینار منعقد کر کے روحانی ماحول پیدا کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں اجر عظیم سے نوازے، اور امت مسلمہ فی الہند کو خاندانِ ولی اللہی کی خدمت قرآن و احادیث نبویہ کی قدر دانی کرنے اور اس سے مستفیض ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ ان کے اس مشن کو تا ابد جاری و ساری رکھے، آمین۔

☆☆☆☆

# خطبۂ صدارت

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی ☆

الحمد للہ وحدہ، والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ!

حضرات محترمین! حکیم الاسلام حضرت اقدس شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی عہد آفرین عبقریت پر سب سے اہم اور قابل ذکر دلیل یہ ہے کہ وہ ملت کے تقریباً تمام مختلف الفکر طبقات کی متفق علیہ شخصیت ہیں۔ لیکن ان کے قائدانہ و تاریخ ساز افکار و نظریات کی ترجمانی و یاددہانی کے لئے صاحبان فضل و کمال سے مزین اس مؤقر سیمینار کے منصب صدارت پر ”شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ دہلی“ کے ارباب بست و کشاد کی جانب سے ایک کم سواد طالب علم کو بٹھا دینے کو ناصواب کہنا جس طرح بے جا جسارت ہے اسی طرح اسے صحیح قرار دینا راقم الحروف کے لئے سرتاسر موجب ندامت بھی ہے۔ لہٰذا اس ندامت کو یہ صورت دعاء دیدینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

بڑے وہ ہیں جو عزت اپنے چھوٹوں کی بڑھاتے ہیں\
کہ دنیا میں مقام ان کا ہی اعلیٰ ہونے والا ہے

معززین ملت! حضرت شاہ ولی اللہؒ، ملت اسلامیہ کے ان بزرگوں میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں کہ جن کے کتاب و سنت سے ماخوذ علم و تدبر نے ملت کو انفرادی اور اجتماعی دائرۂ حیات میں وہ رہنما دفعات عمل عطا فرمائی ہیں کہ جو وقت کی کروٹوں سے کبھی پرانی نہیں پڑیں گی۔ اس مختصر وقت اور مختصر تحریر میں اس وسیع الذیل موضوع کی نہ تفاصیل ہی پیش کی جاسکتی

☆ مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند، صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت۔

ہیں اور نہ عمیق النظر اور وسیع العلم مخاطبین کرام اس کے ضرورتمند ہی ہیں اس لئے اجمال پر اکتفا کرتے ہوئے مختصر کلمات پیش خدمت ہیں۔

معززین ملت! حضرت شاہ صاحبؒ کا حقیقی مطمح نظر جو ان کے علوم سے وجدانا مفہوم ہوتا ہے وہ بصورت عدم اقتدار، ملت اسلامیہ میں اس اجتماعیت کبری کی تولید ہے کہ جس کے فقدان کے نتائج نے ہر دائرہ حیات کو علمی اور عملی بدترین پستیوں سے دوچار کر دیا ہے اس کا دفاع اس کے اصل سرمنشا سے واقفیت کے بغیر چونکہ ممکن نہیں ہے اس لئے اس کے بارے میں چند نہایت وقیع اور مہتم بالشان وضاحتی دفعات جو حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم سے مفہوم ہوتی ہیں اور ماضی کی طرح معاندین اسلام آج بھی اُن کو پورے اہتمام سے اپنائے ہوئے ہیں پیش ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ:

مسلمانوں کے مختلف طبقات میں مسلمات دین کے بارے میں کم سے کم تشکیک وبرگشتگی پیدا کی جا سکے جس کے لئے معاندین اسلام کے غالب ومقتدر طبقات نے ابتداء بزور اقتدار، ملت اسلامیہ پر اپنے غیر مستند مذہبی یا معاشرتی یا سیاسی نظام مسلط کئے۔ اس کے بعد ان خود ساختہ ناقص نظاموں کے بطن سے طبعی طور پر ہونے والی نا قابل حل مشکلات پیش آنے پر ان کے حل کا غیر معقول معاندانہ مطالبہ اسلام سے صرف کیا ہی نہیں گیا بلکہ بدترین شاطرانہ انداز پر حقائق ناشناس مسلم عوام کو اس مطالبہ کا مدعی بنا دیا جس کے قدرتی نتیجے کے طور پر ملت اسلامیہ میں وہ طبقاتی اختلاف رونما ہو گیا کہ جس نے ایک طرف ملت میں اجتماعیت کبرٰی کے تصور کو پادر ہوا بنا کر رکھ دیا اور دوسری جانب ان اعداء اسلام کی دیگر معاندانہ کاوشوں اور کوششوں کے لئے کامیابی کی راہ ہموار کر دی!

کل تک یہی پرواز عداوت کبھی توحید اسلامی کے بالمقابل سبائی فکر کے ساختہ پرداختہ شرک آمیز نظریئے کو اپنا کر اسے اہل اسلام سے انگیز کرنے کا مطالبہ سامنے آیا اور کبھی مبتذل سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے ان الحکم الا للہ کے مقصد و مراد الٰہی میں تحریف وتبدیلی معنوی کر کے اس کو مان لینے کے لئے اہل حق پر زور ڈالا گیا۔ ایسے ہی ایک وقت میں ایمان باللہ کو بہانہ بنا کر طاعات وعبادات کے بے نتیجہ اور گناہ ومعصیت کے غیر مضر ہونے کے خیال فاسد کو واضح

اسلامی تعلیمات کے بالمقابل پیش کر کے اسے تسلیم کرانے پر پوری قوتیں صرف کی گئیں۔

اور کبھی اس سے آگے قدم بڑھا کر عقل کو نقل کتاب وسنت پر غالب قرار دینے والوں نے صفات خداوندی کی نفی کے بغیر اسلامی بنیادی عقیدہ توحید کے معارض اس ناقص وناکمل نظریے اور اس کی تاویلات فاسدہ کے مان لینے پر اہل حق کو مجبور کرنے کی کوششیں کیں۔

اور نوبت بایں جارسید کہ ختم نبوت کے قطعی اسلامی عقیدے کے برخلاف من گھڑت تاویلات کی بنیاد پر دعوے نبوت کیا گیا اور اس کذب صریح کے سامنے اہلِ ایمان کو سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کرنے کے لئے اعداء اسلام کی جانب سے دولت واقتدار کی تمام قوتوں سے کام لینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی۔

معاندین اسلام کے اقتدار کی پشت پناہی کے نتیجے میں اہل اسلام سے ان ہفوات ولغویات کے سامنے سر جھکانے کے مطالبے آج بھی ختم نہیں ہوئے بلکہ عصر جدید کے وسائل سے انہوں نے میں بڑی حد تک عالمگیر حیثیت حاصل کرنا ہے۔ جس نے اہل حق کی ذمہ داریوں میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔

نتیجۂ قابل ذکر بات یہ ہے کہ کم وبیش بعینہ وہی حیثیت اور وہی تسلیم کر لینے پر اصرار کا پروانہ آج ان ناقص ومضر افکار ونظریات اور ان پر مبنی ظالمانہ اجتماعی یا حکومتی نظاموں کا ہے کہ جو قوت اقتدار کے بل پر برپا اور جاری کئے جاتے ہیں اور اسلام سے قطعاً غیر متعلق یہ خود ساختہ ناقص نظام جب مسائل زندگی کو حل کرنے کے بجائے زندگی کو عذاب بنا دینے والی مشکلات پیدا کرتے ہیں تو ان کے حل کا مطالبہ اسلام سے کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال نے ملت اسلامیہ کی ذمہ داریوں میں جو دہشتناک اضافہ کیا ہے وہ آج نہ تفصیل کا ضرورت مند ہے، اور نہ کسی حجت ودلیل کا۔

دوسری چیز کہ جس کی حضرت شاہ صاحبؒ کی جانب سے قرار واقعی اہمیت محسوس ہوتی ہے وہ اسلام کی وہ انفرادی اور امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے انسان کو ودیعت فرمودہ، راحت ومسرت، رنج وغم، غصہ ومتانت، توقیر وتذلیل، حیرت واستعجاب اور افہام وتفہیم وغیرہ پر مشتمل مختلف ومتنوع جذبات واحساسات کی مکمل رعایت کو ملحوظ رکھ کر ان کو معتدل سمت میں صالحانہ رہنمائی عطا کرتا ہے جس کی پرتاثیری یقینی ہوتی ہے لیکن مخالفین اسلام اپنی پرزور کوششوں

کے باوجود اس کو ختم کر دینے کا کوئی ذریعہ نہ آج تک فراہم کر پائے ہیں اور نہ کبھی کر سکیں گے۔

جس کی بنیادی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کی فطرت انسانی سے مطابقت، عقل و شعور سے موافقت، تمام مسائل حیات کے مکمل حل کی صلاحیت اور جملہ مسائل حیات میں معقول و معتدل تصرفات کی ہدایت کے لحاظ سے انسانی عقل کا ساختہ و پرداختہ نہیں بلکہ خالق کائنات کا عطا فرمودہ ایک کامل و مکمل نظام زندگی ہے۔ اس لئے وہ محدود اور صحت و سقم کا احتمال رکھنے والے انسانی افکار و نظریات کے پیدا کردہ تمام نامکمل و ناتمام نظامہائے حیات سے یکسر جدا اور قطعاً مختلف ہے۔ مثلاً آج غالب اقوام عالم نے اپنے خودساختہ اور غیر فطری نظاموں کے تحت ترقی پسندی کی ایک بنیاد عورت اور مرد کی غیر فطری مساوات کو بھی بنا رکھا ہے۔ اس غیر منطقی فکر کے طبعی نتیجے میں معاشرتی فساد، اخلاقی تباہی اور خاندان کی حدود کے ختم ہونے سے معاشرہ میں وہ شدید مشکلات رونما ہوئی ہیں کہ جن کے پیدا کرنے کا اسلام قطعاً ذمہ دار نہیں ہے۔ اس کے باوجود اسلام کو ان مشکلات کے حل کا ذمہ دار بنانے کو کون ہے کہ جو ظلم صریح نہیں قرار دے گا۔

تجارت و اقتصاد کے رگ و پے میں سود کو سمو دینا خواہ وہ اشتراکیت کے نام پر ہو یا کیپیٹل ازم کے نام پر، بہر صورت اس سے طبقاتی نابرابری اور غیر انسانی اونچ نیچ کا پیدا ہونا چونکہ طبعی طور پر ضروری ہے اس لئے اس نظام فاسد میں سود پر قرض لینے والا، دینے والے کے آئینی و قانونی شکنجے میں پوری طرح زندگی بھر کے لئے پھنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور مزید برآں یہ طبقاتی کشمکش نت نئی اقتصادی، معاشرتی، اخلاقی، تجارتی اور تہذیبی آفات و مصائب کے پہاڑ کھڑے کر کے انسانیت کے ٹکڑے کر دیتی ہے تو ان کی اور ان کے حل کی ذمہ داری کسی طرح بھی اسلام پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ مگر پھر بھی اس غیر معقول مطالبے کو دہرانے میں باک محسوس نہیں کیا جا رہا ہے۔

اس مرحلے پر حضرت شاہ صاحبؒ کی مفکرانہ رہبری یہ سامنے آئی کہ چالاک دشمنان اسلام کا سازشی بنیاد پر اور اسلام ناشناس اپنوں کا جہالت کی بنیاد پر ماضی میں بھی یہ ہی تعامل رہا ہے اور یہ ہی آج بھی جاری ہے کہ زندگی کی اجتماعیت و انفرادیت کیساتھ اقتدار پر بھی نافذ تو کیا گیا اس نظام کو جو اسلام سے یکسر مختلف ہی نہیں بلکہ اسلام کے خلاف خودساختہ معکوس عقلی نظریات پر قائم ہے اور یہ مسائل و مشکلات اسی کی پیدا کردہ ہیں۔ پھر ان کے حل کا مطالبہ اپنے ہی

جاری کردہ نظام سے کرنے کے بجائے ان کے حل کا مخاطب اور ذمہ دار بنایا جارہا ہے اسلام کو۔ جبکہ یہ غیر معقول مطالبہ جب صحیح ہوسکتا ہے کہ جب اجتماعیت وانفرادیت کے جزوکل پر اور جملہ شعبہ ہائے حکومت واقتدار پر پہلے اسلام کو جاری اور منطبق کیا جائے۔ یعنی اس کی حاکمیت قائم کی جائے۔ پھر اس نظام اسلام سے اگر کچھ مشکلات ومسائل پیدا ہوں تو اس صورت میں بالیقین ان کے حل کا ذمہ دار اسلام کو قرار دینا عقلاً بھی بجا اور درست ہوگا اور عملاً بھی صحیح قرار پائے گا۔ لیکن اس کے بغیر اسلام کو حل مسائل کا مخاطب بنانے کو غیر معقولیت کے ساتھ "اسلام کے خلاف اہانت آمیز سازش" کے علاوہ کوئی دوسرا عنوان نہیں دیا جاسکے گا۔

تیسرا اہم بالشان نقطۂ فکر جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم سے مستفاد ہوتا ہے وہ تعلیمات اسلام کی روشنی میں نظام تربیت ہے۔ اس نظام تربیت کا اصطلاحی نام "شریعت" ہے جو اپنے متبعین کے لئے تمام خودساختہ نظاموں کے برخلاف ہر دائرہ زندگی کے تمام اقوال، افعال اور احوال میں اخروی جوابدہی کو اولین عقیدہ کی حیثیت دیتی ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے ہر اس طریقہ کی بالکلیہ نفی کرتی ہے کہ جو اسلامی شریعت کے مقررہ احکام کے برخلاف ہو۔

تخریب پسند طاقتوں کی طرف سے اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے والے اغیار میں یہود ونصاریٰ تھے اور اپنوں میں وہ ہیں کہ جن کے عقائد اسلامیہ کے برخلاف افکار ونظریات سطور بالا میں ذکر کئے جاچکے ہیں۔ وہ سب جو قابلِ اعتراض کردار ادا کررہے تھے آج وہی کردار کمیونزم، کیپٹل ازم، اور سوشل ازم کے ناموں سے بروئے کار لایا جارہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دورِ حاضر کے وسائل علم وخبر اور ذرائع نقل وحمل کی عالمگیری نے ان مخالفانہ ریشہ دوانیوں کو بھی عالمگیر بنادیا ہے۔ اس لئے دفاع میں بھی اس عالمگیری کو ملحوظ رکھنا ضروری بن گیا ہے۔

مثلاً کمیونزم کے پرستاروں نے غیروں کو نہیں بلکہ سادہ لوح مسلمانوں کو بھی اشتراکیت کی پیدا کردہ ناقابل حل مشکلات کے حل کا اسلام سے مطالبہ کرنے پر لگادیا ہے اور اس کا خسیس ترین مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کمیونزم سے پہنچنے والے نام نہاد فائدوں کا کریڈٹ تو کمیونزم کو ملے اور اس کی پیدا کردہ مشکلات کے حل سے اسلام بجا طور پر انکار کرے تو اس کو نقص بناکر اسلام کے سر منڈھ دیا جائے۔

حضرت شاہ صاحب کا چوتھا اہم ہدف جملہ امور اجتماعی وانفرادی میں اسلامی عدل وانصاف ہے جس کی رہنما ہدایات اور ان کے تقاضوں کی تکمیل کا اہتمام اساسی اہمیت کے ساتھ کتاب وسنت میں ملتا ہے۔ یعنی حق وعدل کی راہ میں حائل ہونے والی بعض ایسی چیزوں کو لوگ رکاوٹ قرار دے رہے ہیں کہ جن کو اسلام رکاوٹ تسلیم نہیں کرتا۔ ان کو رکاوٹ نہ سمجھنے کے لئے مصالحانہ ماحول سازی ضروری ہے جیسے محتاج وفقیر اس مالدار کے خلاف حق وانصاف کی بات کہنے سے گریز کرتا ہے کہ جس سے اسے مدد ملتی ہے۔ یا معاملاتی امور میں حق وانصاف پر مبنی گواہی سے گواہ کا اس لئے اعتراض کرنا کہ خود اس کو یا اس کے والدین یا اعزہ واقربا کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ یا مالدار حق وانصاف کی بات سے اس لئے پہلو تہی کرے کہ اس سے کسی ایسے ضرورتمند کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو کہ جس سے اس کی ہمدردیاں وابستہ ہیں یہ خود غرضانہ وہ مصالح ہیں کہ جنہیں اسلام اس لئے تسلیم نہیں کرتا کہ ان میں مصلحت جزدی ہے۔ لیکن فساد اجتماعی کی اس سے وسیع داغ بیل پڑتی ہے۔ اس لئے یہ مصلحتیں قطعاً لائق اعتناء نہیں ہونی چاہئیں۔

اسلام کے مزاج عدل پر مبنی ہوازن کا واقعہ شاہد عدل ہے کہ ان سے جنگ کے بعد حاصل شدہ مال غنیمت نبی کریم ﷺ نے شرعی قاعدے کے مطابق فاتحین میں تقسیم کر کے ان کو مالک بنا دیا اس کے بعد بنی ہوازن نے اسلام قبول کر لیا اور خدمت نبوی میں حاضر ہو کر اپنے اموال وافراد کی واپسی کا مطالبہ پیش کیا اور آپ ﷺ کی خواہش بھی یہی ہوئی کہ بنو ہوازن کو ان کے اموال وافراد واپس دیدیے جائیں۔ لیکن تقاضائے عدل کے تحت آپ ﷺ نے مالکوں سے وہ مال زبردستی لینے کے بجائے راہ ترغیب اختیار فرمائی اور فرمایا کہ قبول اسلام کے بعد بنو ہوازن تمہارے دینی بھائی بن گئے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ان کے قیدی جو غلام بنا کر تمہیں دیدیے گئے ہیں، وہ سب ان کو خواہ معاوضہ لے کر یا بلا معاوضہ واپس کردو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ معاوضہ لینے والوں سے میں ان کے مال اس وقت تک بنو ہوازن کو نہیں دوں گا جب تک مجھے معاوضہ ادا کرنے کے بقدر مال کہیں سے حاصل نہ ہو جائے۔ یہ واقعہ کمال عدل وانصاف کے تحت فرد کی ملکیت کے احترام پر بھی مضبوط حجت بن رہا ہے اور عصر رواں میں نیشنلائزیشن کی جابرانہ اور ظالمانہ حقیقت کو بھی طشت از بام کر رہا ہے کہ جس کو نہایت خوبصورت اور جاذب نظر

عنوانات سے پیش کیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تخریب پسند طاقتوں نے اپنی خود غرضانہ خواہشات کے تحت کبھی اسلام کے اعتقادی مسائل کو ہدف بنایا، کبھی طاعات وعبادات کو، کبھی اسلام کے نظام عدل ومساوات پر اپنے فکری عناد کی پوری توتیں صرف کیں تو کبھی نظام اموال پر ہاتھ کی صفائی دکھائی، ان تمام سازشوں میں مشترک بنیادی فکر ہمیشہ یہ ہی کارفرما رہا ہے کہ انسانی عظمت کو پامال کرنے والے نظام برپا کئے گئے اور ان سے جب زبردست مفاسد ومصائب رونما ہوئے تو ان کے حل کا مطالبہ اسلام کے سر ڈال دیا گیا تاکہ حسن ظن تو اپنے باطل نظام سے پیدا کیا جائے اور بدظنی اسلام کے بارے میں قلوب میں راسخ کردی جائے۔ پس اس مفسدانہ طرز وطریق کو ماضی کی طرح آج بھی مخالفین اسلام اپنائے ہوئے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ آج کے دشمنانِ اسلام کے ذہنوں میں بھی اسلام کی پرتاثیری مشتبہ نہیں ہے اسی لئے شاطرانہ چالوں کے ذریعہ اپنا موقف اقدامی بنا کر ملت اسلامیہ کو دفاعی موقف پر کھڑا کردینا چاہتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس روشنی میں ملت اسلامیہ بھی نفسیاتی ہتھیار، مخالفین اسلام کے برخلاف استعمال کرکے انہیں دفاعی موقف سے قدم آگے نہ بڑھانے پر مجبور کردے۔ اسی حقیقت کی علامہ اقبال نے بجا ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ      خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

اگر یہ ممکن ہے کہ فرزندانِ تثلیث میراث خلیلؑ کو چھین کر، خاک پاک حجاز کو خشت بنیاد کلیسا بنا ڈالیں تو یہ کیوں ممکن نہیں ہے کہ فرزندانِ توحید مسیح علیہ السلام کی توحیدی میراث لے کر کلیسا کی خاک شرک آمیز کو حجاز کی خشت توحید میں تبدیل نہ کر ڈالیں۔ پس احوالِ وقت کو نماز عشق اذان سمجھئے اور یقین کیجئے کہ:

نماز عشق پڑھنے کا انہی کو حق ہے دنیا میں
کہ آتا ہے جنہیں خون تمنا سے وضو کرنا

وختامًا نسئل اللہ ان یوفقنا الجمیع الی مافیہ خیر دیننا و دنیانا وھو نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

# مسند الہند اور فہم حدیث

مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیری☆

ملاء اعلیٰ سے وہ کتاب آنے والی تھی جس کا دائرۂ کار صرف ایک نئے دین، نئی شریعت، نئے قانون، نئی امت سازی تک نہیں تھا بلکہ یہ الکتاب پچھلے تمام قوانین کی ناسخ، کتب سماوی کی قانونی حیثیت کے نفاذ کو ختم کرنے والی ہے اور ایک ایسے معاشرے میں خوشگوار انقلاب اس کا خاص مقصد تھا جو معاشرہ انسانیت سے کوسوں دور، آدمیت سے بمراحل بعید، حیوانیت سے قریب تر ہو چکا تھا۔ پھر اسے بھی نہ بھولئے کہ الکتاب المبین کی قانونی وتشریعی حیثیت کسی خاص وقت یا مدت کے ساتھ وابستہ نہیں، بلکہ اسے رہتی دنیا تک کام کرنا ہے اور کرتی رہے گی۔ یہ ہماری اور آپ کی جیتی جاگتی دنیا، تمدن کے نام پر کبھی تہذیب، کلچر، نت نئے فیشن، نئی پوشاک، نئے انداز، شاندار کوٹھیاں، پرفضا محلات، تجارت ومعیشت کے نئے نئے طریقے، خوفناک ہتھیاروں کی ریل پیل، انسان کش زہریلے کیمیکل، اپنے مفادات کے لئے ان اسلحہ کی تقسیم، مقصد کی تکمیل پر ان ہی ہتھیاروں کو ضائع کرنے کے لئے مطالبے، ان مطالبات میں کھلا ظلم، تشدد کی بدترین راہیں سب کچھ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، مگر قرآن کریم پندرہ سو سال سے جس انسانیت کو جگا رہا ہے، انسان کو جھنجھوڑ کر جس طرح بیدار کر رہا ہے، اس کے طریقۂ کار میں نہ کوئی تبدیلی، نہ کوئی تغیر، یہ کتاب اس درجہ مقدس تھی جس کے مضامین جہاں محفوظ کئے گئے حفاظتی انتظامات اتنے کڑے تھے کہ کسی انسان کی پرواز تو درکنار شیطان بھی اپنی شیطنت کے باوجود نہیں پہنچ سکا۔ اس کو پہنچانے

---

☆ شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند۔

کے لئے بھی قوی ترین ذریعہ روح الامین کا اختیار کیا گیا "نزل به الروح الامین، انه لقول رسول کریم ذی قوة عند ذی العرش مکین مطاع ثم امین" یہ گوشہ بھی نہیں چھوڑا کہ جو وقت اس کے نزول کا طے کیا وہ ۱۲ مہینوں میں سب سے زیادہ مقدس مہینہ "شھر رمضان الذی انزل فیه القرآن" "نور علی نور" انا انزلناه فی لیلة القدر" رمضان کیا ہے؟ بشری خواہشات کے طوفان وطغیان پر شریعت کا مضبوط بند جسے نہ سیل عرم زیر آب کر سکے، نہ سمندر کی طغیانی متاثر کر سکے۔ خیر کا غلبہ، شر مغلوب، جود وکرم کی بارشیں، داد ودہش کا ابر کرم، مواسات وغم خواری کا بازار گرم۔ ملکیت کے علم بلند، شیطنت کے جھنڈے سرنگوں۔ یہ سب اشارے تھے کہ قرآن کریم کے لئے مقدس ماحول، فکر کی ذہنی تقدیس اس سے اصلاح پذیر ہونے کے لئے شر کو دبانا اور خیر کو اچھالنا، یہ سب کچھ اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ اس "الکتاب" کو یہ سمجھ کر پڑھا اور پڑھایا جائے کہ خدا تعالیٰ براہ راست مجھ سے مخاطب ہے بقول علامہ اقبال" ع

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

تاج محل کی تعمیر، دہلی کی شاہ جہانی مسجد، لاہور کی شاہی عبادت گاہ وغیرہ میں عام معمار استعمال نہیں کئے گئے نہ کئے جاتے ہیں بلکہ اپنے فن کے ماہر، اپنی صناعی میں یگانہ سامنے آتے ہیں تب جا کر ان کی عمارتیں سینہ گیتی پر مرمریں لہروں کے ساتھ نمایاں ہوتی ہیں۔ پر شکوہ، رفیع الشان اسی وقت کہلاتی ہیں، جھونپڑوں میں کیا خوبصورتی، کہ قابل بیان ہو، کٹیا میں کیا دل کشی کہ مجلس میں اس کی تاریخیت زیر گفتگو آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ وقیع وپُر وقار کتاب، جس کے نزول کے فیصلے کے ساتھ ہی ہر قسم کی چوکسی برتی گئی تھی۔ ہمہ شما تو درکنار یہاں ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام جیسے باوقار پیغمبروں کا بھی انتخاب نہیں ہوا۔ انتخاب ہوا تو لق ودق صحرائے عرب کے ایک نامی گرامی خاندان کے فرد کا جن کا اسم گرامی محمد بن عبداللہ التیمی والہامی ہے جن کے خفی وجلی، اجلی واخفی امتیازات کے لئے دفتر درکار ہے جو جس قدر بڑا ہے اس کے کلام کے لئے لفظ بھی اتنا ہی وقیع۔ ارشادات، ملفوظات، فرمودات وغیرہ مگر یہ سب تعبیرات یہ سب اسلوب یہ سب انداز حدیث کی حقیقت کو کھولنے کے لئے ناقص ونا کام۔ مشہور شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی یہ

کہہ کر پیچھا چھڑا رہے ہیں کہ کلام قدیم سے ممتاز کرنے کے لئے حدیث کا لفظ وضع ہوا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی المغفور نے حدیث کا ماخذ "واما بنعمة ربک فحدث" کو ٹھہرایا، جو نکتہ بعد الوقوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر اس معلم اول و آخر نے محسوس کیا کہ انسانیت میرے کلام کی اہمیت کو نہیں سمجھ رہی ہے تو "اولا مقالتی" کا لفظ استعمال فرمایا جیسا کہ "نضر الله امرأ سمع مقالتی" سے واضح ہے۔ لیکن ابھی ان ارشادات کا رفیع مقام سامنے نہیں آیا تھا نہ ان کی اہمیت واضح ہوئی تو سمجھانے والے نے صاف صاف کہا "حدثوا عنی ولا حرج" اس حدیث پر قیل وقال ہے مگر محدثین نے تعدد روایات کی بناء پر اسے قوی قرار دیا ہے۔ اکہنے والے نے کہا تھا کہ "یعلمھم الکتاب" حدیث اسی کتاب کی شرح ہے۔ چنانچہ الشافعی الامام، دب دبا کر نہیں بلکہ باواز بلند دعویٰ فرماتے ہیں کہ کوئی صحیح حدیث لاؤ۔ اس کا ماخذ قرآن سے متعین کردوں گا۔ خاتم المحدثین علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے بھی بہت سی احادیث کا ماخذ قرآن سے متعین کیا، کچھ سمجھے آپ: اب ایک جانب تو قرآن و حدیث کی اہمیت کہ انسانیت کی ہر درماندگی کا علاج ان ہی میں ہے، ایک بصورت متن (القرآن) دوسرے بشکل حدیث، محمد رسول اللہ ﷺ کے داہنے ہاتھ میں قرآن تھا جب کہ بایاں حدیث کے بیش بہا خزانہ سے لبریز۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ لاکھوں حدیثیں کہاں سے آگئیں، بھلا سوچئے تو سہی جسے ۲۳ رسال کی مختصر مدت میں پوری دنیا میں انقلاب برپا کرنا تھا اس کا ہر قول و فعل، ہر انداز، ہر کردار اگر حدیث نہ بن جاتا تو یہ صبح کائنات اجالے سے کیسے آشنا ہوتی، بلکہ جہالت کی تاریکیوں میں ہمیشہ کے لئے الجھی رہتی۔ عام زندگی کو بھی لیجئے از صبح تا شام، رات تا دن، یک روزہ اس کی باتوں کو سمیٹے یقیناً دفتر بن جائیں گے۔ خواص کو دیکھئے جن کی خلوت و جلوت قانون، جو اسٹیج پر پھد کتے ہیں تو قانون، جب کرسی پر جم کر بیٹھتے ہیں تو قانون جب پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں تو پشتارۂ قوانین، پھر رسول اللہ ﷺ ایسے جلیل الشان نبی سے یہ بدگمانی کیوں؟ اگر چہ تحقیق یہ ہے کہ آپ کا ایک ہی ارشاد محدثین کے یہاں اسناد کی کثرت سے عددی کثرت پاتا ہے، "من کذب علیّ متعمداً" حدیث ایک ہی ہے لیکن سندی کثرت کی بناء پر ۱۰۰ سے اس کا عدد کہیں سے کہیں جا پہنچا پھر فہم حدیث کے بھی حدیث سے مراحل ہیں۔ لغت سے حل کیجئے۔ پس منظر پر نظر دوڑائیے، کارہائے نبوت کو سامنے رکھئے،

مقاصد نبوت کو نظر انداز نہ ہونے دیجئے وغیرہ تا آنکہ محققین نے کہا کہ القرآن کو سمجھنے کے لئے تو ۱۵ علوم ضروری ہیں لیکن فہم حدیث کے لئے ۸۴ بنیادی علوم درکار ہیں۔ ابھی رکئے فہم حدیث کا ایک دوسرا مرحلہ ہے کہ جب کبھی امت سنبھلی تو اسی القرآن والحدیث سے، بگاڑ نے جب معاشرہ میں دخل پایا ان ہی دو مضبوط ستونوں کو چھوڑنے کی بناء پر، جانے والا مقدس ترین انسان جب اس فانی عالم سے عالم جاودانی کی طرف گامزن تھا تو امت پر یہ راز کھول گیا کہ دو چیزیں تمہارے پاس ایسی ہیں جن سے تمہارے لڑکھڑاتے قدم استوار ہوں گے یعنی الکتاب والسنۃ۔

اب آیئے ایک اقتدار بکھر رہا ہے تو دوسرا مکر و مکاری، فریب وعیاری کو دوش بدوش لے کر ہندوستان پر دھیرے دھیرے اپنے قدم جما رہا تھا۔ اسلامی سلطنتوں کی تباہی وبربادی کے بعد ہندوستان میں شوکت شاہی وفخر خسروی کے پرخچے اڑائے جا رہے تھے۔ جانے والے اقتدار اور آنے والے ظالمانہ استبداد کے نتائج اتنے خوفناک تھے جنہیں نظر انداز کرنا مجرمانہ غفلت ہوتی، ٹھیک ان جاں گسل اوقات ولمحات میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے سمجھا اور خوب سمجھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے اس میں صراط مستقیم پر امت کو جمائے رکھنے کے لئے القرآن والحدیث ہی کام دیں گے۔ چنانچہ حدیث کی عربی وفارسی شرح، اصول تفسیر پر عجالۂ نافعہ، فارسی ترجمہ قرآن بلکہ پورے خاندان کو اسی عظیم کام میں مصروف کر دیا۔ ہندوستان کی مایہ ناز شخصیت خانوادہ ولی اللہ کے شب چراغ حضرت شاہ عبدالعزیز الدہلوی کے بارے میں علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ امت حدیث کا حق ادا کر چکی لیکن قرآن کا قرض باقی ہے۔ کاش کہ حضرت شاہ عبدالعزیز کی تفسیر مکمل ہو جاتی تو امت اس قرض سے بھی سبکدوش ہو جاتی۔ حضرت شاہ عبدالقادر علیہ الرحمۃ کا الہامی ترجمہ، شاہ رفیع الدین کی سنبھلی ہوئی زبان۔ اپنے منصوبے کو بروئے کار لانے وبارآور بنانے کے لئے دہلی کی مشہور درسگاہ کا قیام یہ سب کچھ اسی استوار فکر کے ثمرات تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے مجاہدانہ جد وجہد کے بعد مالٹا کے جزیرہ کی طویل اسارت سے لوٹ کر دیوبند کی پہلی تقریر میں حضرت مولانا محمود حسن، المعروف بشیخ الہند نے بھی فرمایا کہ مالٹا کی ۳ رسال سے زائد اسارت میں ہم پر یہ حقیقت کھلی کہ امت میں مفید تر کام انجام دینے کے لئے الکتاب والسنۃ کو دونوں ہاتھوں سے تھامنا ہوگا۔ یہ قرآن وحدیث کی طاقت وتاثیر

کو سمجھنے کا ایک فہم تھا بالغ النظری تھی اور ہر جہت سے اٹھنے والے فتنہ کا بھرپور توڑ، فہم حدیث کی تیسری منزل کہ حضرت شاہ صاحب حدیث کو کس طرح سمجھے اور سمجھاتے ہیں ابتدائی گفتگو اسی واقعی وآخری منزل کے لئے ہے۔

اسلام کے شاندار ماضی کو زبوں حالی کے اس دور پر ہرگز قیاس نہ کیجئے ماضی تحصیل علم حصول کمالات پیش قدمی، وراہ نمائی کے ان واقعات سے لبریز ہے جو تاریخ کے جگمگاتے ہوئے اوراق ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے چھوڑے ہوئے قیمتی اثاثہ کی تلاش وجستجو تو براہ راست دین کا ایک بڑا حصہ تھا محدثین نے حدیث کے ذخیرہ کی جستجو میں مشرق ومغرب شمال وجنوب کی طویل طنابوں کو کس کر رکھ دیا۔ پاپیادہ اسفار، مشقت سے لبریز، ناداری وغربت، مفلسی وفلاکت ان کے ولولوں کو سرد تو کیا کرتی اور مہمیز دیتی۔ حدیث کی تلاش کے اسفار کو "رحلة" کا مقدس نام دیا گیا، اس راہ کی صعوبتیں اور شاق اسفار دنیا کے لئے سامان برکت اور آفات سے حفاظت کا قوی ذریعہ سمجھائے گئے۔

امام بخاری علیہ الرحمۃ خود فرماتے ہیں کہ میں شمار نہیں کرا سکتا کہ تلاش حدیث میں میرے اسفار کوفہ کی جانب کتنے ہوئے؟ اور واقعہ یہ ہے کہ مرکز سے وابستگی بھی اس راہ کی سب سے بڑی کامیابی تھی، جاننے والے جانتے ہیں کہ کثیر الروایہ مشہور صحابی حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک بار خود فرمایا کہ مجھ سے زیادہ حدیث کا کوئی جاننے والا نہیں بجز عبداللہ بن عمرو بن عاص کے۔ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایات کا عدد کم اور ابو ہریرہ کے زوایتی عدد کہیں سے کہیں۔ عبداللہ شام میں مقیم ہو گئے جس نے علمی مرکزیت اختیار نہیں کی تھی۔ ابو ہریرہ کا قیام مدینہ طیبہ میں تھا جو اس دور میں حدیث کے اخذ وقبول اور اشاعت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی اس راز کو سمجھا اور ہندوستان سے باہر پہنچ کر حدیث کو حدیث کے سرچشموں سے حاصل کیا۔ ظاہر ہے کہ اس رحلة کا خاص نتیجہ فہم حدیث ہی کی صورت میں سامنے آنا چاہئے تھا۔

بخاری الامام کی دقت نظری حدیث تالیفی مجموعہ میں ان کی ژرف نگاہی ان کے مشہور تراجم سے واضح ہے۔ محدثین میں کوئی اس دقت نظری کا مظاہرہ نہیں کر سکا۔ مشہور محدث نسائی الامام

کے تراجم امام بخاری کے بعد ہیں بلکہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ کچھ مواقع پر امام نسائی کے تراجم امام بخاری کے تراجم کا عکس جمیل ہیں۔ حسن ظن سے کام لیجئے تو ''توارد'' کہئے۔ زیادہ سے زیادہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نسائی الامام کو امام بخاری کے یہ تراجم اس قدر برجستہ محسوس ہوئے کہ اضافہ وترمیم تو درکنار، فہم حدیث کا بعینہ ترجمان سمجھتے ہوئے انہیں جوں کا توں باقی رکھا۔ مشہور تو یہی ہوگیا کہ بخاری کا فقہ ان کے تراجم میں ہے لیکن ہر مشہور بات صحیح ہو ضروری نہیں بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ بخاری کا فہم حدیث ان کے تراجم میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ اپنے ۲۵ رسالہ بخاری شریف کے درس کی سعادت کے بعد کہہ سکتا ہوں کہ نرا مطالعہ شاید کارآمد نہ ہو۔ تدریس میں بہت سے اشکالات ذہن خود پیدا کرتا ہے تو گاہے مستعد طلباء کچھ مشکلات پر متنبہ کرتے ہیں۔ اسے یوں سمجھئے کہ بخاری نے عنوان قائم کیا کہ انصار سے محبت ایمان کی علامت ہے۔ پیش کردہ حدیث پر فقہی مباحث واختلاف فقہاء کا انبار ہے جو بجائے خود مفید ہے۔ اس سے متصلاً عنوان ہے ''من الدین الفرار من الفتن'' جس میں رسول اکرم ﷺ کی پیشین گوئی جو پیغمبرانہ صداقت کی آئینہ دار ہے، مذکور ہے۔

سالہا سال کی تدریس کے بعد احقر پر سانح ہوا کہ انصار سے متعلق پیش کردہ حدیث ایک مقدس طبقہ کی عظمتوں کو واشگاف کرتی ہے لیکن مہاجرین کی فدائیت، جان نثاری، اسلام کے لئے عظیم قربانیاں بھی ایسی نہیں کہ بخاری الامامؒ ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔ ترک وطن واعزہ واقارب سے جدائی، کاروبار سے یکسوئی یہ سب کچھ دین ہی کی حفاظت کے لئے تھا، الامامؒ نے لاحقہ عنوان سے ترازو کے دونوں پلڑے برابر کردیئے ''کتاب العلم'' میں حضرت عمرؓ کا ایک مقولہ بخاری نے نقل کیا ہے کہ ''دنیا کی سیادتوں سے پہلے علم حاصل کرو، بعد میں حاصل اعزاز واقتدار تحصیل کمالات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے'' اس جاندار واقعی مقولہ کے بعد بخاری نے قال ابوعبداللہ وبعد کبر سنہ کا اضافہ کیا ابوحنیفہ الامامؒ سے تو ان کی بدگمانی کے چرچے عام ہیں لیکن فاروق اعظمؓ کے کسی قول پر رائے زنی یا تبصرہ بہت سی پیشانیوں کی شکن ہے۔

علامہ کشمیری المغفور نے بلاغت کی ایک صنعت ''احتراس'' (چونکا دینا) کا سہارا لیا اور فاروق اعظمؓ کی عظمتوں کے بخاری کے تبصرہ سے تحفظ کی کوشش کی مجھے یہ کہنا ہے کہ امام بخاری نے

اپنے تبصرہ کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے اس مشہور سفر کا تفصیلی ذکر کیا جو خضرؑ سے تحصیل کمالات کے لئے ہوا ہے نبوت وسیادت ہے جس سے بڑھ کر کوئی عظمت نہیں تحصیل کمالات کی راہ میں نہ یہ سیادت رکاوٹ ہے نہ موسیٰ علیہ السلام کی کبرسنی۔

اس گفتگو سے یہ سمجھنا کافی ہے کہ بخاری نے اپنے عنوانات میں باریک بینی، ربط اور تسلسل کو باقی رکھنے کی کوشش کی ہے کوئی غیر مربوط وغیر منظم تالیف نہیں، کہ دنیا نے صحت حدیث کے اہتمام پر نظر رکھ کر قرآن کے بعد صحیح بخاری کو دوسرا درجہ دیا ہو بلکہ تالیفی سلیقہ وقرینہ خود امام کی عظمتوں کی جانب دامان اہل علم کو کھینچ رہا ہے۔ مشہور مورخ ابن خلدون نے ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ بخاری کا حق امت پر باقی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کی معرکۃ الآراء شرح ''فتح الباری'' کی تکمیل پر ان کے مشہور شاگرد حافظ سخاویؒ اپنے استاذ کے عشق میں فرہادی جذبہ سے سرشار رقم طراز ہوئے کہ ہمارے استاذ حافظ ابن حجر نے یہ شرح لکھ کر بخاری کے قرضہ سے پوری امت کو سبکدوش کر دیا اور یہ اعلان غلط بھی نہیں۔

تاہم امام بخاری کے تراجم اب بھی کما حقہ حل نہ ہو سکے۔ حضرت علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں ''کاش کہ اس موضوع پر ابن تیمیہ کا قلم اٹھتا تو کوئی نادر چیز وجود میں آتی۔'' امام دہلوی نے ۱۴ اصول قائم کئے اور بخاری کے تراجم کو حل کرنے کی کوشش کی۔ ان زریں اصول کے تحت شاہ صاحب قدس سرہ نے تراجم پر جو کچھ قلمی اثاثہ چھوڑا اس سے ان کا فہم حدیث کھل کر سامنے آتا ہے۔ راقم الحروف دو چار مثالوں سے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے فہم حدیث کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو لیجئے۔

بخاری کا پہلا ترجمۃ الباب ''کیف کان بدأ الوحی الی رسول اللہ ﷺ'' ہے یہ عنوان اس طرف اشارہ دیتا ہے کہ بخاری وحی سے متعلق ابتدائی کیفیات کا تفصیلی نہ سہی اجمالاً ہی جائزہ لیں گے مگر غضب یہ ہے کہ پہلی حدیث ''انما الاعمال بالنیات'' ہے۔ ذیلاً مذکور احادیث میں صرف ایک حدیث وحی کی ابتدائی کیفیات کو کچھ واضح کرتی ہے۔ شارحین سرگرداں ہیں کہ عنوان اور معنون میں مطابقت کیسے پیدا کی جائے؟ ہندوستان کے مشہور محدث شیخ الہند محمود حسن صاحب قدس سرہ نے بدایت کو فاعلی، مفعولی، زمانی، مکانی میں تقسیم فرما کر مطابقت کی

راہوں میں کچھ چراغ روشن فرمائے، ان کے مشہور شاگرد علامہ کشمیریؒ نے فرمایا کہ یہاں بدایت سے بخاری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ وحی جس کا سلسلہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت پر آکر رک گیا تھا عدم سے وجود میں کس طرح آئی؟ کن مراحل سے گذری؟ اور ہم تک کیسے پہنچی؟ گویا کشمیری الامام بدأ کو ابتداء کے معنی میں لینے کے بجائے ظہور کے معنی میں لیتے ہیں اور اپنے مقصد کو امام بخاری کے اسی قبیل کے تراجم سے مؤید کررہے ہیں۔ اگرچہ حافظ ابن حجرؒ نے بدایت بمعنی ابتدائی پر فاضلانہ زور قلم بھرپور استعمال کیا جب کہ حضرت شاہ ولی اللہ "باب کیف کان بدء الوحی" میں صرف الوحی پر توجہ فرماتے ہیں متلو (القرآن) دوسری قسم وحی غیر متلو (احادیث صحیح) کی تقسیم کرتے ہوئے بدایت سے پیدا ہونے والے جھگڑے نمٹاتے ہیں۔

اہل علم کو یہ تین توجیہات خود بتائیں گی کہ فہم حدیث میں شاہ صاحب کیا رفیع مقام رکھتے ہیں۔ دوسری مثال لیجئے کتاب الایمان۔ ایمان کی حقیقت پر مباحث کا ایک طومار ہے ایمان تصدیق قلبی اقرار لسانی، نیک اعمال کے اہتمام کا مجموعہ ہے لیکن اس دنیا میں کھلا نظر آیا ہے کہ اعمال کا اہتمام شاذ و نادر ہے پھر بھی تارک اعمال کو مومن قرار دیا گیا۔ شاہ صاحب کا خیال ہے کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں ایک "انقیاد" اگر یہ بھی ہوگا تو دنیاوی اعتبار سے مومن قرار دینے میں کوئی تکلف نہیں۔ دوسری قسم حقیقی ایمان کی تجویز فرمائی۔ جس میں اعمال کا بھی بھرپور اہتمام ہو۔ اپنے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ دنیا اس کو بھی انسان کہتی ہے جس کی صحت کو گھن لگ چکا، جاں گسل بیماریوں نے گھیر رکھا ہے، موت سے قریب اور زندگی سے دور ہے اور وہ قوی تندرست و توانا بھی انسان ہی کہا جائے گا جس کی صحت و تندرستی قابل رشک ہے۔ شاہ صاحب نے اپنی اس مختصر، بلند و بالا تعلیم سے مباحث ایمان میں کھڑے پہاڑوں کو ہٹا کر فیصلہ کی راہ صاف کردی۔

تیسری مثال لیجئے رسول اکرم ﷺ کا ارشاد "حیاء ایمان کا شعبہ ہے۔" مشہور امام لغت امام راغبؒ نے حیاء کے لغوی معنی واضح کئے ہیں۔ علامہ کشمیریؒ نے عبداللہ بن مسعودؓ کی ترمذی میں موجود ایک روایت سے خود رسول اکرم ﷺ کی وہ تشریح نقل کی جو حیاء کی اس حقیقت کو کھولتی ہے جسے صرف نبی جلیل و اجل ہی سمجھ پاتے یا سمجھا سکتے ہیں۔ اشکال یہ ہے کہ یہ حیاء کبھی کفر بدوش

افراد میں موجود ہوتی ہے جب کہ بعض مومن اس دولت عظمیٰ سے تہی دامن نظر آتے ہیں۔شاہ صاحبؒ نے حیاء کا اولین تقاضہ معصیت سے حفاظت قرار دیا اور چونکہ ایمان بھی یہ ہی کام کرتا ہے اس لئے حیاء کو مجازاً ایمان قرار دیا۔

ایک اور مثال لیجئے رسول اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے کہ میری احادیث کو امت کا اولین طبقہ کسی انقطاع کے بغیر قیامت تک پہنچاتا رہے۔ بڑی اونچی بات فرمائی کہ براہ راست جو مجھ سے سن رہے ہیں عجب نہیں کہ امت کا آخری طبقہ فہم حدیث میں ان سے آگے بڑھ جائے۔ معلوم ہوا کہ شاگرد استاد سے علوم میں فائق ہوسکتا ہے۔ مسترشد باطنی کمالات کی شہرت میں اپنے مرشد کو پیچھے چھوڑ سکتا ہے۔ ابوحنیفہ الامام کو تو بیشتر جانتے ہیں لیکن ان کے شیوخ واساتذہ کو جاننے والے کچھ ہی نکلیں گے یہی حال باقی تین ائمہ کا بھی ہے۔

شیخ عبدالقادر الجیلانی، سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی، معروف شخصیتیں ہیں لیکن انہوں نے کس سرچشمہ سے باطنی کمالات کی سیرابی حاصل کی؟ خال خال ہی افراد کو معلوم ہوگا۔

اس عنوان کے تحت موجود حدیث میں مذکور ہے کہ تمہاری جانیں ایک دوسرے کے لئے اس طرح حرام ہیں جیسا کہ آج کے دن کی حرمت۔ یاد رہے کہ یہ حجۃ الوداع میں آپ کا وہ معرکۃ الآراء خطبہ ہے جس میں انسانی جان ومال، عزت وآبرو سے نہ کھیلنے کی وہ تلقین ہے جسے کوئی بین الاقوامی چارٹر بھی واضح نہیں کر سکے گا۔

مگر سوال یہ ہے کہ یہاں حرمت سے کیا مراد ہے؟ آیا وہی معروف حرمت جو حلت کے مقابل ہے یا وہ جو اہانت کے مقابلہ میں استعمال ہوتی ہے؟ دونوں حرمتیں مشکلات کی حامل ہیں۔

شاہ صاحب نے حل فرمایا کہ اگر حرمت بمقابل حلت لی جائے تو مفہوم ان برائیوں کا ارتکاب ہوگا جنہیں اس خاص دن میں عوام وخواص بھی بدتر سمجھتے ہیں۔ اور اگر حرمت اہانت کے مقابلہ میں ہے تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ کوئی دوسرے کی توہین کا مرتکب نہ ہو۔

ایک اور مثال سے شاہ صاحب کی فہم حدیث میں بلند قامتی نمایاں ہے۔ امام بخاری نے عنوان قائم کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایک ارشاد کو بار بار فرماتے تاکہ سامعین کا ہر طبقہ مستفیض ہو۔ اس

کے تحت حدیث ہے کہ رسول اکرم ﷺ جب مجلس میں تشریف لاتے تو تین بار سلام فرماتے علامہ سندھیؒ نے تینوں سلاموں کو سلام استیذان قرار دیا اور اس کی ارشادات نبوی سے تائید پیش کی کہ اجازت کے لئے تین ہی کا عدد مسنون ہے۔ بدر عینی نے پہلا سلام استیذان کے لئے، دوسرا سلام تحیہ جو مجلس میں اپنے لئے مخصوص مقام پر پہنچ کر شرکائے مجلس کو کیا جاتا ہے۔ تیسرا اسلام سلام وداع جو مجلس سے رخصت ہونے پر کیا جاتا ہے۔

علامہ کشمیری نے معروف طریقہ سے مدد لی اور فرمایا کہ شرکائے مجلس اگر بکثرت ہوں تو مجلس میں داخل ہونے والا پہلی نشست میں موجود کو سلام کرتا ہے۔ درمیان میں پہنچ کر ان حاضرین کو جو یہاں موجود ہوتے ہیں۔ تیسرا اسلام نشست سے قریب بیٹھنے والوں کو۔

شاہ ولی اللہ الامام الدہلوی پہلا سلام سامنے والوں کے لئے۔ دوسرا دائیں جانب میں تیسرا بائیں جانب کے شرکاء کے لئے تجویز فرماتے ہیں۔ راقم السطور اس اعتراف میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتا کہ وقت کی تنگی اور بے بضاعت قلم عنوان کا حق ادا کرنے میں قاصر رہا پھر بھی طویل اور بے مغز سمع خراشی کے لئے معذرت طلب ہوں۔

# شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی☆

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے درمیان ایک صدی کا فاصلہ ہے۔ شیخ محدث عہد اکبری کے عالم ہیں۔ شیخ کی وفات ۱۰۵۲ھ میں ہوئی۔ امام ولی اللہ نے مغل حکومت کا آخری دور پایا۔ آپ نے عالم گیر کی وفات ۱۱۱۸ھ کے بعد دور زوال کے گیارہ مغل بادشاہوں کا دور دیکھا۔ شاہ صاحب کی وفات کا سال ۱۱۷۶ھ ہے۔

شیخ محدث کا عظیم تجدیدی کارنامہ علوم حدیث کی ترویج واشاعت ہے۔ ہندوستان میں حدیث نبوی کا علم موجود تھا۔ شیخ سے تین سو سال پہلے حضرت سلطان المشائخ حدیث کی مشہور کتاب مشارق الانوار (تصنیف امام حسن بن محمد صنعانی وفات ۶۵۰ھ) کا اپنی خانقاہ میں درس دیتے تھے اور آپ کو حدیث کی یہ ضخیم کتاب حفظ یاد تھی۔ (سلطان المشائخ کا سن وفات ۷۲۵ھ ہے)

البتہ حدیث کی مشہور کتابوں صحاح ستہ کا باقاعدہ درس اور احادیث کا گھر گھر چرچا شیخ محدث کا عظیم کارنامہ ہے اور میں اسے شیخ کا مجددانہ کارنامہ قرار دیتا ہوں۔ حضرت شیخ سے عقیدت رکھنے والوں میں یہ ناچیز واحد آدمی ہے جس نے عہد اکبری "تین مجدد" کا نظریہ پیش کیا اور حضرت مجدد (الف ثانی) سرہندی، شیخ محدث اور ان دونوں ہستیوں کو اپنے روحانی تصرف سے فیض یاب کرنے والے ان دونوں کے مرشد کامل حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندیؒ کو اس دور کا مجدد تسلیم کیا، یہ تھے تین مجدد۔

---

☆ سابق ناظم عمومی جمعیۃ علماء

بعض مجددی حضرات نے مجھ سے شکایت کی مگر میں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت امام ربانی کا تجدیدی کارنامہ جہاد قومی اور نہی عن المنکر میں جرأت و قربانی ہے اور اس مشن میں ان کا کوئی مثیل نہیں۔ اور شیخ محدث نے علوم حدیث اور علوم شریعت کی ترویج میں جد و جہد کی زندگی بھر درس و تعلیم کا فرض ادا کیا اور تمام علوم شریعت میں بڑی بڑی کتابیں تصنیف کیں۔ یہ ان کا تجدیدی میدان تھا۔ دونوں کے میدان الگ الگ تھے۔

شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کے کارناموں کی اولیت کا جہاں تک سوال ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس خاندان کے دینی کارناموں کی اولیت و عظمت کو تمام اکابر کے کارناموں پر اس حیثیت سے عظمت حاصل ہے کہ اس خاندان نے کتاب اللہ اور قرآن کریم کے تراجم کئے اور قرآن کریم کی تفسیروں کا احیاء کیا اور آج کتاب الٰہی کے علوم کا جو چرچا مسلمانوں کے خاص اور عام طبقہ میں نظر آتا ہے وہ اسی مجدد خاندان کی خدمات جلیلہ کا ثمرہ ہے۔

اب اس میں کیا کلام ہوسکتا ہے کہ کلام الٰہی، خدا کا کلام ہے اور خدا کے کلام کو رسول پاک ﷺ کے کلام (حدیث) پر فوقیت حاصل ہے۔

شیخ محدثؒ سے پہلے شیخ شہاب الدین ہندی دولت آبادیؒ نے بحر مواج کے نام سے فارسی ترجمہ و تفسیر تحریر کی۔ اس کی تاریخ ۱۴۹ھ ہے۔ یعنی دوسری صدی ہجری کے وسط میں یہ تفسیر لکھی گئی۔ مصنف شیر شاہ سوری کے استاد تھے۔

اس کے علاوہ سارے مسلم دور اقتدار میں قرآن کریم کی اشاعت کے لئے کوئی منظم اور مقدس جد و جہد نہیں کی گئی اور اس لئے قرآن کا علم عام نہیں ہوسکا۔

تیمور کے عہد میں علامہ سید شریف جرجانیؒ نے فارسی میں ترجمہ کیا، آپ کی وفات کا سن ۸۱۶ھ ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں قرآن کریم کے علوم کی اشاعت برائے نام تھی اور ضرورت تھی کہ شیخ محدث اپنے عہد کے لئے قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر تحریر کریں، لیکن شیخ محدث کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے شیخ محدث کے بارے میں لکھا ہے کہ شیخ کو عربی سے فارسی

زبان میں ترجمہ کرنے کی بڑی مہارت حاصل تھی۔ شیخ کے فارسی ترجمہ اور عربی کی اصل عبارت کے درمیان کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں اتنی قدرت رکھنے والے عالم کے قلم سے اگر قرآن کریم کا ترجمہ اور اس کی تفسیر وجود میں آجاتی تو اس دور کی سرکاری زبان فارسی میں قرآن کریم کی خدمت کا یہ بہت اہم کام ہوتا مگر کلام الٰہی کی مکمل خدمت کا کام جس امام وقت کے لئے مقدر تھا تاریخ نے سو سال تک اس کا انتظار کیا۔

اس مسئلہ پر پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے چند فقروں میں جو فیصلہ کیا ہے اس سے بہتر کوئی فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ پروفیسر صاحب کے اس علمی فیصلہ کا حاصل یہ ہے کہ حضرت مجدد سرہندی ہوں یا شیخ محدث دہلوی اور ان کے بعد شاہ ولی اللہ دہلوی، ان تینوں حضرات نے اپنے آپ کو مامور من اللہ (خدا کا مقرر کردہ) کے منصب کے ساتھ پیش کیا ہے اور یہ ادعاء تینوں کے کلام میں موجود ہے۔ اب حقیقت یہ نظر آتی ہے کہ توفیق الٰہی نے جن کے اندر جو صلاحیت دیکھی اسے اسی خدمت پر لگا دیا۔ (صفحہ ۴۲)

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب (تذکرہ صفحہ: ۲۳۹، ۲۴۴) میں ان اصحاب تجدید بزرگوں کی عظمت پر جو بحث کی ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔

## شیخ محدثؒ کا تفسیر پر کام:

پروفیسر نظامی صاحب نے شیخ کی جن کتابوں کی فہرست نقل کی ہے ان کی تعداد ۶۰ کے قریب ہے جن میں حدیث، فقہ، کلام، تاریخ اور فلسفہ و منطق کی اہم ترین کتابیں شامل ہیں لیکن تفسیر قرآن پر شیخ کے قلم سے صرف چند چھوٹی کتابیں نکلی ہیں۔

تفسیر بیضاوی کے کچھ حصہ پر حاشیہ، آیت نور کی تفسیر میں ایک رسالہ، سورۂ عادیات کی تفسیر پر ڈھائی صفحات (حیات شیخ ۱۶۲)۔

## شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کی قرآنی خدمات:

شاہ ولی اللہ کے دور میں قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کے ذریعہ قرآنی علوم کی اشاعت

کو کس درجہ خطرناک سمجھا جاتا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ جب شاہ صاحب نے اس وقت کی ادبی اور سرکاری زبان (فارسی) میں ترجمہ کیا تو دلی کی مسجد فتحپوری پر شاہ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا اور علماء سوء کی طرف سے یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ جب دفتروں کے محرر قرآن کو جاننے لگیں گے تو پھر علماء کی کیا ضرورت باقی رہے گی؟ اور ان کا اقتدار کیسے قائم رہے گا؟

(تحریک شیخ الہند مرتبہ: مولانا محمد میاں صفحہ: ۴۸)

علماء نے عوام کے اندر یہ تصور بھی پھیلا دیا تھا کہ قرآن کریم ایک مشکل کتاب ہے مسلمان اسے سمجھ نہیں سکتے۔

چنانچہ حضرت شاہ صاحب کے مجاہد پوتے مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی مشہور کتاب (تقویۃ الایمان) میں اس کی تردید کرنی پڑی اور آپ نے لکھا قرآن مجید کی بہت سی باتیں صاف، صریح ہیں۔ ان کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ قرآن کریم کو مشکل کتاب کہہ کر اس کی بنیادی تعلیمات (توحید و اخلاص) سے دور رکھنے والے بدعت پسند طبقہ میں سے ایک خانقاہ نشین بزرگ تھے جنہوں نے مولانا محمد اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان کتاب پر اعتراضات کرتے ہوئے ایک اعتراض یہ بھی کیا کہ مولانا شہید قرآن کو سہل اور آسان کہتے تھے۔

راقم نے اپنی کتاب "مولانا اسماعیل شہید" اور ان کے ناقد میں تفصیل سے اس کا جواب دیا ہے۔

قرآن کریم سے دوری اور مہجوری کا یہ دور وہی تھا جس کی شکایت رسول اکرم ﷺ قیامت کے روز خدا تعالی کے حضور میں کریں گے اور فرمائیں گے۔

"وقال الرسول یا رب ان قومی اتخذوا هذا القرآن مهجوراً" (فرقان)

"رسول پاک کہیں گے کہ اے میرے پروردگار! بے شک ان لوگوں نے اس قرآن کو نظر انداز کر دیا تھا۔ دوسرا ترجمہ یہ ہے، "قرآن کو ہنسی مذاق کا نشانہ بنا رکھا تھا"۔

اس افسوسناک دور میں امام ولی اللہ علیہ الرحمہ اور ان کے خاندان نے قرآن کریم کے فارسی میں اور اردو میں تراجم کیے اور تفسیریں لکھیں"۔

قرآنی علوم اور قرآنی معارف کی شریعت کے نظام میں جو اہمیت ہے شاہ ولی اللہ نے

اس پر فتح الرحمان کے مقدمہ میں روشنی ڈالتے ہوئے لکھا

ا۔ قرآن کریم کو (سمجھ کر) پڑھنے سے بچوں اور بچیوں اور کم علم لوگوں میں فطری سلامتی قائم رہتی ہے اور خدا تعالیٰ نے جس فطرۃ (توحید) پر انسان کو پیدا کیا ہے وہ ماحول کے برے اثرات سے محفوظ رہتی ہے۔

۲۔ ماحول کے برے اثرات اگر مسلمانوں کو اپنی طرف کھینچ کر لے جاتے ہی تو قرآن کریم کے مطالعہ کی برکت سے انہیں توبہ کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے۔

ابتدائی دور کے مشائخ تصوف کے سینوں میں قرآن کریم کی اہمیت اور عظمت کے جذبات کس قدر موجزن تھے، اس کا اندازہ حضرت شیخ المشائخ محبوب الٰہی کے طرز عمل سے بخوبی ہوتا ہے۔

شیخ خود قرآن کریم کے حافظ تھے، اور آپ نے تجوید قرآن کا علم اپنے مرشد حضرت بابا فریدؒ سے حاصل کیا تھا۔

شیخ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم کی تلاوت سے جو سلوک (عرفان حق) حاصل ہوتا ہے وہ دوسرے اذکار کے مقابلہ میں پائیدار ہوتا ہے۔

ہمارے دیوبندی مشائخ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی اپنے متوسلین کو تاکید کرتے تھے کہ قرآن کریم کی تلاوت کا التزام زیادہ کرو، اس سے پائیدار سلوک سے بہرہ ور ہو گے۔

ان اکابر کے بعد جب نام نہاد صوفیاء کا دوز آیا تو اس دور میں تصوف کی کتابوں اور مولانا روم کی مثنوی کا رواج بڑھ گیا اور قرآن کریم کو چھوڑ دیا گیا۔

شاہ ولی اللہؒ نے قرآن کریم کا فارسی میں ترجمہ شروع کیا اور پانچ سال (۱۱۵۰ھ) میں اسے مکمل کیا۔

ترجمہ فتح الرحمان پر مختصر تفسیری حواشی تحریر کیے:

اصول تفسیر میں الفوز الکبیر اور الفتح الخبیر جیسی جامع کتابیں تحریر کیں۔

قصص القرآن اور امثال القرآن کی اصولی تشریح میں تاویل الاحادیث کتاب تحریر کی۔ قرآن کریم کے عجمی زبانوں میں ترجمہ کرنے کے اصول وضوابط میں المقدمہ فی قوانین

الترجمہ کتاب تحریر کی۔

شاہ صاحب کی حیات تک ہندوستان کی سرکاری اور ادبی زبان فارسی تھی، اس لئے شاہ صاحب نے فارسی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا، حالانکہ آپ کی حیات میں اردو زبان شروع ہو چکی تھی۔

اس کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ بقول ڈاکٹر مسعود حسن (مصنف مختصر تاریخ اردو) شمالی ہندوستان میں فارسی کا بہت زور تھا اور لوگ اردو میں لکھنا پڑھنا معیوب سمجھتے تھے (صفحہ:۲۹)۔

خواجہ میر درد صاحبؒ کو اردو زبان کے اساتذہ میں شمار کیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب حضرت شاہ صاحب کے ہم عصر تھے۔ شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد خواجہ صاحب ۲۲ سال زندہ رہے۔

خواجہ ناصر نذیر صاحب فراق (بن خواجہ میر درد) کا بیان ہے کہ شاہ ولی اللہ اپنے لڑکوں کو اردو زبان اور اردو محاورات سیکھنے کے لئے خواجہ میر درد کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ فراق صاحب خاص طور پر شاہ ولی اللہ کے چھوٹے صاحب زادے شاہ عبدالقادر صاحب کو خواجہ صاحب کا شاگرد قرار دیتے ہیں۔

ہندوستان میں آنے والا سیاسی اور سماجی انقلاب یہ بتا رہا تھا کہ تمام ہندوستانیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والی ہندوستانی (اردو) زبان تیزی سے پھیلنے والی ہے اور مغل دور کی سرکاری زبان فارسی کا عہد ختم ہونے والا ہے۔

اس لئے آپ کے دو صاحبزادوں نے اردو زبان میں تراجم تحریر کئے۔

شاہ عبدالعزیز (بڑے صاحبزادے) اپنے والد کی وفات کے وقت ۱۷ سال کے تھے۔ غیر معمولی ذہانت اور بے مثال حافظہ کی وجہ سے آپ نے اسی عمر میں اپنے والد سے جملہ علوم شریعت کی تکمیل کی اور اپنے والد کے بعد ان کے لائق شاگردوں سے بھی استفادہ کیا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے فارسی زبان کے اندر ایک عظیم تفسیر (تفسیر عزیزی) لکھنی شروع کی اور شروع اور آخر کے دو دو پارے مکمل کر سکے۔

شاہ عبدالعزیز نے فارسی زبان اختیار کر کے اپنے والد کی پیروی کی ورنہ آپ اردو

زبان میں اتنی مہارت حاصل کر چکے تھے کہ بقول ناصر نذیر صاحب فراق، شاہ نصیر دہلوی استاد اکبر شاہ ثانی اپنے شاگرد ذوق دہلوی سے ناراض ہو گئے اور انہیں اصلاح دینی بند کر دی تو ذوق صاحب نے شاہ عبدالعزیز کے وعظ میں شرکت شروع کر دی اور لوگوں کے سوال کرنے پر یہ کہا کہ شاہ صاحب اردو زبان دانی میں کسی طرح شاہ نصیر سے کم نہیں ہیں۔

آپ اپنے والد کے بعد (۶۳) سال زندہ رہے اگر آپ اپنی تفسیر میں اعتدال سے کام لیتے تو یہ تفسیر مکمل ہو سکتی تھی مگر معلومات کی بے پناہ وسعت نے آپ کو اپنی تفسیر مکمل کرنے سے قاصر رکھا، شاہ عبدالعزیز صاحب کا سن وصال ۱۲۳۹ھ ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے اپنا اردو ترجمہ اپنے خاندانی مدرسہ (مدرسہ رحیمیہ) سے الگ مسجد اکبر آبادی (دریا گنج) میں شروع کیا اور شاہ عبدالقادر اپنے بڑے بھائی کی حیات ہی میں (۱۲۳۰ھ) میں دنیا سے تشریف لے گئے۔

شاہ عبدالقادر صاحب کی ولادت کا سن ۱۱۶۷ھ ہے اور وفات کا سن ۱۲۳۰ھ ہے اس حساب سے آپ نے ۶۳ سال کی عمر پائی۔

آپ نے پندرہ بیس سال کی عمر میں علوم اسلامی کی تکمیل سے فراغت حاصل کی اور فراغت کے بعد مسجد اکبر آبادی میں درس و تدریس اور ترجمہ قرآن شروع کر دیا۔ اس حساب سے آپ کی تعلیمی اور تصنیفی زندگی ۴۸ سال رہی۔

ترجمہ قرآن کی مدت تحریر کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے چالیس سال اپنی مسجد میں یکسو ہو کر (اعتکاف کی طرح) موضح قرآن مکمل کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو تعجب ہے کہ موضح قرآن کی تکمیل اتنا دشوار کام نہ تھا کہ اس میں چالیس سال لگ گئے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی زبان (ہندی بقول شاہ صاحب کے) جو بھی گھٹنوں چل رہی تھی، اس میں قرآن کریم جیسی ضخیم کتاب آسانی کا با محاورہ ترجمہ واقعی مشکل کام تھا اور اس میں اتنی مدت کا لگ جانا بعید از قیاس نہیں کہا جا سکتا۔

شاہ عبدالقادر صاحب کے بڑے بھائی کے علم میں جب یہ آیا کہ میرے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر صاحب اردو زبان میں با محاورہ ترجمہ کر رہے ہیں تو شاہ رفیع الدین صاحب نے

تحت لفظ ترجمہ (لفظی ترجمہ) کرنے کا سلسلہ شروع کیا، تاکہ دونوں قسم کے ترجمے خاندان ولی اللٰہی کی طرف سے شائع ہوں کیونکہ دونوں قسم کے تراجم کی ضرورت تھی، بامحاورہ کی بھی اور تحت لفظ کی بھی۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے خواجہ میر درد صاحب سے اردو زبان کی تحصیل میں زیادہ مہارت حاصل کی تھی اور اس کے علاوہ شاہ عبدالقادر صاحب کو اردو ترجمہ میں وھبی اعانت اور غیبی فیضان کا بھی بھرپور حصہ مل رہا تھا۔

غیبی فیضان کے حصول کی دلیل یہ ہے کہ خواجہ صاحب اور شاہ صاحب کا عہد تقریباً ایک ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب کو خواجہ کی وفات کے بعد زندہ رہنے کا موقعہ صرف ۳۱ سال ملا۔

صرف اتنے قلیل عرصہ میں اردو زبان اتنی ترقی نہیں کرسکتی تھی کہ شاہ صاحب کی زبان حضرت خواجہ کی زبان سے اتنی ترقی کرجائے۔

خواجہ صاحب کے اشعار میں بکثرت ایسے الفاظ ملتے ہیں جو بالکل متروک ہوچکے ہیں۔ ان میں سے ایک لفظ بھی شاہ صاحب کے ترجمہ میں نظر نہیں آتا، حالانکہ شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ ان متروک الفاظ سے خالی نہیں، کیونکہ شاہ رفیع الدین بھی خواجہ صاحب کے ہم عصر ہیں۔

راقم نے "محاسن موضح قرآن" میں شاہ عبدالقادر کے موضح قرآن اور خواجہ میر درد کے اشعار کا موازنہ کیا ہے۔

علماء دیوبند موضح قرآن کو اسی وجہ سے الہامی ترجمہ کہتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئی۔ یہ فیصلہ عقیدت مندانہ نہیں بلکہ دلیل پر مبنی ہے۔

شاہ رفیع الدین کے لفظی ترجمہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے والد کے فارسی ترجمہ کو سامنے رکھا، البتہ کہیں کہیں تاویل کے دوسرے قول کو ترجیح دی۔

شاہ رفیع الدین صاحب نے اپنا ترجمہ اپنے شاگرد سید نجف علی صاحب کو املاء کرایا خود اپنے ہاتھ سے تحریر نہیں کیا۔

شاہ رفیع الدین صاحب نے سورہ بقرہ کے حصہ پر فوائد کی صورت میں تفسیری حواشی

بھی تحریر کئے اور حملہ "العرش" (ملائکہ مقربین) کی تشریح اور آیت نور کی تفسیر میں بھی دو کتابیں تحریر کیں۔ یہ کتابیں قدیم کتب خانوں کی زینت ہیں۔

ولی اللہی خاندان کے دو عالموں نے لغات القرآن میں دو کتابیں تصنیف کیں، ایک کتاب فارسی میں مولانا عبدالحی صاحب دہلوی تھے (داماد شاہ عبدالعزیز صاحب) نے تحریر کی اور ایک کتاب اردو میں مولانا کرامت علی صاحب جونپوری (رکن تحریک جہاد) نے تصنیف کی اور اس میں شاہ ولی اللہ، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر صاحب کے تراجم سے استدلال کیا۔

مولانا کرامت اللہ صاحب کی تصنیف کا سن ۱۲۵۳ھ ہے یعنی موضح قرآن کے ۴۸ برس کے بعد اردو کی یہ لغت قرآن وجود میں آئی۔

ڈپٹی نذیر احمد کی رائے:

سرسید احمد کے رفیق مولانا ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے شاہ عبدالقادر صاحب کے تقریباً سو برس بعد (۱۳۱۴ھ) اپنے دور کی ترقی یافتہ اردو میں قرآن کا ترجمہ کیا۔

ولی اللہی تحریک قرآنی کے اثرات:

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ شاہ عالم کا دور قرآنی تراجم کی اشاعت کے لئے بڑا بابرکت دور تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاہ عالم کے عہد میں شاہ ولی اللہ کی تحریک رجوع الی القرآن کی انقلابی لہر کا یہ گہرا اثر تھا کہ خاندان ولی اللہی کے باہر ہر طرف قرآن کریم کے تراجم و تفاسیر کی اشاعت شروع ہوگئی۔

تفسیر مرادیہ:

شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی نے پارہ عم کا اردو ترجمہ اور ان سورتوں کی تفسیر تحریر کی جو شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمہ کے ۴۴ سال بعد شائع ہوئی۔

شاہ مراد اللہ، ولی اللہی جماعت کی تحریک جہاد سے تعلق رکھتے تھے۔ اس پہلے ایڈیشن کو بنگال گورنمنٹ لٹریچر سمجھ کر ضبط کرلیا اس کے بعد مختلف پریسوں میں یہ تفسیر چھپتی رہی۔

جائزہ تراجم اردو کے مصنف نے اس تفسیر کو تاریخی اعتبار سے اولیت کا مستحق قرار دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے شاہ عبدالقادر صاحب نے مکمل ترجمہ تحریر کیا اس لئے اس کی اشاعت ۵۵

سال کے بعد ہوئی، اگر شاہ مراد اللہ پورے قرآن کا ترجمہ کرتے تو اس میں نہ جانے کتنی مدت لگتی؟

فورٹ ولیم کالج کا ترجمہ:

اسی دور (۱۹ ویں صدی عیسوی) میں ڈاکٹر جان گل کریسٹ نے کلکتہ میں یہ کالج قائم کیا اور اس کی طرف سے اردو کی کتابیں شائع کرنی شروع کیں۔

قرآن کریم کے اردو ترجمہ کے لئے کالج کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر جان گل کریسٹ نے ملک کے چند منتخب علماء اور اردو کے فاضل افراد کی ایک کمیٹی مقرر کی اور اس کمیٹی نے اردو زبان کا ترجمہ قرآن مکمل تحریر کیا لیکن افسوس ڈاکٹر صاحب کو لندن واپس بلانے کے بعد یہ ترجمہ چھپنے سے محروم رہا۔

میں نے ایشاء ٹک سوسائٹی کی لائبریری (کلکتہ) میں یہ مسودہ دیکھا، جس کی زبان بہت صاف ستھری تھی، یہ مسودہ ابھی تک مسودہ ہی کی صورت میں ہے اس پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوسکا۔

ڈاکٹر گل کریسٹ نے لوہے کے ٹائپ کا اردو پریس بھی قائم کیا جس سے اردو کی کتابیں چھپ کر نکلیں۔

موضح قرآن کا پہلا ایڈیشن جو اس ناچیز کے پاس ہے غالباً وہ اسی پریس میں ٹائپ کے ذریعہ چھپا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ ۱۹ ویں صدی عیسوی کے شروع میں قائم کیا گیا اور ولی اللہی خاندان کی تحریک ترجمہ اردو کا عہد بھی یہی ہے۔

حکیم شریف احمد خاں کا ترجمہ:

خاندان شریفی کے مورث اعلیٰ حکیم شریف خاں شاہ عالم کے عہد میں بخارا سے ہندوستان تشریف لائے۔

حکیم صاحب علم طب کے علاوہ علوم اسلامی کے بھی بڑے فاضل تھے۔ حکیم صاحب نے اپنے فن کی خدمت کے ساتھ قرآن کریم کا اردو میں ترجمہ کیا۔ حکیم صاحب کی زبان فارسی تھی، مگر آپ نے ہندوستان آکر اردو سیکھی اور اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ قرآن کریم کا اردو میں

ترجمہ تحریر کریں جو ولی اللہی تحریک کا تقاضا تھا۔

حکیم صاحب نے پورے قرآن کا ترجمہ تحریر کیا جو مسودہ سے آگے نہ بڑھ سکا، کیونکہ ان کی اولاد اپنے فنی مشغلہ میں مصروف رہی۔

یہ مسودہ میں نے حکیم اجمل خان کے کتب خانہ (شریف منزل) میں دیکھا ہے۔ اس کی زبان نہایت سلیس اور رواں تھی۔

حکیم اجمل خاں کے صاحبزادے حکیم محمد جمیل خان نے یہ قیمتی کتب خانہ دلی کے کتب فروشوں کے ہاتھ کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کر دیا۔ نہ جانے اس نہایت بیش قیمت مسودہ کا کیا ہوا اور وہ اس وقت کہاں ہے؟

مولانا ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ:

ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے شاہ عبدالقادر صاحب کے ۹۹ سال بعد سن ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں اپنے عہد کی ترقی یافتہ اردو میں ایک بامحاورہ ترجمہ کیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پوری صدی میں امت نے صرف ولی اللہی خاندان کے دونوں اردو ترجموں سے استفادہ کیا۔

ڈپٹی صاحب نے اپنے مقدمہ میں اعتراف کیا۔

خاندان شاہ ولی اللہ کے سوا کوئی شخص مترجم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا...... بلکہ شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں کا مترجم ہے کہ انہی ترجموں میں اس نے ردوبدل اور تقدیم وتاخیر کر کے جدید ترجمہ کا نام دے دیا ہے۔ (مقدمہ ص ۹)

ڈپٹی صاحب کا ترجمہ اس اعتراف حقیقت کے باوجود، بعد میں ہونے والے تمام جدید تراجم پیش رو کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن کی تصنیف میں ڈپٹی صاحب کے ترجمہ کو سامنے رکھا اور وہ حمائل جو مولانا کے سامنے رہی مولانا کے کتب خانہ میں موجود ہے اور اس کے حاشیہ پر کہیں کہیں مولانا کے نوٹ بھی تحریر ہیں۔

آج سیکڑوں اردو تراجم ہمارے سامنے ہیں لیکن بقول ڈپٹی صاحب، شاہی تراجم

(خاندان ولی اللہی کے تراجم کو مولانا تھانویؒ "شاہی تراجم" کہتے ہیں) میں ردوبدل اور تقدیم وتاخیر کے سوا کچھ نہیں۔

ولی اللہی تحریک قرآنی کے یہ تحریری اثرات کا تذکرہ ہے، تحریر کے علاوہ جماعت ولی اللہی کے علماء نے ترجمہ وتفسیر کی مجالس تقریر کو رواج دیا اور صرف دلی کے چھوٹے سے مسلم حلقے میں آٹھ دس مساجد میں قرآن کریم کے ترجمہ کی مجالس قائم ہوئیں جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب تک قائم تھیں۔

حریت وعزیمت میں شاہ صاحب کی اولیت:

قرآن کریم کے علوم کو عام کرنے کے میدان میں شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کو جو اولیت حاصل ہے، اس کے علاوہ فرنگی استبداد سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی تحریک جس خاندان سے اٹھی، وہ بھی یہی خاندان تھا۔

شاہ صاحب کے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے فتوی نے تحریک آزادی کی بنیاد رکھی۔ شاہ صاحب نے انگریز کی محکومی میں گرفتار ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ وہ ملک ہند جسے بصرہ اور بغداد سے آنے والے علماء اسلام اور مشائخ روحانیت نے انسانیت نوازی اور مساوات واخوت کا گہوارہ بنایا تھا اسے فرنگی تہذیب اپنے منحوس سایے میں لے کر نفرت اور عداوت کا وحشت کدہ بنائی جارہی تھی۔

شاہ صاحب کے اس فتوی نے ہندوستانی عوام کو اس خطرہ سے آگاہ کرنے کا فرض ادا کیا اور فتوی سے ہندوستانی عوام کو یہ پیغام ملا کہ وہ اپنے عزیز ملک کو غلامی کی لعنت سے نجات دلائیں۔

پھر تحریک آزادی میں شاہ ولی اللہ کے فکری خاندان کے چشم وچراغ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور ان کی جماعت کے علماء اور عوام نے سرفروشانہ اور قائدانہ حصہ لیا۔

آزادی ملک کے بعد یہی جماعت ولی اللہی اور حلقہ شیخ الہند کے صاحب عزیمت وہمت افراد تھے جنہوں نے تقسیم ملک کے طوفان میں گھرے ہوئے ملک کی خدمت کا حق ادا کیا اور دوسری طرف طوفان زدہ ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا فرض انجام دیا۔

اس پہلو سے شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کے کارناموں نے اپنے تمام سابقین کے مقابلہ میں اولیت وشہرت حاصل کی۔

نئے دور کی فکری رہنمائی:

نئے بین الاقوامی اور سائنسی عہد انسانیت میں اسلام کی فطری تعلیمات کس درجہ عالم انسانیت کی رہنمائی کا فرض ادا کر سکتی ہیں حضرت شاہ صاحب کا اس موضوع پر انتہائی ٹھوس کام دنیائے علم وعقل سے خراج تحسین ادا کر چکا ہے اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

# امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی ☆

ہندوستان کے نامور علماء و مشائخ میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ کا نام نامی بہت ممتاز و نمایاں ہے۔ ہر پڑھا لکھا آپ کو جانتا ہے اور آپ کے کارناموں سے واقف ہے۔ خواہ وہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو۔ علم حدیث کی اشاعت و ترویج اگرچہ پہلے سے ہندوستان میں تھی، مگر حضرت شاہ صاحب جب حرمین شریفین سے واپس آئے تو علم حدیث کی ترویج و اشاعت بہت زوروں پر ہوئی، اور علم حدیث کا چرچا اس ملک میں عام ہو گیا۔

اسی طرح قرآن کا ترجمہ اس وقت اس ملک میں عام ہوا، جب آپ نے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا اور ساتھ ہی اعلان فرمایا کہ شروع زندگی ہی سے قرآن کا ترجمہ طلبہ اور نوجوانوں کو پڑھانا چاہئے۔ پھر آپ کے فرزند ارجمند شاہ رفیع الدین نے اردو میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ اور وہ عوام و خواص میں مقبول ہوا۔ پھر ترجمہ کے ساتھ قرآن پاک کی مختصر تفسیر آپ کے دوسرے فرزند جلیل شاہ عبدالقادر صاحب نے اردو زبان میں لکھ کر شائع کی، اور سچ پوچھئے تو خاندان ولی اللہی کے صدقہ ہی میں قرآن مقدس کے ترجمہ و تفسیر کو مقبولیت حاصل ہوئی، گھر گھر قرآن کا ترجمہ پڑھا جانے لگا اور لوگوں میں قرآن فہمی کا ذوق و شوق پیدا ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے چند پاروں کی فارسی زبان میں تفسیر لکھی اور عجیب و غریب نکات بیان کئے۔ اس تفسیر سے اہل علم

☆ مفتی دارالعلوم دیوبند و صدر اسلامک فقہ اکیڈمی، نئی دہلی۔

میں تفسیر قرآن کے ذوق وشوق نے کروٹ لی۔ لہٰذا یہ ماننا ہوگا کہ اس خاندان کی خدمات آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں۔ اس زمانہ کے کچھ بدعتی پیروں نے قرآن کی اس خدمت کو سراہا نہیں بلکہ پبلک میں اس کے خلاف جوش وجذبہ کو ابھارا، کہ اب قرآن کو ہر ایک سمجھنے لگے لگا۔ اور قرآن کی وہ قدر باقی نہیں رہے گی جواب تک چلی آرہی تھی۔ ان بدعتی پیروں کا وہی نظریہ تھا جو پنڈتوں نے ہندو مذہبی کتابوں کے پڑھنے کے سلسلہ میں پھیلا رکھا تھا کہ یہ صرف برہمن اور پنڈتوں کے پڑھنے کی چیز ہے شودروں اور چھوٹی ذاتوں کو پڑھنے کا حق نہیں ہے۔

لیکن الحمد اللہ اس خاندان کی سعی وکاوش سے قدیم نظریہ ختم ہوا، اور عام مسلمانوں میں قرآن مقدس اور احادیث نبوی سے شغف پیدا ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے والد محترم شاہ عبدالرحیم اونچے مشائخ میں شمار ہوتے تھے اور علم تصوف میں ان کا بڑا اونچا مقام تھا۔ اس خاندان سے بہت سے لوگ عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔ اور ان کے فیوض وبرکات سے فیض یاب ہونے کی کوشش کرتے تھے، لیکن اس خاندان کی ترقی اور شہرت میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان کا بڑا حصہ ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے دور میں بڑی اہم خدمات علمی انجام دیں۔ آپ کی تصنیفات وتالیفات کا کوئی جواب نہیں ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ، ازالۃ الخفاء، تفہیمات، لمعات وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ جن اہل علم حضرات نے آپ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ان سے معلوم کریں کہ یہ حضرات کیا علم ودین کی خدمات انجام دے گئے؟ اور اس ملک کو کیسی قیمتی کتابیں دے گئے؟

حضرت شاہ صاحبؒ کی پیدائش مغل بادشاہ عالمگیرؒ کے عہد میں سلطان عالمگیرؒ کی وفات سے چار سال قبل ۱۴ شوال ۱۱۱۴ھ یوم چہارشنبہ بوقت طلوع آفتاب قصبہ پھلت میں ہوئی، جہاں آپ کی ننھیال تھی۔ والد محترم نے آپ کا نام ولی اللہ تجویز فرمایا۔ بعد میں یاد آیا کہ پیدائش سے پہلے خواب میں شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے مژدہ دیا تھا کہ تمہارے گھر ایسا ویسا لڑکا پیدا ہوگا اس کا نام میرے نام پر قطب الدین رکھنا، چنانچہ بعد میں آپ کے والد بزرگوار نے قطب الدین احمد نام رکھ دیا۔ یوں تاریخی نام عظیم الدین نکالا گیا تھا لیکن شہرت ولی اللہ نام ہی کو ہوئی، اور اسی

نام سے برابر یاد کیے گئے۔ دادا کا نام وجیہ الدین تھا۔ سلسلہ نسب حضرت فاروق اعظم حضرت عمرؓ سے جا کر ملتا ہے اس لئے آپ کو فاروقی بھی لکھا جاتا ہے۔ آپ نے خود ایک سالہ الجزء اللطیف کے نام سے لکھا ہے۔ اس میں اپنے احوال درج فرمائے ہیں۔ عمر کے پانچویں سال میں آپ کو مکتب میں بٹھایا گیا اور بسم اللہ کرائی گئی، ساتویں سال میں والد محترم نے نماز، روزہ شروع کرایا۔ عمر کے دسویں سال میں شرح ملا جامی ختم کر لی۔ عمر کے چودہویں سال میں آپ کی شادی ہوگئی۔

شادی کے ایک سال بعد عمر کے پندرہویں سال میں والد بزرگوار کے ہاتھوں پر بیعت کر لی، اور مشائخ صوفیہ بالخصوص حضرات نقشبندیہ کے اشغال میں منہمک ہوگئے، اور اس سلسلہ میں جو کچھ کرنا تھا، پوری توجہ اور محنت سے اس کی تکمیل کی۔ اس سال اس زمانہ کے مروجہ طریقہ پر بیضاوی شریف کا ایک حصہ پڑھ کر فراغت حاصل کر لی۔ والد ماجدؒ نے اس خوشی میں عوام وخواص کی پُر زور دعوت کی اور تدریس کی اجازت دی کہ تم اب طلبہ کو درس دیا کرو۔ مشکوۃ شریف پوری اور بخاری کا ایک حصہ بھی میں والد محترم سے پڑھا، تفسیر کی بعض کتابیں بھی پڑھیں۔ اس طرح تفسیر وحدیث سے بڑا شغف پیدا ہو گیا۔ تصوف کی بھی کتابیں پڑھائی گئیں۔

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ عمر کے سترہویں سال میں والد محترم بیمار ہوئے، اور اسی بیماری میں واصل بحق ہوئے۔ والد صاحب مجھ سے پورے طور پر راضی اور خوش تھے اور بہت ساری مرے لئے دعائیں کیں۔

لکھتے ہیں کہ والد ماجد کی وفات کے بعد بارہ سال تک منقولات ومعقولات کا درس طلبہ کو دیتا رہا۔ اس کے بعد حرمین شریفین حاضری کا شوق کروٹیں لینے لگا بالآخر ۱۱۴۳ء میں حج سے مشرف ہوا، اور ۱۱۴۴ھ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں گذارا۔ شیخ ابو طاہر قدس سرہ ودیگر مشائخ حرمین شریفین سے علم حدیث کا درس لیتا رہا۔ اس قیام کے زمانہ میں روضۂ اطہر ﷺ پر حاضری برابر دیتا رہا اور اس مزار مقدس سے فیضیاب ہوتا رہا۔ کہنا چاہئے فیوض وبرکات کی مجھ پر بارش ہوتی رہی۔

اس سفر میں دوسرے علماء ومشائخ کی صحبت حصہ میں آئیں اور ان سے بھی خوب خوب مستفیض ہوتا رہا۔ بالخصوص شیخ ابو طاہر مدنی نے خاص توجہ دی، اور انہوں نے خرقۂ خلافت عطا کیا۔

اور بہت ساری دعائیں دیں۔

۱۱۴۴ھ میں دوبارہ حج کیا اور اس کی برکتوں سے فیضیاب ہوا اور ۱۱۴۵ھ میں وطن واپسی ہوئی۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ۱۴/رجب المرجب ۱۱۴۵ھ ٹھیک جمعہ کے دن صحت وسلامتی کے ساتھ وطن دہلی پہونچا۔ دوست واحباب اور بزرگوں نے خوش آمدید کہا اور حوصلہ افزا کلمات سے نوازا۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے علم حدیث، علم فقہ، علم تفسیر اور دوسرے علوم وفنون کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ بہت ساری کتابیں تصنیف کیں، جن سے عوام وخواص کو بڑا فائدہ ہوا، اور ان کے شکوک وشبہات دور ہوئے۔ اہل علم میں آپ کی قدر افزائی ہوئی اور انہوں نے محسوس کیا کہ اس ملک میں کس نہج پر علمی کام ہونا چاہئے اور خواص وعوام کے عقائد کو کس طرح نکھارنا چاہئے جس سے ان کے قلب میں دین اور علم کی عظمت دوبالا ہوگی، اور اگلی نسل کے لئے شاہراہ قائم ہوگی۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ پر بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان میں ان کے علمی کارنامے بیان کئے گئے۔ ان کا مطالعہ کرنا چاہئے، تاکہ اس دور میں آپ نے جو عظیم خدمات انجام دی ہیں وہ سامنے آسکیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کے دور پر علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو لکھا ہے اس کا یہاں نقل کردینا کافی ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب نے اس دور میں کیا کارنامے انجام دیئے؟ جن سے اس وقت کے حالات میں سدھار آیا، سید صاحب لکھتے ہیں:

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا، مسلمانوں میں رسوم وبدعات کا زور تھا، جھوٹے فقراء ومشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے، مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق وحکمت کے ہنگاموں سے پُر شور تھا، فقہ وفتاوی کی لفظی پرستش پیش نظر تھی، مسائل فقہ میں تحقیق وتدقیق مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا، عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی ومطالب اور احادیث کے احکام وارشادات اور فقہ

کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے"۔

گویا حضرت شاہ صاحب کے عہد میں ہندوستان کی دینی حالت حد درجہ خستہ تھی۔ عالمگیرؒ کے بعد شاہان ہند رقص و سرود اور حسن و جمال کی محفل جمائے بیٹھے تھے۔ سادات بارھہ یعنی رافضیوں اور شیعوں کا ہر جگہ تسلط تھا۔ وہ جسے چاہتے بادشاہ بناتے، جس کو چاہتے اور جب چاہتے قتل کرا دیتے تھے۔ رعیت بدحال اور افلاس میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شیعوں نے پورے ملک کو قعر مذلت میں ڈھکیل رکھا تھا۔ اسلام ملک میں بے یار و مددگار تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کو ان حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ انہیں مسلمانوں میں سچا جذبۂ دینی پیدا کرنے کی دھن تھی، بڑا سخت اور نازک اور صبر آزما وقت تھا۔

انہوں نے اپنے دور میں مسلمانوں کی اصلاح جو کچھ کر سکتے تھے، کی۔ مسلمانوں میں اس سے بیداری آئی۔ پھر آپ کے فرزند ارجمند حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے مسلمانوں میں زندگی کا صور پھونکنے کی سعی فرمائی۔ اور آپ کے بھتیجے حضرت شاہ اسمٰعیل شہید ولد شاہ عبد الغنی نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ ہو کر پورے ملک کا دورہ کیا اور مسلمانوں میں زندگی کی لہر پیدا کی۔ اور اسی سلسلہ میں بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی ایک قلمی تحریر آخر میں نقل کر دینا چاہتا ہوں، جو خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے اور جس کی تصدیق آپ کے فرزند ارجمند نے کی ہے کہ یہ والد محترم کی تحریر ہے ایک تلمیذ رشید کی سند اجازت:

"العمری نسبا الدهلوی وطنا. الاشعری عقیدة، الصوفی طریقة، الحنفی عملاً، الحنفی والشافعی تدریساً، خادم التفسیر والحدیث والفقه والعربیة والکلام" ۲۲ رشوال ۱۱۵۹ھ

آخری عمر میں تصنیف و تالیف میں مشغول رہے اور ۲۹ رمحرم ۱۱۷۶ھ مطابق ۲۰ راگست ۱۷۶۲ء بروز سنیچر بوقت ظہر دہلی میں انتقال فرمایا، اور مہندیان میں دفن ہوئے، جہاں آپ کے والد بزرگوار شاہ عبد الرحیم اور آپ کے عالی مرتبت صاحبزادگان مدفون ہیں۔

رحمهم الله رحمة واسعة

# شاہ ولی اللہ دہلویؒ

(۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ)

مولانا سعید الرحمن اعظمی☆

سترہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ نے ایک ایسے عظیم قائد اور چمنستان علم ودین کے گل سرسبد کو جنم دیا جس نے اس سرزمین پر صالح اسلامی افکار اور بیش قیمت علوم کی اشاعت میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، اور پرپیچ وادیوں کے درمیان ایک سیدھا راستہ نکالا۔ انہوں نے حالات وقت کے مقابلے کے لئے لوگوں کے اندر تڑپ اور بے چینی پیدا کی، اور اس امت کی بقا اور اس کی تعمیر وترقی کے لئے بیش بہا منصوبے اور لائحہ عمل پیش کئے۔ ان کی یہ کوشش اسلامی معاشرہ کی تشکیل نو کے لئے ایک نئے عہد کا آغاز تھی اور اسلامی زندگی کا ایک بہترین نمونہ پیش کرنے والی زندگی سے لوگوں کو متعارف کرانے کے لئے یہ ایک نئی پہل تھی۔ یہ شخصیت شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تھی۔

شیخ الاسلام قطب الدین ولی اللہ بن عبدالرحیم الدہلوی، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی وفات کے اسّی (۸۰) سال کے بعد (۱۱۱۴ھ میں) پیدا ہوئے۔ وہ دور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک تاریک ترین دور تھا۔ اس دور کے بادشاہ وسلاطین اپنی عیش کوشیوں میں بدمست تھے۔ وہ رعایا اور ملک کے مفاد پر اپنے راحت وآرام کو ترجیح دینے والے تھے۔

اس دور میں تقلیدی علوم، عصبیت اور بے راہ روی کا انسانی ذہنوں پر دور دورہ تھا۔ پورا کا

☆ مدیر "البعث الاسلامی" و مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

پورا ملک ذہنی بے راہ روی اور اخلاقی گراوٹ کا شکار تھا۔ جان و مال کی بے پناہ محبت نے ان کو مختلف روحانی امراض میں مبتلا کر دیا تھا۔ اور وہ مال و جان کی ہوس کی وجہ سے لوٹ مار، ظلم و جور اور قتل و غارت گری میں گرفتار تھے۔

ایسے تاریک دور میں شاہ ولی اللہ جیسی عبقری شخصیت کا ظہور، تاریکیوں میں روشنی کی منارہ ثابت ہوا۔ انہوں نے اس تاریکی کو دور کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان برائیوں کا خاتمہ کر دیا۔ انہوں نے امت اسلامیہ کے گرد آلود ماحول کو خوشنمائی عطا کی، اور ان کے دستور حیات کو صحیح رخ دیا۔ جب کہ اس وقت امت مسلمہ کا اپنے اصل مسائل سے کوئی واسطہ تک نہ تھا۔ مسلمان دین و دنیا دونوں سے غافل، فضول امور میں اپنا وقت برباد کر رہے تھے۔ اپنے اصل مقصد کو انہوں نے فراموش کر دیا تھا۔ اور اپنے واجبات سے انحراف کر چکے تھے، اپنے مقام و مرتبہ سے لاعلم تھے، ان کو نہ حقوق کا پتہ تھا اور نہ ہی جادۂ منزل کا علم۔

اس وقت شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حیات جاوید کا تفصیلی تذکرہ میرا مقصود نہیں ہے۔ اس کا دوسرا موقع ہے، لیکن شاہ صاحب کی زندگی پر چند سطور کے لکھنے کا محرک یہ ہے کہ ہم ان کی زندگی کے اس پہلو کا جائزہ لیں جو خود ہمارے لئے اور ہمارے قارئین کے لئے اہمیت کا حامل ہے۔ یہ پہلو ان کی روحانیت اور معرفت کا ہے جس کے ذریعے شاہ صاحب نے عظمت و سربلندی، بصیرت، وسعتِ نظر اور علوم و معرفت میں بالادستی اور اسلامی موضوعات پر نظریہ سازی کا ملکہ حاصل کیا۔ جس کے ذریعہ اسلامی لٹریچر کا ستارہ اقبال ہمیشہ بلند رہے گا اور اس ملک میں طبقہ علم و علماء کو ہمیشہ عزت و سربلندی حاصل رہے گی۔

شاہ ولی اللہ کو عوام نے اس حیثیت سے نہ جانا کہ وہ ایک صوفی کی طرح خانقاہ نشین اور خلوت گزین ہو گئے ہوں۔ اور دنیا سے کنارہ کش ہو کر انہوں نے خود کو ایک شعبہ کے لئے خاص کر لیا ہو جیسا کہ بعض صوفی، زاہد اور مجرد زندگی گزارنے والے لوگ کرتے ہیں تاہم وہ بہت بڑے عارفین میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے علم کی طاقت سے معرفت کے سمندر میں غوطہ زنی کی صلاحیت پیدا کی اور معرفت کے اس سمندر سے قیمتی موتی چنے۔ انہوں نے لوگوں کو ایسے ایسے حقائق اور راز ہائے دروں بتائے جس سے وہ اب تک ناواقف تھے۔ یہ ایسے حقائق تھے کہ جن کو

سن کر عقل حیران وششدر رہ جاتی ہے۔ شاہ صاحب نے اسلام کے روحانی پہلو کی وضاحت کی۔ اس کی تشریح وتوضیح میں اپنے علم کے دریا بہادیئے اور ایسے ایسے حقائق، علوم واسرار بیان کیے کہ جن کا ذہن میں خیال بھی نہیں آتا۔ انہوں نے سلوک وتصوف کے علوم پر مشتمل بہت ہی قیمتی مواد اور دقیق مضامین پر مشتمل ایک بڑا کتب خانہ تیار کردیا جو اپنی قدامت کے باوجود ہمیشہ زندہ وجاوداں رہے گا اور عام انسانیت کو زندگی روحانیت اور قوت وعلم سے سیراب کرتا رہے گا۔

علامہ عبدالحیؒ اپنی کتاب نزہۃ الخواطر میں تحریر کرتے ہیں:

''انہی علوم میں جو اللہ نے انہیں عطا کیے تھے، تصوف کے اصول اور حقائق کا علم ہے، انہوں نے معرفت کے سرچشموں سے اہل تصوف کی پیاس بجھائی، اس لئے کہ وہ طرق ثلاثہ یعنی فکر، ذوق اور استطاعت سے بہرہ ور تھے۔ اس لئے وہ منقولات ومعقولات میں سے کسی کی تصدیق واقفیت کے بغیر نہیں کرتے تھے''۔

شیخ غلام علی علوی دہلوی نے ''مقامات'' میں بیان کیا:

''کہ ان کے شیخ مرزا جان علوی دہلوی بیان کیا کرتے تھے کہ شاہ ولی اللہ نے ایک نیا راستہ واضح کیا۔ اور علوم کی پرپیچ وادیوں اور علوم ومعارف کے اسرار کی تحقیق میں ان کا ایک خاص اسلوب تھا''۔

وہ ایک ربانی عالم تھے، علم ظاہر وباطن پر عبور رکھنے والے صوفیاء میں بھی ان جیسا مل پانا مشکل تھا۔ وہ ان چند ہستیوں میں سے ایک شمار کیے جاتے تھے۔ جنہوں نے جدید علوم پر بحث وتحقیق کی۔

دلوں کی اصلاح اور تزکیہ نفس کے لئے ہمیشہ خانقاہوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی ہے اور ایسا بھی ضروری نہیں ہوتا کہ کوئی شخص ظاہر وباطن میں زہد اور دنیا سے مکمل کنارہ کشی اختیار کرے بلکہ یہ مسلسل محنت اور مساعی اور ایسی باطنی کوششوں سے روبہ عمل ہوتا ہے جس سے لوگ کم واقف ہو پاتے ہیں۔

بعض مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عارف برائیوں کے ازالہ اور فساد وبگاڑ کے خاتمہ کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ وہ خرافات کے سدباب میں منہمک ہوتا ہے، لیکن لوگ نہیں سمجھ پاتے اور اگر محسوس بھی کرتے ہیں تو اس کی حقیقت کو نہیں سمجھ پاتے اور اس کو اس قسم کے علاوہ شمار کرتے ہیں

جب کہ درحقیقت وہ فساد کی بیخ کنی اور مہلک امراض کے مداوا کے لئے تڑپ رہا ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ بھی کبھی خانقاہ میں گوشہ نشین نہیں ہوئے، لیکن انہوں نے اصلاح وارشاد کے میدان میں ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جو عارفین سے بھی نہ ہو سکے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان سے اصلاح وتزکیہ کی ایسی خدمات لیں، جن کی توفیق چند ہی لوگوں کو ہو سکی۔

انہوں نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ ساری کتابیں اپنے اندر دقیق علم اور معانی ومفاہیم کے خزانے لئے ہوئے ہیں، ان سے عقل کو روشنی ملتی ہے۔ اور وجدان وجذبات کو جلا ملتی ہے۔ لیکن اگر ہم اس وقت ان کی ایک ہی کتاب کو موضوع بحث بنائیں اور اس کے علم ومعرفت کے خزانوں کا جائزہ لینا شروع کریں تو ہمارے لئے یہ کام بہت مشکل ہو جائے گا۔ چہ جائیکہ اس موضوع پر ان کی بے شمار کتابوں پر بحث کی جائے۔

شاہ صاحب محض ایک ایسے دینی قائد ہی نہیں تھے، جو لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے اور دلوں میں ایمان ومعرفت اور محبت وعشق کی چنگاری روشن کرتا ہے بلکہ وہ علم ومعرفت اور دین کی قیادت کرنے والے ایک فرد تھے۔ اور یہ تمام خوبیاں بیک وقت ان کے اندر موجود تھیں۔

انہوں نے دین کی روح کے خلاف ہر نظر آنے والی چیز پر تنقید کی، اور دین کی کرامت کو مجروح کرنے والے ہر چیز پر کھلی اور سخت مذمت کی، خواہ یہ عمل علماء کی جانب سے ہو یا عوام الناس کی طرف سے، ان کی دینی غیرت وحمیت نے ان کو اس حد تک مجبور کر دیا کہ انہوں نے اپنے زمانے کے علماء وصوفیا کو للکارا اور ان سے ان چیزوں کی درستگی کا مطالبہ کیا، جو تزکیہ نفس کے راستہ سے ان کے یہاں بے جا داخل ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ان کے سامنے تصوف حقیقی اور تصوف مجازی کے فرق کو واضح کیا۔ اور ان تمام مضامین پر مشتمل قیمتی کتابیں تصنیف کیں تا کہ احسان وسلوک کے مفاہیم نہ بدل جائیں، اور لوگ تصوف حقیقی کے اصل چہرہ کو بگاڑ کر اور ان کی غلط تصویر کشی کر کے اس کی جگہ کہیں ایسے تصوف کو نہ داخل کر دیں، جس کا دین سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔

جس تصوف کے شاہ صاحب داعی تھے اس سے پورے طور پر احسان مراد تھا، وہ مخلوق کے خالق سے تعلق کی تشریح کرتے تھے، کہ انسان اللہ تعالیٰ سے تعلق وتقرب اخلاص عمل کے ذریعہ اس طرح حاصل کرے، گویا کہ ہر آن خدا کو دیکھ رہا ہو، اور اگر مان لیا جائے کہ وہ خدا کو نہیں دیکھ رہا ہے،

تو وہ ایسا سمجھے کہ خدا تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے، اور ہر لمحہ اس کے کاموں کی نگرانی کر رہا ہے۔

تصوف کے سلسلہ میں ان کا مسلک واضح ہے، نہ اس میں کوئی پیچیدگی ہے نہ الجھاؤ، وہ اپنی کتاب ''التفہیمات الالٰہیہ'' میں تصوف کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جو کتاب اللہ پر غور و تدبر نہ کرتا ہو، حدیث نبوی ﷺ کو سمجھتا نہ ہو۔ اور کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس نے علماء کی صحبت کو ترک کر دیا ہو، یعنی صوفیاء کی صحبت سے، جن کا کتاب وسنت سے گہرا ربط ہوتا ہے اس طرح فقہ پر بھی ان کو عبور حاصل ہوتا ہے، اور جو جاہل صوفیاء ہیں اور جو لوگ تصوف کا انکار کرتے ہیں وہ راہزن ہیں اور وہ دین پر ڈاکہ ڈالتے ہیں، خدا ہم سب کو ان سے محفوظ رکھے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم لوگوں کو اپنے فرمانبرداروں میں سے بنائے اور اس کی خوشنودی کا طلبگار بنائے اور ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے، صرف اس کے لئے جیتے رہیں، اور اس کے لئے جان دیں''۔

ان تمام امور کے علاوہ شاہ صاحب علوم دینیہ کی اشاعت اور اپنے افکار و خیالات کی ترویج کے لئے مجاہدہ و جانفشانی کرتے رہے، اور انہوں نے اس کام کو تالیف و تصنیف وغیرہ کے ذریعہ انجام دیا، یہاں تک کہ ان کی اس جانفشانی کا فائدہ و ثمرہ ہندوستان و دیگر اسلامی ممالک تک پہونچا، بلاد عرب کے علماء نے اس سے فیض حاصل کیا اور عرب علماء میں بھی ان کی تصنیفات کو قبول تام حاصل ہوا، انہوں نے اپنے عقائد، اخلاق اور اسلامی فلسفے کے لئے شاہ صاحب کی کتابوں کو مرجع اور ماخذ کے طور پر استعمال کیا۔

شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ نے علوم دینیہ کے میدان اور اسلامی عقیدہ کی تشریح کے لئے بڑی سرفروشی کی۔ انہوں نے اسلامی عقیدہ کے خزانوں کو مختلف شکلوں میں جمع کر دیا تاکہ علماء اور بڑے بڑے مصنف اس سے فائدہ اٹھائیں انہوں نے تن تنہا ایسے ایسے کارنامے انجام دیے جن کو بڑی بڑی اکیڈمیاں انجام دینے سے قاصر ہیں۔ جب کہ عجیب بات ہے کہ نہ انہوں نے کسی بڑے دینی ادارہ میں تعلیم حاصل کی، نہ علم و ثقافت کے مراکز اور علم و ادب کے گہواروں کی سیر کی، اپنے شہر میں ہی اپنے زمانہ کے علماء سے، انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ لیکن اس کے باوجود ان کے لئے اتنے عظیم کارنامے انجام دینا کیسے ممکن تھا۔ اور کس طرح انہوں نے اس عظیم علمی مرتبہ کو

حاصل کرلیا، "ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم"۔ بس فضل خداوندی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

امام ہمام، حکیم الاسلام، فلسفی وعالم شاہ ولی اللہ دہلوی نے ۱۱۷۶ھ میں اس سرائے فانی سے کوچ کیا، انہوں نے ہندوستان میں دین وعلم کی تجدید کا کام انجام دیا، اوران کے قلم کی طاقت اور افکار وآراء کی ندرت سے پورا عالم فیضیاب ہوا۔ انہوں نے علوم وفنون سے بھرا ہوا انتہائی قیمتی علمی خزانہ عالم اسلام کے لئے چھوڑا جو مثبت اسلامی افکار ونظریات کے مفاہیم سے لالہ زار ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی سالکین وعارفین میں ایک ممتاز ومنفرد عارف باللہ تھے۔ ان کا علم، اللہ سے ان کے تعلق اور معرفت کا ذریعہ بنا۔ وہ عالم سے کہیں بڑھ کر ایک عارف تھے۔ اور اسلام کی سرمایہ افتخار شخصیات میں سے ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی جیسی انفرادی خصوصیات اور ممتاز صلاحیتوں کا مالک تاریخ نے کسی دوسری شخصیت کو پیش نہیں کیا۔

سلام اللہ ورحمتہ علی روحہ الطاہرہ

آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

# تصوف اور حضرت شاہ ولی اللہؒ

مولانا محمد ولی رحمانی ☆

پہلے یہ عرض کروں کہ تصوف کیا ہے؟ تصوف، طرز زندگی ہے مزاج بندگی ہے ہم جئیں تو کس ڈھب سے جئیں، کس دھج سے شاہراہِ حیات پر چلیں؟ جینے کے طریقے الگ الگ ہو سکتے ہیں الگ الگ طرز فکر، جدا جدا طرز عمل، تصوف کسی طرز زندگی سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا، بحث ومباحثہ شاید اس کا مزاج نہیں ہے، وہ فکر وفلسفہ کی گاڑھی بحثوں کی جگہ "زندگی کا نمونہ" پیش کرتا ہے، اور آہستہ سے کانوں میں کہہ جاتا ہے۔

سبھی انداز حسن پیارے ہیں
ہم مگر سادگی کے مارے ہیں

سادگی حسن کا سب سے قیمتی زیور ہے، اور زندگی کی سادگی، لباس وانداز کی نہیں، وضع قطع کی نہیں، نشست وبرخاست کی نہیں، بول چال کی نہیں، غربت میں نظافت کی نہیں، امارت میں لطافت کی نہیں، زندگی کی سادگی چیز ہی اور ہے۔ جب دل میں خدا کی یاد بستی ہے، جب سانسوں سے خدا کا ذکر ہوتا ہے، جب نہ دیکھ کر بھی نگاہیں خدا کو اپنے سامنے دیکھتی ہیں، اور "کانک تراہ"(۱) عبادت کی کیفیت اور زندگی کی عادت بن جاتی ہے، جب دل دماغ، احساس ووجدان

(۱) مشہور حدیث جبرئیلؑ کی طرف اشارہ ہے، آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ اللہ سے اس طرح ڈرو جیسے کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ قال یا رسول اللہ ما الاحسان؟ قال ان تخشی اللہ کانک تراہ" (مسلم شریف، کتاب الایمان، عن عمارۃ)۔

☆ سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر ونائب صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت۔

خدا کی مرضی سے پورے طور پر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، جب پاک دل، پاکِ نفس، پاک نظر کے مرحلے گذرتے ہیں تو زندگی کی سادگی عہد شباب کو پہونچتی ہے۔ اس سادگی میں جلال بھی ہوتا ہے جمال بھی۔ سادہ ہوتے ہوئے اس میں رنگ بھی ہوتا ہے آہنگ بھی۔ کشش بھی، حرارت بھی، برودت بھی، اس سادگی پر کبھی چادر مہتاب بنتی ہوتی ہے، کبھی کبھی آفتاب کا اس پر سایہ ہوتا ہے، اس سادگی میں بڑی بے ساختہ پرکاری ہوتی ہے۔

اس طرز زندگی والے بھرپور زندگی جیتے ہیں مگر جینے کی تمنا نہیں کرتے وہ تو موت کو وصل محبوب کا ذریعہ اور دیدار الٰہی کا آلہ سمجھتے ہیں۔ ان کا شیوہ ان کی سوچ "ایک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں" بھی نہیں ہوتا، وہ تو اسمٰعیل ذبیح اللہ اور ابراہیم خلیل اللہ (علیہما السلام) کی حنیفیت کے چراغ بردار، اور راز زندگی کے علمبردار ہوتے ہیں۔ اس لئے جان دینے میں ہی سرخروئی اور کامرانی کا مزہ لیتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں۔

متاعِ وصل جاناں بس گراں ست
گریں سودا بجاں بودے چہ بودے

اور ان کی سادگی میں حضرت عثمان غنیؓ کی نصف دولت لٹانے کا جذبہ ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے کل اندوختہ قدموں میں نچھاور کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے، اس سادگی حیات میں مقدار مطلوب نہیں اقدار محبوب ہوتے ہیں، یہ سادہ زندگی والے، بھولے بھالے، رب اشعث اغبر کی چلتی پھرتی تصویریں خاموش زبان سے کہتی ہیں۔

سب کچھ لٹا کے راہ محبت میں اے شکیل
یوں خوش ہیں جیسے دولت کونین پا گئے

اس سادگی اور سادہ طرز زندگی کا سرا کہیں اور ہے، جس نے ان کے دل سے تخت کی ہیبت اور تختہ کی وحشت کو مٹا دیا، وہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون"(۱) کی چلتی پھرتی تصویر بن گئے، ان کے لئے تخت شاہی سے زیادہ کشش کھجور کی چٹائی میں ہوتی ہے۔ بوریہ نشین ہو کر انہوں نے تختوں میں لہریں پیدا کیں، ان کی شناخت جبہ و دستار اور تسبیح و زنار نہیں، من کان للہ کان اللہ لہ ہے۔

(۱) سورۂ یونس: آیت: ۶۲۔

وہ خدا کے عشق میں مست ہوتے ہیں باخبری کے ساتھ! وہ لا الٰہ کی ضربِ مسلسل سے نفی تمام اور اعتراف تام کرتے، وہ ہیئت وہیبت، اظہار و ابراز، پہناوا اور دکھاوا کی جگہ سادگی میں پرکاری دیکھتے، وہ اقرار صالح کے مؤید، ریا سے متنفر اور انکار کے کافر ہوا کرتے ہیں!

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

تصوف کی راہ میں عشق کی طلب اور تڑپ بھی چاہیے، حسن کی پرکھ اور پسند بھی، درد کی لہریں بھی چاہئیں، لذت درد بھی، راہ حق کے زخم بھی چاہئیں اور عزم و عزیمت کا مرہم اور تریاق بھی، اور ان سب پر توازن واعتدال کی چادر تنی ہونی چاہیے۔ وہ عشق جو چھلک جائے، وہ حسن جو وا ہو جائے، وہ درد جو ٹیس بن کر ابھرے نہیں، وہ مرہم جو تریاق نہ ہو، اچھا نہیں ہے، چوکھا نہیں ہے! عشق وہ نہیں ہے جو جلوہ جمال آراء میں کھو جائے، عشق وہ عشق ہے جو کوہ کنی پر آمادہ کردے۔ اور تربیت نفس سے بڑھ کر کوہ کنی کہیں اور ہو سکتی ہے؟ حسن وہ ہے جو یوسفؑ عفیف کی نگاہوں کو اور جھکا دے اور خاموش زبان سے کہدے کہ تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر۔ حسن جو پردہ دری پر اتارو ہو۔ حسن جو وا ہونے میں واہ واہی کے مزے لوٹے، حسن ہے، مگر حسن بازاری ہے، حسن درباری ہے، اس کا وزن دل میں نہیں ہوتا، وہ صرف نگاہوں کا کھیل ہے۔ اصل حسن، کردار، افکار، قلب و نظر اور عمل کا حسن ہے۔

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے
کس حسن سے یہ بھی تو سنو حسن عمل سے

درد اور دردمندی بھی اس راہ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے، وہ درد جو سوچ سوچ کر ابھرے، وہ درد جو موقعہ شناس اور مصلحت بین ہو، وہ درد جو لطیفہ قلب نہیں سرمایۂ عقل ہو، درد نہیں ہے، درد کے نام پر آرٹسٹک تہمت ہے۔

تصوف کی راہ حقیقت، طریقت اور شریعت کی راہ ہے اس راہ کے مسافر کے لئے عزم و عزیمت بڑا توشہ ہے، وہ جسے مواظبت اور استقلال کہا جاتا ہے، وہ اسی عزم و عزیمت کا عکس جمیل ہے، مشکل حالات پر قابو پانے کا حوصلہ، آڑے وقتوں میں کلمہ حق کی صدائے دل نواز بلند

کرنا، افضل جہاد کے نمونوں میں اضافہ کرنا، دین کے لئے عزیمت کی راہ اختیار کرنا اور عزم مصمم کے ساتھ مسلسل کام کرتے رہنا، وہ مزاج ہے جس کی تعمیر و تشکیل تصوف کرتا ہے!

تصوف کیا ہے؟ مزاج بندگی اور تکمیل بندگی۔

زندگی کو عبادت سمجھنا اور اپنی خواہش کو مٹا کر، ارادوں کو دبا کر، اپنے کو بھلا کر عبادت میں لگ جانا تصوف ہے، اور جب عبادت ہو رہی ہو تو پھر کسی اور کا خیال کیوں آئے؟ ہر طرف اسی کی ذات جلوہ گر ہو، دل میں بھی، دماغ میں بھی، احساس میں بھی، ادراک میں بھی، داخل میں بھی اور خارج میں بھی! وہ جو کسی نے کہا ہے:

کچھ اس ادا سے آج وہ محفل نشین رہے
جب تک ہمارے پاس رہے ہم نہیں رہے

یہ خود کا نہ ہونا، وجود کو کھونا نہیں، موجود رہتے ہوئے معدوم کر دینا ہے۔ وجود کو کھونا بھی بڑی اونچی چیز ہے، مگر ہے زندگی سے فرار۔ یہ ہے جذب کی راہ۔ مجذوب خدا کی راہ میں کھو جاتا ہے، مگر سالک، صوفی کھوتا نہیں اپنے آپ کو معدوم کر دیتا ہے، ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتا، وہ صرف مرضی مولی کا اظہار بن جاتا ہے، وہ اپنی خواہش، اپنے نفس، اپنی من چاہی کو خدا کی چاہ کے مطابق بنالیتا ہے، یہ ایمان کا اونچا مرحلہ اور تصوف والی زندگی کا طرز ہے، لایومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ"[1]، کا مصداق۔ اس طرح تصوف، طرز حیات، طرز عبادت اور انداز عبودیت کا نام ہے، اس راہ کا مسافر اچھی طرح جانتا ہے کہ العبادۃ ہی امتثال اوامر اللہ تعالٰی والعبودیۃ ہی الرضا بمرضات اللہ تعالٰی۔

تصوف کیا ہے؟ یہ یقین کہ دینے والا صرف اور صرف خدا ہے، مانگنا ہے تو اسی سے، دست سوال دراز ہوگا تو اسی کے سامنے، مرحلہ خاک نشینی کا ہو یا کاخ رسائی کا، نگاہ جمے گی تو اسی کے رحم وکرم پر، طلب ہوگی تو اسی کے در پر۔ یہ عزم کہ اب تو اس در سے نہ سر اٹھے گا انشاء اللہ۔ ایک کیفیت مدام ہے عمل دوام نہیں۔ اس لئے نہیں، کہ عمل کے مرحلے تو اتنے ہی ہوں گے جتنے شہنشاہ کونین ﷺ نے بتائے۔ مگر کیفیت یہ ہونی چاہئے کہ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی! آرام ملے گا تو

(۱) مشکوۃ شریف ص: ۳۰، عن عبداللہ بن عمرو۔

اسی کے حکم سے، تکلیف پہونچے گی تو اسی کے اشارہ پر۔ اور جب زندگی بندگی کا مرقع ہے، یہی عزم ہے، یہی صدائے دل ہے تو جو کچھ مل رہا ہے رب ذوالجلال کے دربار سے، اسی میں مزہ ہے اسی میں راحت ہے، پھر آرام، راحت، تکلیف، کلفت کا پیمانہ بدل جاتا ہے پھر ہر مرحلۂ زندگی عطاء الٰہی بن جاتا ہے اور دل اسے خوش دلی سے قبول کرتا ہے، وہی الرضاء برضات اللہ تعالیٰ، یہی وہ مرحلہ تھا جس میں حضرت ایوبؑ نے جسم سے گرے کیڑوں کو چن چن کر زخموں پر ڈالا تاکہ زخم ہرے رہیں وہ سمجھتے تھے کہ یہ تحفۂ الٰہی ہے۔

یہی وہ مزاج تھا جس نے خاتمۂ زندگی میں بھی لذت محسوس کی، اور ثم احیی ثم اقتل[۱]، (جی چاہتا ہے کہ بار بار زندہ کیا جاؤں اور بار بار جام شہادت نوش کروں) کی صدائے دلنواز سنائی دی، ایسے بندگان خدا اور خوگر تسلیم و وفاء صرف ایک دربار میں ہاتھ پھیلاتے ہیں، اور یقین رکھتے ہیں کہ در کریم سے بندے کو کیا نہیں ملتا، کسی اور کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے، یہ کیفیت ان مریدوں کی بھی ہوتی تھی، جو بزرگ و برتر حضرت خیر البشر ﷺ جیسے مرشد کے مرید تھے، مرشد نے توبہ کرائی، اور بیعت لی تو یہ بھی فرمایا: لاتسئلوا الناس شیئاً[۲]، مریدوں پر اس بیعت وعہد کا اثر یہ ہوا کہ گھوڑے کی پیٹھ پر چلتے چلتے اگر چابک ہاتھ سے گر جاتا تو اتر کر خود اٹھاتے کسی اور سے مانگتے نہ تھے، یہ بیعت و تلقین کا اثر تھا، اور اس یقین کا اظہار تھا کہ چیز چھوٹی ہو یا بڑی، کسی سے نہیں مانگنا ہے، خود ہاتھ بڑھا کر لے لینا ہے، یا پھر دربار عالی میں یہ کہہ دینا ہے۔

کچھ پاس کر اس ضعف کا اے رحمت باری
اٹھتے نہیں اب دست دعاء اور زیادہ

مانگنا اور مانگ لینا انسانی مزاج ہے، اور عام چیزوں کا مانگنا، نہ ذلت ہے نہ طلب ناموافق ہے۔ ضرورت کی تکمیل کا ایک طریقہ بلاواسطہ خدا سے مانگنا ہے، دوسرا طریقہ بالواسطہ بندوں سے طلب کرنا ہے، یہ بندہ سے طلب کرنا بھی عطاء الٰہی کی ایک راہ کھولنا ہے، خدا تعالیٰ نے "اما السائل فلا تنھر"[۳]، کہہ کر ضرورتمندوں کے حوصلے بلند فرمائے۔ اور دینے والوں کے

---

(۱) والذی نفسی بیدہ لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل..... مشکوۃ شریف کتاب الجہاد، ص: ۳۲۹، عن ابی ہریرۃؓ۔

(۲) سنن ابن ماجہ، ص: ۲۸۱۔

(۳) سورۃ الضحیٰ آیت: ۱۰۔

مزاج کی تربیت کردی، یہ عام انسانی قانون ہے، مگر مرشد کامل ﷺ نے احسانی قانون کے تحت جو تربیت فرمائی تو چابک کی طلب سے مرید گریزاں ہوگیا، دل میں یہ بات جم گئی کہ مانگنا ہے تو صرف خدا سے، اس ''مانگ'' کی قیمت الگ ہے، اس مانگ کا رنگ خدا کے رحم خاص پر قائم ہے، اس مانگ کا سیندور کہیں اور سے بھرا جاتا ہے!

نیازمندوں کی بے نیازی کا یہ مزاج و انداز، کہ جو بے نیاز کا بندہ ہے، بے نیاز رہنے، تصوف والے طرز فکر اور انداز زندگی کا اہم پہلو ہے، یہ تربیت یافتہ حضرات اپنے فکر فردا اور غم امروز سے بے نیاز ہوتے ہیں، وہ اتنے پختہ ہوچکتے ہیں کہ آسانی دل کو بہکاتی نہیں، دشواری دل کو برماتی نہیں، خوشی دل کو گرماتی نہیں اور تکلیف دل کو کھلاتی نہیں، وہ اس یقین کے ساتھ جیتے ہیں کہ دل میں بسے ہے یار تمنا کا ہے کی، اور ان کے دل ہی میں نہیں نگاہوں میں بھی ایک ہی تصویر ہوتی ہے، کانک تراہ باہمہ ہوتے ہیں، وہ بے ہمہ ہوتے ہیں، ''باہمہ'' اس لئے کہ خلق بھی خالق کی مرضی تخلیق کا شہکار ہے، اور بے ہمہ اس لئے کہ خالق ہی ان کی منزل ہے، --وہ صرف اور صرف ''کانک تراہ'' کے مرحلہ میں جیتے ہیں۔

''کانک تراہ'' کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے غار حراء کی خاموشی اور یکسوئی کی سنت بھی سامنے رہنا ضروری ہے، غار ثور کے نازک مرحلے بھی حوصلہ بڑھاتے ہیں، ہجرت کا طویل سفر بھی عزم و عزیمت کو مستحکم کرتا ہے، محبت، ایثار اور جاں نثاری کا ذوق و مزاج مدینہ پاک کے گل و بو، وہاں کی مٹی کی خوشبو اور سخت پہاڑوں کی نرمی سے بنتا ہے، مرحلۂ سخت و دشوار میں چٹانوں کے سے عزم کے لئے معرکہ بدر و حنین کی تربیت کام آتی ہے، احد کی شکست اور مکہ مکرمہ کی فتح کے مرحلے دلیل راہ ہوتے ہیں اور دل کی آنکھ سے انہیں دیکھ دیکھ کر آنکھیں بند کرکے اور کبھی آنکھیں کھول کر خدا کی راہ میں بڑھا جائے، تو کانک تراہ کا مرحلہ آسکتا ہے۔

یاد رہے! اگر یہ عملی پہلو علمی موشگافیوں کی خراد پر چڑھ گیا، تو پھر بحث ہوگی، کہ مادی نظر نورانی الاصل کو دیکھ کیسے سکتی ہے، اور جو جسم و جہت سے بلند و بالا ہے، وہ نظر کس طرح آسکتا ہے، ایسی ایسی بڑی کارآمد عالمانہ متکلمانہ بحثیں سامنے آئیں گی، اور جس طرح ذکر غیر مربوط جذب کی کیفیت پیدا کردیا کرتا ہے، علمی موشگافیوں کی کثرت اور متکلمانہ نکات کی زیادتی علمی تہی دامنی کا تحفہ دے جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں عقل باریک اور روح تاریک ہوتی جاتی ہے، شاید اسی لئے

اللہ کے رسول ﷺ نے منطقی استدلال اور فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعہ خدا کو دماغ میں نہیں اتارا، حکمت وموعظت، صحبت وموانست، جہد پیہم اور زہد مسلسل سے خدا کو دلوں میں اتار دیا۔ اچھا ہے لوگ علمی بحث کریں کہ کأنک تراہ کی حقیقت اور صورت کیا ہو سکتی ہے، وہ مثال ہے یا حقیقت، اور اگر حقیقت ہے تو رویت بصری ہے یا قلبی، بحثیں بہت ہو سکتی ہیں، مگر جاننے والے اتنا ہی کہہ سکتے ہیں، کہ وہ جیسا دکھائیں گے ہم ویسا ہی دیکھیں گے۔ اور دور کہیں سے کوئی کہتا سنائی دے گا۔

لذت ایں بادہ نہ دانی بخدا تانہ چشی

تصوف کیا ہے؟ شریعت پر عمل اور شریعت کے ذوق ومزاج کو دل میں اتار لینا، دماغ میں بسا لینا۔

اس لئے حقیقت، طریقت اور شریعت کے درمیان نہ الجھاؤ ہے نہ ٹکراؤ، ایمان ویقین کے ساتھ یہ تربیت کے مرحلے ہیں، درخت کی جڑیں جتنی گہری جاتی ہیں، اس کے برگ وبار، تازگی اور توانائی، روئیدگی اور بالیدگی میں فرق آتا جاتا ہے، ژالہ زدہ پودوں اور پتوں کا رنگ کیسا جھرکا ہوا ہوتا ہے، سب جانتے ہیں، کبھی تو اتنا فرق ہو جاتا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ایک چمن کے دو پودے، ایک ہی نسل کے دو پھول ہیں۔ تربیتی مرحلہ سے گذر کر تیار ہونے والے انسان اور غیر تربیت یافتہ کے درمیان کچھ اسی انداز کا فرق ہوتا ہے۔

شریعت قانون اسلامی ہے، کسی خوف سے قانون کو مان لینا اور بات ہے، اور قانون کے مطابق مزاج بنا لینا بالکل دوسری چیز ہے، دونوں مزاج کے عمل اور دونوں کے نتیجے میں بڑا فرق ہے، شاید اسی لئے شریعت کے دائرہ میں مدعیٰ علیہ سزا پا سکتا ہے، طریقت کی راہ میں مدعی خطاکار اور سزاوار ہوتا ہے، شریعت کے ذریعہ سزا اسے دلوائی جا سکتی ہے، جو مجرم ہے جس کے خلاف دعویٰ دائر کیا گیا ہے، طریقت انہیں مجرم سمجھتی ہے جو دعویٰ کرنے، ادعاء، کے مرتکب ہوگئے، شریعت کے فیصلے قاضی کی عدالت میں ہوتے ہیں، طریقت کے محاکمہ کی جگہ قاضی الحاجات کا دربار ہے!

اور صوفی کون؟ اللہ والا کون؟

وہ وعدہ الست کے راز دار، عشق الٰہی میں سرشار، حب نبوی ﷺ میں جاں نثار اور دین محمد ﷺ کے وفادار ہوتے ہیں، خدا رسیدہ اور کانک تراہ چشیدہ ان کی شناخت ہے، اس لئے حسن کے معیار کو پرکھتے ہیں، عشق کے مرحلۂ گرہ گیر کے راز آشنا ہوتے ہیں، توازن واعتدال ان کی زندگی، ان کی تعلیم اور تبلیغ کا بنیادی عنصر ہوتا ہے، جو جتنا بلند ہوتے ہیں وہ اتنا ہی متواضع اور متوازن ہوتے ہیں۔

تصوف کو بہتوں نے بے توازنی کے جھروکوں سے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ امت وسط کی تعمیر وتشکیل مرضی مولیٰ ہے، اس لئے ''شخصیت وسط'' بھی خدا کی پسند ہے۔ صوفی یا اللہ والا، اسی شخصیت وسط کا نمونہ اور نمائندہ ہوتا ہے، جو ادھر اُدھر جھک گئے وہ مثال اور معیار نہیں ہوسکتے، انسان کامل، مربی کامل، مرشد کامل ﷺ متوازن اور معتدل ہیں، وہ اسوہ حسنہ ہیں معیار کامل ہیں اسی لئے

سیرت تیری تصویر کمالات بنا کر
دانستہ مصور نے قلم توڑ دیا ہے

حضرت شاہ ولی اللہؒ اسی علم وعمل، حکمت وبصیرت، جوش عمل اور سعی مسلسل، سوز دروں اور جذب وجنون کے ساتھ توازن واعتدال کی ایسی زندہ مثال تھے جس طرح کے نمونے اللہ کے رسول ﷺ بعد کے زمانہ میں چاہتے تھے، حضرت شاہ ولی اللہ کی سیرت اور کارناموں میں وہ جھلکیاں نظر آتی ہیں جو عہد صحابہ میں ہر طرف نظر آتی تھیں۔ ان کی علمی جامعیت، عملی استقامت، تسبیح وذکر پر مواظبت، درس وتدریس، تعلیم وتبلیغ، تصنیف وتالیف اور قرآن وحدیث سے گہرا شغف ان کا امتیازی وصف ہے، اور کئی حیثیتوں سے وہ اپنی صدی میں ہی نہیں، تاریخ اسلام کے ممتاز علماء اور عبقری صفت شخصیتوں میں ہیں۔

تصوف سے حضرت شاہ صاحب کی دلچسپی اور وابستگی خاندانی بھی ہے، تجرباتی بھی اور علمی بھی!۔ حضرت شاہ صاحب (ولادت ۴؍شوال ۱۱۱۴ھ وفات ۲۹؍محرم ۱۱۷۶ھ) نے دینی تعلیم سے کم عمری میں فراغت حاصل کی، اور اپنے والد بزرگوار نامور عالم دین اور صاحب نسبت بزرگ حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ (وفات ۱۲؍صفر ۱۱۳۱ھ عمر ۷۷ سال، تخمینی سن ولادت

۱۰۵۴ھ) سے بیعت کی اور سلسلہ نقشبندیہ کی باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل کر کے خلافت واجازت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب کا دادیہالی اور نانہالی خاندان اہل علم اور اہل دل کا خاندان رہا ہے، اسی فضا میں وہ پلے بڑھے۔ ۱۱۲۹ھ میں مدرسہ کی تعلیم سے فراغت ہوئی اور اگلے دو برسوں میں اسباق نقشبندیہ اور اعمال صوفیہ میں تکمیل ومہارت حاصل کی۔

آپنے والد کے انتقال کے بعد بھی بارہ سال تک آپ نے طلبہ دینیہ کو پڑھایا، تدریس کی شہرت اور طلبہ کی کثرت کی وجہ سے آپ مدرسہ رحیمیہ (مہندیان) کی عمارت سے کلاں محل کی عمارت میں منتقل ہوئے جسے اس وقت کے بادشاہ محمد شاہ نے پیش کیا تھا، اور اب بھی وہ حلقۂ عمارت مدرسہ شاہ عبدالعزیزؒ ہی کہلاتا ہے، آپ نے ۱۱۴۲ھ تک پوری پابندی اور بڑے اہتمام کے ساتھ درس دیا، اس زمانہ میں درسگاہوں کا معیار ووقار منطق وفلسفہ کے درس سے قائم ہوتا تھا، حضرت صاحبؒ نے قرآن وحدیث کو براہ راست موضوع درس اور مرکز فکر ونظر بنایا، مدرسہ رحیمیہ دوسرے علوم وفنون کا بھی مرکز تھا، مگر حضرت شاہ صاحبؒ نے محور کو بدلا، ان کا درس، قرآن وحدیث کے علوم کا گنجینہ اور ان کی مجلسیں تصوف اور حکمت دین کی گفتگو سے آباد ہوتی تھیں۔

جن لوگوں کو درس وتدریس کا تجربہ ہے، اور اہل علم کے عام رجحان کے دباؤ کا اندازہ ہے، وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ محور عمل، مرکز فکر اور ذوق نظر سے الگ راہ بنالینا کتنا مشکل کام ہے؟ حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک سوچی سمجھی مگر بے حد مشکل راہ اپنائی۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ یہ وہ دور تھا جب تعلیم گاہوں کی بہترین صلاحیتیں منطق وفلسفہ پر خرچ ہو رہی تھیں، حضرت قاضی محب اللہ بہاریؒ (م ۱۱۱۹ھ) کی مشہور کتاب سلم سامنے آچکی تھی، خود قاضی صاحب مرحوم نے صرف سلم العلوم (منطق) نہیں لکھی تھی، مسلم الثبوت (اصول فقہ) بھی اس کا شہکار ہے، مگر اس دور کے ذوق ومزاج کی وجہ سے سلم العلوم نے تعلیم گاہوں کو مشغول کر رکھا تھا، اس کی تدریس وتفہیم مدرسین کا کمال وامتیاز تھا، مایہ ناز علماء اس کی شرح اور حاشیہ لکھنے میں لگے ہوئے تھے۔

ملا حمد اللہ سندیلویؒ (م ۱۱۶۰ھ) نے سلم العلوم کی شرح لکھی، جسے حمد اللہ کے نام سے قبول عام حاصل ہوا۔ قاضی محمد مبارک گوپاموی (م ۱۱۶۲ھ) کی دوسری شرح کا شہرہ ہوا، اور مدرسوں میں قاضی کے نام سے معروف ہوئی۔ ملا احمد حسن فرنگی محلی (م ۱۱۹۹ھ) کی شرح بھی علماء اور طلبہ

میں پسند کی گئی، اور ملاحسن کے نام سے مدرسوں میں پڑھائی جانے لگی۔ منطق اور فلسفہ کی کتابیں تعلیم گاہوں کا معیار اور اساتذہ کا وقار واعتبار قائم کرتی تھیں، کم وبیش ڈھائی سو سال تک سلم العلوم اور اس کی شروح وحواشی مدارس دینیہ اور اساتذہ علوم اسلامیہ کا مرکز نقل رہے ہیں۔ اور اگرچہ اس کے پڑھانے والے کم اور پڑھنے والے ختم ہو چکے ہیں مگر اب بھی بعض مدرسوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہیں۔

اس زمانہ (بارہویں صدی ہجری) میں مختلف علوم وفنون کی معرکۃ الآراء کتابیں سامنے آئیں، خود ملا محب اللہ بہاری کی اصول فقہ میں مسلم الثبوت مایہ ناز قلمی خدمت ہے، مولانا محمد اعلیٰ تھانویؒ کی کشاف اصطلاحات الفنون کا بلند پایہ علمی سرمایہ ہے، مشہور صوفی عالم شیخ احمد بن ابو سعیدؒ (ملاجیون امیٹھوی ۱۰۴۷ھ، ۱۱۳۰ھ) کی نور الانوار اصول فقہ میں گرانمایہ کتاب ہے جو زبان وبیان کے لحاظ سے سہل ممتنع کا نمونہ ہے، اور علمی تدریسی لحاظ سے آج بھی زندہ کتاب ہے، علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی زبیدی (۱۱۴۵ھ، ۱۲۰۵ھ) کی تاج العروس اور اتحاف السادۃ المتقین، شرح احیاء علوم الدین لغت اور تصوف کا معیار ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ کتب اسلامیہ میں اپنی نظیر آپ ہے، اور بھی دوسری کتابیں، شروح وحواشی، سامنے آئیں، ملا نظام الدین لکھنوی (م ۱۱۶۱ھ) نے مدارس دینیہ کے نصاب تعلیم کو سمت دینے اور ایک مناسب نصاب تعلیم رائج کرنے کی بڑی مخلصانہ اور کامیاب کوشش فرمائی، درس نظامی ہماری تعلیم گاہوں میں اب بھی کچھ بدلی شکل میں رائج ہے۔

خدمت علم وقلم کی اس فراوانی کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے دور میں اور بعد کی دو صدیوں میں بھی ہماری تعلیم گاہوں پر تسلط منطق وفلسفہ کا ہی رہا ہے۔ حضرت شاہ صاحب جس فضا میں پلے بڑھے تھے اور جوان کا زاویۂ نظر تھا، وہ محسوس کرتے تھے، کہ منطق وفلسفہ کے ذریعہ خدا اور آخرت کا اقرار کرایا جا سکتا ہے، مگر وہ یقین نہیں پیدا کیا جا سکتا، جو مطلوب ومقصود ہے، وہ سمجھتے تھے کہ قرآن وحدیث سے شغف، اس کے مفہوم اور معنی سے قرب اور اس کے الفاظ وآہنگ سے ہی اچھے مسلمان کی تعمیر ہو سکتی ہے، اور وہ ''یقین'' پیدا ہو سکتا ہے، جو فکر کو عملی سانچہ میں ڈھالتا ہے، اعمال حسنہ کا پابند بناتا ہے، اور مشکل حالات میں غیرت وحمیت کے ساتھ دین سے

وابستہ رہنے کا سبب بنتا ہے!

اس لئے انہوں نے قرآن و حدیث کو مرکزی حیثیت دی، عوام و خواص کو قرآن پاک سے قریب کرنے کے لئے انہوں نے درس قرآن کا سلسلہ جاری کیا، اور سفر حج (۱۱۴۳ھ، ۱۱۴۵ھ) سے پہلے سورۃ البقرۃ اور سورۃ النساء کا ترجمہ مکمل کیا(۱) اسی طرح حکمت دین اور حدیث شریف میں آپ کی مہارت اور شہرت سفر حج سے قبل دور دور تک پھیل چکی تھی، حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے جلیل القدر والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیمؒ سے قرآن اور حدیث کا درس لیا، حکمت دین کی نعمت حاصل کی اور حدیث شریف کی سند اور متن کے سلسلہ میں سفر حج کے موقعہ پر علماء کرام اور

(۱) بعض حضرات کا رجحان یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے انداز فکر میں تبدیلی سفر حج کے بعد آئی، وہ توحید خالص اور قرآن و حدیث کی طرف اس وقت مائل ہوئے جب حرمین شریفین میں علماء سے ملاقات ہوئی، اور وہاں انہوں نے حدیث کا علم حاصل کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ترجمہ قرآن کا کام سفر حج سے قبل ہی شروع ہوا تھا، شاہ صاحبؒ نے اپنے ترجمہ فتح الرحمٰن کے دیباچہ میں اسکی صراحت کی ہے اور یہ بھی وضاحت فرمائی ہے کہ یہ ترجمہ تین قسطوں میں تیار ہوا، اور بیچ کے تقریباً چھ پارے سفر حج سے واپسی پر ایک طالب علم کو پڑھانے کے سلسلہ میں لکھے گئے، دو تہائی ترجمہ کا کام ۱۱۵۰ھ، ۱۱۵۱ھ میں پورا ہوا، اسی طرح حضرت شاہ صاحبؒ نے طالب علمی کے زمانہ میں مشکوٰۃ شریف، بخاری شریف کے بعض حصے، شمائل ترمذی پڑھی تھی، اور سفر حج سے قبل علم حدیث میں مہارت حاصل کرلی تھی، انہوں نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ) کا زمانہ نہیں پایا تھا، جن کا درس حدیث ملک میں ممتاز تھا، شیخ نے حدیث شریف کی کئی اہم کتابوں کے درس کو رواج دیا، اسی زمانہ میں پورے ملک میں روایت حدیث شریف کا مزاج عام ہوا، آپ کے نامور صاحبزادہ قاضی شیخ نورالحق م ۱۰۷۳ھ شارح بخاری شریف (بزبان فارسی چھ جلدوں میں) اور بعد میں خاندان کے دوسرے حضرات (اولاد و احفاد) کا ملک میں طوطی بولتا رہا، جن میں حضرت شیخ الاسلام دہلویؒ (شارح بخاری شریف بزبان فارسی) اور حضرت سلام اللہؒ (صاحب محلی و کمالین) زیادہ مشہور ہوئے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی تعلیم گاہ اور خانقاہ وہیں رہی ہے، جہاں آج مولانا آزاد میڈیکل کالج اور ڈاکٹروں کی رہائشی عمارتیں ہیں، یہیں شیخ کی خانقاہ اور مسجد تھی، مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۷ء میں میں نے اس مسجد میں نماز پڑھی ہے (اس وقت وہاں چاروں طرف جنگل تھا، برسوں سے وہاں کا نقشہ بدلا ہوا ہے) یہ جگہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیم گاہ اور تجربہ گاہ (جامعہ رحیمیہ مہندیان) سے زیادہ سے زیادہ دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر ہے، اس لئے حرمین شریفین جاکر حدیث کا علم حاصل کرنے والا چند قدم کے فاصلہ پر موجود خزانہ حدیث پر نظر نہ ڈالے یہ بات جچی نہیں ہے۔

مشائخ عظام سے استفادہ کیا، حرمین شریفین کے زمانہ قیام (ذی قعدہ ۱۱۴۳ھ، ربیع الثانی ۱۱۴۵ھ) میں حضرت شاہ صاحبؒ نے سب سے زیادہ استفادہ شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکروی المدنی سے کیا۔

حضرت شاہ صاحب، حضرت شیخ ابوطاہر مدنی سے بہت متاثر نظر آتے ہیں، شیخ نے حضرت شاہ صاحب کو سلسلۂ تصوف کی اجازت سے بھی نوازا تھا، اور خرقہ عطا فرمایا تھا، جسے خود شاہ صاحب نے تمام خرقوں کا جامع کہا ہے، (تفصیل کے لئے دیکھئے القول الجلی، الجزء اللطیف اور لسان العین) شیخ ابوطاہر مدنی کے ایک جملہ سے حضرت شاہ صاحبؒ کی فن حدیث میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ "شیخ ولی اللہ مجھ سے لفظ کی سند لیتے ہیں، میں ان سے حدیث کے مطالب میں استفادہ کرتا ہوں"۔ (الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی) اور جب حضرت شاہ صاحب حج کے لئے مکہ مکرمہ حاضر ہوئے، تو حدیث سے شغف رکھنے والوں کے اصرار پر آپ نے المسجد الحرام کے مصلی حنفی پر حدیث شریف کا درس دیا، اس موقعہ پر استفادہ کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا (القول الجلی) سفر حرمین شریفین سے پہلے آپ کی فن حدیث پر کیا نظر تھی، اس کا اندازہ حرم شریف میں آپ کے درس کے قبول عام اور شیخ طاہر مدنی کے کلام سے ہوتا ہے!

حضرت شاہ صاحب کا یہ علمی پس منظر تھا، انہوں نے سوچ سمجھ کر زندگی کی راہ بنائی تھی، جس میں قرآن مجید، حدیث شریف اور تصوف کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ انہوں نے بارہ سال تک (سفر حج سے قبل) بڑی پابندی اور اہتمام کے ساتھ تدریسی خدمت انجام دی، سفر حج کے بعد تدریسی سلسلہ تدریجاً کم ہوتا گیا، اور تصنیف و تالیف اصلاح و تبلیغ اور ذکر تزکیہ کا کام بڑھتا چلا گیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید میں فہم معنی اور تعیین مفہوم، حدیث شریف میں متن کی تلاوت ایجابی تشریح و تفصیل اور حدیث کے مختلف مفہوم میں تطبیق، اور تصوف کے علمی اور عملی پہلو کو عام کیا، انہوں نے فکری صلاحیتوں کو منطق و فلسفہ کی کتابوں کی تدریس اور شرح و حاشیہ پر صرف کرنے سے بہتر یہ سمجھا، کہ اسے حکمت دین اور علت احکام کو واضح کرنے پر خرچ کیا جائے۔

تصوف کے دو پہلو ہیں، علمی اور عملی۔ تصوف کا عملی پہلو علم و تحقیق، دیدہ وری اور نکتہ رسی سے

کچھ الگ ہے، تصوف کا علمی حصہ مشکل ہے، اس میں بڑی لطیف بحثیں ہیں، اور بڑے بڑے علماء نے جو صوفی بھی رہے ہیں، اپنے علمی و تحقیقی مزاج کے ساتھ تصوف کے تجرباتی اور عملی پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے جو مشکل بحثیں کی ہیں، ان میں اہل علم کو اشکال رہا ہے، اور بعض باتیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں، یہ اشکال حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تحریروں پر بھی ہے، اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریروں میں "ارشدنی ربی" جیسے الفاظ سے لے کر وحدت الوجود کی بحث تک پر اہل علم کے ذہن میں سوالیہ نشان آتا رہا ہے۔ اس طرح کی بحثیں نہ صرف طویل غور وفکر کی طالب ہیں، بلکہ تجربہ مشاہدہ اور تصوف کے عملی پہلوؤں سے گذرنے کی طلب گار ہیں، دشواری یہ بھی ہوئی ہے کہ ہمارے بزرگوں نے شی لطیف کو کاغذ وقلم کا لباس کثیف پہنا دیا، تو دشواری پیدا ہوگئی۔

جو حضرات تصوف کو "توحید خالص" سے ہم آہنگ نہیں سمجھتے ساتھ ہی حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت قرآن وحدیث، حکمت دین کی توضیح وتشریح اور ان کے علمی وفکری مقام ومرتبہ کا احترام بھی کرتے ہیں، شاید انہوں نے شعوری طور پر مان لیا ہے، کہ تصوف کے متعلق ان کے خیالات، اور اس کی علمی بحثوں پر ان کی رائے حرمین شریفین کے سفر سے قبل کی چیزیں ہیں، ورنہ حضرت شاہ صاحبؒ تو وہ ہیں جو حجۃ اللہ البالغہ میں نظر آتے ہیں، ایسے اہل علم سارا زور اس پر صرف کرتے ہیں، کہ القول الجمیل سفر حرمین شریفین سے قبل کی تصنیف ہے، انفاس العارفین کی نسبت حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف مشتبہ ہے، یا انہوں نے اسے بھی سفر حرمین شریفین سے قبل لکھا ہوگا، لیکن یہ زاویۂ نظر حقیقت سے ہم آہنگ نہیں ہے، حضرت شاہ صاحبؒ تصوف کے علمی مباحث پر اپنی رائے رکھتے تھے، اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر سفر حرمین شریفین کے ذریعہ ان کے افکار کو دو حصوں میں بانٹا نہیں جا سکتا۔

فیوض الحرمین، الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ، الطاف القدس، التفہیمات الالٰہیہ، الخیر الکثیر، الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین، حضرت شاہ صاحبؒ کے رسالے اور کتابیں ہیں، جن میں انہوں نے تصوف کے مسائل اور خواب، مبشرات، مکاشفات سے گفتگو فرمائی ہے، ان سے یہ کہہ کر گذرا نہیں جا سکتا کہ یہ سب حرمین شریفین سے قبل کی رائے ہے، یہ چیزیں حرمین کے زمانۂ قیام میں یا اس کے بعد لکھی گئیں پھر حرمین شریفین سے واپسی کے بعد، اکتیس سال تک انہوں نے

تصنیفی خدمت انجام دی، یہ کتابیں ان کے پاس تھیں، کبھی انہوں نے اپنی تحریزوں اوراپنی رائے سے رجوع نہیں فرمایا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے افکاروآراء پر تفصیلی جائزہ کی ضرورت ہے، خواہ اس کا تعلق تصوف کے علمی اور نظری پہلوؤں سے ہو، یا کلام اور فقہ کے مسائل میں ان کی ترجیحات سے ہو، یا ان کے قلمی اورادبی انداز اورآہنگ سے ہو۔ان تینوں گوشوں میں ان کی تحقیق اوررائے پر گفتگو کی جاسکتی ہے، اور کسی نتیجہ تک پہونچا جاسکتا ہے۔اس مختصر مقالہ میں اتنی گنجائش نہیں ہے۔حضرت شاہ صاحبؒ نے تصوف کے عملی پہلو پر جو اجتہادی خدمت انجام دی ہے، اور غیر محسوس طریقہ پر طالبان راہ طریقت کی جیسی رہنمائی فرمائی ہے، وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے، اور ماضی کے نقوش پر قائم رہتے ہوئے نئی راہوں کی تلاش کی جو خدمت انہوں نے انجام دی، وہ ہر لحاظ سے اس لائق ہے کہ اسے دماغوں میں اتارا جائے، دلوں میں بسایا جائے اور زندگی کا حصہ بنایا جائے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے طالبان راہ طریقت کی رہنمائی کے لئے "القول الجمیل فی بیان سواء السبیل" لکھی ہے، جس میں سلسلہ عالیہ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ کے اوراد ووظائف اشغال ومراقبہ کی تعلیم موجود ہے، ساتھ ہی مختلف مرحلوں کے طالب کے لئے ہدایت نامہ بھی ہے اور خاندانی اعمال ووظائف بھی لکھے گئے ہیں، جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے، یہ اوراد ووظائف ان کے اوران کے خاندان کے معمولات رہے ہیں، جن سے فائدہ پہونچا اور جو تقرب الی اللہ اور سیر فی اللہ کا ذریعہ بنے۔اور یہ اوراد وظائف سبب حقیقی نہیں ہیں، اللہ کا حکم ہوگا تو اس کے اثرات ظاہر ہوں گے، ورنہ نہیں۔سبب حقیقی مرضیِ مولیٰ ہے، حضرت شاہ صاحبؒ اور بزرگان دین نے ایسی تمام تحریروں میں پڑھنے والوں کی صلاحیت پر اعتماد کرتے ہوئے "بامر اللہ" کو محذوف رکھا ہے، اس لئے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اس طرح کا انداز بیان حضرت شاہ صاحبؒ کے محدثانہ رنگ اور توحید خالص کے ذوق سے میل نہیں کھاتا۔

انہوں نے القول الجمیل میں ایک جگہ اصحاب کہف کے نام لکھے ہیں، بحث یہ کی جاتی ہے کہ یہ نام کہاں سے آئے؟ اور شاہ صاحبؒ نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اسماء اصحاب الکھف امان من الغرق والحرق الخ" بس یہ "امان" کا لفظ غضب کرگیا۔کوئی شک نہیں کہ یہ نام کسی حدیث صحیح سے ثابت نہیں ہیں، لیکن یہ بحث کرنا کہ "قطعی الثبوت" ذریعہ سے جو بات

ثابت نہ ہو وہ لکھنی نہیں چاہئے، غیر ضروری بحث ہے۔ حدیثوں کے عظیم الشان ذخیرہ میں کتنی حدیثیں ہیں، جنہیں قطعی الثبوت کے مرحلہ سے گذارا جا سکتا ہے؟ جس طرح بہت سی تفسیری روایتیں اور عہد نبوی ﷺ سے قبل کے واقعات زبانوں پر تھے، وہ غلط بھی ہو سکتے ہیں، صحیح بھی ہو سکتے ہیں، مفسرین نے انہیں اپنی تصنیفات میں جگہ دی، بعد میں علماء محققین نے ان کا جائزہ لیا، اور اپنی رائے دی، اسی طرح اصحاب کہف کے ناموں کا معاملہ ہے، یہ نام ان کا تلفظ اور ان ناموں کی ترتیب میں اختلاف ہے، یہ نام حدیث صحیح سے ثابت بھی نہیں ہیں، لیکن بزرگوں کے تجربات اور مکاشفات نے انہیں مفید پایا تو لکھ دیا۔

جس طرح امام ابوداؤد طیالسی کی ایک سند (۱) مسدد بن مسرہد بن مجرہد بن مسربل بن مغربل والی ناموں کا مجموعہ ہے، جس کا کوئی تعلق شفاء امراض سے بظاہر نظر نہیں آتا، مگر محدثین کے تجربہ میں یہ بات آئی، اور انہوں نے لکھا ہے کہ ان ناموں کے ذریعہ بخار اترتا ہے۔ یا اگر خیالات منتشر ہوتے ہوں یا جمائی آتی ہو، اور اس پر قابو پانے کا ارادہ ہو تو حضرت عمر بن الخطاب ؓ کا نام لیا جائے۔ تو فائدہ ہوگا، یہ بات حدیث سے ثابت نہیں ہے، مگر اہل علم صوفیاء کا تجربہ ہے۔ خود نظر بد دور کرنے کے لئے حدیث کی کتابوں میں بعض صحابہ کرام کے جو واقعات لکھے ہیں، اور مریض کو غسل دینے کا جو طریقہ لکھا ہوا ہے (۲) وہ صحابہ کرام کا تجربہ ہے، لوگ اس طرح پر عمل کرتے تھے۔

اس طرح کے معاملات میں بزرگوں کی تلاش، ان کا مکاشفہ ان کا تجربہ کام کرتا رہا ہے، وہ یہ سمجھتے تھے کہ الفاظ وحروف کے اپنے خواص واثرات ہوتے ہیں، اس بنیاد پر وہ اپنی سی تحقیق جاری رکھتے اور جب کسی نتیجہ تک پہونچتے تو اسے بیان کرتے تھے یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔ نظر

---

(۱) مسدد بن مسرهد بن مجرهدبن مسربل بن مغربل بن مرعبل بن مطربل بن ارندل بن سرندل بن غرندل بن ماسک بن مستور الاسدی البصری.......... من لطائف هذه الاسماء ماصرح به جماعة من شراح الصحيحين وغيرهما من ارباب الطبقات بان هذه الاسماء اذا كتبت وعلقت على محموم كانت انفع الرقى وجربت فكانت كذلک، وقال عاصم انها رقية للعقرب اى مع البسملة، بذل المجهود: ج ۱، ص ۲، باب التخلى عند قضاء الحاجة (سنن ابى داؤد ج ۱).

(۲) مشکوۃ شریف، ص: ۳۹۰، کتاب الطب والرقی، عن ابی امامۃ۔

بدکو دور کرنے، بعض امراض سے شفاء پانے کے لئے حضور ﷺ نے معوذتین پڑھ کر دم کیا ہے، سورہ اخلاص پڑھ کر بھی دم کیا گیا۔ سورہ فلق اور سورہ ناس کو دفع سحر کے لئے مفید بتایا گیا۔ یہ سب الفاظ وکلمات اور کلمات کی مخصوص ترکیب وترتیب کے نتائج ہی تو ہیں جو اللہ کے حکم سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی نہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے کلام اللہ کے علاوہ دوسرے کلمات بھی مریضوں پر پڑھے ہیں، "اعوذ بکلمات اللّٰہ التامات من شر کل ماخلق" قرآن پاک کے الفاظ نہیں ہیں، مگر قلب اطہر ﷺ پر ان کے فوائد ظاہر کئے گئے، مریضوں پر پڑھا گیا اور اس کا فائدہ ہوا۔ یہ یقینی ہے کہ فائدہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا، ذریعہ یہ الفاظ تھے، خود پڑھنے والے کی زبان کا اثر اس کے خشوع وخضوع اور انابت الی اللہ کا بھی اس میں دخل ہوتا ہے۔

الفاظ کے اپنے اثرات اور پڑھنے کے مواقع کا بھی فرق ہوتا ہے، اور بعض مقامات پر اس فرق کی تعلیم سرکار دوعالم ﷺ نے دی:

عن عوف بن مالک انه حدثهم ان النبی ﷺ قضی بین رجلین فقال المقضی علیه: حسبی اللّٰه ونعم الوکیل، فقال رسول اللّٰه ﷺ ردوا علی الرجل فقال: ماقلت؟ قال: حسبی اللّٰه ونعم الوکیل، فقال رسول اللّٰه ﷺ: ان اللّٰه یلوم علی العجز ولکن علیک بالکیس، واذا غلبک امر فقل: حسبی اللّٰه ونعم الوکیل۔

اسی طرح حضرت جابرؓ کی روایت ہے:

عن رسول اللّٰه ﷺ قال: اذا رآی احدکم الرؤیا یکرهها، فلیبصق عن یساره ثلاث مرات ولیستعذ باللّٰه من الشیطان ثلاثاً ویتحول عن جنبه الذی کان علیه۔

اس روایت میں برے خواب دیکھنے والوں کے لئے تین ہدایتیں ہیں: بائیں طرف تین بار تھوکنا، تعوذ تین بار پڑھنا، پہلو بدل لینا۔ حضرت عوفؓ کی روایت میں الفاظ کے مواقع بتائے گئے۔ دوسری روایت میں تعوذ کی تعداد متعین کی گئی، بائیں طرف تھوکنے اور پہلو بدلنے کی تعلیم دی گئی، یہ دعاء یا تعوذ کی ترتیب وترکیب ہے۔ اس روایت میں اللہ کے رسول ﷺ نے یہ نہیں فرمایا

کہ "ایسا کرے تو اللہ کے حکم سے فائدہ ہوگا" ایسا کہنے کی ضرورت نہیں تھی، صاحب ایمان کے دل میں یہ بات پہلے سے متعین ہے، پھر آپ ﷺ نے جو ترکیب و ترتیب بیان فرمائی وہ رہنمائی کرتی ہے، کہ الفاظ و کلمات کے اثرات کے ساتھ اس کی ترتیب بھی قائم کرنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے!

سرکار دو عالم ﷺ نے حفاظت کا طریقہ بتایا: (جسے صوفیاء کی اصطلاح میں حصار کہتے ہیں)۔

**عن انس ؓ قال رسول الله ﷺ من قال: یعنی اذا خرج من بیته، بسم الله توکلت علی الله ولاحول ولاقوة الا بالله یقال له: کفیت وهدیت ووقیت وتنحی عنه الشیطان فیقول لشیطان آخر: کیف لک برجل قد هدی و کفی ووقی۔**

شہنشاہ کونین نے حفاظت کا جو طریقہ بتایا، وہ قرآن مجید کی آیت نہیں ہے، بلکہ الفاظ قرآنی کی نئی ترتیب ہے۔ یہ نئی ترتیب شیطان سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔ مگر روایت میں کہیں بامر اللہ کا لفظ نہیں ہے، اور نہ وسیلۃ للوقایۃ فرمایا گیا، اس لئے کہ ہر صاحب ایمان مؤثر حقیقی اللہ کو مانتا ہے۔

اس لئے اگر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اصحاب الکہف کے نام لکھدیئے، اور اس کے ساتھ "امان من الغرق" الخ لکھا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ ان ناموں کو مؤثر حقیقی سمجھتے تھے، ان کا یہ انداز بیان وہی ہے، جس کا سرا ماضی بعید سے ملتا ہے۔

القول الجمیل چونکہ طالبان راہ طریقت کے لئے ہدایت نامہ ہے اس تذکرہ کے ذیل میں یہ باتیں آگئیں۔ القول الجمیل کی شکل میں حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ عمومی ہدایت نامہ تحریر فرمایا ہے اور اس امانت کو صفحات میں محفوظ کر دیا ہے، جو انہیں اپنے والد بزرگوار سے ملی تھی، اور جو ماضی قریب و بعید کے تجربات کا خلاصہ اور ان کے خاندان کا آزمودہ نسخہ رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ انہوں نے یہ صرف عام مسلمانوں بلکہ علماء، اہل علم اور طالبان راہ طریقت کی جو رہنمائی فرمائی ہے، وہ ان کا مجتہدانہ کارنامہ ہے۔ انہوں نے الفاظ قرآن اور الفاظ حدیث سے دلچسپی پیدا کرادی، اور الفاظ سے معنی اور مفہوم تک پہونچنے کا مزاج بنایا۔ فتح الرحمان (قرآن پاک کا فارسی ترجمہ) المسوی من احادیث الموطا (عربی) اور مصفی (فارسی میں موطا امام مالک کی شرح) اسی انداز فکر کا نمونہ ہیں۔

آپ نے منطق و فلسفہ اور کلام کی باریک بحثوں اور غیر ضروری نکتوں پر مباحثہ کی جگہ حکمت

دین وشریعت پر غور وفکر کی عملی تعلیم دی، اور حجۃ اللہ البالغہ جیسی کتاب پیش کی، تاکہ وہ نمونہ کا کام کرے اور اس بنیاد پر آنے والی نسل حکمت قرآن وحدیث پر اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دین سے براہ راست رابطہ کی شکل جہاں قرآن اور حدیث کو پڑھنا، سمجھنا اور پڑھانا ہے، وہیں حکمت دین بھی بنیادی ذریعہ ہے، اور یہ مرحلے تزکیہ کے مرحلے بھی ہوں گے، اور پھر ان مرحلوں سے گذر کر "تزکیہ" کے بقیہ کام اور آسان ہو جائیں گے۔ یہی ترتیب خداوندی ہے، یہی طریقہ نبویؐ ہے اور اسی طرز وطریقہ پر صحابہ کرامؓ کے مزاج وانداز کی تعمیر وتشکیل ہوئی۔

قرآن مجید میں نبی کریم ﷺ کی ذمہ داری ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ"(۱)۔ اور دوسری جگہ اس ترتیب میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ارشاد ہوا۔ "یعلمھم الکتب والحکمۃ ویزکیھم"(۲)۔ تلاوت آیات کو نبی کریم ﷺ کا پہلا کام قرار دیا گیا، یہ تلاوت آیات نبی کریم کی صحبت اور مجالست کے ساتھ تھی۔ یہ دونوں (تلاوت اور مجالست) تزکیہ کا ذریعہ ہیں اور تزکیہ کے ساتھ کتاب وحکمت کی تعلیم آسان بھی ہوگی اور بہتر بھی! وہ تزکیہ جو علم وحکمت کے بغیر ہو، بدعت وضلالت تک پہونچ سکتا ہے، اور کتاب وحکمت کی ایسی تعلیم جو تزکیہ کے بغیر ہو، سرکشی، انانیت اور تکبر کا ذریعہ بن سکتی ہے، اس لئے ہدایت خداوندی کے مطابق تلاوت، تزکیہ اور علم کتاب وحکمت ان سبھوں کو یکجا کرنا چاہئے، تبھی وہ انسان تیار ہوگا جو خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گذارے، اور اسی ترتیب کو سامنے رکھ کر سرکار ذی وقار ﷺ نے صحابہ کرام کی تربیت فرمائی۔

حضرت شاہ صاحب نے عالم دین، عالم ربانی کے لئے جو آداب متعین کئے ہیں، ان میں پہلے نمبر پر اسی آیت کے پیش نظر یہ ہدایت دی ہے، کہ "وہ لوگوں کو تعلیم دے اور یہ تعلیم تفسیر، حدیث، فقہ، سلوک، عقائد اور صرف ونحو کی ہو۔ عالم کو علم کلام اور منطق میں مشغول نہیں رہنا چاہئے"۔ (القول الجمیل)

(۱) سورۃ الجمعہ: آیت:۲

(۲) سورۃ البقرہ: آیت:۱۲۹۔

تصوف وسلوک یا تزکیہ کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کا یہ نقطۂ نظر صرف ان چند جملوں میں نہیں ملتا، انہوں نے تصوف کی اصطلاح ''نسبت'' کے سلسلہ میں لکھا۔

''تصوف کے جتنے طریقے اوپر بیان کئے گئے ان سب کا مقصد یہ ہے کہ طالب کے نفس ناطقہ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جائے، اسی کیفیت کو صوفیاء کرام نے ''نسبت'' کہا ہے۔ اس کو نسبت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ کیفیت نام ہے اللہ تعالیٰ سے انتساب اور ربط و تعلق کا''۔

اس نسبت یا اللہ سے خاص ربط و تعلق کو حاصل کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''یہ نہ سمجھنا کہ یہ نسبتیں صرف اشغال اور وظائف ہی سے حاصل ہوتی ہیں، بلاشبہ ان نسبتوں کے پانے کا ایک طریقہ یہ اشغال و وظائف بھی ہیں، لیکن دوسرے طریقوں سے بھی انہیں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک اس مسئلہ میں رائے غالب یہ ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین ان اشغال اور وظائف کی جگہ ''سکینہ کی نسبت'' دوسرے طریقوں سے حاصل کیا کرتے تھے۔ ان میں ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ خلوت میں پورے خضوع وخشوع کے ساتھ نمازیں پڑھتے، ذکر و تسبیح کرتے، ہمیشہ پاک رہتے، موت کو ہمیشہ یاد رکھتے، ثواب اور عذاب کا دھیان کرتے جس کے نتیجہ میں مادی لذتوں سے ان کا دل ہٹ جاتا، اس طریقہ سے ان میں یہ ''نسبت'' پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کے حصول کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے، اس کے معانی اور مطالب میں غور و فکر کرتے رہتے تھے، وہ وعظ و نصیحت سنتے اور دل کو نرم کرنے والی حدیث سنتے تھے، اور وہ ان چیزوں کو مدت دراز تک باقاعدگی کے ساتھ یاد کرتے رہتے تھے۔ اس سے ان کے اندر ایک ملکہ اور نفسی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، اور وہ لوگ آخر عمر تک اس کیفیت کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ یہ ہے کیفیت، جو رسول اللہ ﷺ سے ہمارے مشائخ کے ذریعہ ورثۃً چلی آ رہی ہے۔ (القول الجمیل)

حصول نسبت کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں تین طریقے بیان کئے۔ صوفیاء کرام کے اوراد و وظائف، اعمال و اشغال کا طریقہ، اور آپ نے اس کی بھرپور تائید کی ہے، پھر صحابہ کرام اور تابعین عظام کے دو طریقے بتائے ہیں، جو صوفیائے کرام کے طریقہ سے بالکل الگ نہیں ہیں، مگر دونوں میں فرق ہے، نسبت کے حصول کے لئے صحابہ کرام کا دوسرا طریقہ وہی

بتایا گیا ہے، جس کی تعلیم حضرت شاہ صاحبؒ نے دی اور اپنے علم وفکر، تجربہ ومشاہدہ تصنیف وتالیف کے ساتھ اپنے عمل کے ذریعہ جسے پھیلایا اور لوگوں تک پہونچایا، انہوں نے ''عالم'' اور ''صوفی'' کے فاصلہ کو مٹانے کی کوشش کی، اور ایسے ''عالم ربانی'' کی تعلیم وتربیت کی، جو عالم بھی ہو صوفی بھی ہو، خودشناس بھی، خداشناس بھی، باہمہ بھی، بے ہمہ بھی، قرآن وحدیث سے گہرا شغف رکھنے والا، اور حکمت دین کا امانتدار۔ ایسا عالم ربانی جو صاحب نسبت بھی ہو ایک مخصوص ملکہ اور نفسی کیفیت کا مالک ہو، حضرت شاہ صاحبؒ نے صوفیائے کرام کے طریقہ اور ان کے بتائے اذکار اور اشغال کو بیان کیا، ان کی افادیت واضح کی، ان کی تائید کی، اور اس امانت کے احترام کے ساتھ یہ بھی بتادیا کہ جو چیز حضور ﷺ سے وراثۃً چلی آرہی ہے وہ کیا ہے، اور عہد صحابہ کرام میں اس کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا رہا ہے؟

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ رائے ان کے معتدل اور متوازن مزاج کا ایک حصہ ہے، جو ان کے علم وتجربہ کی وسعت، غوروفکر کی غیر معمولی صلاحیت، تحلیل وتجزیہ پر بھرپور قدرت اور قرآن وحدیث کی حکمت سے گہری واقفیت کا آئینہ دار ہے، اور یہ ان کی اجتہادی شان کا ایک رخ ہے!

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم، ربنا ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه، ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا، ربنا ولاتحملنا مالاطاقة لنا به واعف عنا واغفرلنا وارحمنا انت مولانا، وصلی اللہ علی سیدنا وشفیعنا محمد وعلی آله وصحبه اجمعین.

# شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تجدیدی خدمات:

## چند پہلو

مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانوی☆

رسول اکرم ﷺ کی ایک حدیث سنن ابی داؤد اور مستدرک حاکم وغیرہ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کی گئی ہے کہ "اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر اس امت کے لئے ایسے شخص کو مبعوث فرماتا ہے جو اس امت کے لئے اس کے دین کی تجدید کرے" (ان اللہ یبعث لھذہ الأمة علی رأس کل مائة سنة من یجدد لھا دینھا) اسلامی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی ایسی بہت سی شخصیات نظر آتی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے زمانے میں دین وملت کے خشک ہوتے ہوئے شجر طیب کی آبیاری کی اور اسے حیات نو بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز، علامہ ابن تیمیہ، شیخ احمد سرہندی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرات شہیدین-- مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید رحمہم اللہ یہ تمام وہ شخصیات ہیں جن سے متعلق امت کے سواد اعظم کے مابین اتفاق سا پایا جاتا ہے کہ وہ ایسی ہی شخصیات تھیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ جس دور میں پیدا ہوئے اس کو ہندوستان میں اسلامی تاریخ کا سیاہ ترین دور کہا جاسکتا ہے۔ جاہلیت مسلمانوں کی زندگی اور سماج کے ہر ہر شعبے میں اس طرح سرایت کرچکی تھی کہ دین کی اصل تصویر اہل دین کی اکثریت کی نگاہوں سے تقریباً چھپ سی گئی تھی۔

☆ کارگزار صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند و کارگزار جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت۔

سیاسی سطح پر اورنگ زیب عالمگیر جیسے مدبر اور دور اندیش و بیدار مغز حکمراں کی وفات کے بعد فساد وفتن کا وہ طوفان جو اب تک دبا ہوا تھا، اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور انتشار و انار کی اور طوائف الملو کی نے ملک کو کمزور و غیر مستحکم کر دیا تھا۔ اس طوائف الملو کی اور انتشار کا کچھ اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خود شاہ صاحب کی حیات میں گیارہ بادشاہ تخت نشیں ہوئے جن میں سے بعض کی مدت صرف چند دن تھی تو کسی کی صرف چند ماہ۔ اورنگ زیب کے جانشیں مغل شہزادے "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے زمرے میں مشغول داد عیش دے رہے تھے اب ان کے بازوؤں میں وہ سکت اور عقل و ہوش میں وہ قوت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ مغلیہ حکومت کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دے سکیں، گویا یہ کچھ ویسی ہی صورت حال تھی جو اس سے قبل قرطبہ اور بغداد وغیرہ میں پیش آ چکی تھی۔

سیاسی ابتری اور ادبار کی یہ صورت حال دراصل اُس انحطاط و زوال کی پیداوار تھی جو دین کے تعلق سے عوام و خواص کے ہر ایک طبقے میں پیدا ہو گیا تھا اور جس سے علماء، فقہاء، صوفیا اور وہ لوگ بھی بچے ہوئے نہ تھے کہ جن پر اسلامی معاشرت کی دیکھ بھال اور دین و ملت کی پاسبانی کا بار گراں ہوتا ہے۔ شاہ صاحب اس صورت حال سے خود کس حد تک دل گیر اور کبیدہ خاطر تھے اس کا اندازہ ان کے ان اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے:

"سچ فرمایا اللہ کے رسول ﷺ نے ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ ضعیف الایمان مسلمان دیکھے ہیں، جنہوں نے صلحا کو ارباب من دون اللہ بنالیا ہے اور یہود و نصاری کی طرح اپنے اولیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے۔ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو کلام شارع میں تحریف کرتے ہیں اور نبی ﷺ کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لئے ہیں اور گنہگار میرے لئے۔ یہ اس قسم کی بات ہے جیسے یہودی کہتے تھے کہ لن تمسنا النار الا ایاما معدودة......صوفیا کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زبان زد ہیں جو کتاب وسنت سے مطابقت نہیں رکھتے"(۱)۔

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"اگر تم کو (عہد جاہلیت کے) مشرکین کے عقائد و اعمال کے اس بیان کے صحیح تسلیم

(۱) تفہیمات الہیہ جلد دوم، ص: ۱۳۴۔۳۵۔

کرنے میں کچھ توقف ہو تو چاہئے کہ اس زمانے کے تحریف کرنے والوں کو علی الخصوص جو دار الاسلام کے نواح میں رہتے ہیں، دیکھو......"(۱)

مسلم معاشرے کی یہ زبوں حالی اس بات کی سراسر متقاضی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ پردۂ غیب سے ظہور میں آئے اور اس دیار میں دین وملت کی شگافتہ کشتی کو گردابِ شر اور طوفان جاہلیت سے نکال کر ساحل نجات تک پہنچائے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی ۲۷، ۲۸ سالہ عملی زندگی (جیسا کہ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنے مضمون (۲) میں حساب وشمار کے بعد اس کی وضاحت کی ہے) کے نقشے، ترتیب کار، تفصیلات اور اس کے نتائج کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ شاہ صاحب نے جو تجدیدی کارنامے انجام دیئے وہ اپنی نوعیت اور اہمیت شان کے اعتبار سے اسی مردِ غیب کے کارنامے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ خصوصی طور پر اپنی موہوبہ قوتوں کے ساتھ ایسے ہی انتہائی نازک اور حساس وقت میں تجدید واحیائے دین کا کام لیتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے مختلف جگہوں پر خود اس بات کا اظہار واعادہ کیا ہے کہ انہیں قائم الزمان کے منصب پر فائز کیا گیا ہے اور یہ کہ انہیں خدا کی طرف سے ایک ذمہ داری سونپی گئی ہے جسے انہیں انجام دینا ہے۔

شاہ صاحب کے تجدیدی عمل کا دائرہ کار بہت وسیع، متنوع اور ہمہ گیر ہے۔ اس کا تعلق عقائد واخلاق، تہذیب ومعاشرت، سیاست، امور معاش اور تعلیم وتدریس سبھی سے ہے۔ انہوں نے ان تمام چیزوں کو اپنے غور وفکر اور مطالعہ ومشاہدہ کا موضوع بنایا ہے اور اسے سلف صالح کے مزاج وروش کے مطابق، دین خالص کے میزان پر رکھ کر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس پورے عمل میں شاہ صاحب کا طریقہ مجتہدانہ، مصلحانہ اور بصیرت آمیز ہے۔ وہ ان میں سے کسی بھی چیز کے کسی بھی پہلو کو تقلید وروایت پسندی کی بنیاد پر اختیار کرنے اور اُسے انفرادی یا اجتماعی رویے کی اساس بنانے کے لئے تیار نظر نہیں آتے کہ ایک مجدد کی شان یہی ہوتی ہے۔ یہی طرز فکر اُسے ان جاہلی رجحانات سے بچاتی ہے جو ہر زمانے میں ایسے دیدہ زیب پیراہن میں ملبوس ہو کر سامنے آتے ہیں جنہیں عام نگاہیں پرکھ نہیں پاتیں اور اس کے بچھائے ہوئے دامِ فریب میں پھنستی چلی جاتی ہیں۔

---

(۱) الفوز الکبیر، ص: ۲۶، (تقریب الاستاذ، سلمان ندوی)۔

(۲) دیکھئے: مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا مضمون "آغوش موج کا ایک درتابندہ یا اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں خدا کا وفادار بندہ" "الفرقان" شاہ ولی اللہ نمبر، دوسرا ایڈیشن ص: ۲۲۷۔

مجموعی طور پر شاہ ولی اللہ کے عمل تجدید کے دو رخ ہیں۔ ایک کا تعلق استحکام مرکز حکومت خلافت ظاہری کے قیام سے اور دوسرے کا تعلق "احیائے دین و اصلاح ملت (خلاف باطنی کے قیام و احیا) سے ہے۔ خلافت ظاہری کے تعلق سے دیکھا جائے تو انہوں نے اپنے طور پر اس بات کی پوری سعی کہ ہندوستان میں مسلم حکومت منور کر سکے۔ (جو مغلوں کے ہاتھ میں تھی) کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لو تیز ہو جائے تا کہ وہ دوبارہ روشن ہو کر دنیا کو (مزید تیرہ و تاریک ہونے سے بچا سکے) اس تعلق سے وہ مسلسل اضطراب اور بے چینی کا شکار رہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلام اور مسلم مخالف اور مستحکم وطن مخالف سیاسی طاقتیں مسلسل زور پکڑ رہی ہیں۔ مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کے حوصلہ مند اور جنگجو جتھے حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے در پے ہیں۔ روز بروز ان کا سیاسی اثر در سوخ بڑھتا جا رہا ہے اور ان کے حوصلے جواں ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ یہ احساس پیدا ہوا کہ اگر ان کے قدم نہ روکے گئے تو شاید اس ملک میں اسلامی شعائر کی حفاظت و بقا ممکن نہ رہے۔ اس بارے میں اپنے درد و کرب کا اظہار شاہ صاحب نے مختلف جگہوں پر کیا ہے۔ نجیب الدولہ کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے، اور تھوڑا ہی زمانہ گزرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ کر سکے گی"(۱)۔

اسی طرح "تفہیمات الٰہیہ" میں شاہانِ وقت کو جہاد پر ابھارتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اے بادشاہو! ملاء اعلیٰ کی مرضی اس زمانے میں اس امر پر مستقر ہو چکی ہے کہ تم تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو، جب تک کہ مسلم مشرک سے بالکلیہ جدا نہ ہو جائے اور اہل کفر و فسق کے سرکش لیڈر کمزوروں کے گروہ میں جا کر شامل نہ ہو جائیں اور یہ کہ ان کے قابو میں پھر کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جس کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں۔ قاتلوهم حتى لاتكون فتنة ويكون الدين كله لله"(۲)۔

(۱) شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات پروفیسر خلیق احمد نظامی ص: ۲۲-۲۳۔

(۲) تفہیمات الٰہیہ جلد اول ص: ۲۱۵-۲۱۶ بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم۔

شاہ صاحب نے اس طرح امرا، ارکان دولت، سپاہیوں اور عسکریوں کو بھی خطاب کیا اور انہیں اقامت دین اور شعائر اسلام کی حفاظت و پاسداری کے لئے جان کی قربانی پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کا معرکہ ان ہی کی تحریک پر پیش آیا جس نے مرہٹوں کی قوت و شوکت توڑ دی اور ہندوستان کے اسلامی نقشے کو محفوظ و برقرار رکھنے کے لئے فضا ہموار کر دی۔ اس طرح ایک دفعہ پھر مسلمانوں کو سنبھلنے اور مسلم حکمرانوں کو خواب غفلت سے بیدار ہونے کا موقع حاصل ہو گیا۔ تاہم درحقیقت تاریخ وعمرانیات کے مشہور مفکر علامہ ابن خلدون کے اس نظریے کے مطابق کہ: ''جب کسی حکومت کو ضعف لاحق ہو جاتا ہے تو پھر وہ دوبارہ اٹھ نہیں پاتی''(۱) مغلیہ حکومت میں وہ جوش و توانائی نہ آسکی اور بالآخر آگے چل کر وہ طوفانِ حوادث کا شکار ہو گئی۔

کام کے اس رخ میں اگرچہ شاہ صاحب کی عملی شرکت نظر نہیں آتی جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ کے یہاں نظر آتی ہے جبکہ وہ تاتاریوں کے ساتھ شام کے معرکے میں خود شمشیر برہنہ ہو کر کود پڑے تھے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس سیاسی فتح میں جو پانی پت کے معرکے میں مسلمانوں کو حاصل ہوئی وہ انہی کے مضبوط عملی خاکے اور منصوبہ بند جدوجہد کا ثمرہ تھی۔ شاہ صاحب کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود اس بات کے متمنی اور خواہش مند تھے کہ جہاد بالسیف کی یہ سنت بھی ان کے دم سے تازہ ہو لیکن حالات اور زمانے کی رعایت اس میں تھی کہ وہ خود کو رزم گاہ سے دور رکھیں۔ جیسا کہ وہ تفہیمات میں ہی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اگر بندہ ایسے زمانے میں ہوتا کہ اقامتِ جہاد کے بغیر لوگوں کی اصلاح ممکن نہ ہوتی تو یہ بندہ امر جہاد کو انجام دیتا اور وہ جنگ و جہاد کا امام ہوتا جس کے سامنے رستم و اسفندیار کی داستانیں بھی ہیچ ہو جاتیں''(۲)۔

شاہ صاحب کے کام کا دوسرا رخ وہ ہے جس کا تعلق اس روحانی خلافت کے احیاء سے ہے، جس کا وارث انبیا کے بعد اس امت کے علمائے دین کو بنایا گیا ہے۔ اور درحقیقت یہی وہ اصل کارنامہ ہے جو انہیں تجدید و احیائے دین کے اُس اعلیٰ منصب پر فائز کرتا ہے جس کی کوئی نظیر شاہ

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون، فصل ان الھرم اذا نزل بالدولۃ لا یرتفع۔

(۲) تفہیمات الٰہیہ جلد اول، ص: ۱۰۱۔

صاحب کے بعد کے ہندوستان میں نظر نہیں آتی۔

شاہ صاحب کے اس تجدیدی رخ کے متعدد پہلو ہیں، وہ برصغیر ہند میں فہم قرآن کے بند دروازے کو کھولنے والے بھی ہیں اور حدیث وسنت کی اشاعت اور اس کی تعلیم وتدریس کو عام کرنے والے بھی، مختلف مکاتب فقہ میں شاہراہ اعتدال تلاش کرنے والے بھی اور جدید علم کلام کے بنیاد گزار بھی، تصوف وروحانیت کی باطل شکل کو آشکارا کر کے "احسان" کی اسلامی شکل کو دنیا کے سامنے رکھنے والے بھی ہیں اور اجتماعیات واقتصادیات کی شریعت اور فطری رہنمائی کی روشنی میں گرہ کشائی کرنے والے بھی۔ علم اسرار شریعت کے بانی بھی اور فلسفۂ تشریع کے نکتہ داں بھی۔ غرضیکہ وہ تمام صفات وخصوصیات شاہ صاحب کی ذات میں جمع ہوگئی تھیں جو کسی عہد کے نقیب ومجدد میں ہوا کرتی ہیں۔

یہاں صرف چند امور پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے: شاہ صاحبؒ کی تجدیدی کوششوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور اولیت جس چیز کو حاصل ہے وہ شاہ صاحب کی عامۃ الناس کو رجوع الی القرآن کی دعوت ہے۔ انہیں اس بات کا بخوبی ادراک تھا کہ امت کو جن امراض نے آگھیرا ہے اور جس کی وجہ سے اس کا وجود پارہ پارہ ہو رہا ہے اس کا اولین سبب قرآن سے دوری اور محرومی ہے۔ لوگوں کے لئے قرآن محض حصولِ برکت وتلاوت کی کتاب بن کر رہ گیا ہے اور اس کی تعلیمات صرف خواص کے بعض مخصوص حلقوں تک سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ کیونکہ عوام عربی سے نابلد ہیں اور خواص کو اس کی فکر نہیں کہ وہ قرآن پر پڑے ہوئے پردہ کو ہٹا کر اس کی تعلیمات کو لوگوں کے سامنے لائیں جس کی بنیاد پر اسے کتاب ہدایت کا نام دے کر نازل کیا گیا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے "فتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن" کے نام سے قرآن کریم کا فارسی میں ترجمہ کیا جو تجدید واصلاح کے باب میں شاہ صاحب کے اُس عملی خاکے کا عنوان معلوم ہوتا ہے جو وہ حجاز کی مقدس سرزمین سے اپنے ذہن میں بٹھا کر لائے تھے۔ شاہ صاحب کا یہ کام کتنا وقیع اور جمود شکن تھا اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب کے اس اقدام پر علماء اور عوام الناس کے بعض حلقے نہ صرف یہ کہ مشتعل ہوئے بلکہ بازاری غنڈوں کے ذریعہ ان کی مسجد (مسجد فتح پوری جہاں وہ رہتے تھے) کا گھیراؤ بھی کیا گیا اور ان کی مذمتیں بھی کی گئیں۔

فتح الرحمٰن کے ذریعہ قرآن فہمی کا جو عمومی پروگرام شاہ صاحب کے ذہن میں تھا اس کا اظہار انہوں نے اس کے مقدمے میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''متن قرآن کے بعد بچوں کو چند مختصر فارسی کتابیں پڑھائی جائیں...... پھر یہ کتاب (فتح الرحمٰن) پڑھائی جائے۔ چوں کہ اہل حرفہ اور سپاہیوں کے بچوں کو عربی کی تعلیم پوری حاصل کرنے کی امید نہیں ہوتی، اس لئے یہ کتاب بچپن ہی میں پڑھا دینی چاہئے تا کہ سب سے پہلے جو چیز ان کے دماغ میں آئے، وہ اللہ کی کتاب کے مطالب ہوں''۔ (۱)

''فتح الرحمٰن'' کی اشاعت کے بعد ہی برصغیر ہند میں وہ تحریک شروع ہوئی جسے بجا طور پر قرآن فہمی کو عام کرنے کی تحریک سے موسوم کیا جا سکتا ہے، جس کی ابتدائی قیادت کا کام بھی اللہ تعالیٰ نے اسی خاندان کے دو بزرگوں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین رحمہما اللہ کے ذریعہ لیا۔ جنہوں نے قرآن کا اردو میں ترجمہ کر کے قرآن کی تعلیم کو گھر گھر پہنچا دیا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''ہندوستان میں قرآن فہمی کا چرچا آج جو کچھ نظر آتا ہے اور یہ اردو، انگریزی اور دوسری زبانوں میں جو بیسیوں ترجمے شائع ہو چکے ہیں، ان کے اجر کا جزو اعظم یقیناً شاہ صاحب کے حسنات میں لکھا جائے گا کہ یہ سارے چراغ اسی چراغ سے روشن ہوئے ہیں''۔ (۲)

فتح الرحمٰن کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے اصول تفسیر میں ایک رسالہ ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' کے نام سے تالیف کیا جس کے متعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ وہ ''اپنے موضوع پر ہمارے علم میں پورے اسلامی کتب خانے میں منفرد کتاب ہے''۔ (۳)

قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے علاوہ حدیث و فقہ بھی شاہ صاحب کی خصوصی توجہ کا

---

(۱) مقدمہ فتح القرآن بحوالہ: ''تاریخ دعوت و جہاد: برصغیر کے تناظر میں'' از عبیداللہ فہد فلاحی (۱۹۴)۔

(۲) الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر دوسرا ایڈیشن ص: ۳۱۔

(۳) تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم ص: ۱۵۔

مرکز بنے۔ شاہ صاحب علوم دینیہ میں حدیث کے مقام اور اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ان عمدة العلوم اليقينية ورأسها ومبنى الفنون الدينية وأساسها هو علم الحديث الذی يذكر فيه ماصدر من افضل المرسلين ـــ صلى الله عليه وعلى آله وأصحابه أجمعين ـــ من قول، أول فعل، أو تقرير، فهی مصابيح الدجى ومعالم الهدى و بمنزلة البدر المنير من انقادلها ووعى فقد رشد واهتدى"(۱)۔

حدیث کے تعلق سے برصغیر ہند میں جو سرد مہری اور بے توجہی کا رویہ پایا جاتا رہا تھا اس کی داستان طویل بھی ہے اور افسوس ناک بھی۔ علوم آلیہ: صرف ونحو اور یونانی علوم کے جس فلسفے نے اسلامی علوم میں نقب لگا کر امت کے ایک بڑے حلقے کو پراگندہ ذہن کر دیا تھا۔ اور جس کے خلاف پہلے امام غزالی اور بعد میں علامہ ابن تیمیہ کو زبردست جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ اسی بے روح اور غیر اسلامی فلسفے کو حلقہائے علم ودرس کو تاج وری حاصل تھی۔ علما کی کثرت اسی پر سرد ھنتی اور اسی میں استغراق کو معراج علم وکمال تصور کرتی تھی۔ شاہ صاحب نے اس پست فکری اور زبوں حالی پر خود بھی ماتم کیا ہے۔ "تفہیمات الٰہیہ" میں علما کے نام اپنے خطاب میں فرماتے ہیں:

"میں ان طالبان علم سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علما کہتے ہیں کہ بے وقوفو! تم یونانیوں کے علوم اور صرف ونحو ومعانی میں پھنس گئے اور سمجھے کہ علم اس کا نام ہے۔ حالاں کہ علم تو کتاب اللہ کی آیت محکمہ ہے۔ یا پھر وہ سنت ہے جو رسول سے ثابت ہو.....تم پچھلے فقہا کے استحسانات اور تفریعات میں ڈوب گئے کیا تمہیں خبر نہیں کہ حکم صرف وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے فرمایا ہو: تم میں سے اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کسی کو نبی کی کوئی حدیث پہنچتی ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میرا عمل تو فلاں کے مذہب پر ہے نہ کہ حدیث پر۔ پھر وہ حیلہ یہ پیش کرتا ہے کہ "صاحب! حدیث کا فہم اور اس کے مطابق فیصلہ تو کاملین وماہرین کا کام ہے اور یہ

(۱) مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ، ص:۲۔

حدیث ائمہ سلف سے چھپی تو نہ رہی ہوگی پھر کوئی وجہ تو ہوگی کہ انہوں نے اسے ترک کردیا" جان رکھو! یہ ہرگز دین کا طریق نہیں ہے۔ اگر تم اپنے نبی پر ایمان لائے ہو تو اس کی اتباع کرو خواہ کسی مذہب کے موافق ہو یا مخالف"(۱)۔

چنانچہ "صدرہ" اور "شمس بازغہ" کے طلسم کو توڑنے کے لئے ایک طرف شاہ صاحب نے اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ کے ذریعہ حدیث کی تدریس وترویج کی عملی کوشش کی وہیں دوسری طرف اس موضوع پر تصنیف وتالیف کو بھی اپنے عملی منصوبے کا حصہ بنایا۔ فارسی اور عربی میں موطا امام مالک کی شرح بالترتیب "مصفی" اور "مسوی" کے نام سے لکھی۔ نیز شرح ابواب تراجم صحیح البخاری "الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین" وغیرہ کتابیں تصنیف کیں۔

علوم شریعت کی ترویج واشاعت اور "تنقیح وتہذیب" کے تعلق سے شاہ صاحب کا ایک بڑا تجدیدی کارنامہ وہ ہے جس کا تعلق فقہ اسلامی سے ہے۔ فقہ کے تعلق سے شاہ صاحب کا نقطۂ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک فقہ سے اس طرح وابستگی کہ حق کو اسی میں محصور سمجھ کر دوسرے تمام فقہی مکاتب سے آنکھیں بند کرلی جائیں، صحیح نہیں ہے۔ شاہ صاحب اگرچہ بنیادی طور پر حنفی تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ عراقی فقہ کو حجازی فقہ سے ہم آہنگ کیا جائے جس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ایک طرف مسائل کے حل میں توسع اور کشادگی کی راہیں نکلیں گی جو اس حیثیت سے ناگزیر ہیں کہ زمانہ ہر لحہ تغیر پذیر اور ارتقا کے دوش پر سوار ہے۔ چنانچہ کسی ایک متعین فقہ اور اس کے اصولوں کی بہر صورت پیروی میں اس کی رعایت ممکن نہیں ہوگی۔ دوسری طرف امت کو مسلکی مخاصمت اور تعصب وتنگ نظری کی اس انتہائی شکل سے بچانا ممکن ہوگا جس کے بدترین پرتشدد مظاہر وہ شب وروز اپنی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے پیش نظر ایک طرف انہوں نے اجتہاد پر زور دیا اور اس نظریے کی شدید مخالفت کی کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوچکا ہے۔ دوسری طرف حدیث وفقہ کے مابین توفیق وتطبیق کی کوشش کی۔ شاہ صاحب نے اپنی کتاب "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف اور عقد الجید فی بیان احکام الاجتہاد والتقلید" نیز حجۃ اللہ البالغہ میں

---

(۱) تفہیمات

اجتہاد وتقلید اور اس کے حدود و قیود پر اصولی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اور تقلید و اجتہاد کے تعلق سے اس اعتدال کے راستے کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جو لوگوں کو اپنے فقہی مسلک کے اتباع میں افراط وتفریط سے محفوظ رکھ سکے۔ اگر چہ یہ بات بحث طلب ہے کہ اس طرح کی کوشش اپنے مقصد میں کامیابی اور نتیجہ خیزی کا کس حد تک امکان رکھتی تھی، تاہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ شاہ صاحب کی ان کوششوں سے مسلکی چپقلش کی وہ آندھی رک گئی، جس نے دنیائے اسلام کے اس خطے میں اسلامی وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

برصغیر ہند میں مسلمانوں کے عہد زوال میں بلاشبہ یہی وہ تجدیدی خدمات تھیں جو اسلامی علوم کے احیا اور مسلمانوں کی روحانی و ذہنی بیداری کا ذریعہ بنیں۔

بہر حال شاہ صاحب کی تجدیدی خدمات کے یہ چند پہلو یا گوشے ہیں جن پر مختصر روشنی ڈالی گئی۔ اس چھوٹے سے مضمون میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنا صحرا کو آئینے میں اتارنے کے مترادف ہے جو ظاہر ہے کہ ایک محال امر ہے۔

# قرۃ العینین اور سبب تالیف

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری☆

زیر تبصرہ کتاب دراصل مطبع مجتبائی دہلی کی اشاعت کا فوٹو ہے۔ ص ۳۳۶ کے کالم ۳ پر یہ تصریح موجود ہے: "بتوفیق الٰہی وفیض نامتناہی نسخۂ نادر الوجود (قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین) مصنفہ راس المحدثین، حجۃ اللہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ بہ تصحیح وتنقیح کہ زیادت بران متصور نباشد، از اہتمام احقر الانام محمد عبدالاحد بماہ جمادی الاخری ۱۳۱۰ھ بمطبع مجتبائی واقع دہلی، طبع گردید"۔

## موضوع:

کتاب کے نام سے موضوع کی جانب اشارہ ہو جاتا ہے۔ خطبۂ کتاب میں مصنف علام نے ایسے جملے استعمال کئے ہیں جن سے "براعت استہلال" کے طور پر موضوع کا علم ہو جاتا ہے۔ ایک جملہ بہت واضح ہے: "وجعل أفاضلهم وزراءه فی عهده، وخلفاء من بعده" یعنی صحابہ میں جو افضل تھے انہیں آپ کے عہد میں آپ کا وزیر اور آپ کے بعد آپ کا خلیفہ مقرر فرمایا۔

خطبۂ کتاب کے بعد مصنف نے جو چند سطریں تمہید و مناسبت کے طور پر لکھی ہیں ان سے بھی موضوع پر روشنی پڑتی ہے۔

اہل سنت کے موقف کی تائید اور اعتقادی بدعتوں کی تردید میں شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کا کردار بے حد واضح اور مؤثر ہے۔ امت اسلامیہ کے اندر فکر و عقیدہ کی جو ناہمواریاں

☆ ریکٹر جامعہ سلفیہ، بنارس۔

پیدا ہو گئی تھیں، اور جس طرح مسلمان کتاب و سنت سے ہٹ کر اپنی راہ متعین کر رہے تھے، اس پر یہ خانوادہ بالخصوص اس کے صاحب نظر افراد متفکر تھے۔ اور یہ تفکر صرف زبانی نہ تھا، بلکہ ان حضرات نے اصلاح حال کے لئے عملی اقدامات کئے جن کے عمدہ اثرات آج تک اور آئندہ بھی محسوس کئے جاتے رہیں گے۔ ان عملی اقدامات ہی کا ایک حصہ کتاب ''قرۃ العینین'' ہے، شاہ صاحب کا ادبی مقام بھی بے حد بلند تھا، کتابوں کے نام اور عربی و فارسی عام تحریروں میں بھی وہ چست اور موثر ترکیبیں استعمال کرتے تھے۔ اسلامی عقیدے کے ایک اہم اور حساس مسئلہ پر اظہار خیال کے لئے جو کتاب تصنیف کی اس کے نام میں ''قرۃ العینین'' کی ترکیب استعمال کر کے ذہنی الجھن کو دور کرنے میں کتاب کے کردار کی جانب اشارہ کر دیا کہ اس سے قارئین کی آنکھوں (بلکہ دلوں کو بھی) ٹھنڈک حاصل ہوگی۔

**مناسبت:**

خطبہ کے بعد کی تمہیدی سطروں میں شاہ صاحب نے (خواجہ محمد امین) کے سوال کا ذکر فرمایا ہے جس میں انہوں نے شیخین (ابوبکر و عمر) رضی اللہ عنہما کی فضیلت کے اسرار و وجوہ کی بابت دریافت کیا تھا جو قرۃ العینین کی تالیف کا محرک بنا۔

مذکورہ سوال کی توجیہ میں شاہ صاحب نے چند جملے استعمال کئے ہیں جن سے اس عہد کی دینی و فکری حالت اور کتاب کی تالیف کے لئے ضرورت کے احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔ موصوف فرماتے ہیں: ''کہ دریں زمانہ ایں مسئلہ مطرح انظارِ مردم، و مسرحِ افکارِ بنی آدم گشت، و بسبب اشراق مذاہب مبتدعہ شکوک و شبہات پدید آمد، تا آنکہ حق مخفی شد، و قائل بمذہب سلف در مقام مناظرہ درماندہ''۔

''مطرح انظار اور مسرح افکار'' کے الفاظ بتاتے ہیں کہ شیخین کی فضیلت کا مسئلہ لوگوں کی ظاہری و باطنی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور مطالعہ اور غور و فکر کے سلسلے میں اسے اہم قرار دیا جاتا تھا۔ مبتدعانہ افکار و مذاہب کے نتیجے میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے تو اس کا برا اثر یہ ہوا کہ ''حق مخفی ہو گیا'' اس سے صورت حال کی خرابی کا اندازہ ہوتا ہے کیونکہ شاہ صاحب جیسا مومنِ بابصیرت ''حق کے مخفی ہو جانے'' کی تعبیر استعمال کر رہا ہے!

اس مقام پر ایک اور جملہ کئی پہلوؤں سے قابل توجہ ہے: "وقائل بمذہب سلف در مقام مناظرہ درماندہ" یعنی سلف کے مذہب کو ماننے والا مناظرہ کے موقع پر عاجز نظر آتا ہے۔

☆ شاہ صاحب کی نظر میں سلف کے مذہب کی اہمیت ہے، اور یہ حق وصداقت کا عنوان ہے۔

☆ سلف کے مذہب کو ماننے اور اس پر عمل کرنے والے اس وقت موجود تھے۔

☆ پروانِ مذہب سلف گمنام اور نا قابل توجہ نہ تھے، بلکہ معاشرے میں ان کا عقیدہ وعمل ممتاز تھا اور دوسرے لوگ ان سے بحث ومناظرہ کرتے تھے۔

☆ مختلف اسباب کی وجہ سے اہل بدعت کو قوت حاصل تھی، اور ان کے کروفر نیز ظاہری شان وشوکت اور زور بیان کی وجہ سے متبعین مذہب سلف عاجز وخاموش نظر آتے تھے۔

شاہ صاحب نے "لاجرم مشیا علی الرأس وجریا علی الوجہ درین بادیہ پرہول شتافت" کے جملہ سے خواجہ محمد امین کے سوال کی اہمیت، اس کے جواب کی ضرورت اور موضوع کی نزاکت وپیچیدگی کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے، سوال اتنا برمحل اور سائل اتنا عزیز ہے کہ جواب کے لئے سر کے بل بھی چلا جا سکتا ہے۔

مقام صحابہ کی عظمت مسلم اور قرآن وسنت سے یہ مسئلہ مبرہن ہے۔ چونکہ باطل پرستوں نے اپنے مقاصد کی تحصیل اور مزعومات کی تائید کے لئے ہم عصر صحابہ کے بعض واقعات واعمال کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے جس سے یہ موضوع حساس ہو گیا ہے۔ شاہ صاحب نے اسی وجہ سے اسے "بادیۂ پرہول" کہا ہے۔ مگر انہوں نے اپنے علم کی وسعت، دینی بصیرت اور حکیمانہ اسلوب سے اسے سہل اور تشفی بخش بنا دیا ہے۔ ان کی حکیمانہ نظر اُن مقامات کو پہچان گئی ہے جہاں سے شبہات پیدا ہوتے ہیں، پھر ان کے ازالہ کے لئے اپنے تجربہ اور دقتِ نظر سے کام لیا ہے۔

کتاب کے مباحث تین سو سے زائد صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اور موضوع کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا ہے۔ نقلی وعقلی دلائل سے ہر جزئیہ کو منقح کیا گیا ہے، اس لئے مصنف علام نے اپنی اس توقع کا اظہار کیا ہے کہ "مغز سخن" کا احاطہ کئے بغیر رد وانکار کا ارادہ نہ کریں اور مصنف کے مقصد کو جانے بغیر "تحسین وتہجین" کی جلدی نہ کریں۔

شیخین کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے شاہ صاحب نے عقلی ونقلی دونوں طرح کے ثبوت

پیش کیے ہیں۔ خطبہ وتمہید کے بعد ہی ان کی اس تصریح پر غور کیجیے: ''باید دانست کہ تفضیل شیخین بر سائر صحابہ ثابت است بنقل و عقل''، یعنی معلوم ہونا چاہیے کہ شیخین کی فضیلت دیگر صحابہ پر نقل وعقل دونوں سے ثابت ہے۔

نقلی دلائل سے متعلق شاہ صاحب کا فرمانا ہے کہ انہیں واضح کرنے کے بہت سے طریقے اور راستے ہیں۔ میں صرف تین طریقوں پر اکتفاء کر رہا ہوں۔

## مسلکِ اول:

اس مسلک میں اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کا ذکر ہے جو اس نے ایمان اور عمل صالح سے متصف اپنے بندوں سے کیا ہے، اور جس میں ارشاد ہے کہ انہیں خلافتِ ارضی سے نوازا جائے گا، ان کے دین کو تمکن ملے گا، وہ خود اور ان کے ذریعہ دوسرے بھی امن سے بہرہ اندوز ہوں گے۔

نبی ﷺ نے اس اجمال کی تفصیل اپنے مبارک خوابوں سے اور صحابہ کے دیکھے ہوئے خوابوں کی تصویب وتعبیر سے فرمائی۔

پھر آپ ﷺ نے شیخین کو نص واشارے سے خلیفہ بنایا اور اس معنی کو ''معنوی تواتر'' کا درجہ حاصل ہو گیا، پس ان کی خلافت قطعاً حق ہے، اور یہ اپنے علاوہ دوسروں سے افضل ٹھہرے۔

مذکورہ بیان کے بعد شاہ صاحب نے وعدۂ استخلاف پر مشتمل سورۂ نور کی آیت (۵۵) پیش کی، پھر رسول اکرم ﷺ کے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے خوابوں کا ذکر کیا جن سے آیت میں مذکورہ وعدے کی تفصیل معلوم ہوئی۔

تنہا ابوبکر یا شیخین کو نصاً یا اشارۃً خلیفہ بنانے کا ذکر متعدد حدیثوں میں وارد ہے، شاہ صاحب نے انہیں بھی بحیثیت مجموعی معنوی تواتر کا درجہ دیا ہے۔ نص واشارے سے جب یہ بات ثابت ہو جائے کہ نبی علیہ السلام نے شیخین کو مقرر فرمایا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس استخلاف سے شیخین کی افضلیت کیوں کر ثابت ہو سکتی ہے؟

شاہ صاحب نے استخلاف وافضلیت کے مابین تلازم ثابت کرنے کے لئے دس وجوہ پیش کی ہیں جن کا بیان دو صفحات میں مکمل ہوا ہے۔ آخری یعنی دسویں وجہ میں فرماتے ہیں کہ: شیخین کا استخلاف قطعی طور پر محقق ہے، جب کہ دوسرے لوگوں کا استخلاف ایسا نہیں، اور خلافت میں صفات

کمال کی شرط ہے جیسا کہ اس کے مقام پر بیان ہوا۔ لہٰذا جس کی خلافت قطعی طور پر ثابت ہے، اس کا کمال بھی قطعی الثبوت ہوا، اور ایسا شخص اس کے مقابلہ میں افضل ٹھہرے گا جس کی افضلیت قیاس یا خبر واحد سے ثابت ہو، جیسا کہ فرض وواجب کے مابین تفریق کی گئی ہے۔

## مسلک دوم:

اس مسلک کے ضمن میں شاہ صاحب نے باشارۂ آنحضرت ﷺ شیخین کی مجموعی طور پر یا کسی ایک کی افضلیت کا اس کے لوازم کو ثابت کر کے ذکر کیا ہے: مثلاً: اہل جنت کی احبیت وسیادت، آخرت میں ثواب کی زیادتی اور مرتبہ کی بلندی، فضل کلی کے جزو کی حیثیت رکھنے والی صفات کا اثبات، مثلاً: جان ومال سے نبی ﷺ کی خدمت کی حد درجہ کوشش، ان سے شیطان کا بھاگنا، ان کے ذریعہ دین کی مدد وغیرہ، اور یہ تمام باتیں اجتماعی طور پر حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔

شاہ صاحب نے یہاں شیخین میں سے ایک کی فضیلت سے دوسرے کی فضیلت کے لزوم پر مبنی ایک نکتہ ذکر کیا ہے، پھر لکھا ہے کہ شیخین کے فضائل کی توضیح میں جملہ طرق کا استیعاب ممکن نہیں، لہٰذا قوت حافظہ کے مطابق ذکر کروں گا، اور ہر فضل کو ایک مستقل نوع کے ضمن میں واضح کروں گا۔

پھر شاہ صاحب نے سولہ صفحات میں ستر انواع کا ذکر کیا ہے، اور ایسی حدیثیں پیش کی ہیں جن میں شیخین کی یا ان میں سے کسی ایک کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

ان انواع کے اختتام پر موصوف لکھتے ہیں: "اینست آنچہ از تلویح آنحضرت ﷺ بافضلیت شیخین دریں مسلک میسر شد، وبجز ایں فضائل شیخین را فضائل بسیار است" یہ ہے وہ بیان جو اس مسلک میں شیخین کی افضلیت سے متعلق آنحضرت ﷺ کی تلویح کے سبب میسر ہوا، اس کے علاوہ شیخین کے فضائل بہت ہیں۔

اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر رقمطراز ہیں کہ: جو کچھ مطلق صحابہ کی فضیلت میں، یا خاص طور پر مہاجرین کی فضیلت میں، بدر، احد، بیعت رضوان وغیرہ معرکوں میں شریک صحابہ کی فضیلت میں وارد ہے اس میں شیخین بدرجۂ اولی داخل ہیں۔ جس شخص کو علم حدیث کا درک اور انصاف کی نعمت ملی ہے، وہ جانتا ہے کہ جس قدر فضائل شیخین کو حاصل ہیں ان کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں۔

شاہ صاحب نے اس کی دو وجہ ذکر کی ہیں، اول یہ کہ دوسروں کے فضائل زیادہ بھی ہوں تو شیخین کے فضائل کی طرح انہیں شہرت واستفاضہ کا درجہ حاصل نہیں۔ دوم یہ کہ فضل کلی یعنی نیابت نبوت کے باب میں شیخین کے فضائل کی طرح ان کی تخصیص وتصریح نہیں ہے۔ یہاں شاہ صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ رسالہ کے کسی اور مقام پر اس بات کو اور زیادہ واضح کریں گے۔

**مسلک سوم:**

اس مسلک کے تحت شاہ صاحب نے حضرت ابوبکر کو افضل امت اور اس کے بعد حضرت عمر کا درجہ ثابت کرنے کے لئے صحابہ وتابعین کے اجماع کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس معنی کو ہم دو طرح بیان کریں گے۔

پہلے صراحۃ اور دلالۃ بطور اجمال اجماع کو نقل کیا ہے۔

اس کے بعد تفصیلی طور پر فقہائے صحابہ وتابعین کے اقوال نقل کئے ہیں۔

بطریق تصریح اجماع کے اجمالی بیان میں بعض حدیثیں ذکر کی ہیں، ان میں ایک حدیث یہ ہے: عن عبداللہ بن عمر قال: كنا نخير بين الناس في زمان رسول الله ﷺ فنخير أبابكر، ثم عمر، ثم عثمان بن عفان، أخرجه البخاري" یعنی رسول ﷺ کے زمانہ میں ہم لوگوں کے درمیان انتخاب کرتے تھے تو پہلا درجہ ابوبکر کو، دوسرا عمر کو اور تیسرا عثمان بن عفان کو دیتے تھے، ذکر کیا اسے بخاری نے۔

بطور دلالت اجماع کا بیان پانچ انواع کے ضمن میں کیا ہے۔ نوع پنجم میں لکھا ہے کہ: "مرتضی درایام خلافتِ خود در مجالسِ متعددہ افضلیت شیخین را بترتیب بیان نمود الخ" یعنی حضرت علی نے اپنی خلافت کے دور میں متعدد مجلسوں میں شیخین کی افضلیت کو بترتیب (یعنی پہلے ابوبکر پھر عمر) بیان فرمایا۔ آگے ذکر ہے کہ: جو لوگ اس مسئلہ میں فاسد گمان رکھتے تھے، ان کو توبیخ کی، ان مجالس میں فقہائے صحابہ موجود تھے، لیکن کسی کی طرف سے کوئی ممانعت یا اعتراض سامنے نہ آیا، اس طرح کے آثار حد تواتر کو پہنچے ہوئے ہیں، جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ: فقہائے صحابہ وتابعین کے اقوال کا تفصیلی بیان بصورت استیعاب مشکل ہے، لہذا بطور نمونہ کچھ اقوال ذکر کرتے ہیں۔

اس کے بعد بترتیب حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، اہل بیت، حضرت ابن مسعود، حضرت حذیفہ وغیرہم رضی اللہ عنہم کے اقوال ذکر کیے ہیں جن سے شیخین کی افضلیت ثابت ہوتی ہے۔ ان اقوال میں کچھ اشعار بھی ہیں جن سے افضلیت کی تائید ہوتی ہے۔

ان اقوال کے اختتام پر محمد بن سیرین کا یہ قول مذکور ہے: "ما أظن رجلا ينتقص ابابكر وعمر يحب النبی ﷺ، أخرجه الترمذی" یعنی میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص ابوبکر وعمر کی تنقیص کرتا ہے، اسے نبی ﷺ سے محبت ہے۔ (ترمذی)

ابوداؤد کے حوالہ سے سفیان کا یہ قول نقل کیا ہے: من زعم أن عليا كان أحق بالولاية منهما فقد خطأ أبابكر وعمر والمهاجرين والأنصار رضی الله عن جميعهم، وما أراه يرتفع نداله عمل السماء(؟) یعنی جس نے یہ گمان کیا کہ حضرت علیؓ شیخین کے مقابلہ میں ولایت کے زیادہ حقدار تھے، اس نے ابوبکر، عمر، مہاجرین اور انصار رضی اللہ عنہم کو خطا کار ٹھہرادیا، میرا خیال ہے کہ اس کا کوئی عمل آسمان تک نہ پہنچے گا۔

واضح ہو کہ مسلک سوم کا بیان کتاب کے ص ۲۶ سے شروع ہو کر ص ۳۶ پر ختم ہوا ہے۔

## بعض فوائد اور سوال وجواب:

مقدمۂ سابعہ کے بعد ص ۱۵۶ سے ص ۱۷۷ تک شاہ صاحب نے متعدد فوائد اور سوال وجواب ذکر کیے ہیں، ان سب سے موضوع کی وضاحت ہوتی ہے، اور افضلیت شیخین سے متعلق دلائل کو تقویت ملتی ہے۔

ایک سوال منامات وبشارات کے موجب فضیلت ہونے، اور خوابوں کے لحاظ سے انبیاء کے ساتھ تشبہ سے متعلق ہے۔ اس کے بعد مصنف نے جزء علمی میں تشبہ کے اعتبار سے شیخین کی افضلیت ثابت کی ہے۔ مصحف فاطمہ، وحدت وجود، اور رز بروبینات سے متعلق فوائد میں موصوف نے مختصر بحث کی ہے، پھر ایک سوال عراق وشام وغیرہ کی فتح سے، دوسرا حروب مرتضی سے، اور تیسرا ان کی دعوت وتبلیغ کی نوعیت سے متعلق ہے۔

دعوت الی اللہ، اشاعت علوم دینیہ اور صفات قلبیہ کے لحاظ سے شیخین کی افضلیت کا بیان شاہ صاحب نے اسی مبحث میں کیا ہے۔

ایک سوال مداخلات ومنازعات اور توکل وزہد کے مابین تضاد سے ہے، جواب میں شاہ صاحب نے دونوں کے مابین تضاد تو نہیں ثابت کیا ہے، البتہ مقام نبوت کی روشنی میں اعلیٰ و برتر درجہ کی توضیح کی ہے، پھر ذکر لسانی وذکر قلبی کی بات بھی اسی جگہ بطور تمثیل ذکر کی ہے۔

## افضلیت شیخین کی عقلی دلیل کا بیان:

دلیل عقل کی توضیح کے لئے شاہ صاحب نے کل سات مقدمات ذکر کئے ہیں، اور ہر مقدمہ کے ضمن میں متعدد مباحث ونکات ہیں جن سے شیخین کی افضلیت کا موضوع واضح ہوتا ہے۔

یہ بحث سابقہ مباحث کے مقابلہ میں طویل ہے، یعنی ص: ۳۶ سے شروع ہو کر ص ۱۵۶ پر ختم ہوا ہے، بنظر اختصار ہم ذیل میں صرف ہر مقدمہ کا عنوان مع ترجمہ نقل کر رہے ہیں تا کہ ان کے مشتملات کا اندازہ ہو سکے:

مقدمۂ اولی: بیان حقیقت فضل مطلقا، یعنی مطلق طور پر فضل کی حقیقت کا بیان۔

مقدمہ ثانیہ: بیان حقیقت فضل کلی، یعنی فضل کلی کی حقیقت کا بیان۔

مقدمۂ ثالثہ: بیان اینکہ مراد از فضل کلی اشبہ بودن بہ پیغامبر خود است در صفاتیکہ پیغمبر را از حیثیت پیغامبری ثابت است وتربیت کردن امت بر منہاج تربیت پیغامبر، یعنی فضل کلی سے اپنے پیغمبر کے ساتھ زیادہ مشابہ ہونا مراد ہے ان صفات میں جو پیغمبر کے لئے بحیثیت پیغامبری ثابت ہیں، اور امت کی تربیت کرنا پیغام کی تربیت کے طریقہ پر۔

مقدمۂ رابعہ: تعین صفاتے کہ نبی را از جہت نبوت حاصل شود۔ یعنی ان صفات کا تعین جو نبی کو نبوت کی وجہ سے حاصل ہیں۔

مقدمۂ خامسہ: بیان حالتیکہ بہ سبب آں غیر نبی را بہ نبی تشبیہ کنند، واعانت کلی پیغامبر بہ امور بعث بچہ قسم متصور گردد۔ یعنی اس حالت کا بیان جس کے سبب غیر نبی کو نبی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اور امور بعث میں پیغامبر کی اعانت کلی کس قسم سے متصور ہوگی؟

مقدمۂ سادسہ: تحقق این خصال در شیخین بوجہ کمال۔ یعنی شیخین میں ان خصلتوں کا مکمل طور پر موجود ہونا۔

مقدمۂ سابعہ: بیان رجحان شیخان بر غیر خویش در خصالیکہ مناط فضل کلی اند۔ یعنی شیخین کا پلہ

دوسروں پر ان خصلتوں میں بھاری ہونے کا بیان جو فضلِ کلی کا مدار ہیں۔

## مخالفین کے شبہات کا جواب:

ص ۷۷ پر شاہ صاحب نے وضاحت کی ہے کہ اب تک ہم نے بدلائل نقلیہ وعقلیہ شیخین کی فضیلت کو ثابت کیا، اب ہماری توجہ مخالفین کے شبہات کے دفعیہ کی جانب ہے، اور مخالفین میں امامیہ وزیدیہ کی جانب ہمارا روئے سخن نہیں، کیونکہ ان کے ساتھ مناظرہ کا طریقہ الگ ہے، اس میں صحیحین وغیرہ کی احادیث سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

مذکورہ دونوں فرقوں سے صرف نظر کرنے کے بعد اس مسئلہ سے متعلق موافق ومخالف لوگوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک گروہ کی توجہ نصیر طوسی کے علم کلام پر ہے، ان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ فضلِ کلی کی تنقیح نہ کر سکے۔ دوسرا گروہ علم حدیث کو تحقیق واجتہاد کے بغیر وراقیت کے طریقہ پر پڑھتا ہے، ملت مصطفویہ میں ان کی حیثیت سوفسطائیوں کی ہے، ان کو نہ اجتہاد آتا ہے نہ تقلید۔ تیسرا گروہ علوم صوفیہ کو ماخذ مانتا ہے، اور صوفیوں کے سلسلہ کو حضرت علی تک پہنچاتا ہے، یہ لوگ کتاب مین ابن عربی کے مکاشفات کو دیکھ کر دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔ شاہ صاحب اعتراف کرتے ہیں کہ اس مختصر کتاب میں ان تینوں گروہوں کے ساتھ پورے طور پر مباحثہ نہیں ہو سکتا، پھر بھی ان کے شبہات کی اصل اور جواب کے اصل طریقوں کی طرف اشارہ ممکن ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے تین فصلیں قائم کی ہیں، اور ہر فصل میں ایک گروہ کے شبہات اور ان کے جواب سے بحث کی ہے۔

پہلی فصل میں تمام صحابہ کے مقابل حضرت علی کی افضلیت سے متعلق صاحب تجرید کے دلائل ذکر کیے ہیں۔ پھر ان کا جواب دیا ہے۔ اسی فصل کے ضمن میں ایک سوال وجواب استخلاف وافضلیت کے مابین تلازم سے متعلق ہے۔ ایک سوال وجواب پیغمبر ﷺ کی نصرت، جہاد، اعلاء کلمۃ اللہ، اعانت مسلمین سے متعلق ہے کہ یہ اوصاف فضلِ کلی کی بناء ہیں یا نہیں۔ ایک سوال حضرت ابوبکر کو امامت صلاۃ کے لئے منتخب کرنے سے متعلق ہے، ممکن ہے اس مجمع میں حضرت علی موجود نہ رہے ہوں، نیز یہ کہ اس سے فضلِ کلی ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں شاہ صاحب نے فقہائے صحابہ کا استدلال ذکر کیا ہے، اور سوال کے ہر پہلو کا جواب واضح کیا ہے۔

دوسری فصل اس گروہ کے شبہات اور ان کے جوابات سے متعلق ہے، جو بطریق وراثت حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ فصل ص ۲۲۶ سے شروع ہو کر ص ۲۹۶ پر ختم ہوئی ہے۔ اس میں متعدد فوائد اور سوال و جواب ہیں۔

فصل کے آغاز میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ: اس گروہ کے شبہات دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو ان میں ان احادیث و آثار سے استدلال کیا گیا ہے جو شیخین کو افضلیت کے درجہ سے کمتر دکھاتی ہیں۔ یا ان احادیث و آثار سے استدلال کیا گیا ہے جن سے شیخین کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کے افضل ہونے کا وہم پیدا ہوتا ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے فدک سے، چوری میں بایاں ہاتھ کاٹنے سے، دادی کی میراث کی بابت عدم واقفیت سے، امیر نہ بنانے سے، شیخین پر عمرو بن العاص اور اسامہ کو امیر مقرر کرنے سے، خلافت پر نص نہ ہونے سے متعلق اعتراضات نقل کر کے ان کا جواب دیا ہے۔

مذکورہ اشکالات کے جواب کے لئے موصوف نے سات مقدمات ذکر کئے ہیں، اور ان کے ذریعہ جملہ اشکالات کو دور کیا ہے۔ اسی مبحث میں کچھ اور اشکالات و جوابات مذکور ہیں۔ پھر ص ۲۶۱ سے ص ۲۷۰ تک متعدد حدیثیں ذکر کر کے ان سے متعلق شبہات کو دور کیا ہے۔ ان میں تمتع اور قران سے عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے روکنے کی حدیث ہے، شاہ صاحب نے اس کی صحیح توجیہ پیش کر کے شبہ کو دور کیا ہے، اسی طرح حضرت عمر کے متعہ سے روکنے کا واقعہ اور اس کی اصل توجیہ ہے۔ ایک اعتراض مناقب عمر سے متعلق حدیث: "ماسلک عمر فجا الاسلک الشیطان فجا غیرہ" سے، مجنونہ کو رجم کرنے کا حکم دینے سے، سودرہ کی جگہ شاخ سے مارنے سے اور نبی ﷺ کی وفات میں عمر کے شک سے متعلق ہے، شاہ صاحب نے ان شبہات کو ذکر کر کے ان کا منشا بتایا ہے، پھر ان کا جواب دیا ہے۔

شیخین سے متعلق اعتراضات کا جواب دینے کے بعد شاہ صاحب نے ختنین (عثمان و علی رضی اللہ عنہما) سے متعلق اعتراضات کے جواب بھی دیئے ہیں، اور اس طرح ص: ۲۹۸ پر یہ فصل ختم ہوتی ہے، اس فصل میں علم حدیث سے متعلق بھی بہت سی اہم باتیں آگئی ہیں۔

تیسری فصل ص ۲۹۸ سے شروع ہو کر ص ۳۳۱ پر ختم ہوئی ہے، اس کا موضوع ہے: معاصر

صوفیاء کے شبہات اور ان کے جوابات۔ اس میں ایک سوال سلاسل کے حضرت علی تک پہنچنے سے متعلق ہے۔ ایک تنبیہ صوفیاء کے رسوم سے متعلق ہے۔ ایک سوال میں حضرت علی کے لئے فضل کلی کے ثبوت کی بات ہے، ساتھ میں اس کا جواب مذکور ہے۔ آنحضرت سے بچی ہوئی مٹی سے حضرت علی کی تخلیق سے متعلق ابن عربی کی تصریح اور اس کا جواب ہے۔ ایک سوال میں صوفیاء کے ایسے عظیم واقعات خواب میں دیکھنے کا ذکر ہے جن سے حضرت علی کی فضیلت کا ثبوت ملتا ہے، شاہ صاحب نے اس شبہ کا بھی جواب دیا ہے۔ اسی طرح شیخین وعلی رضی اللہ عنہم کے جو حالات شاہ صاحب کو منکشف ہوئے ہیں، انہیں بتانے کے لئے ایک دقیق مقدمہ ذکر کیا ہے، آخری مبحث کو شاہ صاحب نے ''مقصد اصلی'' کے نام سے یاد کیا ہے اور ایک صفحہ سے زیادہ میں اس کی تشریح کی ہے، اس طرح کتاب ''قرۃ العینین'' تمام ہوئی ہے۔

## صحابہ کرامؓ کی فضیلت:

عام طور پر یہ مسئلہ لوگ سمجھ نہیں پاتے، ان کے ذہن میں شاید یہ بات آتی ہے کہ عصمت صرف انبیاء علیہم السلام کے لئے ہے۔ اس لئے امت کے ہر طبقہ کو ہر نقص سے آلودہ کیا جاسکتا ہے۔ صحابہ کے خلاف مختلف اوقات میں زبانِ طعن دراز کرنے کی وجہ یہی ہے کہ معترض ان کے مقام اور دینی ذمہ داری کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ شاہ صاحب کی دوررس نگاہ سے یہ مسئلہ مخفی نہ تھا۔ انہوں نے ص: ۴۵ پر فائدہ کے زیر عنوان حدیث شریف ''خیر القرون قرنی الخ'' ذکر کی، پھر فرمایا: ''وسرّ در تفضیل صحابہ بر ہر کہ بعد از ایشاں آمد آنست کہ ایشاں واسطہ اند میان پیغامبر واین جماعتِ متاخرہ، از جہتِ غلبۂ اسلام بواسطۂ ایشان، ورسیدن علم بسبب ایشان الخ''۔

یعنی صحابہ کے بعد میں آنے والوں پر فضیلت کا راز یہ ہے کہ یہ لوگ پیغمبر ﷺ اور بعد کی جماعت کے درمیان واسطہ ہیں، انہی کے ذریعہ اسلام کو غلبہ حاصل ہوا ہے، اور انہی کے ذریعہ علم پہنچا ہے۔

آگے مثال پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر سمجھ سکو تو سمجھو کہ: ملت کا معاملہ دیوار سے پوری مشابہت رکھتا ہے، جس میں اوپر کی ہر اینٹ نیچے کی اینٹ کی فرع اور محتاج ہے۔ اسی سے اوپر کی اینٹ کو مضبوطی حاصل ہے۔ یہ وصف بنیاد تک ہر اینٹ پر صادق ہے۔ اسی طرح بعد کی

ہر صدی شرائع اسلام اور علوم وہدایت میں سابقہ صدی سے مستمد اور اس کی منت پذیر ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ صاحب شریعت تک پہنچتا ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے شریعت کو بغیر واسطہ لیا ہے۔

دونوں ادوار کے فرق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ: آج اگر کوئی کافر مسلمان ہونا چاہے تو اسے اہل کفر اور رسم کفر سے نکل کر اہلِ اسلام میں آنے اور اسلامی اخلاق اختیار کرنے میں سخت کوشش کرنی ہوگی۔

## افضلیت صدیق:

شیخین کی افضلیت کو شاہ صاحب نے دلیل عقلی سے ثابت کرنے کے سلسلہ میں کل سات مقدمات متعین کیے ہیں۔ اجمالی تعارف میں ہم اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ ان مقدمات میں ساتواں مقدمہ (ص: ۱۴۹ و مابعد) اس بات پر مشتمل ہے کہ جو خصال فضلِ کلی کا مدار ہیں ان میں شیخین اپنے علاوہ دوسروں پر فائق ہیں۔ اس مقدمہ میں شاہ صاحب نے سات نکات پیش کیے ہیں، ان میں چھٹا نکتہ حضرت ابوبکر کی افضلیت کو ثابت کرتا ہے، شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ترجمہ: اسی طرح عقل جائز قرار دیتی ہے کہ ایک شخص کو پیغمبر کی صحبت حاصل نہ ہو، وہ اس سے آشنا نہ ہو، پھر تقدیر الٰہی جاری ہو کہ اس شخص کو پیغمبر سے مقصود کاموں میں سے بعض کو پورا کرنے والا بنایا جائے، پھر اللہ تعالیٰ پیغمبر کو اس راز سے مطلع فرمائے، پھر پیغمبر اسے اپنا خلیفہ بنالے، اور وہ امت کا بہترین شخص ہو جائے، اور دوسرے اس کی رعیت ہوں، یہ ایک مستقل فضیلت ہے۔

اسی طرح عقل جائز قرار دیتی ہے کہ ایک شخص نے پیغمبر کی بعثت کی آغاز ہی سے قوم کی تالیف و اتفاق، دین کی اشاعت میں سعی جمیل، دشمنوں کے مقابلہ اور ملت کے قواعد کے استقرار کے سلسلہ میں اس کی مدد کی ہو اور اللہ کی رحمت جو پیغمبری کی جانب رہتی ہے، مذکورہ خصال کے لحاظ سے اس شخص میں اپنا اثر دکھاتی ہے، پھر اس کی موجودگی ہی میں پیغمبر کی وفات ہوتی ہے، اور یہ شخص افضلِ امت ٹھہرتا ہے، اور دوسرے اس کے تابع ہو جاتے ہیں، یہ ایک علاحدہ فضیلت ہے۔ اللہ کا احسان ہے، کہ اس نے شیخین کے حق میں دونوں قسم کی فضیلتوں کو جمع کر دیا ہے۔ اگر

دوسری قسم کی فضیلت میں شیخین کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی کسی کی نظر میں شریک ہوں تو یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ اسے فضل کلی حاصل ہوگا، کیونکہ شیخین دونوں قسم کی فضیلتوں کے جامع ہیں۔

(قرۃ العینین ص:۱۵۴)

## علم شریعت کی اشاعت:

علم دین کی اشاعت میں شیخین کے کردار کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"اما نشر شیخین علم شریعت را، وواسطہ بودن درمیان آنحضرت ﷺ وامت اور علوم پس تفصیلے دارد، یک ساعت خاطر را متوجہ آن باید ساخت الخ"۔ یعنی شریعت کے علم کی اشاعت کرنا اور علوم کے سلسلے میں نبی ﷺ اور آپ کی امت کے درمیان شیخین کا واسطہ بننا قدرے تفصیل طلب ہے، اس پر کچھ توجہ کی ضرورت ہے۔ نبی ﷺ نے امت کو جو سب سے بڑی میراث ملی ہے وہ قرآن کریم ہے، اس کے حاملین اور کاتبین ہیں جنہوں نے رسم قرآنی کے مطابق اسے لکھا ہے۔ علوم قراءت رسم کا جو حصہ بھی آج لوگوں کے پاس باقی ہے، اس کا مصدر و منشاء شیخین ہی ہیں۔

شاہ صاحب نے اس تمہید کے بعد تقریباً پانچ صفحات میں وہ حدیثیں پیش کی ہیں جن میں قرآن اور تفسیر و قرأت وغیرہ علوم میں شیخین کی خدمت کا ذکر ہے۔

قرآن ہی کی طرح حدیث کی خدمت میں بھی شیخین کا کردار نمایاں ہے، ذیل کا اقتباس اور اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

"وآنچہ امروز از علم حدیث بدست مردمانی است، ساختہ و پرداختہ شیخین است، بآن سبب کہ جملہ صالحہ از حدیث شیخین خود روایت کردہ اند، نہ پنداری کہ شیخین ہمیں قدر روایت کردہ اند کہ در کتب مسانید بایشان نسبت کردہ می شود، بلکہ بسیاری از احادیث مرفوعہ کہ در مسانید بکثیرین از صحابہ مذکور است، بحقیقت روایت شیخین است کہ عبداللہ بن عمر، وعبداللہ بن عباس، وابوہریرہ آنرا ارسال نمودہ اند، و بآنحضرت ﷺ رفع کردہ، واہل مسانید ظاہر آنرا اعتبار کردہ در مسانید ایشان درج نمودہ اند، چناں کہ برشخصے کہ متتبع جزئیات وکلیات علم حدیث باشد، مخفی نخواہد بود۔ وبریں قدر اکتفاء نہ نمودہ اند، وصحابہ را در آفاق فرستادہ اند، وایشان را طریق روایت آموختہ اند، وبرروایت

حدیث تحریف نمودہ اند، وقوم را بر اخذ از ایشان حمل کردہ اند الخ"۔

یعنی علم حدیث کا جو حصہ بھی آج لوگوں کے ہاتھ میں ہے، وہ شیخین ہی کا ساختہ و پرداختہ ہے، کیونکہ خود انہوں نے حدیث کی اچھی خاصی مقدار روایت کی ہے، یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ شیخین نے صرف اسی قدر حدیثیں روایت کی ہیں جو کتب مسانید میں ان کی طرف منسوب ہیں، بلکہ بہت سی مرفوع حدیثیں جو بہت سے دوسرے صحابہ کی مسانید میں مذکور ہیں، حقیقت میں شیخین کی روایت کردہ ہیں۔ کیونکہ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہم) نے انہیں مرسل روایت کیا ہے، اور نبی ﷺ کی طرف مرفوع کیا ہے، اور مسانید کے مصنفین نے ظاہر کا لحاظ کرتے ہوئے انہیں ان اصحاب کی مسانید میں درج کر دیا ہے، جو شخص علم حدیث کی جزئیات وکلیات کا تتبع کرتا ہے، اس سے یہ بات مخفی نہیں۔ شیخین نے صرف اسی پر اکتفاء نہ کیا، بلکہ صحابہ کو مختلف علاقوں میں بھیجا، انہیں روایت کا طریقہ سکھایا، حدیث کی روایت کے لئے ترغیب دی، اور لوگوں کو ان سے حدیث سیکھنے اور روایت کرنے پر آمادہ کیا الخ۔

شاہ صاحب آگے فرماتے ہیں کہ: شیخین نے حدیث کی یہ خدمت بھی انجام دی کہ راویوں پر نظر رکھی، ان کی مرویات کو پرکھا، سنت کے ذریعہ قرآن کی تخصیص، متشابہات کا حل اور اس طرح کے دوسرے امور کی تعلیم دی۔

شیخین کا یہ احسان بھی ہے کہ: انہوں نے صرف قرآن پر اعتماد کرتے ہوئے سنت سے اعراض اور شرعی مسائل میں محض عقل پر اعتماد سے سختی سے منع کیا ہے۔ (قرۃ العینین ص: ۵۵)۔

## وحدتِ وجود اور حضرت علی:

جزء علمی میں افضلیت شیخین کی بحث شاہ صاحب نے ص ۱۵۷ سے شروع کی ہے، آگے ص: ۱۶۱ پر وحدتِ وجود کی ذیلی سرخی قائم کی ہے، اس مبحث کی اہمیت کے پیش نظر ہم عبارت مع ترجمہ پیش کر رہے ہیں:

"واما معارف دقیقۂ علم وحدتِ وجود پس باطل است، باتفاق جملۂ علم از جناب مرتضی، زیرا کہ جملۂ علم از جناب او یا اہل سنت اند یا امامیہ یا زیدیہ، وباستقراء تام معلوم می شود کہ غیر این ہر سہ فریق جمع ہمت بر حملِ علم از آنجناب نکردہ اند الخ"۔

یعنی جہاں تک علم وحدت وجود کے دقیق معارف کا تعلق ہے تو وہ باطل ہیں، اور اس پر حضرتِ مرتضیٰ سے علم حاصل کرنے والوں کا اتفاق ہے، کیونکہ آپ کے علم کے حاملین اہلِ سنت ہیں یا امامیہ یا زیدیہ۔ اور استقراءِ تام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تین فرقوں کے علاوہ کسی نے آنجناب کے علم کو سیکھنے سکھانے کا قصد نہ کیا۔

جہاں تک اہل سنت کا تعلق ہے تو علمِ وحدت وجود کا صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں مطلق ذکر نہیں تھا، علمائے نقل و روایت اسے قطعاً نہ جانتے تھے۔ متاخرین میں جو اس کے قائل ہوئے ان کی دلیل کشف ہے نہ کہ نقل۔ اگر اعتبار کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اسے ہمارے مبحث سے کوئی تعلق نہیں۔

جہاں تک زیدیہ کا تعلق ہے تو وہ راہِ ولایت کے کلی طور پر منکر ہیں، اور اس راہ کو اپنے ائمہ سے خلفاً عن سلف نقل کرتے ہیں۔ رہے امامیہ تو وہ بھی منکر ہیں، جیسا کہ مخفی نہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علوم اگر حضرت علی سے مروی ہوتے تو لامحالہ ان تین فرقوں میں سے کوئی انہیں نقل کرتا، اور ان کا قائل ہوتا۔ (قرۃ العینین ص:۱۶۱)۔

## فصلِ سوم مشتمل بر شبہاتِ متصوفہ:

## بعض شبہات کی توضیح:

تیسری فصل کا آغاز ہی شاہ صاحب نے متصوفہ کے شبہات کی تشریح سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ: صوفیہ میں سے کچھ لوگ سلسلۂ تصوف کے حضرت علی پر استناد کی وجہ سے ان کی افضلیت کے قائل ہیں۔ یا ان کا یہ گمان ہے کہ تصوف حق تک پہنچنے کا طریقہ ہے، بخلاف شریعت کے کہ وہ اوامر حق تک پہنچاتی ہے۔ لہٰذا حضرت علی حق تک پہنچنے کی راہ کے امام اور اسی لحاظ سے آنحضرت ﷺ اور آپ کی امت کے درمیان واسطہ ہیں۔ جبکہ شیخین شریعت کے امام اور اسی لحاظ سے آنحضرت ﷺ اور آپ کی امت کے درمیان واسطہ ہیں۔ نتیجہ یہ کہ حضرت علیؓ افضل ہیں۔

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ: شریعت میں ظاہر کی اصلاح ہے، یہ رسمِ کہ خدائی و ملک داری کی طرح ہے، لیکن حقیقی فضیلت فنا و بقا اور ذات وصفات کی معرفت ہے، اور اس فضیلت کے مستحق

حضرت علیؓ ہیں۔ شیخین کا کام رسوم اسلام کی امامت کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا!

دونوں فرقوں کے مدعا کی توضیح کے بعد شاہ صاحب کا لہجہ سخت ہو گیا، اور انہوں نے جواب سے پہلے اپنا تاثر ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: "واصل این شبہ افسانہ ہا است کہ از اسماعیلیہ وقرامطہ ودہریہ اخذ نمودہ اند، وکلام بعض صوفیہ را بریں معنی فرود آوردند، وجمعی ہستند کہ از ظاہر کلام شیخ محی الدین ابن عربی واتباع او تفضیل گونہ فہم کردہ اند، ویکی را بدہ گرفتہ چیز ہا بدماغ خود پختہ اند، وجمعی ہستند کہ بہ بعض واقعات خود واسلاف خود تمسک نمودہ فضلِ کلی اثبات نمودہ اند، وبحقیقت گواہی کسے در باب تفضیل مسموع نیست تا منزلۂ ہر دو فہمیدہ باشند" یعنی ان شبہات کی اصل وہ افسانے ہیں، جنہیں انہوں نے اسماعیلیہ، قرامطہ اور دہریہ سے لیا ہے، اور بعض صوفیہ کے کلام کو اسی معنی پر محمول کیا ہے، ایک جماعت شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے متبعین کے ظاہر کلام سے ایک قسم کی تفضیل سمجھی ہے۔ اور ایک کو دس بنا کر اپنے دماغ میں کچھ چیزیں پکائی ہیں۔ ایک اور جماعت نے اپنے اور اپنے اسلاف کے بعض واقعات سے تمسک کیا ہے، اور اس طرح فضل کلی ثابت کیا ہے۔ لیکن حقیقت میں تفضیل کے باب میں کسی کی گواہی قابلِ سماعت نہیں جب تک کہ دونوں کے مقام کو سمجھ نہ لیں۔

اس تاثر کے بعد شاہ صاحب نے سوال وجواب ذکر کیا ہے جس سے سابقہ شبہات کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

فصل سوم کے پہلے سوال کا تعلق "توجہ ہمہ سلاسل بحضرتِ مرتضیٰ" سے ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ: اتصالِ سلاسل بحضرت مرتضیٰ امرے است مشہور برالسنۂ صوفیہ، ونزدیک تفتیش آنرا اصلے ظاہر نمی شود، ومشہورات دو قسم اند، مشہور عند جماہیر اہل نقل، ومشہور نزدیک طائفہ، دون طائفہ واین از قسم اخیر است، نزدیک طائفہ صوفیہ مشہور شدہ فقط، واصل این نقل ضعیف است یا باطل کہ آنرا تلقی کردند متاخران بقبول، وہر مشہورے کہ چنیں باشد آنرا اعتدادے نیست، مثل نماز لیلۃ الرغائب، ولیلۃ النصف من شعبان، ونماز ایام اسبوع الی غیر ذلک، بلکہ متاخرین ہر طایفہ را از فرق ناس مشہوراتِ مسلمہ است درمیان ایشان وبا صلے رجوع نمی کنند کما لا یخفی"۔

یعنی سلاسل کے حضرت علیؓ کے ساتھ اتصال کی بات صوفیہ کی زبان پر مشہور ہے، لیکن تفتیش پر ان کی کوئی اصل ظاہر نہیں ہوتی۔ مشہورات دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک وہ جسے جمہور اہل روایت مشہور مانتے ہیں۔ دوسری وہ جسے صرف کسی ایک جماعت کے نزدیک شہرت حاصل ہے، دوسری جماعت اسے مشہور نہیں تسلیم کرتی۔ اس مسئلہ کو صرف صوفیہ کا گروہ مشہور مانتا ہے، اور اس کی اصل ایک ضعیف یا باطل روایت ہے جسے متاخرین نے قبول کیا ہے۔ اور جو مشہور ایسا ہو اس کا کوئی لحاظ نہیں، جیسے لیلۃ الرغائب اور لیلۃ النصف من شعبان کی نماز یا ہفتہ کے دنوں کی نماز وغیرہ، بلکہ لوگوں کے جو فرقے ہیں ان میں سے ہر گروہ کے متاخرین کی کچھ مشہورات ہیں جنہیں یہ لوگ تسلیم کرتے ہیں، لیکن کسی صحیح اصل سے ان کا تعلق نہیں، جیسا کہ مخفی نہیں۔

حضرت علی تک سلاسلِ تصوف کے پہنچنے کی بحث میں حضرت حسن بصریؒ کے حضرت مرتضیٰ ”سے اتصال کا موضوع مذکور ہوا ہے۔ شاہ صاحب نے اس مبحث میں انتہائی اہم فنی باتیں ذکر کی ہیں، ان سے ان کے تبحر علمی، غیر معمولی بصیرت اور تمسک بالکتاب والسنۃ کا اندازہ ہوتا ہے، بحث کے آغاز میں فرماتے ہیں:

”قائلان بایں سلاسل متفق اند بر آنکہ بنای آن اتصالِ حسن بصری است بحضرت مرتضیٰ، واگر اتصال حسن بصری بہ مرتضیٰ متحقق می بود، او صحبتِ معتد بہا با مرتضیٰ متحقق می بود، وخود چنیں صحبت منتفی است، پس اتصال او منتفی است۔“ یعنی ان سلاسل کے قائل اس بات پر متفق ہیں کہ اس کی بنیاد حسن بصری کے حضرت مرتضیٰ سے اتصال پر ہے، اور اگر مرتضیٰ کے ساتھ حسن بصری کا اتصال واقع ہوتا تو مرتضیٰ کے ساتھ ان کی معتد بہا صحبت بھی ہوتی، چونکہ اس طرح کی صحبت منتفی ہے، اس لئے ان کا ملنا بھی منتفی ہے۔

اس کے بعد اتصال کا مدار چار چیزوں کو بتاتے ہیں، خرقہ، تلقین، بیعت اور صحبت مسترہ خرقہ کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں کہ: ”خرقہ در عصر اول نبود“ یعنی عہد اول میں خرقہ موجود نہ تھا۔ پھر توثیق کرتے ہیں: ”قال الحافظ المحدث المتقن ابن وجیہ، وابن الصلاح وشیخ الاسلام خاتمة المحدثین ابن حجر العلامة العسقلانی: انه باطل: وقال ابن حجر: لم یصح فیه شیء من الأخبار فی خبر صحیح ولا ضعیف ولا طریق

من الطرق عن رسول الله ﷺ، ومانقله بعضهم: "إن النبی ﷺ ألبسها لعلي، وان عليا ألبسها الحسن البصری" لا أصل له". یعنی ابن دحیہ، ابن الصلاح اور ابن حجر کا قول ہے کہ خرقہ باطل ہے، ابن حجر نے یہ بھی کہا کہ اس کے بارے میں کوئی صحیح یا ضعیف حدیث کسی بھی طریق سے رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ اور یہ جو بات نقل کی جاتی ہے کہ خرقۂ نبی ﷺ نے حضرت علی کو، اور انہوں نے حسن بصری کو پہنایا" بے اصل ہے۔

شاہ صاحب نے اتصال کے مدار میں صحبت مستمرہ کو بھی مانا ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ حضرت علی اور حسن بصری میں صحبتِ مستمرہ نقلا وعقلا منتفی ہے، نقلا منتفی ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ جو حدیث عن الحسن عن علی مروی ہے وہ بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد وغیرہم کے نزدیک متصل نہیں۔ حضرت علی سے حسن بصری کی اکثر روایتیں اس واسطہ سے ہیں: عن الحسن عن قیس بن عباد عن علی، ہر چند کہ زمانہ صحبت وروایت کے لئے موافق تھا، لیکن نقل مطالب میں وقوع کا ذکر کیا جاتا ہے نہ کہ امکان کا، اور جو لوگ معاصرت کو لے کر صحبت کو صحیح قرار دیتے ہیں ان کی یہ بات محققین اہل حدیث کے یہاں ثابت نہیں۔ اسی طرح عقلی طور پر بھی صحبت کے انتفاء کی تشریح کی ہے۔

(قرۃ العینین ص: ۳۰۰)

## اعتقادِ کمال اور تصدیقِ مقال:

شاہ صاحب نے حسن بصری کے حضرت علی سے اخذ کے سلسلہ میں سائل کا یہ سوال نقل کیا ہے کہ: اصحاب طرق نے تصریح کی ہے کہ بواسطہ حسن عن علی وجود میں آیا ہے، اور یہ اکابر استاد کی طرف سے شاگرد میں جو اثر ہوتا ہے اس سے واقف ہیں، یہ مستبعد ہے کہ زہد وورع سے متصف ہوتے ہوئے کوئی بات جھوٹ کہیں، یا بغیر تحقیق کسی چیز کی تصریح کریں، لہذا جو شخص ان کے طریقہ کو اختیار کئے ہوئے ہے، اور ان کے کمال کا معتقد ہے، اس پر لازم ہے کہ ان کی بات کی تصدیق کرے۔ (ملخص ترجمہ)

شاہ صاحب اس شبہ کے جواب میں فرماتے ہیں: "شبہ نیست در کمال معرفتِ ایشان باثر باطن، وعبادت وورعِ ایشان، وصدقِ ایشان، لیکن در آنچہ موقوف بر روایت باشد، تصحیح روایت می باید کرد، واخذِ طریقہ از ایشان ومنت پذیر شدن از ایشان، مانع تفتیشِ روایت، وبحث در ضعف

وصحت مرویات ایشان نمی شود نمی بینی کہ شیخ ابو طالب مکی، استادِ صوفیہ است، وہمہ صوفیہ از و مستمد اند، احیاء وغنیۃ وعوارف ہمہ از کلام و بر آمد معہذا مرویات او را در محک عیاری باید آورد بلکہ اکثر مرویات او در مرتبۂ نقد نمی نشیند، فنے کہ وے دران متقدم بود فنے دیگر است، ودر فنِ مرویات با دیگران ہمعنان است، تا شافعی گفتہ است کہ حقِ مالک برمن کبیر است، وحقِ حق اکبر است از حقِ مالک"۔

یعنی ان حضرات کے اثر باطن کو پوری طرح پہنچانتے میں، ان کی عبادت میں اور ورع وصدق میں کوئی شبہ نہیں، لیکن جو مسئلہ روایت پر موقوف ہو اس میں روایت کی تصحیح کرنی چاہئے، ان بزرگوں سے علم ومعرفت اخذ کرنا، اوران کا احسان مند ہونا، روایت کی تفتیش اوران کی مرویات کی صحت وضعف کی چھان بین سے مانع نہیں۔ کیا دیکھتے نہیں کہ شیخ ابو طالب مکی صوفیوں کے استاد ہیں، اور تمام صوفیہ ان کے خوشہ چیں ہیں۔ احیاء علوم، غنیۃ الطالبین اور عوارف المعارف انہی کے کلام سے مستخرج ہیں، پھر بھی ان کی مرویات کو کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت ہے، بلکہ ان کی اکثر مرویات تنقید پر کھری ثابت نہیں ہوتیں، جس فن میں ان کو سبقت حاصل تھی، وہ دوسرا ہے، لیکن فن روایت میں دوسروں کے ساتھ ہیں۔ امام شافعی کا قول ہے کہ: "مجھ پر امام مالک کا حق بڑا ہے، لیکن حق کا حق مالک کے حق سے زیادہ بڑا ہے۔

## حسن بصری کی تصریح:

علم روایت میں اتصال واخذ کا مسئلہ اہمیت رکھتا ہے، اس مسئلہ میں ظن وتخمین مفید نہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں: "گویم کہ تصریح حسن بصری بآنکہ مرا فلاں معنی از صحبتِ حضرت مرتضیٰ حاصل شد منقول نیست تا بروی اعتماد کنیم۔ ونہ این را دلیلے ہست قطعی کہ آن را ناظر تقریر کند، نہ از طرف نافی ونہ از طرف مثبت الخ" (قرۃ العینین ص:۳۰۲)

یعنی میں کہتا ہوں کہ حسن بصری کی طرف سے یہ تصریح کہ مجھے فلاں معنی حضرت مرتضیٰ کی صحبت سے حاصل ہوا ہے، منقول نہیں کہ ہم اس پر اعتماد کریں۔ نہ اس کی کوئی قطعی دلیل ہے کہ ناظر اسے ثابت کرے، نہ نافی کی طرف سے نہ مثبت کی طرف سے الخ۔

## اتصال حسنِ بصری بحضرت مرتضیٰ:

واتصالِ بحضرت علی کرم اللہ وجہہ نیز محل بحث است، زیرا کہ بخاری ومسلم وترمذی وابوداؤد کہ محکِ علومِ نقل اند، اثبات نکردہ اند، بلکہ جزم کردہ اند بعدم آن، پس انتساب صوفیہ بطبقۂ تابعین واصحاب درتہذیب لطائفِ بارزہ، واحوالے کہ از آن خیزد، اسبابے کہ بآن کسب کردہ شود خواہد نہ باعتبار رسومِ تصوف ونہ باعتبارِ علوم اشارات۔ ودر اتصال بر محض معاصرت اکتفا کردن امرے است کہ سلامتِ ذہن ازان اباء میکند، بلکہ لابداست از طولِ صحبت وکثرۃ ملازمت وحمل علوم خصوصاً علمِ تہذیب نفس"۔ (قرۃ العینین، ص:۳۰۲)

یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ حسن بصری کا اتصال بھی محلِ بحث ہے، کیونکہ بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد نے جو علوم روایت کے لئے معیار ہیں، اسے ثابت نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے نہ ہونے کا یقین کیا ہے۔ لہٰذا لطائفِ بارزۃ کی، جو احوال اس سے پیدا ہوں اور جو اسباب اس سے حاصل ہوں ان کی تہذیب میں صوفیہ کا طبقۂ صحابہ وتابعین سے انتساب نہ تصوف کے رسوم کے اعتبار سے نہ ہو سکے گا علوم اشارات کے اعتبار سے۔ اور اتصال میں صرف معاصرت پر اکتفا کرنا ایسا امر ہے کہ ذہن اس سے انکار کرتا ہے۔ بلکہ طویل صحبت، کثرت ملازمت اور علوم خصوصاً علم تہذیب نفس کا حاصل کرنا ضروری ہے۔

## شریعت وطریقت:

ان دونوں اصطلاحی الفاظ سے کبھی کبھی ایسے معانی مراد لئے جاتے ہیں جن سے شرعی احکام بے سود نظر آتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اس مسئلہ کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"شبہ نیست درآنکہ ظاہر حضرت پیغامبر ﷺ احکامِ شریعت بود، وطریقت خفی ومستور، واعتناء کلی آنحضرت ﷺ جہاداً وتعلیماً وترویجاً وترغیباً وترہیباً احکام شریعت بود الخ"۔

یعنی شبہ نہیں کہ آنحضرت ﷺ کا ظاہر شریعت کے احکام تھے، اور طریقت مخفی ومستور۔ آنحضرت ﷺ کی پوری توجہ جہاد، تعلیم، ترویج، ترغیب اور ترہیب کے لحاظ سے شریعت کے احکام

تھے، اور ضمنی طور پر طریقت کی طرف اشارے ہو جاتے تھے، اکثر آیات واحادیث صراحۃً اور تفصیلاً شریعت کو ثابت کرتی ہیں، اور صرف بعض سے اشارۃً اور اجمالاً طریقت کا اثبات ہوتا ہے، لہٰذا جو فضل کہ اظہر واصرح سے متعلق ہو، اور جس پر کلی توجہ ہو وہی کلی فضل ہوگا، اور اس کے علاوہ دوسرا فضل خواہ انفس واعلیٰ ہو، جزئی فضل مانا جائے گا۔ (قرۃ العینین ص: ۲۱۰)

## معتزلہ، امامیہ، زیدیہ اور اسماعیلیہ پر شاہ صاحب کا حکم:

فنا، بقا اور وحدت وجود وغیرہ اصطلاحات پر بحث کے دوران ایک مقام پر شاہ صاحب نے مذکورہ فرقوں کے بارے میں مختصر طور پر اپنی رائے بیان کی ہیں۔ لکھتے ہیں:

"وہمین علامت بعینہا شناختیم کہ معتزلہ وامامیہ وزیدیہ واسماعیلیہ نوابت اند، واز اصل ملت نیستند، بلکہ مارا میرسد کہ سخن فراختر گوئیم کہ این مسایل را فرق غیر ناجیہ مانند معتزلہ وغیر آن نیز نمی شناسند، پس اگر از حضرت مرتضی وذریۃ او این معانی منقول میبودلا اقل امامیہ وزیدیہ می شناختند، وبآن قائل می بودند، ولیس فلیس، بلکہ مارا میرسد کہ ازین نیز فراختر گوئیم کہ این عقیدہ ایست کہ یہود ونصاری ہم بآن قائل نیستند"۔

یعنی بعینہ اسی علامت سے ہم نے پہچانا کہ معتزلہ، امامیہ، زیدیہ اور اسماعیلیہ بعد کی پیداوار ہیں، اور اصل ملت سے نہیں ہیں، بلکہ ہمیں حق پہنچتا ہے کہ مزید کہیں کہ ان مسائل کو غیر ناجی فرقے جیسے معتزلہ وغیرہ بھی نہیں جانتے، لہٰذا اگر حضرت مرتضیٰ اور ان کی ذریت سے یہ معانی منقول ہوتے تو کم از کم امامیہ اور زیدیہ انہیں جانتے، اور اس کے قائل ہوتے، لیکن قائل نہیں ہیں تو وہ معانی ان سے منقول بھی نہیں۔ بلکہ ہمیں حق پہنچتا ہے کہ اس سے بھی وسعت کے ساتھ یہ کہیں کہ یہ عقیدہ ایسا ہے کہ یہود ونصاری بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔ (قرۃ العینین: ص: ۳۱۴)

## ابن عربی کے استدلال کی تردید:

شاہ صاحب نے حضرت علی کی فضیلت سے متعلق ایک سوال ابن عربی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ موصوف نبی ﷺ کی بقیہ مٹی سے پیدا ہیں، اور حدیث مواخاۃ اسی معنی پر محمول ہے۔

شاہ صاحب جواب میں بڑی وضاحت سے فرماتے ہیں: مسئلہ تفضیل شیخین امرے است ماخوذ از شرع، وحاصل بحث آنست کہ از جہۃ شرع فضل کلی شیخین را حاصل است، پس دریں

مباحثہ ادلہ شرع از کتاب وسنت واجماع وقیاس ذکر می باید کرد، نہ مکاشفات صوفیہ، زیرا کہ از مکاشفات صوفیہ ہیچ حکمے شرعی ثابت نمیشود الخ"۔

یعنی شیخین کی تفضیل کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے جو شریعت سے ماخوذ ہے، اور بحث کا حاصل یہ ہے کہ شریعت کی رو سے فضل کلی شیخین کو حاصل ہے، لہذا اس مباحثہ میں ان شرعی ادلہ کو جو کتاب وسنت اور اجماع وقیاس سے ماخوذ ہوں، ذکر کرنا چاہئے، نہ کہ صوفیہ کے مکاشفات کو، کیونکہ صوفیہ کے مکاشفات سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا ہے۔ (قرۃ العینین ص:۳۱۷)

## شیخین کی علی پر فضیلت کا راز:

کتاب کے اختتام پر شاہ صاحب نے ایک مقدمہ اور مقصد ذکر کیا ہے جس میں شیخین کی افضلیت کے مسئلہ کو اور ساتھ ہی حضرت علی کے مقام کو واضح کیا ہے۔ مقصد کے اختتام پر عربی زبان میں ایک سوال نقل کیا ہے جس کا مضمون یہ ہے: میں نے رسول اللہ ﷺ سے علی پر شیخین کی فضیلت سے متعلق ایک روحانی سوال کیا، اور کہا کہ حضرت علی نسب کے لحاظ سے اشرف، فیصلہ میں سب سے ماہر اور دل کے سب سے زیادہ بہادر ہیں، اور تمام صوفیہ ان ہی کی طرف منسوب ہیں، پھر ان پر شیخین کی فضیلت کا راز کیا ہے؟

جواب میں فرماتے ہیں کہ: رسول اکرم ﷺ کی طرف سے میرے دل پر یہ فیضان ہوا کہ: آنحضرت ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں، ایک ظاہری، اور دوسری باطنی۔ ظاہری حیثیت کا تعلق لوگوں میں عدل قائم کرنے، ان سے الفت کرنے اور ظاہری شریعت کی طرف ان کی رہنمائی کرنے سے ہے، اور شیخین اس معاملہ میں حضور کے لئے جوارح کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور باطنی حیثیت کا تعلق مرتبہ فنا و بقا سے ہے، اور آپ سے مروی تمام علوم ظاہری وجہ سے نکلے ہیں۔

(قرۃ العینین ص:۳۳۱)

## حکم شریعت اور امتیوں کے خواب:

شاہ صاحب نے اس فصل میں لوگوں کے خواب کے ذریعہ حضرت مرتضی کی فضیلت سے متعلق ایک سوال نقل کیا ہے جس میں وہ حدیث بھی مذکور ہے کہ: مومن کا خواب نبوت کے ۴۶

اجزاء میں سے ایک جزء ہے، لہذا حضرت علی افضل ہوں گے۔

شاہ صاحب جواب میں فرماتے ہیں: ''اجماع اہل شرع است بر آنکہ ہیچ حکم از احکام شریعت بواقعات ومنامات امتیان ثابت نمی شود، وعلی التنزل در باب افضلیت بواقعات وقتی استیناس حاصل کردہ شود کہ کشف نمایند حال دو شخص را باعتبار اکثر وجوہ معتبرہ در باب تشبہ بانبیاء کہ فضل کلی ہمان است، اما چون کشف کنند حال یک شخص را فحسب، ہر چند علو مقامِ او فہمانند، در مبحث فضیلت آنرا نتوان گفت۔'' (قرۃ العینین، ص: ۲۲۵)

یعنی اہل شرع کا اجماع ہے کہ شریعت کے احکام میں سے کوئی حکم امتیوں کے واقعات ومنامات سے ثابت نہ ہوگا۔ اور تنازل کے بعد ہم کہتے ہیں کہ افضلیت کے باب میں واقعات سے اس وقت استیناس حاصل کیا جاتا ہے جب دو شخص کے احوال کا انبیاء کے ساتھ تشبہ کے باب میں اکثر وجوہ معتبرہ کے اعتبار سے کشف کریں کہ فضل کلی یہی ہے، لیکن جب صرف ایک شخص کے حال کو کھولیں تو ہر چند کہ ان سے اس کے مقام کی بلندی ثابت ہو، اسے فضیلت کے مقام میں بیان نہیں کر سکتے۔

# حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور مفاہمت بین المذاہب الاسلامیہ

پروفیسر نثار احمد فاروقی ☆

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۱۴ء، ۱۱۷۶ھ) بارہویں صدی ہجری/ اٹھارہویں صدی عیسوی کے ہندوستانی مسلم معاشرے کی نہایت ممتاز اور اہم شخصیت ہیں۔ وہ مفسر بھی ہیں، محدث بھی، فقیہ بھی ہیں، متکلم بھی، صوفی بھی ہیں، فلسفی بھی، زبانِ فارسی و عربی کے شاعر بھی ہیں انشا پرداز بھی، کسی دوسرے ہندی عالم کی نظر اپنے زمانے کی معیشت و معاشرت پر، سیاسی و اقتصادی حالات پر، تاریخ کے نشیب و فراز اور تداول ایام پر اتنی گہری نہیں ہے جس کا اندازہ ہمیں شاہ صاحب کے افکار کا مطالعہ کرنے سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے عبقری ہیں۔ زمانے کی نبض پر اُن کا ہاتھ ہے اور دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان میں مسلم اقتدار کا چہار صد سالہ دور ختم ہونے والا ہے۔ اور اگر اُمتِ مسلمہ نے تاریخ کے اس موڑ پر سنبھالا نہ لیا تو انہیں ایک ایسی زندگی گذارنی ہوگی جس کے لئے وہ کبھی راضی نہ ہوں گے۔ انہوں نے بدلتے ہوئے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور اپنے اصلاحی پروگرام کو مختلف سطحوں پر شروع کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ ہندوستانی ماحول میں اسلامی تعلیمات کی خصوصیات اسی وقت اپنی خالص شکل میں باقی رہ سکتی ہیں جب یہاں دینی تعلیم کا نظام مضبوط ہو۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد بھی خود

☆ سابق صدر شعبۂ عربی دلی یونیورسٹی

بارہ سال تک مسند درس پر بیٹھ کر اپنے ذی استعداد جانشینوں کی ایک جماعت تیار کردی جس نے تفسیر، حدیث، فقہ، منطق اور کلام کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ شاہ صاحب نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں سرکاری اور تصنیف و تالیف کی زبان فارسی ہے اور عربی کا علم صرف ایک محدود طبقے میں ہے اس لئے عام آدمی قرآن و حدیث کے مضامین و مطالب سمجھنے کے لئے اس طبقے کا محتاج ہے اور وہ گروہ اپنے مزعومات و تعصبات کی گرفت سے آزاد نہیں ہے۔ عقائد کے اختلافات نے اُمت کے شیرازے کو منتشر کر دیا ہے۔ اتحاد و تقرب کی کسی کوشش کے بجائے ایک ہی فرقے میں مزید شاخیں پیدا ہو رہی ہیں اور غیر اہم فروعی مسائل کو بھی بنیادی مسائل بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ اس کے مقابلے کے لئے ضروری تھا کہ قرآن فہمی کا ذوق عام کیا جائے۔ شاہ صاحب نے قرآن کریم کی تفسیر کے اصول پر بھی رسائل لکھے اور خود قرآن کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ یہ زمانہ ہندوستان میں فارسی زبان کے عروج و اقتدار کا آخری دور تھا۔ ہندوستانی زبان (اردو) آہستہ آہستہ فارسی کی جگہ لے رہی تھی۔ اس خاموش انقلاب کو ان کے فرزند شاہ عبدالقادر (۱۱۶۷-۱۲۳۰ھ) نے محسوس کیا اور ۱۲۰۵ھ میں قرآن کا نہایت سلیس اور عام فہم اردو ترجمہ کیا جو پہلی بار ۱۲۵۴ھ میں ''موضح قرآن'' کے نام سے شائع ہوا۔ قرآن کے بعد اسلام کی صحیح تعبیر و تشریح صرف احادیث کی روشنی میں ہو سکتی ہے۔ شاہ صاحب کا عقیدہ تھا کہ حدیث کا مجموعہ ''الموطا'' سب سے قدیم ہے اور مستند بھی۔ اس کا اختصار بھی اس کی خوبی ہے اور اس میں وہ احادیث ہیں جو احکام شرعیہ کے استنباط میں بھی معاون ہوتی ہیں اس لئے انہوں نے اس کتاب کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک ''المصفی شرح الموطا'' فارسی میں دوسری ''المسوّٰی'' عربی میں تاکہ عوام اور علماء دونوں استفادہ کر سکیں۔

تیسرا مرحلہ فقہی مسائل کا تھا اور یہی وہ میدان ہے جس میں اختلاف کو پھلنے پھولنے کی خوب گنجائش ملی ہے اور اس کے لئے قرآن و حدیث کی تفسیر و تشریح بھی اپنے مسلک کو درست ثابت کرنے کے لئے خوب کی گئی۔ شاہ صاحب نے اختلافی مسائل میں حد اعتدال پر رہنے کی نصیحت کی۔ اور اس بارے میں ایک کتاب الانصاف فی سبب الاختلاف تصنیف کی۔ تقلید اور عدم تقلید کا مسئلہ اور ائمہ فقہ کی آراء میں اختلاف کی بحث شاہ صاحب کے زمانے میں اتنی شدت

اختیار کر چکی تھی کہ رفع یدین، قرأت فاتحہ خلف الامام یا صلوۃ الجنازہ علی الغائب یا حلت غراب جیسے معروف مسئلوں میں علماء ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے اور ایک دوسرے کی تکفیر کرنا ایک عام مشغلہ بنا ہوا تھا۔ اس ماحول میں شاہ صاحب نے تفہیم دین کے ایک سنجیدہ عالمانہ اور دانشورانہ اسلوب کا آغاز کیا۔ انہوں نے خود لکھا ہے:

اس بندہ ضعیف پر خداوند تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ مجھے فاتحیت کی خلعت پہنائی گئی ہے اور پچھلے دور کا افتتاح میرے ہاتھ سے کرایا گیا ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا: ''فقہ میں اچھی باتیں کیا ہیں؟ چنانچہ میں نے ان کو جمع کر کے فقہ حدیث نئے سرے سے مرتب کر دی ہے۔''

ان کا مسلک ایک طرف صلح کل مفاہمت اور رواداری کا تھا تو دوسری جانب وہ دین قیم کو اس کی خالص شکل میں دیکھنا اور اس کے لئے جہاد کرنا بھی جانتے ہیں۔ ان کی دینی خدمات کا یہ اسلوب ایک غیبی اشارے سے متعین ہوا جو انہیں ۱۰ر صفر ۱۱۴۴ھ کو ایک خواب میں بتایا گیا۔ یہ خواب انہوں نے مکہ مکرمہ میں دیکھا تھا اور اس کا تذکرہ متعدد مقامات پر اپنی تصانیف میں کیا ہے:

''کأن الحسن و الحسین رضی اللہ عنهما نزلا فی بیتی وبید الحسن رضی اللہ تعالیٰ عنه قلم قد انکسر لسانه وبسط الیٰ یده لیعطینی وقال هذا قلم جدی رسول الله ﷺ ثم قال حتی یصلح الحسین واصلحه فلیس ما اصلحه الحسین کما لم یصلحه فاخذه الحسین ثم ناولنیه فسررت به ثم جئ برداء فخطط فیه خط اخضر وخط ابیض فوضع بین ایدیهما فرفعه الحسین وقال هذا رداء جدی رسول الله ﷺ ثم البسنی فوضعته علی راسی تعظیماً وحمدت الله تعالیٰ''۔

یہ خواب اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاہ صاحب مسلمانان ہند میں افہام و تفہیم کی راہیں کھولیں گے اور دینی فکر میں ایک نئی توانائی پیدا کریں گے حدیث نبوی کی حجیت کو قائم کریں گے اور اصلاح افکار امت کے لئے جہاد بالقلم کریں گے۔ شاہ صاحب کے افکار کی روح کو سمجھنے کے لئے یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ وہ دین کو زندگی کی غایت اور منتہائے مقصود سمجھتے ہیں۔ دین سے زندگی کو ایک واضح مقصد اور نصب العین ملتا ہے اور یہ مقصد محدود نہیں ہے بلکہ خود زندگی کی

طرح عام اور عالمگیر ہے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح بھی اسی وقت ہو سکتی ہے جب ان کی دینی فکر مستقیم ہو۔ اپنی نہایت بلند پایہ تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں انہوں نے اسرار شریعت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ دین ایک مربوط نظام حیات کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ انہوں نے مسلم معاشرے کے ہر طبقے اور ہر پہلو کا جائزہ لیا۔ محمود احمد برکاتی نے صحیح لکھا ہے:

''ان کا تفکر حقیقت پسندانہ اور ابلاغ دیانت دارانہ تھا۔ وہ کسی بھی مسئلہ پر خواہ اس کا تعلق فقہ سے ہو یا عقائد و کلام سے، تفسیر سے ہو یا تصوف سے وہ پہلے سے کوئی رائے قائم کر کے غور نہیں کیا کرتے تھے۔ ان کے نتائج فکر جو کچھ ہوتے تھے ان کو جوں کا توں نذرِ قرطاس و سپردِ قلم کر دیا کرتے تھے''۔

اس ذہنی رویے نے انہیں امت کے مختلف فرقوں میں اختلاف عقائد کے اسباب و علل کا سراغ لگانے کی طرف مائل کیا۔ فقہ، کلام اور تصوف میں ان کا خاندان خود ایک مکتب فکر کا نمائندہ تھا مگر شاہ صاحب نے تحقیق مسائل میں جانبداری یا عصبیت کو اثر انداز نہیں ہونے دیا اور اپنے عقائد کی تائید و توثیق سے زیادہ اس بات سے سروکار رکھا کہ وجوہ اشتراک تلاش کی جائیں اور اختلاف میں تطبیق کی راہ نکالی جائے۔ ایک عالم دین کا یہ انداز فکر کم سے کم ہندوستان کی مسلم معاشرت میں اجنبی سا تھا جہاں عقائد کے اختلافات نے پانچ سو سال سے زائد مدت میں خوب گہری جڑیں پکڑ لی تھیں اور ایک مسلک کے پیرو عموماً دوسرے مسلک کی کتابوں سے نا آشنا رہتے تھے یا انہیں پڑھتے تھے تو مقصد صرف تردید کرنا ہوتا تھا۔ تطبیق و تقریب میں شاہ صاحب کی کوشش کے متضاد اثرات ظاہر ہوئے۔ ایک جانب اہل تقلید (احناف) کا ایک طبقہ انہیں اپنا پیشرو مانتا ہے مگر ان کے بعض افکار سے یا انحراف کرتا ہے یا ان میں تحریف کرتا ہے۔ دوسری جانب غیر مقلد گروہ (طبقہ اہل حدیث) انہیں اپنا ہم مشرب و ہمنوا سمجھتا ہے مگر اس گروہ کے لئے بھی شاہ صاحب کے افکار سے کلی اتفاق کرنا دشوار ہے۔ تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ سلفیت کے اثبات و تائید میں بھی بعض بیانات شاہ صاحب کی طرف غلط منسوب کر دیئے گئے تاکہ ان کے مرتبہ علمی کا احترام کرنے والے ان خیالات کو شاہ صاحب کے عقائد سمجھ کر ان کی پیروی کریں۔

اٹھارہویں صدی کی ہندوستانی سوسائٹی میں ایک نہایت بااثر طبقہ صوفیہ کا تھا ان میں کچھ

دنیادار اور عقبیٰ فروش بھی تھے جو دین کے علم سے بے بہرہ تھے۔ انہوں نے مختلف رسموں کو دین کا درجہ دے رکھا تھا۔ لیکن ایسے کبار صوفیہ بھی تھے جن کے خاندان میں سلوک وتصوف کی مضبوط اور معتبر روایت رہی ہے یا جو خود ایک روحانی مسلک کے پیشرو ہوئے ہیں۔ یہ طبقہ بھی کئی مسائل میں دوسروں سے اختلاف رکھتا تھا۔ مثلاً بیعت صرف خلافت کے لئے ہے یا دوسرے مقاصد کے لئے بھی ہو سکتی ہے؟ شریعت اور طریقت کا باہمی رشتہ کیا ہے؟ ذکر جہر جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح سماع موتی، تصور شیخ، توسل وغیرہ فروعی مسائل میں اختلافات تھے مگر سب سے اہم مسئلہ وجود تھا ایک گروہ وحدۃ الوجوہ کا معتقد ہے جو یہ کہتا ہے کہ وجود صرف ایک واجب الوجود کا ہے اور وہ ذات باری ہے۔ اس نے کائنات کو مرتبہ وہم میں خلق کیا ہے، یعنی اس کا وجود صرف نمود ہے، وجود نہیں ہے جیسے برف جو پگھل کر صرف پانی رہ جاتا ہے۔ اس مسلک کے سب سے ممتاز مبلغ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی ۵۶۰ھ۔ ۶۳۸ھ) ہوئے ہیں۔ شاہ صاحب کے پیش رو حضرات میں اس مسئلے پر عالمانہ تصانیف حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی ۱۹۹۶۔ ۱۰۵۸ھ) نے لکھیں۔ دوسرا طبقہ وحدۃ الشہود کا اعتقاد رکھتا ہے اس نظریے کا مبلغ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (۹۷۱۔ ۱۰۳۴) کو سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ وحدۃ الوجود کے نظریے سے اختلاف کے شواہد ہمیں علاء الدولہ سمنانی (۶۵۹۔ ۷۳۶ھ) سید اشرف جہانگیر سمنانی (۶۸۸۔ ۸۰۸ھ) اور سید محمد الحسینی گیسو دراز (۷۲۱۔ ۸۲۵ھ) کے ملفوظات میں بھی ملتے ہیں۔ بہرحال اس مسئلے پر اختلاف آرا نے سلاسل صوفیہ کو بھی ایک دوسرے سے دور کر رکھا تھا۔ شاہ صاحب نے اس میں تطبیق کی مخلصانہ کوشش کی۔ آفندی اسمٰعیل بن عبداللہ الرومی ثم المدنی کے نام ان کا طویل مکتوب جو "مکتوب مدنی" (الرسالۃ المدینہ) کے نام سے شائع بھی ہوا ہے اسی موضوع پر ہے اور اس میں شاہ صاحب نے وجود کے دونوں نظریات کا عالمانہ جائزہ لے کر ان میں معنوی تطبیق کی مستحسن کوشش کی ہے۔ اگرچہ شاہ صاحب نے لکھا کہ وحدت شہود کے معنی یہ ہوں گے کہ سالک ایسے مقام پر متمکن ہے جہاں احکام جمع وتفریق کے ڈانڈے باہم ملے ہوتے ہیں یعنی سالک اس حقیقت کو پانے میں کامیاب ہو گیا ہے کہ اشیاء میں جو وحدت سی نظر آتی ہے من وجہ ہے اور کثرت جو اس کے متباین محسوس ہوتی ہے وہ بھی من وجہ ہے۔ معرفت وسلوک کا یہ مقام پہلے مقام (وحدۃ

وجود) سے نسبتاً زیادہ اونچا ہے۔ تطبیق کی اس کوشش کو نہ وجودیوں نے پسند کیا نہ شہودیوں نے۔ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں (۱۱۱۱-۱۱۹۵ھ) نے اپنے خلیفہ شیخ غلام یحییٰ بہاری سے اس کا جواب "کلمات الحق" ۱۱۸۴ھ میں لکھوایا جس کی مزید شرح ان کے بیٹے سید نورالہدیٰ نے "المظاہر" کے نام سے لکھی۔ شاہ ولی اللہ کا تو کلمات الحق کی تحریر سے پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا (۱۱۷۶ھ) مگر ان کے اخلاف نے ان رسائل کے جوابات بھی دیئے۔ پہلا رسالہ "دمغ الباطل" شاہ صاحب کے فرزند شاہ رفیع الدین محدث دہلوی نے لکھا۔ بعد کے زمانے میں بھی یہ بحث ہوتی رہی۔ اس تطبیق کے عمل میں شاہ صاحب کی نیت نیک تھی کسی بحث کا دروازہ کھولنا مقصود نہ تھا۔ شاہ صاحب کا خیال تھا کہ صوفیہ کے تمام سلاسل حضرت حسن بصریؒ (ف ۱۱۰ھ) کے واسطے سے حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ پر منتہی ہوتے ہیں مگر ان دونوں شخصیتوں کا اتصال اتنا ثابت نہیں ہوتا جو استفادے کے لئے ضروری ہے۔ کتب احادیث مثلاً "بخاری، ترمذی، ابوداؤد" وغیرہ میں جو مرویات حضرت حسن بصری سے آئی ہیں وہ بھی حضرت علیؓ سے بلا واسطہ نہیں ہیں بلکہ ان میں درمیانی کڑی قیس بن عباد ہیں۔ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے ممتاز بزرگ شاہ فخر الدین نظامی محب النبی دہلوی (۱۱۲۶-۱۱۹۹ھ) نے اس کا جواب "فخر الحسن" لکھا اور ثابت کیا کہ حضرت حسن بصری نے حضرت علی بن ابی طالب سے روحانی فیض حاصل کیا تھا۔

امت مسلمہ کا ایک بڑا طبقہ شیعہ امامیہ کا ہے اور اس کے بارے میں بھی ہر دور میں علماء امت کا متباین ردعمل رہا ہے۔ ایک غالی گروہ انہیں بے تکلف کافر کہتا ہے تو دوسرے نے راہ اعتدال اختیار کی اور کف لسان سے کام لیا۔ جو کلمہ توحید پر اعتقاد رکھتا ہو، رسالت کا قائل ہو، آخرت کو مانتا ہو، قرآن کریم کو منزل من اللہ جانتا ہو اس پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔ شاہ صاحب کا مسلک اس بارے میں بھی اعتدال پر مبنی اور حقیقت پسندانہ ہے۔ انہوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر میرا اختیار تمیزی کا معاملہ ہوتا تو میں فقہ میں عدم تقلید کو تقلید پر ترجیح دیتا مگر مجھے مقلد بن کر رہنے کا "حکم دیا گیا" اسی طرح میرا میلان تفضیل علی علی الشیخین کی جانب تھا مگر مجھے تفضیل شیخین کا حکم دیا گیا۔ ان کے اس معتدل رویے سے اہل سنت بھی کچھ خوش نہ تھے۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز میں لکھا ہے کہ ایک روہیلہ (افغانی) شاہ صاحب کی خدمت میں آیا اور ان سے شیعہ

امامیہ کے بارے میں رائے معلوم کی۔ شاہ صاحب نے علماء متقدمین کے مستند خیالات کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کردی وہ مطمئن نہیں ہوا چلا گیا۔ دوبارہ پھر حاضر ہوا اور وہی سوال دوہرایا کہ شیعہ امامیہ کافر ہیں یا نہیں؟ شاہ صاحب نے پھر علماء قدیم کے حوالے سے اسے جواب دیا۔ وہ ناراض ہو کر یہ کہتا ہوا گیا کہ یہ تو خود بھی شیعہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تو اہل سنت کا حال تھا۔ طبقہ شیعہ بھی ان سے خوش نہ رہا اور اس کا ایک سبب تو یہ کہ شاہ صاحب کے زمانے کی سیاست میں جو رسا کشی ہو رہی تھی اس میں دو گروہ ایرانی اور تورانی تھے۔ دونوں نے اپنا اپنا حلقۂ اثر قائم رکھا تھا اور زندگی کا کوئی شعبہ اس اختلاف کے سائے سے بچا ہوا نہ تھا۔ دوسرا سبب یہ کہ شاہ صاحب کی تصانیف کی پوری اشاعت خود اہل سنت میں نہ ہو سکی۔ شیعوں تک ان کی تصانیف کیا پہنچتیں جن کی دسترس شاہ صاحب کی تصانیف تک ہوئی بھی ان میں بھی سب ان کے افکار کو سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔ اس لئے کہ شاہ صاحب اپنی خاص مصطلحات میں کلام کرتے ہیں اور ان کی تحریر فلسفہ وکلام کے ساتھ ہی کشف ووجدان کا رنگ بھی لئے ہوتی ہے۔ تیسرا سبب یہ بھی ہوا کہ شاہ صاحب کے اخلاف میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ۱۱۵۹۔ ۱۲۳۹ھ اور شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی (۱۱۹۳۔ ۱۲۴۶ھ) کی بعض تصانیف نے شیعوں کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے بھی بدظن کردیا اور اس کا ردعمل اس طرح ظاہر ہوا کہ مرزا علی لطف نے ۱۸۰۱ء میں شعرائے اردو کا تذکرہ لکھا تو وہ شیخ احمد سرہندی کے اخلاف میں ایک شخصیت شاہ ولی اللہ اشتیاق دہلوی کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سمجھا اور لکھ دیا کہ اکثر کتابیں اس بحر علم کی مشہور ہیں چنانچہ دو نسخے ایک کا نام "قرۃ العینین فی ابطال شہادۃ الحسین" اور دوسری کا نام "جنت العالیۃ فی مناقب معاویۃ" ہے حالانکہ جس شاعر کا وہ احوال لکھ رہا ہے وہ شاہ ولی اللہ سے بالکل مختلف شخصیت ہیں اور ہمارے شاہ صاحب اردو کے شاعر نہ تھے۔ ان کی تصنیف "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" کو مرزا علی نے "فی ابطال شہادۃ الحسین" بنادیا اور مناقب معاویہ میں شاہ صاحب نے کوئی رسالہ نہیں لکھا۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق دہلوی کی بھی کوئی تصنیف ان موضوعات پر نہیں ہے۔

مختلف مسلک کے اسلامی فرقوں کو مشترک باتوں پر جمع کرنا اور فروعی مسائل میں تطبیق کرکے راہ وسط نکال لینا کچھ ایسا دشوار نہ تھا جب کہ ہمارے پیشوائے اعظم ﷺ نے یہود ونصاریٰ

کو بھی دعوت دیتے ہوئے بار بار یہ تحریر فرمایا: "تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم" مگر دین کی حکمت اور دقائق سے ناواقف ایک طبقہ ہمیشہ یہ چاہتا رہا ہے کہ جن مسائل پر اتفاق ہو سکتا ہے ان پر بھی نہ ہونے پائے خواہ امت کا شیرازہ کتنا ہی کیوں نہ بکھر جائے۔ عرصہ ہوا میں نے ایک کتاب "اصل الشیعة واصولها" پڑھی تھی جس کے مصنف علامہ محمد حسین آل کاشف الغطاء ہیں انہوں نے جس معتدل اور متوازن سنجیدہ اور مدلل انداز میں اپنے عقائد کی وضاحت کی ہے اس کے بڑے حصے کو میں نے پسند کیا اور یہ تاثر لیا کہ چند بنیادی اعتقادی مسائل کو چھوڑ کر اہل السنۃ اور شعیہ امامیہ کے مسلکوں میں کوئی ایسا اختلاف نہیں ہے جسے پاٹا نہ جا سکے یا جن کے ہوتے ہوئے صلح و آشتی اور مفاہمت کا امکان ہی نہ ہو۔ میں نے اس کتاب کو عام افادے کے لئے اردو زبان میں ترجمہ کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ اس کا ترجمہ لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ تلاش بسیار کے بعد وہ ترجمہ مجھے دستیاب ہوا اور میں نے اردو ترجمے کو اصل عربی سے مقابلہ کر کے دیکھا تو بعد مشرقین نظر آیا مثلاً مصنف نے اگر کہیں شیخین کے لئے کوئی کلمہ خیر لکھا ہے یا ان کے کسی عمل کی تائید کی ہے تو وہ عبارت ترجمے میں بالکل حذف کر دی گئی۔ جب یہ صورت ہو تو تقریب و تفاہم کی کوشش کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے شاہ صاحب کی نظر ہندوستانی مسلمانوں کے اسباب زوال پر تھی۔ انہوں نے ایک نہایت شاندار اور بارعب وجلال حکومت کے تار و پود کو پارہ پارہ ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ایسے حالات میں وہ امت مسلمہ کو وحدت اور تنظیم کی دعوت ہی دے سکتے تھے اسے افتراق وانتشار کی جانب کیوں بلاتے؟ انہوں نے اپنے معاشرے کے ہر طبقے کو للکارا اور اسے اس کی ذمہ داریاں یاد دلائیں۔

# شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور عقیدۂ توحید

مولانا اصغر علی امام مہدی السّلفی ☆

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی شخصیت ان نابغۂ روزگار شخصیات میں سے ایک ہے جو روز روز اس دارفانی میں نہیں آتیں اور جب دارفانی سے عالم بالا کی طرف سدھار جاتی ہیں تو اپنے پیچھے انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ علامۂ زماں نواب صدیق حسن خان فرماتے ہیں:

''اگر ان کا وجود دور اوّل میں ہوتا تو وہ امام المحدثین اور تاج الائمہ ہوتے''۔

شاہ ولی اللہ کی ولادت بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے چار سال قبل ۴ر شوال ۱۱۱۴ھ بروز بدھ قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر میں ہوئی۔ اس وقت آپ کے والد محترم شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی نے ساٹھ (۶۰) سال کی عمر میں اپنا قدم رکھ دیا تھا۔ آپ کا نام احمد، ابوالفیاض کنیت ولی اللہ عرف بشاری نام قطب الدین اور تاریخی نام عظیم الدین تھا۔ شاہ صاحب نے ''الامداد فی مآثر الاجداد'' میں اپنا شجرہ نسب یوں بیان کیا ہے۔

ولی اللہ بن عبدالرحیم بن الشہید وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین مفتی بن شیر ملک بن عطا ملک بن ابوالفتح ملک بن عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن ہامان بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عمر۔'' (انفاس العارفین ص:۵۲، بحوالہ حضرت شاہ ولی اللہ ص:۱۴)

☆ ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ اہلحدیث

## شاہ ولی اللہ کی تعلیم وتربیت میں اُن کے والد کا کردار:

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا گھرانہ علمی تھا اور مدرسہ رحیمیہ کا پہلے ہی سے علمی ماحول تھا۔ ان کے والد محترم نے آپ کی تعلیم وتربیت پر خاصی توجہ مرکوز کی۔ محبت وشفقت اور دینی ماحول کے ساتھ اپنے بیٹے کی نشوونما کی۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب کا رخ کیا، سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا، نماز کی عادت ڈالی گئی اور شرعی امور کے التزام کا شوق پیدا کیا گیا۔ دراصل شفقت پدری اور دینی ماحول کا کمال تھا کہ آپ کے اندر دینداری کا وصف نمایاں ہوا۔ عربی وفارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد شرح جامی اور تفسیر بیضاوی کا درس لیا۔ پندرہ سال کی عمر میں علوم مروجہ سے فارغ ہوگئے۔ ۱۱۴۳ھ کے اواخر میں بیت اللہ کی زیارت اور ذخیرۂ احادیث سے دامن مراد کو پر کرنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ شیخ ابوطاہر مدنی سے کتب ستہ کا درس لیا۔ شیخ وفد اللہ مالکی ودیگر مشائخ سے استفادہ کیا۔

## شاہ صاحب کا مسلک:

جب شاہ صاحب کا مطالعہ وسیع تر ہوا تو یہ کہنے پر مجبور ہوگئے "مذاہب اربعہ کے فقہ اور اصول فقہ کی کتابوں اور جن احادیث سے یہ استدلال کرتے ہیں ان کے ملاحظہ کے بعد نورِ غیبی کی مدد سے دل فقہاء محدثین کی روش پر مطمئن ہوگیا"۔ اس سے ہر صاحب علم کو اندازہ ہوگا کہ شاہ صاحب کا حضرات محدثین کی روش اختیار کرکے اپنے دلی اطمینان کا اظہار کرنا جملہ دیگر شاہراہوں پر چلنے والوں کو چیلنج کرنا ہے اور اس بات کا ثبوت فراہم کرنا ہے کہ اگر بہتری اور خیر کا پہلو نمایاں ہے تو بس محدثین کی روش میں ہے، کیوں کہ ان کا طریقہ راہ محمدی سے ملا ہوا ہے جس میں راہرو کے بھٹکنے کا امکان معدوم ہے۔

شاہ صاحب جب محدثین کرام کے منہل صافی سے سیراب ہوکر ہندوستان واپس آئے تو درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا شغل جاری رکھا۔ بیعت وارشاد اور اصلاح احوال کا سلسلہ بھی ایک مستقل کام بن گیا تھا۔ شاہ عبدالرحیم کی کامل توجہ اور بہترین تعلیم وتربیت نے یہ اعلیٰ مقام عطا کیا تھا۔

## برصغیر میں مسلمانوں کی مجموعی حالت:

شاہ ولی اللہ دہلوی اس عہد کے فرد فرید تھے۔ جب برصغیر میں مسلمانوں کا اقتدار چراغ سحری تھا، عظیم المرتبت شخصیتیں موجود تھیں، ملک میں نت نئے مسائل ومشکلات جنم پذیر ہو رہے تھے۔ رفض وتشیع کا دور دورہ ہو رہا تھا، مجوسیت اور ہندو ازم اپنی قباحتیں پھیلانے میں سرگرمی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ لوگ دینی تعلیمات سے بالکل ناواقف اور اخلاقی مفاسد کے شکار تھے۔ علماء ومشائخ اپنے مدرسوں اور خانقاہوں میں گوشہ نشیں تھے۔ جمود وبے حسی وتنگ نظری سے معمور تھے، کورانہ تقلید نے ان کی فکری وذہنی صلاحیتوں پر تباہ کن پنجہ نصب کر دیا تھا۔ بدعات وخرافات اور اوہام پرستی کی گرم بازاری تھی۔ قاضی محمد اسلم سیف نے ان کے عہد کا بایں طور نقشہ کھینچا ہے:

> اس زمانے میں مسلم معاشرہ اخلاقی طور پر نہایت پستہ تھا۔ امراء ارباب دولت اپنے کو کسی ضابطے کا پابند نہیں سمجھتے تھے، عیش پرستی ان کا مقصد حیات بنا ہوا تھا۔ مغلیہ بادشاہوں کے تشیع کی طرف رجحان نے ان پر ایرانی تہذیب مسلط کر دی تھی۔ سازشیں، ریشہ دوانیاں، ایک دوسرے کے خلاف خوفناک منصوبے، کردارکشی ان کا معمول بن چکی تھی۔ ان میں انتظامی کمزوریاں پھیل چکی تھیں نظم ونسق چلانے کی صلاحیتیں مفقود ہوگئی تھیں، صرف عیش پرست بن کر رہ گئے تھے، کسی انقلابی تحریک میں کوئی کردار ادا کرنے کی ہرگز کوئی صلاحیت نہ تھی۔ (تحریک اہل حدیث تاریخ کے آئینے میں)۔

## برصغیر میں مسلمانوں کی اعتقادی حالت:

بعض نے اس دور کی سنگینیوں کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

> "اس دور میں معاشرتی واخلاقی پستی سے زیادہ خطرناک اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محرومی اور قوت وطاقت سے خالی کرنے والی بداعتقادی عام تھی۔ مسلم معاشرہ میں بدعات، ہندوانہ اور شیعوں کی بہت سی رسوم وعادات کا بہت زور تھا، بہت سے حلقوں میں شرک جلی سے بھی گریز نہیں کیا جاتا تھا، قبر پرستی، مشائخ کے لئے سجدہ تعظیمی، مزارات اوران کے قرب وجوار کا حرم کی طرح احترام، قبروں پر چادریں

چڑھانا دینی مشن تھا۔ بزرگوں کے نام پر قربانیاں کرنا، مزارات کا طواف، وہاں میلہ لگانا، تہوار منانا، گانا، بجانا اور چراغاں کرنا، مختصر الفاظ میں ان کو قبلہ و کعبہ، ملجاو ماوی سمجھنا، شیخ سدو کا بکرا، سید احمد کبیر کی گائے، غازی میاں کے جھنڈے اور چھڑیاں، محرم کے تعزیئے، غیر اسلامی تہواروں کو شان و شوکت سے منانا، بیماریوں کو دفع کرنے میں ارواح خبیثہ سے مدد مانگنا اور بعض اوقات دیوی دیوتاؤں کی رضا جوئی، چیچک میں شیلا کی تعظیم، اولیاء و صالحین کی منتیں ماننا، قربانیاں کرنا، اولیاء و نیک بیویوں کے نام سے روزہ کی نیت کرنا، ان سے اپنی حاجت برآری اور مقاصد کی تکمیل کو وابستہ کرنا اور اس سلسلہ میں خاص خاص کھانے پکوانا، بی بی کی صحنک، مخدوم صاحب کا توشہ اور ان میں خاص آداب کی پابندی یہ اور ایسے بہت سے عنوانات ہیں جن کے تحت توہمات عقائد فاسدہ اور رسوم جاہلیت عام تھیں، علی بخش، حسین بخش، پیر بخش، نبی بخش، مدار بخش اور سالار بخش ایسے مشرکانہ نام عام تھے، غرض بارہویں صدی ہجری کا ہندوستان سیاسی، انتظامی، اخلاقی اور بہت حد تک اعتقادی حیثیت سے انحطاط و پستی کے اس نقطہ پر پہنچ گیا تھا جو اسلامی ملکوں کے زوال اور مسلم معاشرے کی پستی کا افسوس ناک اور خطرناک مرحلہ ہوتا ہے"۔

## کتاب وسنت سے دوری کا عالم:

مولانا سید سلیمان ندوی "مقالات سلیمانی ص: ۴۴" میں رقمطراز ہیں:

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا۔ مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا، جھوٹے فقراء اور نام نہاد مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے، مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پرشور تھا، فقہ و فتوی کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی، مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا، عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب اور احادیث کے احکام و ارشادات اور فقہ دین کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے"۔

## معاشرتی اصلاح میں شاہ صاحب کے کارنامے:

یہ تھا وہ عہد جس میں شاہ ولی اللہ نے آنکھیں کھولی تھیں، شاہ صاحب بڑے ہی فہم وفراست والے، ذکی وفطین تھے، علم کے بے پایاں سمندر تھے، انہوں نے مستقبل میں آنے والے حوادث کو بھانپ لیا تھا اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس عہد کو جملہ شرکیات وغلط رسوم ورواج سے بچانے وپاک کرنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں، ہر طبقے کی خرابیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کی، فکر ونظر کا جمود توڑنے اور اندھی تقلید وتعصب کی زنجیریں کاٹنے، ذہنی الجھنوں اور نظریات وعقائد کے بگاڑ کو دور کرنے کی سعی کی، اخلاقی، فکری، اعتقادی اور دینی مفاسد میں مبتلا لوگوں کو اصلاح عمل اور تطہیر فکر ونظر کی دعوت دی، زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہ چھوڑا جس کی اصلاح وتطہیر اور کتاب وسنت کی بنیادوں پر از سر نو تعمیر کی دعوت نہ دی ہو اور اپنے عہد کو دینی واعتقادی اعتبار سے تابناک بنانے کی بھرپور جدوجہد نہ کی ہو"۔

شاہ صاحب نے اولاً نام نہاد امراء وسلاطین اور بد دین حکمرانوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور ان کو اسلام کی سچی تعلیمات سے روشناس کرایا۔ علماء کرام کو بھی جنہوں نے اسلام کا نقشہ ہی بدل دیا تھا اور اس کے صاف شفاف چہرے کو مسخ کرنے کی ناکام سعی کی تھی جھنجھوڑا اور باطل پرستی واوہام پرستی کی دلدل سے نکالنے کی کوشش کی۔ پھر عباد وزہاد کی طرف متوجہ ہونے اور ان کے طرز زندگی کو اسوۂ رسول کے قالب میں ڈھالنے کی دعوت دی۔ معاشرے کو اسلامی رنگ دیا۔ اس کے اندر پیدا شدہ ہندوانہ رسوم وتقالید کو دریا برد کیا۔

"شاہ ولی اللہ" بلا کے ذہین تھے، سنجیدہ نیک طینت، خوش اطوار وخوش مزاج تھے۔ سادہ لوحی اور پاکبازی، نازک طبعی ومنکسر المزاجی کا مجسمہ تھے۔ لغویات وہزلیات سے کنارہ کش تھے۔ دراصل شاہ صاحب کی زندگی پر ان کے والد کی شخصیت اور ان کی تعلیم وتربیت کا گہرا اثر تھا۔ آپ کے استاد ومربی سب کچھ آپ کے والد ہی تھے۔ بچپن سے بہترین نگہداشت نے آپ کو کندن بنا دیا تھا۔ شفقت پدری سے متاثر ہو کر شاہ صاحب نے برملا اس بات کا اظہار فرمایا کہ "کسی باپ، کسی استاد اور کسی مرشد کو میں نے نہیں دیکھا جو اپنے بیٹے اور شاگرد کے معاملے میں اس قدر شفقت کا رویہ

رکھتا ہو جو کہ اس فقیر کے ساتھ حضرت والد کا ہے''۔

تہذیب و شائستگی کے پیکر تھے، ضیافت و مہمان نوازی، بڑوں کا احترام آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ اخلاق و مروت کی باتیں ہر وقت زبان پر رہا کرتی تھیں۔ کتب بینی تصنیف و تالیف، تحقیق و درس، ذکر و فکر، نظم و ضبط اور وقت کی پابندی کے نمایاں اوصاف سے متصف تھے۔ گویا شاہ صاحب کی زندگی ایک مستعد، منظم اور محنتی شخصیت کا نمونہ تھی۔

شاہ صاحب نے ''انفاس رحیمیہ'' میں صفحہ:۳۸ پر اپنی ذات اور معمولات زندگی کی تصویر کشی کی ہے کہ:

''میں اپنی ذات میں تنہا ہوں اپنی مٹی آپ اکٹھی کرتا ہوں۔ اپنے وقت کا بندہ ہوں۔ اپنے نصیب کا شاگرد ہوں۔ جو کچھ سوجھ گیا اس کا پابند ہوں۔ جو کچھ دل میں سما گیا اسے غنیمت شمار کرتا ہوں''۔

شاہ صاحب کے حلقۂ درس میں تشنگان علوم کتاب و سنت کا ہجوم ہوتا تھا۔ لوگ اکتساب فیض کے لئے پروانہ وار ٹوٹ پڑتے تھے۔ اور آپ کے علمی و روحانی فیض کا سلسلہ بھی بڑا وسیع ہے۔ آج جہاں بھی درس نظامیہ کے ادارے قائم ہیں وہ سب اپنا سلسلہ شاہ صاحب سے ہی جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ سے فیض حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت بڑی ہے۔ ان میں سے شاہ اہل اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، خواجہ محمد امین ولی اللہی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، جار اللہ لاہوری، سید مرتضی زبیدی بلگرامی، سید شرف الدین محمد، فضل اللہ کشمیری اور شاہ جمال الدین قابل ذکر ہیں:

## شاہ صاحب اور ان کی علمی خدمات:

شاہ صاحب کی علمی خدمات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ درس و تحقیق اور دینی کتابوں کی تصنیف و تالیف میں گزرا۔ ان کی تالیفات پر مولانا مودودیؒ کو بھی بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے برجستہ کہا کہ:

''ایک طرف ان کے زمانے اور ماحول کو اور دوسری طرف ان کے کام کو جب آدمی بالمقابل رکھ کر دیکھتا ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اس دور میں اس نظر، ان

خیالات، اس ذہنیت کا آدمی کیسے پیدا ہو گیا؟ فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے ہندوستان کو کون نہیں جانتا؟ اس تاریک زمانہ میں نشوونما پا کر ایسا آزاد خیال مفکر و مبصر منظر عام پر آتا ہے جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے۔ تقلیدی علم اور صدیوں کے جمے ہوئے تعصبات کے بند کو توڑ کر ہر مسئلہ زندگی پر محققانہ و مجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ اور ایسا لٹریچر چھوڑتا ہے۔ جس کی زبان، انداز بیان، خیالات، نظریات، مواد تحقیق اور نتائج مستخرجہ کسی چیز پر بھی ماحول کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا حتی کہ اس کے اوراق کی سیر کرتے ہوئے یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ یہ چیزیں اس جگہ لکھی گئی تھیں جس کے گردوپیش عیاشی، نفس پرستی، قتل و غارت، جبر و ظلم اور بدامنی و طوائف الملوکی کا طوفان تھا"۔ (تجدید و احیائے دین صفحہ: ۹۹،۹۸)۔

شاہ صاحب کی جملہ علمی خدمات کا احاطہ نہایت مشکل ہے۔ البتہ ان کی تصنیفات میں سے فتح الرحمان بترجمۃ القرآن، المصفی شرح موطا، الاربعین، المسوی، الانصاف فی بیان سبب الاختلاف، عقد الجید فی الاجتہاد والتقلید، الارشاد الی مہمات علم الاسناد، تراجم ابواب البخاری، قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین، حجۃ اللہ البالغہ، الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین، حسن العقیدہ، شفاء القلوب، فتح الودود و معرفۃ الجنود، انفاس العارفین، الفوز الکبیر، فتح الخبیر، التفہیمات الالٰہیہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شاہ صاحب کی جملہ تصانیف میں ان کی دعوت کا یہ پہلو کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے لیکن تفہیمات الٰہیہ میں تو ان کے دل کا درد بے پایاں بڑے موثر الفاظ میں ڈھل گیا ہے۔ چنانچہ محدثین کا طرز عمل اور ان کا طرز زندگی محبوب بن گئے، جمود و تعصبات کی زنجیروں کو پاش پاش کر دیا۔ فقہی مسالک کو تنقید و تطبیق کی نگاہ سے دیکھا اور اقتصاد فی العمل کی راہ اختیار کی۔ فقہی تعصب اور کورانہ تقلید کی مخالفت کی اور اہل علم سے فرمایا۔

"تم لوگ ماقبل کے فقہاء کے استحسانات و تفریعات میں ڈوب کر غور و خوض کرتے ہو، کیا تم نہیں جانتے کہ حکم تو وہ ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول حکم دیں؟ تم میں سے بہت سے لوگوں کے پاس جب کوئی حدیث پہنچتی ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ میرا عمل حدیث پر نہیں بلکہ فلاں کے مذہب پر ہے" (تفہیمات الٰہیہ صفحہ: ۲۱۴)۔

شاہ صاحب کی تصنیف کردہ کتابوں میں سے: "الانصاف فی بیان اسباب

الاختلاف" عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید" اور "حجۃ اللہ البالغہ" وہ معرکۃ الآراء کتابیں ہیں جن کو مقلد متعصب پڑھنے کے بعد بجا طور پر کہے گا اور یہ دلی طور پر اعتراف کرے گا کہ شاہ صاحب نے ہمیشہ کورانہ تقلید کی مخالفت کی ہے اور عوام الناس سے اس مہلک مرض کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنا رشتہ اصحاب حدیث سے استوار کیا ہے اور قرآن و حدیث پر چلنا نجات کا ذریعہ سمجھا ہے۔ مشہور محقق و باحث جناب مولانا ارشاد الحق اثری تحریر فرماتے ہیں:

"برصغیر میں حدیث کا چرچا شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے سے ہوا، اس سے کسی مورخ یا اہل علم کو انکار نہیں ہے۔ اس میں کوئی بھی ان کا سہیم و شریک نہیں ہے۔ وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے پوری قوت سے شرک و بدعات کے سامنے بند باندھا اور کورانہ تقلید کی بجائے کتاب و سنت کی اتباع کو رواج دیا۔ اور یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ برصغیر میں آج جہاں بھی قال اللہ و قال الرسول کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ اسی خانوادے کی مرہون منت ہے اور انہی کی کوششوں اور کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ مگر حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ سنت صحیحہ کی پیروی کی تمام تر دعوت کے باوجود جس کا اظہار انہوں نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں جابجا فرمایا ہے۔ علمی میدان میں خم ٹھونک کر سامنے نہ آسکے بلکہ حالات و ظروف کی مصلحتوں کے پردہ میں دبے رہے" (پاک و ہند میں علماء اہل حدیث ...... صفحہ:۲۴)۔

شاہ صاحب نے ۶۳ سال اس دار فانی میں مکمل کئے اور یہ علم دین کا درخشندہ آفتاب سدا کے لئے غروب ہو گیا۔ مہندیان دہلی میں مدفون ہیں۔ اس قبرستان کو محدثین کا قبرستان کہا جاتا ہے۔

## شاہ ولی اللہ صاحب کے عقائد و نظریات:

شاہ صاحب اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ "عقیدہ" دین حنیف کی اولین اساس ہے اور اس کو ایمانیات میں وہی مقام حاصل ہے جو اعضاء جسمانی میں سر کو حاصل ہے۔ اور عقیدہ کے بغیر حقیقی ایمان اور صحیح اعمال اور اسلامی زندگی کا تصور محال ہے۔ ضعف عقیدہ یا بدعقیدگی کی اسلام میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور یہ ایسا مرض ہے جو انسان کے سارے اعمال حسنہ کو تباہ کر ڈالتا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ دربار الٰہی میں اعمال کی مقبولیت کا دارو مدار عقیدہ توحید ہے۔ عقیدۂ

توحید کے بغیر اخروی زندگی میں نجات ممکن نہیں، ان کو "ومن یکفر بالایمان فقد حبط عمله وهو فی الآخرة من الخاسرین" (مائدہ:۵) کی سچی تفسیر معلوم تھی کہ منکرین ایمان کے اعمال ضائع اور اکارت ہیں اور آخرت میں سرخروئی انہی لوگوں کا مقدر ہے جن لوگوں نے دنیاوی زندگی میں عقیدہ توحید کو نجات کا ذریعہ مانا، ان کے سامنے نبی ﷺ کا اسوۂ حسنہ تھا کہ مکہ میں تیرہ سالہ زندگی آپ نے مشرکین مکہ کے عقائد کی تطہیر و اصلاح میں صرف کی، اور قرآن مجید کا تہائی حصہ عقیدہ توحید پر مشتمل ہے۔

شاہ صاحب نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا: "ذرا اپنے آپ پر نگاہ ڈالو، امانت و دیانت تم سے رخصت ہوگئی ہے، اپنے رب کی عبادت سے تم غافل ہو چکے ہو اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگے ہو، اپنے فرضی معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہیں، قبروں کا طواف اور حج کرتے ہوء فالیں نکلواتے ہو اور ٹوٹکوں اور گنڈوں کا سہارا لیتے ہو۔ اللہ خوش حالی عطا کرتا ہے تو اسراف و تبذیر تمہارا شیوہ بن جاتا ہے"۔ دوسری جگہ لوگوں کو مقصد تخلیق کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا کہ:

"اللہ نے تمہیں جہاد کے لئے پیدا فرمایا تھا، تمہارا مقصد زندگی اعلائے کلمۃ الحق اور شرک و اہل شرک کا استحصال تھا لیکن تم نے اپنے اس کام کو چھوڑ دیا"۔

ایک جگہ بدعات و مشرکانہ افعال کی تردید کرتے ہوئے اپنا عقیدہ یوں ظاہر کیا:

"جو لوگ حاجتیں طلب کرنے کے لئے اجمیر یا سالار مسعود (بہرائچ) یا اسی قسم کے دوسرے مقامات پر جاتے ہیں وہ اتنا بڑا گناہ کرتے ہیں کہ قتل اور زنا کا گناہ اس کے مقابلے میں ہیچ اور کمتر ہے۔ ذرا سوچئے اس میں اور خود ساختہ معبودوں کی پرستش میں کیا فرق ہے؟ جو لوگ لات و عزیٰ سے حاجتیں طلب کیا کرتے تھے ان کا فعل ہمارے ان لوگوں کے فعل سے کس طرح مختلف تھا؟"۔

شاہ صاحب نے استعانت باللہ پر زور دیا ہے اور حکمرانوں کو اس کی نصیحت فرمائی ہے کہ:

"خلیفہ کو عجیب عجیب مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔ اعدائے دین کی طرف سے بھی اور موافقین کی طرف سے بھی ان تمام مشکلات کا بس واحد علاج یہی ہے کہ مرضیات حق کو اپنا نصب العین بنا کر حق تعالیٰ ہی سے مدد طلب کی جائے اور اس کے غیر سے قطع نظر کر لی جائے"۔

ان تمام اقتباسات کی روشنی میں یہ کہنا بجا ہے کہ شاہ صاحب ایمان کو تباہ کرنے والے

حرکات سے بخوبی واقف تھے اور انہوں نے عقیدہ توحید کو مضبوطی سے پکڑا اور اسی پر قائم رہے۔ دوسروں کو بھی ضعیف الایمانی سے بچانے کی سعی کی۔ انہیں اللہ کی ذات سے رشتہ استوار رکھنے کی تلقین کرتے رہے۔ شاہ صاحب رقمطراز ہیں:

"اصل اصول البر وعمدة انواعه هو التوحيد وذلک لأنه يتوقف عليه الاخبات لرب العالمين الذى هو اعظم الاخلاق الكاسبة للسعادة وهو اصل التدبير العلمى الذى هو افيد التدبيرين وبه يحصل للانسان التوجه التام تلقاء الغيب ويستعد نفسه للحقوق به بالوجه المقدس وقد نبه النبى على عظم أمره وكونه من انواع البر بمنزلة القلب اذا صلح صلح الجميع واذا فسد فسد الجميع" (حجۃ اللہ البالغہ: صفحہ ۱۵۳)۔

تمام نیکیوں کی اصل اور عمدہ ترین نوع توحید ہی ہے، اس لئے کہ یہی رب العالمین کے روبرو عجز وانکساری کا دارومدار ہے، اور یہی سعادت کے حصول کا عظیم ترین خلق بھی ہے، یہی اس عملی تدبیر کی بنیاد ہے جو کہ دونوں تدبیروں میں مفید تر ہے۔ اس کے ذریعہ انسان کو غیب کی طرف کامل توجہ حاصل ہوتی ہے اور مقدس طریقہ سے اس کے نفس میں غیب کے ساتھ لاحق ہونے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ نبی ﷺ نے اس کی عظمت شان بیان کی اور اسے نیکیوں کی جملہ اقسام میں بمنزلہ قلب کے قرار دیا کہ جب وہ درست ہو جائے تو سارا بدن درست اور جب یہ خراب ہو جائے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔

## عقیدۂ توحید شاہ ولی اللہ کی نظر میں:

شاہ صاحبؒ کا عقیدہ جو کچھ ان کی کتابوں میں ہے وہ متن کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی شرح وتفصیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کو پیدا کیا۔ خاص طور پر ان کے احفاد میں شاہ اسماعیل شہیدؒ نے ان کے عقیدہ توحید کی شرح تقویۃ الایمان کے نام سے کردی۔ اس کتاب کو شاہ صاحب کے عقیدۂ توحید کی شرح سمجھنا چاہیے۔

علماء محققین نے توحید کی تین قسمیں کی ہیں۔ا توحید ربوبیت جس کے قائل ومعتقد مشرکین

مکہ بھی تھے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "ولئن سالتھم من خلق السموٰت والأرض لیقولن اللہ" (لقمان:۲۵) (اگر آپ ان سے دریافت کریں آسمان وزمین کا خالق کون ہے؟ تو یہ ضرور جواب دیں گے کہ اللہ)۔

دوسری قسم توحید اسماء وصفات کی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اسماء وصفات میں بھی کوئی شریک نہیں۔ وللہ الاسماء الحسنی فادعوہ بھا۔ (اعراف:۱۸۰)

تیسری قسم توحید الوہیت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ حقیقت میں عبادت کے لائق کوئی اور نہیں: "وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون"۔ (الذاریات:۵۶)

مشرکین مکہ توحید الوہیت میں اللہ تعالیٰ کو شریک گردانتے تھے اور ہر دور کے مشرکین توحید الوہیت میں ہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے تھے۔ چنانچہ تمام انبیاء کرام نے اپنی اقوام کو توحید الوہیت کی دعوت دی۔ "ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا أن اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت"۔ (النحل:۳۶)، (ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچو)۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ کی نظر میں عقیدۂ توحید کی حقیقت وہی ہے جو اسلاف کرام کی نظر میں ہے اور جس کا قرآن نے علماء امت سے مطالبہ کیا ہے۔ رسولوں کی بعثت کا بنیادی مقصد قرار دیا ہے، اپنی عملی زندگی میں جملہ انسانوں کو نافذ کرنے کا تاکیدی حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات وصفات میں اکیلا ماننا، خالق ورازق اور مدبر تسلیم کرنا، عبادت کی تمام اقسام کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ کو گردانتا، تمام کام صرف اللہ کے لئے کرنا، شرک کا ارتکاب نہ کرنا، قبروں میں مدفون اشخاص اور فوت شدہ بزرگان سے حاجات کی تکمیل نہ چاہنا، قرآن وحدیث میں بیان کردہ صفات خداوندی کو بغیر کسی تاویل وتحریف، تشبیہ وتمثیل کے تسلیم کرنا اور ان کو اسی انداز میں کسی غیر میں نہ ماننا ہی حقیقت توحید ہے اور شاہ صاحب کی زندگی میں یہ چیزیں بہت ہی نمایاں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے توحید کے چار مراتب کر کے اللہ تعالیٰ ہی کو واجب الوجود قرار دیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ شاہ صاحب نے کسی اور ذات کو اس لائق نہیں گردانا کہ وہ بھی ایسی صفتوں کی حامل ہیں بلکہ اللہ کی ذات ہے جو جملہ اشیائے کائنات کا خالق اور ہر طرح کی عبادت کا سزاوار ہے، انہوں نے مشرکین وصلحاء کی نوعیت عبادت کی سخت تردید کی ہے اور ان کے اس زعم "مانعبدھم

الالیقربونا الی اللہ زلفی" کو باطل قرار دیا ہے کہ الوہیت میں کسی کو شریک ٹھہرانا شرک عظیم ہے اور صلحاو نیک لوگوں کو تقریب الی اللہ کا وسیلہ اور سفارشی بنانا اپنے آپ پر ظلم کرنے کے مترادف ہے کیوں کہ ان لوگوں نے اللہ کی عبادت کر کے اس کا قرب حاصل کیا اور اب ان کا قرب حاصل کر کے صفات الٰہی کا حصول ممکن ہے؟ ہرگز نہیں!

اولیاء وصلحاء کو قرابت الٰہی کا وسیلہ تصور کرنا، اللہ کی ذات وصفات میں کسی کو شریک ٹھہرانا، کسی کو عبادت کا سزاوار ماننا، پتھروں کو تراش کر سجدہ وطواف کرنا، نذر ونیاز چڑھانا، غیروں کو ہر کام کا منتظم ومدبر خیال کرنا، مردوں کو سمیع وبصیر قرار دینا، قرآن میں بایں الفاظ "الھم ارجل یمشون بھا، ام لھم ایدیبطشون بھا، ام لھم اعین یبصرون بھا، ام لھم اذان یسمعون بھا" کی واضح تردید کے باوجود مدفون افراد سے مقصد برآری کی امید رکھنا، نصاریٰ کا مسیح علیہ السلام کو مخلوق سے اعلیٰ مقام عطا کرنا، منجانب اللہ عطا کردہ چند اوصاف کو دیکھ کر ابن اللہ اور اللہ کہنا، ناسمجھی کی بنا پر ان کو واجب الوجود قرار دینا یہ وہ امور ہیں جو عقیدہ توحید کے تقاضوں سے متصادم ہیں اور سب کے سب باطل ہیں اور گمراہ کن عقیدے ہیں۔ شاہ صاحب نے تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ان پہ لمبے چوڑے دعوے ہیں اور ان کے بیانات فضول وخرافات ہیں، یقیناً یہ حق کے متلاشی اور محقق کے اوپر مخفی نہیں ہے، قرآن کریم نے اس پر بحث کی ہے اور کافروں کے ان شبہات کی بھرپور تردید کی ہے" (حجۃ اللہ البالغہ: صفحہ ۱۵۵)۔

شاہ صاحب کا زمانہ بڑی ہی مشکلات سے پُر تھا۔ ان کے عہد میں تصوف کا رنگ غالب تھا اب اس میں مکمل طور پر اشتغال رکھنا یا مکمل طور پر بری ہونا شاہ صاحب کے اصلاحی وتجدیدی کاموں میں مخل ہوسکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے فلسفہ آمیز اور خرافات واوہام سے آلودہ تصوف کی نفی کی ہے اور اس تصوف سے وابستگی پر زور دیا ہے جو شریعت کے عین تابع ہو، بایں ہمہ شاہ صاحب خود تصوف کی بھول بھلیوں سے باہر نہیں آسکے اور تصوف کے باب میں بعض جگہوں پر آپ کی شطحیات کو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ چیزیں آپ سے سرزد ہوئی ہوں گی۔

شاہ صاحب کے نزدیک اس باب میں توحید کے کئی مراتب ہو جاتے ہیں۔ توحید محبت، توحید افعال، توحید صفات، توحید ذات پھر یادداشت پھر دوام، بہرحال تصوف کے پیرائے میں

توحید کو کئی خانوں میں بانٹ کر دراصل اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق پختہ بنانا ہے۔ اب جہاں ان کی تعلیمات سے واضح ہوتا ہے وہاں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ جملہ امور کو اللہ تعالیٰ کے لئے خاص کیا ہے اور ان جملہ اوصاف وصفات کو جو قرآن میں مذکور ہیں، ان کو اللہ کے علاوہ کسی غیر میں ثابت ماننا شرک ہے۔ شرک اور مظاہر شرک سے انہوں نے خود کو بچایا ہے اور دوسروں کو بچنے کی تاکید کی ہے، ان کا اس بات پر ایمان تھا کہ:

"اتفقوا علی الایمان به علی الوجه الذی اراد الله تعالیٰ منها واوجب تنزیهه عن متشابهات المخلوقات بقوله "لیس کمثله شیٔ" فمن اوجب خلاف ذلک بعدهم فقد خالف سبیلهم"۔

یعنی امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اسماء وصفات پر اس طرح ایمان رکھا جائے جیسے وہ مروی ہیں اور جیسے اللہ تعالیٰ کی مراد ہے، اور مخلوق کی مشابہت سے پاک گردانا ضروری ہے۔ فرمایا: اس کے مانند کوئی شیٔ نہیں ہے اور جو ان کے برعکس راہ اختیار کرے اس نے راہ کی مخالفت کی۔

شاہ صاحب جہاں اسلامی معاشرے میں پیدا شدہ غلط افکار ونظریات اور باطل رسومات کے استیصال کے لئے کوشاں تھے وہیں آپ نے مسلمانوں کے عقائد کی درستگی پر کافی توجہ دی، اسماء وصفات میں بے جا تاویلات اور عمیقانہ غور وفکر کو ضلالت اور گمراہی کا نشان قرار دیا۔ اور اللہ کی ذات کی ہر اس چیز سے نفی کی جو اس کی شان کے منافی ہے بالخصوص ایسے اوصاف سے اس کو مبرا قرار دیا ہے جو ظالم لوگ اس کے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ اللہ تنہا واکیلا ہے نہ جنا ہے اور نہ جنا گیا ہے۔ جملہ مذاہب سماویہ کا اس پر اتفاق ہے ہم ایسے معانی میں زیادہ تامل سے کام نہ لیں کہ عقل کی رسائی سے باہر ہو جائے اور انکار کے مراحل سے گزرنا پڑے بلکہ مسلمانوں کو وہ طریقہ اپنانا چاہئے جو مشہود لہا بالخیر کے لوگوں کا تھا۔ کیوں کہ اسماء وصفات توقیفی ہیں جیسا کہ شاہ صاحب نے "حجۃ اللہ البالغہ صفحہ: ۱۵۸" میں بیان کیا ہے۔

"والحق ان صفاته واسماءهٗ توقیفیة بمعنی انا وان عرفنا القواعد بنی الشرع بیان صفاته تعالیٰ علیها کما حررنا فی صدر الباب لکن کثیرا من الناس لو أبیح لهم الخوض فی الصفات لضلوا وأضلوا"۔

حق بات یہ ہے کہ اس کی صفات ونام توقیفی ہیں، یعنی اگرچہ ہم ان قواعد کو سمجھتے ہیں کہ جن

پر شریعت نے حق تعالیٰ کی صفات بیان کرنے کی بنیاد رکھی ہے جیسے کہ ہم نے شروع باب میں بیان کیا ہے مگر اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر ان کے لئے صفات میں غور وخوض کو جائز قرار دیا جاتا تو وہ بھی گمراہ ہوتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے۔

یہ بات ہر کس وناکس کو معلوم ہونی چاہئے کہ اجازت نہ ہونے کے باوجود بھی لوگوں نے ان کے اندر اپنے عقلی گھوڑے دوڑائے اور گمراہی میں مبتلا ہوگئے اور ایسا کیوں نہ ہو جب انسان کا عقیدہ توحید محکم نہ ہو تو وہ یوں ہی ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا اور حیرت واستعجاب کے بحر عمیق میں غوطہ زنی پر مجبور رہے گا۔ چنانچہ اس باب میں شاہ صاحب نے محدثین کرام کا طریقہ اپنایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں غور وخوض کو جائز قرار دے کر اہل حدیث پر زبان طعن دراز کرنے والوں کی شاہ صاحب نے مذمت کی ہے اور انہوں نے اصحاب الحدیث کی تعریف کی ہے اور اعتراف حقیقت کو بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں:

"استطال هولاء الخائضون على معشر اهل الحديث وسموهم مجسمة ومشبهة وقالوا هم المسترون بالكفالة وقد وضح على وضوحا بينا ان استطالتهم هذه ليست بشئ وانهم مخطئون فی حقالتهم رواية ودراية وخاطئون في طعنهم أئمة الهدیٰ"۔

غور وخوض کرنے والوں نے اہل حدیث پر زبان درازیاں کی ہیں اور انہیں مجسمہ ومشبہ کا نام دیا ہے اور کہا ہے کہ لوگ تجسیم وتشبیہ کو چھپاتے ہیں اور مجھ پر خوب واضح ہوگیا ہے کہ ان کی زبان درازیاں بے معنی ہیں اور یہ لوگ روایت ودرایت کے اعتبار سے اپنی زبان درازی میں غلطی پر ہیں اور ائمہ ہدیٰ پر طعن کرنے کے سلسلے میں خطا کار ہیں۔

"واحسرتا! اہل اللہ اور عارفین ہر زمانے میں ہوتے ہیں مگر ایسا مرد حقانی جو ایک طرف اوصاف حمیدہ کا جامع ہو دوسری طرف کتاب وسنت کے علم میں مجتہد مطلق کا درجہ رکھتا ہو، حقائق ومعارف کا بحر مواج اور دیگر علوم کا دریائے فیاض ہو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو عقیدۂ توحید کی حقیقت وافادیت سمجھنے کی توفیق دے اور شاہ ولی اللہ کی ان تعلیمات کو اپنانے کی جو کتاب وسنت کے عین مطابق ہوں نیز انہیں عملی زندگی میں نافذ کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

# سلطنتِ مغلیہ کا زوال ــــ تجزیہ ولی اللٰہی

پروفیسر ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی ☆

مغل سلطنت کی تباہی حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۴ر شوال ۱۱۱۴ھ/۲۱ر فروری ۱۷۰۳ء متوفی ۲۹ر محرم ۱۱۷۶ھ/۲۰ر اگست ۱۷۶۲ء) کی زندگی میں شروع ہوئی۔ وہ اس کے پہلے پچاس برسوں کا عینی شاہد تھے۔ اپنی آنکھوں سے عظیم سلطنت کی مستحکم عمارت کو بنیادوں سے ہلتے دیکھا۔ ان کے سماجی شعور اور سیاسی بصیرت نے زوالِ سلطنت کے اسباب وعوامل کا ادراک کیا اور ان کے تدارک کی صحیح راہ سجھائی۔ حضرت شاہؒ صاحب ایک دینی عالم اور مذہبی قائد تھے۔ وہ سیاست داں اور سیاسی رہنما نہ تھے۔ بایں ہمہ وہ سماجیات کے ماہر ونبض شناس تھے۔ دین ومذہب کا براہ راست واسطہ فرد سے بھی ہوتا ہے اور معاشرہ سے بھی۔ دینی تبحر اپنے سماجی ماحول اور اس کے تقاضوں سے ناآشنا نہیں رہ سکتا۔ شاہ ولی اللہؒ صاحب نے مسلم ہندی سماج کے مطالعہ میں سلطنت وریاست اور حکمراں طبقات کو بھی نگاہِ تجزیہ میں رکھا لہٰذا ان کا تجزیہ زوال دراصل قومی زوال کا تجزیہ ہے۔

ان سے تین صدی قبل عظیم ترین مسلم ماہر فلسفہ تاریخ وسماجیات ابن خلدون (۱۳۳۲/۷۳۲-۱۴۰۶/۸۰۸) نے مسلم ریاست وسماج کے زوال وسقوط کا مطالعہ اسی سماجیاتی تناظر میں کیا تھا۔ یہ یقینی ہے کہ شاہ صاحبؒ ان کے افکار سے بخوبی واقف تھے مگر دونوں میں ایک بڑا فرق ہے: ابن خلدون خالص ماہر مورخ اور نباض سماجیات تھے اگرچہ ان کے مطالعۂ دینی سے قطعی انکار نہیں۔ شاہ صاحبؒ علوم دینی کے ماہر اور مصنف اور تجزیہ نگار تھے۔ تاریخی بصیرت کا

☆ ڈائریکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

حامل تھے مگر تواریخ کے مصنف و تحلیل نگار نہ تھے۔ انہوں نے دینیات و اسلامیات کے حوالے سے یا ان کے تناظر میں تاریخ اور اس کی اقدار و آثار کے بارے میں ہی تحریر فرمایا یہی وجہ ہے کہ تاریخی امور و واقعات پر ان کی نگارشات ضمنی، مختصر اور بالواسطہ پائی جاتی ہیں۔ مسلسل و مربوط تجزیہ کی صورت میں نہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی اور سماجی تجزیے کو اسی پس منظر میں دیکھنا اور پرکھنا چاہیئے۔ اس مختصر مقالے میں مغل سلطنت کی تباہی و بربادی، ابتری اور لخت لخت ہونے کا مطالعہ اسی صحیح تناظر میں کیا جارہا ہے۔

ارتفاقات کی بحث پورے معاشرہ انسانی کے تمام اعضاء و جوارح میں باہمی ارتباط و تعامل کو پیش کرتی ہے۔ شاہ صاحب نے ان چاروں ارتفاقات سے وابستہ انسانی سماج کے ارتقاء کارکردگی اور تعامل کو واضح کیا ہے۔ اسی ضمن میں یہ بھی بتاتے چلے گئے ہیں کہ سماج و معاشرہ کے باہمی اشتراک و تعامل میں خرابی، کجی اور بے راہ روی آتی ہے تو زوال، انتشار اور ابتری وافراتفری کا عمل شروع ہوتا ہے جو پورے معاشرہ کی بربادی و تباہی پر ختم ہوتا ہے۔ بالعموم اس بحث کو ایک نظریاتی بحث سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے مصنف گرامی کا حالات زمانہ سے گہرا تعلق ہے اور وہ عام انسانی سماج و تہذیب کے ارتقاء، عروج، زوال اور سقوط کا معاصر فلسفہ ہے اور سماجی تجزیہ بھی کیونکہ کوئی بھی باشعور مصنف اور صاحب بصیرت تجزیہ نگار اپنے زمانہ کے سیاسی وسماجی واقعات سے غیر متعلق نہیں ہوسکتا ابن خلدون کا پورا فلسفہ تاریخ اور تمام تر حکمتِ سماجیات ان کے عصری واقعات کا عطیہ بھی ہے اور ان کا تجزیہ بھی۔

مورخین بالعموم اور ماہرینِ سیاسیات بالخصوص سیاسی واقعات، عناصر، اسباب و عوامل پر زیادہ زور دیتے ہیں اس کے نتیجے میں قوموں اور ملکوں، سلطنتوں اور بادشاہتوں کے عروج وزوال، فرمانرواؤں اور حکمراں طبقات کے کارناموں یا نالائقیوں کا افسانہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ان کے طریق فکر و تجزیہ میں سیاست تمام سماجی اچھائی یا برائی کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اسی طرزِ فکر نے تاریخ کو بڑے اشخاص اور اکابر و ابطال کے کارناموں کا دفتر بنانے کا نظریہ و تصور بنا کر رکھ دیا ہے۔ ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ نے پورے سماج پر نظر رکھی ہے اور سیاست کو اس کا صرف ایک جزو مانا ہے۔ ان کے فکر و فلسفہ میں معاشرہ و معاشرت اصل ہے اور سیاست اس سے اپنے وجود کی نیرنگیاں حاصل کرتی ہے۔

صحت مند، ارتقاء پذیر، صلاحیت سے بھرپور معاشرہ سیاسی، تمدنی، معاشی، فوجی ہر طرح کے کمال وعروج لاتا ہے۔ بیمار، زوال آمادہ، لیاقت سے خالی سماج ہر طرح کی ابتری، افراتفری، انارکی اور تباہی وبربادی کا باعث بنتا ہے۔ فکرولی اللہی میں سیاسی زوال اور مغل سلطنت کی ابتری دراصل ہندی مسلم قومی معاشرے کی سماجی شکست وریخت کا محض ایک شعبۂ حیات کی انارکی کا قصہ ہے۔

حکمتِ ولی اللہی کی ہمہ گیری پر نظر نہ ہونے کا باعث مورخین وماہرین سیاسیات کسی ایک سبب کو یا دو چار اسباب کے مجموعہ کو مغل سلطنت کے زوال، سقوط اور تباہی کا باعث قرار دے دیتے ہیں اور کل کی خبر نہیں رکھتے، ایک مشہور مورخ کا خیال ہے کہ ''شاہ صاحب نے مسلم سوسائٹی اور سلطنت کے مغلیہ زوال وانحطاط کے اسباب علاحدہ علاحدہ متعین کیے تھے...... مسلم سوسائٹی کے زوال کا سبب ان کے خیال میں مذہبی شعار سے بے اعتنائی اور علوم دینیہ سے بے تعلقی تھی۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کا سبب انہوں نے اقتصادی انحطاط کو قرار دیا تھا، اسی کے باعث تمام سیاسی انتشار اور بدنظمیاں پیدا ہوئی تھیں۔''

(شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مقدمہ مرتب، ۵)

اس ناقص تجزیہ میں سماج اور سیاست کے دونا آشنا، غیر متعلق اور درجہ بند اکائیوں کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کل کے اجزاء کی باہمی بیگانگی اور ان کے ایک دوسرے سے جداگانہ فعل کا غیر حقیقت پسندانہ نظریہ بھی پوری طرح موجود ہے۔

اقتصادی بحران اور معاشی ابتری پر زور دینے کا رجحان اور تجزیہ بعض دوسرے اہل قلم کے یہاں بھی ملتا ہے شاہ صاحب کی شاہکار کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے ''باب سیاسۃ المدنیہ'' کا آخری اقتباس ان ماہرین کا دستاویزی ثبوت ہے۔ جو اپنے سیاق وسباق سے کاٹ کر اور پوری حکمتِ ولی اللہی سے صرفِ نظر کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے وہ اقتباس حجۃ:

''......وغالب سبب خراب البلدان فی هذا الزمان شیئآن: احدهما تضییقهم علی بیت المال بان یعتادوا التکسب بالاخذ منه علیٰ انهم من الغزاة او من العلماء الذین لهم حق فیه او من الذین جرت عادة الملوک بصلتهم کالزهاد والشعراء او بوجه من وجوه القیامة ویکون العمدة عندهم هو التکسب دون بالمصلحة فیدخل قوم علی قوم فینغضون علیهم ویصیرون کلا علی المدنیة، والثانی ضرب

الضرائب الثقيلة على الزراع والتجار والمحترفة والتشديد عليهم حتى يفضى الى احجاف المطاوعين واستئصالهم والى تمنع اولى باس شديد وبغيهم، وانما تصلح المدنية بالجباية اليسيرة واقامة الحفظة بقدر الضرورة، فلينبه اهل الزمان لهذه النكتة، والله اعلم".
(حجة الله البالغه ۱/۴۵)

ترجمہ: اس زمانے میں ملک کی خرابی ؤویرانی کے زیادہ تر دو سبب ہیں: ایک بیت المال یعنی ملک کے خزانہ پر تنگی، وہ اس طرح کہ لوگوں کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ کسی محنت کے بغیر خزانہ سے روپیہ اس دعویٰ سے حاصل کریں کہ وہ سپاہی ہیں یا عالم ہیں جن کا حق اس خزانہ کی آمدنی میں ہے، یا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو بادشاہ خود انعام واکرام دیا کرتے ہیں جیسے زہد پیشہ صوفی اور شاعر، اور دوسرے گروہوں میں سے جو ملک وسلطنت کے کسی کام کے بغیر کسی نہ کسی طریقہ سے روزی حاصل کرتے ہیں جو محنت کے بغیر ان کو ملتی ہے۔ یہ لوگ ان کے اور دوسروں کے ذرائع آمدنی کو کم کردیتے ہیں اور ملک پر بوجھ ہیں۔

دوسرا سبب کاشتکاروں، بیوپاریوں اور پیشہ وروں پر بھاری محصول لگانا اور ان پر اس بارے میں سختی کرنا ہے، یہاں تک کہ جو بیچارے حکومت کے مطیع اور اس کے حکم کو مانتے ہیں وہ تباہ ہورہے ہیں، اور جو سرکش ونادہند ہیں وہ اور سرکش ہورہے ہیں اور حکومت کے محصول نہیں ادا کرتے۔ حالانکہ ملک اور سلطنت کی آبادی سستے محصول اور فوج اور عہدہ داروں کے بقدر ضرورت تقرر پر ہے۔ چاہئے کہ اس زمانہ کے لوگ ہوشیار ہوکر سیاست کے اس راز کو سمجھیں" سید سلیمان ندوی، الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر، ۳۴۹، ۳۵۰، خلیق احمد نظامی، سیاسی مکتوبات، ۸۔۹۔ سعید احمد پالن پوری، ترجمہ حجۃ ۱/۱۷۴،۲/۱۷۴۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے اس اقتباس کی بنا پر عنوان لگایا ہے: "ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال کا سبب۔ شاہ صاحب کی نظر میں" علامہ موصوف کا علمی شعور انہے صرف ایک سبب ہی گردانے کو کہتا ہے۔ سیاسی مکتوبات کے مرتب گرامی نے اس اقتباس اور مکتوبات کی بنا پر

لکھا ہے کہ "......زوال کے اسباب یہ متعین کیے ہیں: (۱) خالصہ کے علاقہ کا محدود ہونا۔(۲) خزانہ کی قلت۔ (۳) جاگیرداروں کی کثرت۔ (۴) اجارہ داری کے مسموم اثرات (۵) افواج کے مواجب کا بروقت نہ ملنا، وغیرہ وغیرہ۔" (سیاسی مکتوبات:۱۰)

بلاشبہ حضرت ولی اللہ دہلوی کی فکر میں زوال سلطنت کا ایک بنیادی سبب معاشی ابتری اور اقتصادی بدحالی اور بحران بھی تھا۔ لیکن وہ سیاسۃ المدنیہ (نظام حکومت) کی بحث کا آخری تجزیاتی حصہ ہے۔ پوری بحث میں وہ ہیئت اجتماعیہ اور کل سماجی حالت کی کارگذاری کی بات کرتے ہیں اور مختلف سیاسی، سماجی، اخلاقی، تہذیبی اور مذہبی شعبوں کے باہمی تفاعل پر زور دیتے ہیں۔ ویرانی ملک (بلدان) کا غالب سبب اقتصادی بحران بہت سے دوسرے بنیادی سماجی شعبوں کی بربادی کا زائیدہ و نتیجہ تھا۔

جن سماجی خرابیوں اور معاشرتی اسباب کا شاہ صاحب نے عمومی ذکر کیا ہے ان میں سے کئی اخلاقی ہیں اور کئی سماجی۔ ان میں سے ایک دو معاشی بھی ہیں لیکن ان کی سماجی، اخلاقی اور تہذیبی برائی بھی ہے اور وہ سب مل کر زوال پذیر معاشرہ اور خللِ نظام حکومت کا باعث بنتی ہیں۔ ان کی تعداد آٹھ بتائی ہے اور ان سب پر معاصر حالات کی گرد جمی ہے۔

(۱) مفسدین اپنے برے مقاصد کے لئے من مانی کرتے اور انصاف کی راہ ترک کردیتے ہیں اور فساد و فتنہ پھیلاتے ہیں۔

(۲) ظالم لوگ قتل، آبروریزی، ڈکیتی، چوری، تہمت طرازی، غنڈہ گردی اور اس جیسے دوسرے مفسدانہ کام کرتے ہیں۔

(۳) جادوگری، خورد و نوش کی چیزوں میں ملاوٹ، دنگا فساد کی تعلیم، عوام کو حکومت کے خلاف مشتعل کرنا اور باغیانہ حرکات بھی باعث فساد ہیں۔

(۴) عوام و خواص کی بری عادت و رسوم بھی نظام حکومت میں خلل کا باعث بنتی ہیں جیسے جنسی بے راہ روی، شراب نوشی وغیرہ۔

(۵) جوا، قمار بازی، سود خالص یا سود مرکب، رشوت ستانی، ناپ تول میں کمی، تاجرانہ مکاری، ذخیرہ اندوزی وغیرہ بھی ان میں ہیں۔

(۶) بلاوجہ کے اختلافات وتنازعات اور مقدمات جو لوگوں کے اخلاق کو خراب کرتے اور معاشرہ کے نظام کو تباہ کرتے ہیں۔

(۷) شہری لوگوں کی بادیہ نشینی یا دیہاتیوں کی شہروں میں بلا روک ٹوک آبادی، زراعت، تجارت وغیرہ کو نظر انداز کرنا بھی تباہ کن ہے۔

(۸) حملہ آور درندوں کی کثرت، موذی حشرات کا انتشار یا مختلف بیماریوں کا پھوٹ پڑنا بھی نظام حکومت کو لے ڈوبتا ہے۔

ولی اللہی حکمت میں دین و معاشرہ اور دینی احکام و امور کی بجا آوری اور سماجی استحکام کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ دین، دینی شعائر اور اسلامی فرائض و سنن و مستحبات کو انہوں نے سماجیاتی تناظر میں نہ صرف دیکھا اور پرکھا ہے بلکہ صحیح دین پر عمل درآمد اور احکامِ الٰہی کی پابندی اور فرامین نبویؐ کی تعمیل کو معاشرہ کی صحت، ترقی اور استحکام کے لئے ناگزیر بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ دین اور دینی احکام و معاملات سے غفلت و کوتاہی اور ان کی علانیہ یا خفیہ خلاف ورزی بربادی کی طرف ہی لے جائے گی۔ دین سے غفلت و بیگانگی بھی اسی طرح باعث فساد ہے، نہ صرف افراد کے اخلاق و کردار کے لئے بلکہ پورے معاشرہ کے لئے۔ اسلام کے سماجیاتی پہلو اور دین کی معاشرتی حرکیت کا فلسفہ خاص ولی اللہی فلسفہ ہے اور اس میں ان کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ عام اسبابِ زوال کے علاوہ مغل سلطنت کے سقوط اور ان کے معاصر مسلم سماج کی ابتری کا اس سے گہرا ربط ہے۔

تفہیمات الٰہیہ اور بعض دوسری نگارشات میں شاہ صاحب نے مسلم معاشرہ کے مختلف طبقات کو ان کی خرابیوں اور بے اعتدالیوں سے آگاہ کر کے ان کو صحیح راہ اعتدال اختیار کرنے کی نصیحت کی ہے۔ ان کا سارا زور اس امر پر ہے کہ ان معاشی اور معاشرتی برائیوں نے سماج کو کھوکھلا کر کے نظامِ سلطنت کو آمادۂ زوال کر دیا اور یہ برائیاں ان میں محض اس لئے در آئیں کہ انہوں نے صحیح اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کر دیا اور من مانی زندگی اور خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی۔ امراء اور حکمراں طبقات کی مسرفانہ زندگی بے محابا اخراجات، لذائذ دنیا کی حرص صرف خشیت الٰہی کے فقدان کا نتیجہ تھی عام سپاہ اور عوام کا اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ اسراف تک لے گیا اور ان کو مالی مشکلات میں مبتلا کرنے کے علاوہ رفاہِ عام اور باہمی تعاون اور انسانی خیر سگالی کے جذبات سے

خالی کر گیا۔ مشائخ وصوفیہ نے مریدوں کا مالی استحصال کیا خود بھی اخلاق سے گئے اور ان کو بھی فساد خلق میں مبتلا کر دیا۔ علماء نے شہرت و منصب کی خاطر آیات الٰہی کو فروخت کر دیا۔ سماج کے امر بیل طبقوں نے محنت ومشقت سے جی چرایا اور دوسروں کی آمدنی پر بوجھ بنے تو خود بھی بیکار ہوئے اور ذرائع کو خشک کیا۔ یہ انفرادی، طبقاتی، معاشرتی خرابیوں کی پیدائش کی وجہ صرف یہ ہے کہ سب نے اسلامی احکام کو نظر انداز کر دیا اور اس کے نتیجہ میں معاشرے اور سماج میں خرابی پیدا ہوگی بلکہ خرابیوں کی بھر مار ہوگی، اور بیمار معاشرہ کا نظام حکومت صحت مند نہیں رہ سکتا۔

آمد سے زیادہ خرچ اور مسرفانہ زندگی نے مغل حکمرانوں کو بھی انتظامی بے اعتدالیوں بلکہ بربادیوں کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔ دورِ زوال میں صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ مغل شہنشاہ انتظامی اداروں کے غیر فعال ہونے کے سبب خالصہ آراضی کو اجارہ پر دینے لگے۔ محض اس لئے کہ ان کو اپنے سرکاری محاصل اور زرعی آراضی کی آمدنی وصول کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی صوبیداروں، والیوں، گورنروں اور دوسرے تمام ماتحت منتظموں نے اپنی اپنی آراضی بٹائی پر دینے کا آغاز کر دیا کیونکہ وہ نقد تنخواہ دینے کے لائق نہیں رہ گئے تھے۔ نقد تنخواہ کی جگہ اقطاع نظام کا بے محابا پھیلاؤ اوپر سے نیچے تک پھیل گیا تو استحصال فساد، قتل وغارت گری، لوٹ مار اور انتظامی وسماجی ابتری کا وہ دور دورہ شروع ہوا جس نے مغل سلطنت کو برباد کر کے چھوڑا۔ یہ انتظامی ابتری، سماجی خرابی اور سلطنت کی بربادی محض اس بنا پر تھی کہ اسلامی نظام عدل وحکومت کو تج دیا گیا تھا۔ بقول امام غزالی ملک و پادشاہی کفر کے ساتھ تو باقی رہ بھی سکتی ہے مگر ظلم و بے انصافی کے ساتھ اس کا بچ جانا ناممکن ہے۔

شاہ ولی اللہ نے تفہیمات الٰہیہ میں حکمرانوں کو نظام عدل قائم کرنے کا مشورہ دیا ہے کہ اس کے بغیر زندگی محال ہے۔ اسی بنا پر وہ ان سے کہتے ہیں کہ ایک مناسب مسافت پر صاحب عدل امیر کی موجودگی اور تقرری ضروری ہے تاکہ وہ ظالم سے مظلوم کا حق لے سکے، شرعی حدود کو قائم کرے کہ بقول قرآن مجید اسی میں سب کی زندگی کی بقا کا راز وحکمت پوشیدہ ہے۔ امیروں کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اس بات کی پوری کوشش کریں کہ لوگوں میں سرکشی وبغاوت، جنگ وقتال، ارتداد و بے دینی اور کبائر نہ پھیلیں، ان کے بجائے اسلام کی اشاعت اور اسلامی

شعائر کا غلبہ ہو، مثبت انداز سے وہ اپنے علاقوں پر ہر شخص کو اس کے فرائض ادا کرنے پر مجبور کرے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب ہر امیر کے پاس اتنی قوت وشوکت ہو کہ وہ اپنے علاقہ وشہر کی اصلاح پر قدرت رکھتا ہو۔ لیکن وہ اتنا طاقتور اور صاحب اقتدار بھی نہ بن بیٹھے کہ وہ اپنی قوت کو ذاتی منافع اور استحصال کے لئے استعمال کرے اور بادشاہ وقت کے خلاف بغاوت کر بیٹھے۔ مغل سلطنت کے دگرگوں حالات اور ملک وعلاقہ جات کا بدامنی سے بھرپور معاملات کے پیش نظر شاہ صاحب نے یہ نصیحت بھی کی تھی کہ ہر بڑی اقلیم میں ایک امیر کبیر ہو جس کے پاس بارہ ہزار مخلص وسرفروش مجاہدین ہوں جو صرف باغیوں، سرکشوں اور فسادیوں کے خلاف قتال وجہاد کرتے رہیں۔ فساد وبغاوت کے فرو ہونے کے بعد ہی تدبیر منزل یا شہری انتظامات کی درستی کی باری آتی ہے اور ان سب جہاد وقتال اور شہری انتظامات میں شریعت کے مطابق عمل ہو کیونکہ صرف اسی سے امن وامان اور بہتر نظام پیدا ہو سکتا ہے۔

— شر وفساد اور قتل وغارت گری اور سماج ومملکت کی ابتری کے لئے شاہ ولی اللہ دہلوی نے تین طبقات کو سرفہرست رکھا ہے اور یہ ہیں: مرہٹہ، جاٹ اور سکھ، ان کے علاوہ وہ مغل سلطنت کے باغی امراء کو بھی سلطنت کے زوال کے لئے ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ ان تمام مسلم وغیر مسلم طالع آزما طبقات نے اپنے ذاتی، طبقاتی اور فسادی مقاصد کے لئے پورے معاشرہ کو تہس نہس کر ڈالا تھا اور مغل سلطنت کو بربادی کے آخری دہانے تک لے جا رہے تھے۔ شیخ محمد اکرام نے بالکل صحیح تجزیہ کیا ہے کہ "...... مغل فوج میں صرف آرام طلبی اور محنت سے جی چرانے کا مرض ہی نہ تھا بلکہ ان میں غدار اور نمک حرام بھی بہت تھے۔ جس کثرت سے مغل سپہ سالار مرہٹوں سے مل جاتے تھے اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔" سیاسی افراتفری سماجی اقدار اور مذہبی احکام کی خلاف ورزی کا نتیجہ تھی اور اس کی ذمہ داری مغل حکمرانوں پر عائد ہوتی تھی اور امراء پر بھی۔ (رود کوثر، کراچی غیر مورخہ ۲۱۶)

— حجۃ اللہ البالغہ کے متعدد ابواب اس سیاسی مرض سے بحث کرتے ہیں جیسے باب سیرۃ الملوک، باب سیاسۃ الاعوان، باب الخلافۃ الکبری وغیرہ۔ فری لینڈ ایبٹ (Freeland Abbott) کا تبصرہ اور تجزیہ اس سے بھی زیادہ حقیقت پسندانہ ہے کہ مسلم معاصر سماج خود اپنے خلاف برسر پیکار

تھا "indeed the Community was divided against itself" انہوں نے سنی شیعہ اختلاف، علماء وصوفیہ نزاع، صوفیہ کی باہمی گروہ بندی اور وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود پر جدال، علماء کی فقہی مکاتب فکر میں تقسیم اور طبقاتی فساد اور متعدد دوسرے سماجی اختلافات وتنازعات کا ذکر کر کے واضح کیا ہے کہ شاہ صاحب کو اپنی معاصر سوسائیٹی کی ابتری اور اس کے نتیجہ میں پوری سلطنت کی خانہ بربادی کا پورا اندازہ تھا اسی بنا پر انہوں نے افہام وتفہیم اور تطبیق وموافقت کی راہ اپنائی اور وہی حکمت ولی اللہی کی ایک عظیم ترین صفت ہے۔ مسلم سماج میں متشددانہ فقہی جمود سے وابستگی نے جنگ وجدال اور سماجی تقسیم کی راہ ہموار کی اور عجیب تربات یہ ہے کہ ان فقہی تعبیرات سے کورانہ اور شدید وابستگی پیدا کی جو دوسرے علاقوں اور گذشتہ زمانوں کے لئے خاص تھے۔ ہندی مسلم فقہاء نے ان کو اسلامی عقائد وتعلیمات کا درجہ دے دیا اور اجتہادی احکام وفروع کی وقتی ومقامی نوعیت کو نہیں سمجھا اسی لئے شاہ ولی اللہ ہندی علماء وفقہاء کو اپنے ملک وملت کے حالات کے موافق اجتہاد کا حق دلانا چاہتے تھے تاکہ اسلام اور اس کی شرعی تعلیمات کی صحیح تعبیر اور موافق تشریح سے ہندی مسلم سماج ابتری کے بندھنوں سے نکلے۔

(Freeland Abbott "The Decline of the Mughal Empire and shah waliullah" (The Muslim world, Harlford, USA, Vol. L11, No.2,April 1962,115-23).

زوال سلطنت کے اسباب میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے متعدد اخلاقی، سیاسی، سماجی اور معاشی وجوہ واسباب کو عمومی طور سے شامل کرنے کے علاوہ تاریخ عالم سے شہادتیں فراہم کی ہیں اور ان کا موازنہ معاصر مغل سلطنت سے کیا ہے۔ رومی اور ساسانی سلطنتوں کے زوال سے بحث کرتے ہوئے جو اہم اسباب زوال بیان کئے ہیں ان میں شامل ہیں: (۱) جانشینی کا مسئلہ (۲) مسرفانہ زندگی اور دولت کا غیر پسندیدہ استعمال (۳) غیر منصفانہ نظام محاصل، (۴) کاشتکاروں اور پیشہ والوں کی بری حالت، (۵) اور سماجی امر بیل طبقات کے خزانے اور ذرائع دولت پر بے حق اثرات وحقوق۔ ان کے آخر میں شاہ صاحب کا تبصرہ نہایت اہم ہے، فرماتے ہیں کہ "پرانی کہانیوں کو دہرانے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان تمام چیزوں کو تم اپنے شہروں کے

حکمرانوں اور بادشاہوں کی زندگی میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو"۔

اعلم ان العجم والروم لما توارثوا الخلافة قرونا كثيرة وخاضوا فی لذة الدنيا ونسوا الدار الآخرة واستحوذ عليهم الشيطان تعمقوا في مرافق المعيشة وتباهوا بها...... وذكر ذالك يطول، وما تراه من ملوك بلادك يغنيك عن حكاياتهم...... باب اقامة الارتفاقات واصلاح الرسوم: ۱/۱۰۴، ۱۰۵، رحمة الله والواسعة، ۲/۲۳۹، ۲۴۶۔

شاہ صاحب نے اس بحث میں رومی اور ایرانی شہنشاہوں کے زوال اور مغل معاصر سلطنت کے زوال کے درمیان قدر مشترک پائی ہے اور سچ بات یہ ہے کہ عروج وزوال اقوام کے بنیادی اسباب وعوامل یکساں ہی ہوتے ہیں، بعض عوامل کا فرق ممکن ہوتا ہے اور فی الواقع ہوتا بھی ہے لیکن ان کی حیثیت ضمنی یا ثانوی یا مقامی ہوتی ہے۔

اس بحث میں سے اہم نکتہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ نے عیش کوشی اور اس کے مظاہر کو بنیادی سبب زوال قرار دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں امراء و پادشاہ اور ان کی دیکھا دیکھی عوام وخواص کے طبقات مسرفانہ زندگی اختیار کرتے ہیں اور وہ محض بری رسوم اور قبیح عادات اختیار کرنے کے سبب ہوتی ہے۔ عمدہ کھانے، بہترین لباس، شاندار مکانات اور فضول خرچی پر مبنی سماجی رسوم اختیار کرنے کی بنا پر ان میں یہ رسوم وعادات در آتی ہیں۔ اس کے لئے وہ آمدنی سے زیادہ خرچ کرتے ہیں، زیادہ مال خرچ کرنے کے لئے پادشاہ اور حکمراں طبقات کسانوں اور تاجروں وغیرہ پر بھی بھاری محاصل لگاتے ہیں اور ان کی وصولیابی کے لئے ان کو بے انتہا تنگ کرتے ہیں۔ انکار کرنے والوں کو سزاؤں سے اور جنگوں سے برباد کرتے ہیں اور اطاعت وفرمانبرداری کرنے والوں کو معاشی گدھا بنادیتے ہیں اور اس طرح ان کی شخصیت اور ان کا اخلاق تباہ ہوجاتا ہے۔ وہ محض اپنی معاشی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کی مشین بن کر رہ جاتے ہیں اور سعادت اخروی بلکہ سعادت دارین حاصل کرنے سے قطعی محروم ہوجاتے ہیں۔ عوام وخواص اور امراء وحکمرانوں کی یہ اخلاقی تباہی دولت وسلطنت کا زوال بن جاتی ہے۔

اخلاقی اور سماجی خرابیوں کی جڑ شاہ ولی اللہؒ رسومِ غیر اسلامی اور عادات قبیحہ میں تلاش

کرتے ہیں۔ ہندی مسلم سماج نے زیادہ بڑے پیمانے پر اور ہندی مسلم سلطنت نے اپنے خاص دائرے میں بہت سی رسوم وعادات، ملک کی اکثریت سے مستعار لے لی تھیں۔ ان میں بہت سی انتظامی اور اخلاقی اور سماجی خوبیوں والے رسوم ورواج تھے، شاہ صاحب ان کے خلاف نہ تھے اور نہ ہی کوئی مفکر و مصلح حتی کہ پیغمبر الٰہی ان کی مخالفت کرتا ہے اور نہ اپنانے سے گریز کرتا ہے۔ وہ صرف ان سماجی، تہذیبی اور مذہبی رسوم ورواج کی اصلاح فرماتا یا ان کو مٹاتا ہے جو اخلاق، بدن اور معاشرے کے لئے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ اور صالح روایات و رسوم اور رواجوں کو برقرار رکھتا ہے کہ وہ تعمیر و تشکیل کردار میں معاون ہوتی ہیں حجۃ اللہ البالغہ کا ''باب بیان ما کان علیہ حال اہل الجاہلیۃ فاصلحہ النبی ﷺ'' (۱/۱۲۴، ۱۲۷، رحمۃ اللہ الواسعہ ۲/۴۱۰، ۴۳۷)، ملاحظہ فرمانا چاہیے۔

ہندوانہ رسوم ورواج کے خلاف شاہ ولی اللہ دہلوی کے نقد و تبصرہ کو اس پس منظر میں دیکھنا اور پرکھنا چاہئے۔ فری لینڈ ایبٹ نے خوب کہا ہے کہ وہ ان کے خلاف اس لئے نہیں تھے کہ وہ ہندو رسوم تھیں بلکہ ان کی مخالفت اس لئے کی کہ وہ غیر اسلامی تھیں۔ انہیں رسوم وعادات اختیار کرنے کے سبب مسلم سماج میں اخلاقی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ سماجی انتشار اور افراتفری آئی، مسرفانہ زندگی اور اس کے مظاہر نے جنم لیا۔ عوام کے اجتماعی اخلاق تباہ ہوئے اور حکمرانوں کے کردار و عمل میں تباہی آئی، عدل حکومت کی جگہ ظلم و جبر نے لی، حکمرانوں میں نااہلی اور فرائض سے غفلت پیدا ہوئی، استحصال معاشی تنگی کی بنا پر آیا، محاصل دہندہ طبقات کی اقتصادی شکست و ریخت ہوئی، تدبیر منزل اور نظام مدنیت کے سارے ادارے کھوکھلے ہو گئے، ان کا لازمی نتیجہ زوال سلطنت کی صورت میں نکلنا تھا اور واقعتاً وہ نکلا بھی۔

حکمتِ ولی اللہی کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ وہ صرف مرض اور سبب کی نشاندہی نہیں کرتی بلکہ اس کا علاج اور تدارک بھی بتاتی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ، تفہیمات وغیرہ کے علاوہ مکتوبات میں شاہ صاحب کے سلاطین وامراء کے نام جو خطوطِ نصیحت آمیز تھے ان میں زوال کی روک تھام اور گمشدہ سلطنت کے وقار کی بحالی کا نسخۂ کیمیا بخوبی تجویز کیا ہے۔ مرہٹہ، جاٹ اور سکھ طبقات کے خلاف ان کی مہم صرف اس لئے تھی کہ وہ شر و فساد اور ظلم و زیادتی کے عناصر بن گئے تھے۔ اپنے گندے اور شرعی مقاصد کے لئے وہ سلطنت اور سماج دونوں کی اینٹ سے اینٹ بجا رہے تھے وہ ہندوستان کے دشمن تھے اور اپنے ملک کے برباد کرنے والے۔ ان کے ساتھ بہت سے مغل اور

مسلم طبقات بھی فساد و بربادی کا علمبردار بن گئے تھے۔ شاہ ولی اللہؒ نے ان کے خلاف جو کچھ لکھا اور جو علمی اور عملی مساعی کیں وہ فرقہ وارانہ ہرگز نہیں تھیں۔ وہ ملک کی سلامتی اور سماج کی بحالی کے لئے تھیں۔ اور ہر اس شخص اور طبقہ اور گروہ کے خلاف تھیں جو ملک کی بربادی اور سماج کی ابتری کے لئے ذمہ دار تھا۔ یہی بنیادی حقیقت یوں اجاگر ہوتی ہے کہ وہ عام غیر مسلم بالخصوص ہندو طبقات کے خلاف بالکل نہ تھے کیونکہ وہ امن پسند اور صالح عناصر تھے۔ مکتوبات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ تین فسادی طبقات کے تعصب، شدت اور غیر صالح صلابت کی بناپر ان کے استیصال کا مشورہ دیتے ہیں۔ (سیاسی مکتوبات، ۱۱۸، وابعد)

اور پرامن، وفادار، صالح ہندو طبقات کو اہل ذمہ قرار دے کر ان کی حفاظت اور ان کے حقوق کی پاسداری کرنے کو لازم بتاتے ہیں امراء کو ہدایت کرتے ہیں۔ کہ مسلم اور غیر مسلم طبقات کے اختلاط کے مقامات پر حلم و بردباری کا معاملہ کریں (سیاسی مکتوبات: ۱۰۹) موجودہ حالات ملکی کے پیش نظر شاہ صاحب کی یہ ہدایت و نصیحت کتنی مومنانہ فراست و دور اندیشی کی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو غالب اکثریت والے قریوں اور گاؤں سے لاکر شہروں اور قصبوں میں بسایا جائے۔ (سیاسی مکتوبات: ۱۰۷)

مغل سلطنت کا زوال دراصل ہندی مسلم سماج کا انحطاط تھا، اور سیاسی زوال و سقوط اس کا محض ایک شاخسانہ۔ ولی اللہی تجزیہ میں ان کے معاصر مسلم سماج کے ادبار و نکبت کی جو تصویر کشی، حقیقت نویسی ملتی ہے وہ دراصل مسلم معاشر کے عالمی زوال پر صحیح ثابت ہوتی ہے اور ہندی مسلم معاشرہ کے لئے تو وہ آئینہ حق ہے۔ ایک بڑے فرق کے ساتھ شاہ صاحب کا معاصر سماج بہر حال سیاسی قوت اور سیاسی قیادت رکھتا تھا، خواہ ان دونوں کا حال کتنا ہی گیا گذرا ہو۔ ہمارا معاصر مسلم سماج آج سیاسی قیادت و قوت سے عاری ہے اور ان تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی اور معاشی برائیوں میں مبتلا ہے اور شاید کچھ زیادہ ہے جن میں مغل زوال کا معاشرہ مبتلا تھا، بلکہ ہمارا پورا قومی سماج ان تمام اسباب و عناصر زوال کو سینے سے لگائے اور دل میں اتارے جا رہا ہے جن کے سبب بربادی اور تباہی مقدر ہو جاتی ہے۔ ولی اللہی تجزیہ و ارشاد سے مسلم سماج کو بالخصوص اور قومی سماج کو بالعموم نصیحت لینی ہے ورنہ ہماری داستان بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور اور ہمارے ذاتی ذخیرہ میں موجود

# حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف وتالیفات کے قلمی نسخوں کا تعارف

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی ☆

جب امام ہمام حضرت شاہ ولی اللہ کا ذکر آتا ہے تو اور بہت سی بحثوں اور موضوعات کے ساتھ حضرت شاہ صاحب کی تصانیف ومؤلفات اور تحریرات ومکتوبات کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے، ایسے موقعوں پر عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی تصانیف کے صحیح نسخے ومعتمد عموماً کم یاب ہیں، حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف ومؤلفات، افادات ومکتوبات وغیرہ کے قلمی نسخوں کی اچھی خاصی تعداد موجود معلوم ہے۔ جو ہندو پاکستان کے علاوہ کئی ملکوں کے قومی کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں بکھری ہوئی ہے ان میں معتبر نسخے بھی ہیں اور غیر معتبر بھی۔ معتمد نسخوں میں سے چند خود حضرت مصنف کے قلم فیض رقم کے ہیں، چند اور حضرت شاہ صاحب کے ممتاز واہم شاگردوں اور صاحبزادگان عالی مرتبت (حضرت شاہ عبدالعزیز شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر مولانا شاہ محمد اسحاق رحمہم اللہ) وغیرہ کے دست مبارک کے بھی ہیں جس میں سے چند ایسے نسخے بھی ہیں کہ ان پر حضرت شاہ صاحب کے دست مبارک سے اجازتیں اور تحریرات درج ہیں نیز چند نسخے حضرت شاہ

☆ ڈائریکٹر مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ۔

صاحب کے صاحب سِرّ اور ان کے علوم وارشادات کے سب سے پہلے اور اہم ترین مخاطب حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی یا ایک اور محبوب و معتمد شاگرد خواجہ محمد امین سندھی کے نقل کیے ہوئے بھی موجود ہیں۔ان کے علاوہ بھی حضرت کی تصانیف کے کئی اہم نسخے معلوم ہیں جن کی کسی اور وجہ سے خاص اہمیت ہے اور حضرت شاہ صاحب کے علوم کی تدوین اور ان کی کتابوں کی تازہ اشاعت و تحقیق کے وقت ان نسخوں کو نظر انداز کرنا غفلت اور بے توفیقی میں شمار کیا جاسکتا ہے، بہرصورت مجموعی طور پر ان نسخوں کی خاصی تعداد ہے ان کے نام گنوانا بھی خاصا وقت چاہتا ہے مفصل گفتگو یہ ایک بسیط مقالے یا ایک کتاب کا موضوع ہے جس کی اس وقت گنجائش نہیں:

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

اس لئے اس طویل موضوع سے صرف نظر کرتے ہوئے میں یہاں حضرت شاہ صاحب کی تصانیف کے صرف چند ایسے قلمی نسخوں کا تعارف پیش کرنا چاہتا ہوں جو کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اور ہمارے ذخیرہ (حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ) کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں مگر وابستگانِ علوم ولی اللہی کو ان کا بہت کم علم ہے۔اس کی ابتدا کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے مخطوطات کے تذکرہ سے ہوگی۔ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت شاہ ولی اللہ کی انیس تالیفات کے تیس نسخے تھے جس میں سے اب غالباً چوبیس یا پچیس موجود ہوں گے، غالباً اس لئے کہ تین چار تو کیڑوں کی نذر ہوگئے اور دو تین اس وقت دستیاب نہیں، معلوم نہیں کہ وہ موجود ہیں یا ضائع ہوگئے ہیں۔ جو نسخے اب موجود نہیں اور ان کا کتب خانہ کی فہرست میں بھی اندراج نہیں، ان میں اہم ترین نسخہ حجۃ اللہ کا تھا جس پر حضرت شاہ عبدالعزیز کا ایک اہم خط چسپاں تھا جس میں حضرت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ کے متعلق اپنی رائے تحریر فرمائی تھی، اور جو نسخے ضائع یا کیڑوں کی نذر ہوگئے ان میں کوئی اور نسخہ غالباً اہم نہیں تھا، اب جو قلمی نسخے موجود ہیں ان کو بھی اہم اور غیر اہم میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اہم نسخوں میں وہ مجموعہ نہایت قابل قدر اور قیمتی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ کے حبیب لبیب اور رفیقِ قدیم حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ اور ان کے فرزند شاہ عبدالرحمٰن (مرتب مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ) کے قلم سے ہے، ان کے علاوہ ایک اور نہایت ہی اہم اور بیش قیمت نگینہ مکتوبات

حضرت شاہ ولی اللہ کا ایک نسخہ ہے۔ (تعارف آرہا ہے)۔

مجموعہ رسائل مکتوبہ حضرت شاہ محمد عاشق وشاہ عبدالرحمان میں حضرت شاہ ولی اللہ کے چھ رسائل وتالیفات شامل ہیں مگر ان رسائل یا اس مجموعہ کا کتب خانہ دارالعلوم کی مطبوعہ اور قلمی دونوں فہرستوں میں تذکرہ شامل نہیں، اس مجموعے کے رسائل جس میں سے چار رسالے حضرت شاہ محمد عاشق کے قلم سے اور دو شاہ عبدالرحمان کے نقل کئے ہوئے ہیں، شاہ محمد عاشق کے مکتوبہ چار رسائل یہ ہیں:

۱۔ رسالہ فی لُبْسِ الاحمر (عربی) ۲۔ رسالہ ضابطہ مناسخات (فارسی)

۳۔ رسالہ در تحقیق وتعیین صراط مستقیم (فارسی)

۴۔ رسالہ دربیان تدوین علوم السر المکتوم (عربی)

شاہ عبدالرحمان صاحب کی نقل کی ہوئی دو کتابیں (۵) الفوز الکبیر اور (۶) شرح رباعتین حضرت خواجہ باقی باللہ (ازالۃ الغین فی شرح الرباعتین) ہیں۔

مذکورہ نسخوں میں سے تین کتابیں (رسالہ دربیان علوم، الفوز الکبیر اور شرح رباعتین) مطبوعہ اور عموماً دستیاب ہیں، لیکن پہلے تینوں رسائل کا حضرت شاہ ولی اللہ کی کمیاب تالیفات میں شمار ہے، ان تینوں میں سے کوئی رسالہ بھی غالباً اب تک نہیں چھپا۔

یہ تینوں مختصر رسالے ہیں، رسالہ فی لبس الاحمر حضرت شاہ صاحب کے سفر حجاز کی یادگار ہے یعنی شاہ صاحب عہد تصنیف کے دور متوسط کی نسبۃً کم یاب تحریر ہے۔

یہ رسالہ حضرت شاہ صاحب نے ۲۹ر ذی الحجہ ۱۱۴۹ھ (۳ر مارچ ۱۷۳۷ء) کو مکہ مکرمہ میں شیخ حسن آفندی کی فرمائش پر تحریر فرمایا تھا، اس میں (فقہ حنفی کی مشہور کتاب نورالایضاح کے مصنف کے اسی موضوع پر ایک رسالہ کا تجزیہ اور اس مسئلہ کی مزید تحقیق وتوضیح ہے۔

۲۔ رسالہ مناسخات میں میراث کی تقسیم کے موضوع پر شاہ صاحب پر وارد ایک خاص طریقہ حساب کی ترتیب وتفہیم ہے۔

۳۔ رسالہ تحقیق وتعیین صراط مستقیم، احادیث شریفہ کے ذخیرے اور فقہی مسالک کے اختلاف میں طریقہ صواب کی تلاش میں شاہ صاحب کے معروف مسلک کی ایک توضیح ہے، یہ رسالہ

ایک مرتبہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ یہ وہی بحث ہے جو حضرت شاہ صاحب نے مؤطا کی شرحات میں بھی پیش فرمائی ہے کہ فقہائے مذاہب کی تحقیق میں بنیادی چیز اہل مدینہ کا تعامل ہے۔

۴۔ رسالہ در بیان علوم السر المکتوم فی بیان تدوین العلوم ہے۔ جو (حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے ایک ممتاز ناشر اور شاہ رفیع الدین کے نواسہ) سید احمد، ولی اللہی کے مطبع احمدی دہلی سے ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء) میں شائع ہو چکا ہے اور اس کے اردو ترجمہ بھی چھپے ہیں۔ سر مکتوم اور مذکورہ بالا نسخوں کی اہمیت یہ ہے کہ یہ چاروں حضرت شاہ محمد عاشق کے قلم سے ہیں اور اس امتیاز کی وجہ سے نسخہ مصنف کے قائم مقام ہیں۔

اس مجموعہ کے آخری دو کتابوں میں سے الفوز الکبیر ناتمام اور شرح رباعیات خواجہ باقی باللہ مکمل ہے اگرچہ ان میں سے کسی نسخہ پر بھی سنہ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں، لیکن شاہ محمد عاشق اور شاہ عبدالرحمان کی اور تحریروں سے مقابلہ کے بعد یہ طے ہے کہ یہ دونوں نسخے انہیں دونوں کے قلم سے ہیں اور چوں کہ شاہ عبدالرحمان پھلتی کی حضرت شاہ ولی اللہ کی حیات (۱۱۶۸ھ۔۵۵۔۱۷۵۴ء) میں وفات ہوگئی تھی، اس لئے یہ تمام نسخے بلاشک وشبہ اس سے پہلے کے لکھے ہوئے ہیں۔

مذکورہ رسائل وتالیفات کے علاوہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت شاہ ولی اللہ کے جو علمی آثار موجود ہیں ان میں سے اکثر کا مفصل تذکرہ ضروری نہیں ان کی صرف نام شماری کافی ہوگی، کیونکہ کہ ان نسخوں میں کوئی ندرت یا ایسا امتیاز نہیں ہے جس کا تذکرہ ضروری اور مفید ہو۔ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں فتح الرحمان (ترجمہ فارسی قرآن شریف) کے بھی دو نسخے ہیں جس میں سے ایک نسخہ اگرچہ بہت عمدہ اور صاف ستھرا ہے مگر دونوں پر کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں۔

شاہ صاحب کی تین مشہور تالیفات الفضل المبین الدر الثمین اور النوادر (جس کے مجموعہ کو مسلسلات کہا جاتا ہے) کی تین تین نقلیں موجود ہیں، تینوں نقلوں میں تینوں رسائل شامل ہیں۔ ان میں سے دو نسخوں میں جاذبیت وکشش کا کوئی عنصر موجود نہیں، نہ ان کی کتابت عمدہ ہے نہ کاغذ، غالباً کسی معمولی لیاقت کے آدمی نے نقل کی ہیں، اور ان میں سے ایک نقل کے متعلق کتب خانہ

دارالعلوم کی مطبوعہ فہرست کی یہ اطلاع صحیح بھی نہیں کہ اس نسخہ پر حضرت شاہ عبدالعزیز کے دستخط ہیں (۱)۔ مسلسلات کا تیسرا نسخہ اس مجموعہ کی سب سے پہلی اشاعت (۱۲۹۳ھ) کی جوں توں نقل ہے، اور اس میں مطبوعہ نسخہ کی طرح شاہ صاحب کا رسالہ حل تراجم (ابواب) بخاری بھی شامل ہے۔

البدور البازغہ کے دو نسخے ہیں، جن میں سے ایک یوسف بن عبدالصمد بڈھانوی نے ۱۲۹۵ھ میں نقل کیا تھا، دوسرا نسخہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (وفات ۱۳۲۳ھ، ۱۹۰۵ء) کے کتب خانہ کا ہے جس پر حضرت مولانا کے دستخط بھی ہیں۔ ایک ایک نسخہ الانتباہ اور تحقیق وحدت الوجود والشہود کا بھی ہے مگر دونوں پر کاتب کے نام اور سنہ کتابت درج نہیں، یہ دونوں نسخے مولانا مفتی سعد اللہ رام پوری (وفات ۱۲۹۴ھ، ۱۸۷۷ء) کے کتب خانہ کے ہیں، مفتی صاحب کی مہر اور دستخط ثبت ہیں۔ ایک نسخہ القول الجمیل کا ہے جو ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) کا لکھا ہوا ہے۔

اس ذخیرہ میں تالیفات ولی اللہی کے جو دو نسخے اہم بطور خاص قابل ذکر ہیں، وہ مصفیٰ شرح فارسی مؤطا امام مالکؒ اور انفاس العارفین کے ہیں۔

مصفیٰ کا نسخہ اس وجہ سے اہم اور قابل توجہ ہے کہ وہ غالباً حضرت شاہ محمد عاشق کے اصل نسخہ کی نقل ہے، اس نسخہ کی جو تکمیل کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ کے اہم ترین شاگردوں خواجہ محمد امینؒ، بابا فضل اللہ کشمیریؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی مجلس میں پڑھا اور سنا گیا۔ شاہ رفیع الدین نے پڑھا شاہ عبدالقادرؒ اور تمام حضرات نے سنا، یہ قرأت وسماعت ۲۵ ربیع الاول ۱۱۸۵ھ (جولائی ۱۷۷۱ء) میں مکمل ہوئی اور حضرت شاہ عبدالعزیز نے یہ تمام روداد بقلم خود اس نسخہ پر تحریر فرمائی۔

اس نسخہ کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ اس کے اختتام پر شاہ محمد عاشق کی وہ تحریر مکمل درج ہے جس میں شاہ محمد عاشق نے مصفیٰ کی تسوید وتبییض کا مفصل تذکرہ کیا ہے، یہ تحریر اگرچہ مصفیٰ اور مسویٰ کی پہلی طباعت (مطبع فاروقی دہلی ۱۲۹۳ھ) کے آخر میں بھی شامل ہے لیکن اس نسخہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ مطبوعہ تحریر اصل تحریر چوتھائی سے بھی کم حصہ ہے، مکمل تحریر یا مضمون فل اسکیپ سائز کے اکیس سطری صفحہ کے پانچ صفحات میں آئی ہے جس میں شاہ محمد عاشق نے خواجہ محمد امین کا خاصا مفصل ذکر کیا ہے اور خواجہ محمد امین کی وہ سند بھی نقل کی ہے جو شاہ ولی اللہ نے خواجہ امین کو عطا فرمائی تھی، آخر میں مصفیٰ کی تکمیل کی تاریخ پر ایک عزیز کی لکھی ہوئی شاہ محمد عاشق کے الفاظ میں

(۱) فہرست مخطوطات کتب خانہ دارالعلوم دیوبند ۹۷،۹۶، جلد اول (دیوبند: ۱۳۹۰ھ)۔

ایک نظم [یا نو شعر کا قطعۂ تاریخ] بھی ہے، جس سے اس خدمت کی تکمیل کا (۱۱۷۹ھ/ ۶۶-۱۷۶۵ء) بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

مصفّٰی کے اس نسخہ کے اختتام پر کاتب کا نام مذکور نہیں، سنہ کتابت اور صفحات واوراق کا شمار بھی درج نہیں، تحریر نستعلیق، رواں پختہ قلم ہے۔

اس ذخیرہ میں انفاس العارفین کا بھی ایک عمدہ صاف خوش قلم اور خاصا صحیح نسخہ ہے جو ۱۲۳۹ھ (۲۴-۱۸۲۳ء) کا لکھا ہوا ہے، اس میں اس مجموعہ کے تمام چھے رسائل شامل ہیں۔ شروع میں فہرست بھی ہے یعنی ہر پہلو سے اچھا اور قابل قدر نسخہ ہے۔

اس کتب خانہ میں مذکورہ کتابوں کے علاوہ ایک نسخہ بلاغ المبین کا بھی ہے، جس کو بعض اہل علم نے حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیفات میں شمار کیا ہے، حالانکہ اس کا شاہ صاحب سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا، بلاغ المبین غالباً حضرت شاہ ولی اللہ کے ایک اہم نام اور معاصر شاعر و مصنف ولی اللہ اشتیاق سرہندی کی تالیف ہے۔ بلاغ المبین کے شاہ ولی اللہ سے انتساب کا کوئی ثبوت بلکہ قرینہ بھی موجود نہیں، بہر حال اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ دار العلوم میں موجود ہے، جو صاف ستھرا نسخہ ہے مگر اس پر کاتب کا نام یا سنہ کتابت درج نہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی تالیفات کے تعارف کے بعد کتب خانہ دار العلوم کے ایک اور اہم اور نادر ترین نسخہ کا تذکرہ بے حد ضروری ہے، جو اگر چہ حضرت شاہ صاحب کی تصانیف میں شامل نہیں اور چند سال پہلے تک اس کا تذکرہ بھی نہیں آتا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے استفادہ کئے بغیر حضرت شاہ صاحب کے حالات، علوم و نظریات اور تصانیف و خیالات کا جائزہ ناتمام ہے۔ یہ حضرت شاہ صاحب کے مکتوبات گرامی کا وہ بیش بہا مجموعہ ہے جس کا پہلا حصہ شاہ محمد عاشق کے فرزند شاہ عبد الرحمان پھلتی نے (جو حضرت شاہ ولی اللہ کے داماد بھی تھے) مرتب کیا تھا، شاہ عبد الرحمان اس خدمت تصنیف میں مشغول تھے کہ ۱۱۶۸ھ (۵۵-۱۷۵۴ء) میں اچانک رحلت کر گئے۔ شاہ عبد الرحمان کی وفات کے بعد ان کے والد ماجد شاہ محمد عاشق پھلتی نے اس تصنیف کو مکمل کرنے کا ارادہ فرما لیا اور حضرت شاہ عبد الرحمان جو کام کر چکے تھے اس کو حصہ اول قرار دے

---

(۱)۔ اس نسخہ کا فہرست کتب خانہ دار العلوم، مرتبہ: مفتی مولانا ظفیر الدین صاحب مفتاحی ۱۴۴، ۱۴۵، جلد اول (طبع اول دیو بند: ۱۳۹۰ھ، ۱۹۷۰ء) میں تعارف ہے۔

کر مزید مکتوبات تلاش کیے اور ان کو مرتب کر کے مجموعہ مکتوبات مؤلفہ شاہ عبدالرحمان کا دوسرا حصہ قرار دیا۔

مجموعہ مکتوبات مرتبہ شاہ عبدالرحمان (حصہ اول) میں حضرت شاہ ولی اللہ کے دوسو بیاسی اور حصہ دوم مرتبہ شاہ محمد عاشق میں صرف ستتر (۷۷) مکتوبات شامل ہیں، اگر چہ دونوں حصوں میں سے کسی پر بھی کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں لیکن میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دونوں نسخۂ مصنف ہیں، لیکن کتب خانہ دارالعلوم میں موجود نسخے کے پہلے حصہ کے ابتدائی ترپن ۵۳/ ورق جس میں ایک سو سات (۱۰۷) مکتوبات تھے اس نسخہ میں موجود نہیں، حصہ دوم مکمل ہے۔ حصہ اول کا جو حصہ موجود ہے اس میں صفحہ تدین ۵۳/ سے ۱۲۴/ تک اور مکتوب نمبر ایک سو سات کے نصف سے مکتوب نمبر دوسو اکیاون تک یعنی کل ایک سو چودہ خط شاہ عبدالرحمان کے نوشتہ ہیں، اس نسخہ کے آخری اڑتیس مکتوبات شاہ محمد عاشق صاحب کے نقل کیے ہوئے ہیں۔ حصہ دوم کا مکمل نسخہ حضرت شاہ محمد عاشق کے قلم کا ہے، حصہ اول میں جو شاہ عبدالرحمان صاحب کا مؤلفہ ومکتوبہ ہے ایک سو چوبیس فی صفحہ عموماً پچیس سطریں ہیں اور اسی حصہ کے ان اوراق میں جو شاہ محمد عاشق صاحب کے نقل کیے ہوئے عموماً بیس سے بائیس تک سطریں آئی ہیں، دوسرے حصہ میں جو حضرت شاہ محمد عاشق کا مؤلفہ ومکتوبہ ہے فی صفحہ بیس سے بائیس تک سطوریں ہیں۔

یہ تالیف یا نسخہ حضرت شاہ ولی اللہ کی حیات میں مرتب حضرت شاہ صاحب کے مکتوبات کا سب سے بڑا اور جامع ترین مجموعہ ہے، اس مجموعہ کی تالیف وترتیب کے بعد سے اب تک بھی حضرت شاہ ولی اللہ کے مکتوبات کا کوئی اور ایسا ضخیم اور وقیع مجموعہ مرتب یا دریافت نہیں ہوا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ دارالعلوم کا نسخہ مکتوبات اس مجموعہ کا نسخہ مؤلفین تو ہے ہی، اس کی یہ بھی ایک غیر معمولی اہمیت ہے کہ یہ اس مجموعہ کا اس وقت تک معلوم واحد نسخہ ہے، کسی ذاتی یا قومی لائبریری میں اس کی نقل کا سراغ نہیں ملا۔

ابھی عرض کیا ہے کہ اس کا حصہ اول مرتبہ مکتوبہ شاہ عبدالرحمان ناقص ہے، اس کے ایک سو سات مکتوبات زیر نظر نسخہ میں موجود نہیں لیکن مکتوبات کا وہ حصہ یا اوراق جو اس نسخہ میں شامل نہیں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں موجود ہیں، اس طرح یہ نسخہ مکمل ہو جاتا ہے۔

زیر تعارف مجموعہ مکتوبات کے سلسلہ میں یہ بھی عرض کردینا چاہئے کہ مکتوبات کا یہی مجموعہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی تالیف ''حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات'' کی بنیاد ہے، سیاسی مکتوبات میں شامل شاہ صاحب کے تمام مکتوبات اسی مجموعہ سے لئے گئے ہیں، نیز مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی نے ان مکتوبات کا (جس میں نسخۂ حیدرآباد بھی شامل ہے) کا اردو ترجمہ کیا تھا، جو نادر مکتوبات کے نام سے دو جلدوں میں پھلت اور دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

لیکن یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ نادر مکتوبات (اردو ترجمہ) کے خطوط کی ترتیب میں قلمی نسخہ سے مکتوبات کی مطابقت کا اہتمام نہیں رہا اور اس میں ان جلدوں میں شامل تمام فارسی مکتوبات کا ترجمہ بھی شامل نہیں، جس فارسی خطوط کا ترجمہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات میں آگیا ہے وہ مکتوبات نادر مکتوبات میں شامل نہیں کئے گئے جس کی وجہ سے یہ ترجمہ نا تمام سا محسوس ہوتا ہے، نیز سیاسی مکتوبات میں جو خطوط شامل ہیں ان میں سے کئی خطوط کا ترجمہ بھی نا مکمل ہے، کئی نا تمام ہیں، بعض خطوط کے پورے پیرے گراف اور بعض کی سطور یا فقرے اس میں شامل نہیں۔

نیز سیاسی مکتوبات میں درج خطوط کی ترتیب میں بھی بہت تغیر اور ردوبدل ہوا ہے، اصل فارسی مجموعہ مکتوبات میں جو خطوط ابتداء میں شامل ہیں، وہ سیاسی مکتوبات کے آخر میں پہونچ گئے اور جو اصل مجموعہ میں آخر میں تھے ان کو سیاسی مکتوبات کی ابتداء میں جگہ ملی ہے، جس سے اس مجموعہ کی اندرونی فکری تاریخی ترتیب متاثر ہوئی ہے۔ فارسی مکتوبات میں اگرچہ مکتوبات کی تاریخ تحریر مذکور نہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ان میں جزوی طور پر زمانی ترتیب موجود ہے، جس کو اصل و ترجمہ دونوں میں اسی طرح باقی رکھنا چاہئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے یہ خطوط جس ترتیب سے لکھے خصوصاً شاہ محمد عاشق کو جس ترتیب سے ملے مجموعہ مکتوبات کی تالیف میں اس کا خیال و اہتمام کیا گیا ہے، اس لئے ان دونوں مجموعوں کی افادیت کے اعتراف کے باوجود اصل فارسی نسخہ کی معنویت اور اس سے استفادہ کی اہمیت اپنی جگہ باقی ہے۔

یہ مکتوبات کے متعلق ایک ضمنی بات تھی جو زبان قلم پر آگئی، عرض یہ کرنا تھا کہ یہ مجموعہ مکتوبات سلسلہ ولی اللہی کی تصانیف میں کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کا اہم ترین نسخہ اور گویا در شہوار ہے، کتب خانہ دارالعلوم میں سلسلۂ ولی اللہی کی ایک اور بھی نہایت اہم یادگار محفوظ ہے، جو اگرچہ

تالیفات ولی اللٰہی میں شمار نہیں کی جا سکتی، لیکن اس کے بغیر یہ تعارف ناتمام رہے گا۔

یہ سلسلہ ولی اللٰہی کے ایک بڑے عالم اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے شاگرد، مولانا رشید الدین خاں کشمیری دہلوی (وفات محرم ۱۲۴۳ھ) کی ایک تالیف ہے جس کا کتب خانہ دارالعلوم کی فہرست مخطوطات میں مجموعہ مکاتیب کے عنوان سے اندراج ہے، جس کا مولانا نسیم احمد صاحب فریدی بیاض رشید الدین کے حوالہ سے ذکر کرتے ہیں لیکن یہ نہ مجموعہ مکتوبات ہے اور نہ اس کو بیاض کہا جا سکتا ہے۔ اس کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک باقاعدہ تالیف ہے جس میں خصوصاً حضرت شاہ عبدالعزیز کے عربی مکتوبات تحریرات وفتاوی اور ارشادات کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ کے متعدد گرامی نامے اور افادات بھی جمع کئے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ یا تالیف خاصے بڑے سائز کے بچانوے اوراق یا ایک سو نوے صفحات پر مشتمل ہے، جس کا تقریباً نوے فیصد حصہ عربی میں ہے، چند افادات وفتاوی فارسی کے بھی شامل کئے گئے ہیں، مولانا رشید الدین خاں نے اپنے نام حضرت شاہ عبدالعزیز کے دو خط بھی نقل کئے ہیں، یہ پورا مجموعہ مولانا رشید الدین کے قلم کی یادگار ہے۔

☆☆☆

کتب خانہ دارالعلوم کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے کتب خانہ میں موجود حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا تعارف پیش خدمت ہے۔

کتب خانہ مظاہر العلوم میں حضرت شاہ صاحب کی دس تالیفات ورسائل کے خطی نسخے موجود ہیں جو یہ ہیں:

(۱) مسوی مکتوبہ ۱۲۷۹ھ (۲) (۳) رسائل درحقائق ومعارف (۴) التفہیمات الٰہیہ (۵) الطاف القدس (۶) ہمعات (۷) رسالہ در تحقیق وحدۃ الوجود والشہود، مکتوبہ صفر ۱۲۹۶ھ (۸) رسالہ دانشمندی (۹) رسالہ صرف (۱۰) القول الجمیل۔

ان نسخوں میں سے حقائق ومعارف کے دونوں رسالوں کے علاوہ جو نہ صرف غیر مطبوعہ بلکہ غیر متعارف بھی ہیں اور تمام کتابیں وہ ہیں جو مطبوعہ اور عموماً دستیاب ہیں، ان میں سے ابتدائی تین نسخوں کا کسی قدر تعارف مفید ہوگا۔

مسوی کا نسخہ مظاہر علوم خوش قلم صحیح اور عمدہ نسخہ ہے، جس میں کہیں کہیں بین السطور میں حل

لغات کا اہتمام کیا گیا ہے، بین السطور میں ہی ایک دو فقروں میں مختصر توضیحات بھی ہیں۔ نستعلیق قلم ہے، بہت عمدہ صاف واضح تحریر ہے، یہ نسخہ نامور عالم مولانا مفتی عنایت صاحب کاکوری کی فرمائش پر نقل اور مرتب ہوا ہے۔ اکثر حصہ مولانا عزیز الدین صاحب نے نقل کیا ہے، چند اوراق مفتی عنایت احمد صاحب کاکوری کے قلم سے نیز چند اوراق مفتی صاحب کے دوسرے شاگردوں (مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی اور مولانا فدا حسین صاحب) کے قلم سے بھی ہیں، آخر میں ترقیمہ کاتب مولانا مفتی عنایت احمد صاحب کے قلم سے ہے، جس میں مذکورہ بالا اطلاعات کا ذکر ہے، اس نسخہ کی کتابت کی تاریخ تکمیل ۲۳ر رمضان المبارک ۱۲۷۹ھ، (۱۴ر مارچ ۱۸۶۳ء) درج ہے۔ اس نسخہ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کو نسخہ مؤلف سے نقل کیا گیا ہے جس پر حضرت شاہ عبدالعزیز کے افادات و حواشی بھی درج تھے، یہ افادات اور حاشیے نسخۂ مفتی عنایت میں بھی نقل ہیں۔

- مظاہر علوم کے کتب خانہ میں حقائق و معارف پر حضرت شاہ صاحب کے دو مختصر رسالے بھی موجود ہیں دونوں شاہ صاحب کی نادر و کم یاب مؤلفات میں سے ہیں، ان میں سے ایک رسالہ میں شاہ صاحب نے ایک اپنے فارسی اشعار کی شرح فرمائی ہے اور دوسرے میں دو عربی قصیدوں کی شرح ہے۔ پہلے کے آغاز پر فرماتے ہیں:

> ''می گوید فقیر ولی اللہ کہ سابق از شوق برادرم خواجہ امین الدین اکرمہ اللہ تعالیٰ بعض معارف الٰہیہ در نیکوترین لباسے کہ لباسِ نظم است بیان کردہ شود، والحال ایشاں تقاضائے آں کرد کہ زیر ہر بیتے اشارتِ لطیف کردہ شود باں معرفت کہ در آں مودع است: زیادہ ام یا بادیہ پیمانہ ام عاشق شوریدہ ام یا عشق با جانانہ ام''

اس ردیف و قافیہ کے صرف سات شعر ہیں، حضرت شاہ صاحب کی شرح بھی ہے۔ اس کے بعد ایک رسالہ اور بھی ہے جس کے آغاز پر فرماتے ہیں:

> اما بعد فقیر ولی اللہ عفی عنہ کہ سابقاً بعض معارف غامضہ را در دو قصیدہ...... کہ ہر یک سی بیت باشد بلسان ......... بیان کردہ شد الحال شوق برادرم خواجہ امین اکرمہ اللہ بشھودہ باعث شرح آں می شود.........

مگر افسوس کہ دونوں رسالوں پر نہ رسالوں کا نام درج ہے نہ کاتب کا، مزید تاسف یہ ہے

کہ دونوں نسخے نہایت خستہ اور کرم خوردہ ہیں، دونوں کا کوئی مصرعہ یا سطر ایسی نہیں ہے جو کرم خوردہ نہ ہو، اندیشہ ہے کہ یہ نسخے اگر اسی حالت میں رہے تو جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔

مظاہر علوم کے نسخوں میں سے ایک اہم نسخہ تفہیمات الٰہیہ کا ہے، یہ بھی نہایت عمدہ اور صحیح نسخہ ہے جو غالباً حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی یادگار ہے، غالباً اس لئے کہ اگرچہ اس پر کاتب نے اپنا نام "محمد یعقوب" لکھا ہے مگر نانوتوی نسبت کی صراحت نہیں، لیکن کتب خانہ سہارن پور میں یہ نسخہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی کے کتب خانہ سے آیا ہے جو مولانا محمد یعقوب کے حقیقی بھانجے تھے، اس لئے قرین قیاس ہے کہ یہ مولانا محمد یعقوب صاحب کا نقل کیا ہوا ہو، اس نسخہ کی کتابت صفر (۱۲۹۸ھ، جنوری ۱۸۸۱ء) میں مکمل ہوئی تھی۔ یہ نسخہ ہلکے باریک مگر عمدہ ولایتی کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ یہی نسخہ تفہیمات الٰہیہ کے اس نسخہ کی اساس ہے جو مجلس علمی ڈابھیل کے اہتمام سے مدینہ پریس بجنور سے ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں چھپا تھا۔

تفہیمات کے اس نسخہ کی دوسری جلد کے آخری صفحات موجود نہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کاتب نسخہ (مولانا محمد یعقوب نانوتوی) کو اس کی تکمیل کا وقت نہیں ملا۔

اس نسخہ کے اختتام پر حضرت شاہ صاحب کا رسالہ تحقیق وحدۃ الوجود والشہود بھی شامل ہے۔ جو کاتب نسخہ (مولانا محمد یعقوب نانوتوی) کے بھانجے مولانا نذیر احمد صاحب انبیٹھوی کے قلم سے ہے، اختتام پر لکھا ہے:

"الحمد للہ کہ......... تاریخ ۲۱ رصفر ۱۲۹۶ھ بخط بے ربط کمترین نذیر احمد ساکن قصبہ انبیٹہ ضلع سہارنپور، در بھاول پور اختتام یافت"۔

☆☆☆☆

آخر میں ان چند کتابوں کا تذکرہ کیا کرتا ہے جو ہمارے ذخیرہ کتب میں موجود ہیں، ہمارے خاندانی کتب خانہ میں حضرت شاہ صاحب کی اکثر تصانیف کے خطی نسخے موجود تھے، جس کا اکثر حصہ ضائع ہو چکا ہے، جو چند کتابیں اس وقت راقم سطور کی تحویل میں ہیں، ان کا مختصر تعارف حاضر ہے۔ اس وقت ہمارے ذخیرہ میں حضرت شاہ صاحب کی گیارہ کتابوں کے چودہ قلمی نسخے محفوظ ہیں:

۱۔ الرسالۃ الخافضۃ للملۃ الرافضہ ۲۔ القول الجمیل (نسخہ مؤلف)

۳۔ المکتوب المدنی یعنی رسالہ تحقیق وحدۃ الوجود والشہود، دو نسخے

۴۔ ازالۃ الخفاء، مکتوبہ شوال ۱۱۷۸ھ ۵۔ البدور البازغہ، مکتوبہ سن ۱۲۰۲ھ

۶۔ المقدمۃ السنیہ فی انتصار الفرقۃ السنیہ

۷۔ مسلسلات (مشتمل بر الفضل المبین، الدر الثمین و رسالہ نوادر)

۸۔ رسالہ دعائے اعتصام ۹۔ سرور المحزون، دو نسخے

۱۰۔ رسالہ دانش مندی ۱۱۔ وصیت نامہ، دو نسخے

## الرسالۃ الخافضہ للملۃ الرافضہ:

حضرت شاہ صاحب کی نہایت نادر اور کم یاب تحریر ہے، راقم السطور کو الرسالۃ الخافضہ کے کسی اور قلمی یا مطبوعہ نسخے کا علم نہیں، حضرت شاہ صاحب کی تالیفات کی فہرستوں میں بھی اس کا تذکرہ نہیں ملا۔ الرسالۃ الخافضہ فارسی کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں شیعہ مذہب کے ابطال پر تین نکات بیان فرمائے ہیں، جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے:

> الحمد للہ الذی لا الہ الا ہو واشہد ان سیدنا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی الہ وصحبہ وسلم امابعد فیقول العبد الضعیف ولی اللہ ابن عبدالرحیم الدہلوی، کان اللہ لہما فی الاولیٰ والاخریٰ، این فقیر وقتے، بجانب غیب متوجہ شد تا مطلع شود بر حال رافضہ و بر دلیلے کہ ابطال مذہب ایشاں کند، دو سہ نقطہ بخاطر این فقیر ریختند این فقیر امیدوار آنست کہ ہر کہ......

اور اس کا اختتام حضرت شاہ صاحب کے ان خاص الفاظ پر ہوا ہے جو شاہ صاحب اپنی اکثر کتابوں کے اختتام پر رقم فرماتے ہیں، جو یہ ہیں:

"والحمد للہ اولاً و آخرا وظاھر او باطناً"

اس رسالہ پر اگرچہ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں، مگر یہ جس جلد میں شامل ہیں اس کے تمام رسائل و مؤلفات روح اللہ کشمیری شاگرد مولانا مرزا حسن علی محدث کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں، ان کا سنہ کتابت ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) سے ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۰ء) تک کا ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ الرسالۃ الخافضہ بھی روح اللہ کشمیری کے قلم کا اور ۱۲۵۵ھ کا ۱۲۵۷ھ کے درمیان

کا نقل کیا ہوا ہے۔

ان کتابوں میں سے القول الجمیل کا نسخہ اس لئے اہم ترین ہے کہ اس کی حضرت شاہ صاحب نے خود اپنے دست مبارک سے تصحیح و تکمیل فرمائی ہے یہ نسخہ کل تراسی صفحات پر مشتمل ہے، بیسیوں صفحات پر حضرت شاہ صاحب کے قلم سے چھوٹی بڑی تصحیح واصلاحات درج ہیں اور چوں کہ اس نسخہ کی قدیم نقل کے چار ورق (صفحہ اسی سے تراسی تک) ضائع ہو گئے تھے، اس لئے حضرت شاہ صاحب نے وہ صفحات دوبارہ نقل کر کے اس میں شامل فرمائے ہیں، آخر میں یہ صراحت بھی ہے کہ:

"ان الله وفقنا لتصحيح هذه النسخة، وانا الفقير المؤلف ولى الله عفا الله عنه"۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے اس نسخہ کی تصحیح کی توفیق عطا فرمائی اور میں ہوں، ناچیز مؤلف ولی اللہ عفی اللہ عنہ۔

المکتوب المدنی یا رسالہ تحقیق وحدۃ الوجود والشہود کے دو نسخے ہیں، پہلا نسخہ بہت عمدہ نسخہ ہے، اگرچہ اس پر کاتب کا نام وغیرہ یا کوئی صراحت درج نہیں، بلکہ یہ جس طرح نقل ہوا اس سے پہلے یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ بھی شاہ صاحبؒ کے قلم سے ہو، مگر یقین سے کہنا مشکل ہے۔ یہ نسخہ ساڑھے پانچ ورق یا گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔

مکتوب مدنی کا ایک نسخہ اور بھی ہے جو ۱۲۹۵ھ کا لکھا ہوا ہے، اسی شخص کے قلم سے حضرت شاہ محمد اسماعیل کی تالیف عبقات کا ایک نسخہ بھی اسی جلد میں مجلد ہے۔

ازالۃ الخفاء کا نسخہ تین بڑی جلدوں پر مشتمل ہے، جس میں پہلی جلد جو مقصدِ اول پر محیط ہے ۱۲۷۴ھ کی مکتوبہ ہے، یہ نسخہ مولانا نور الحسن کاندھلوی وفات ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) نے نقل کرایا تھا۔

مقصد دوم جو دو جلدوں اور سوا چار سو اوراق یعنی ساڑھے آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے، اپنی کئی خصوصیات کی وجہ سے توجہ طلب ہے۔

(الف) یہ نسخہ حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ (۲۱ اگست ۱۷۶۲ء) کے صرف دو سال بعد حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک خاص مکتوب الیہ مجد الدولہ نواب عبد المجید خاں

بہرام جنگ کی فرمائش پر عبدالحمید نامی کسی شخص نے نقل کیا ہے، ناقل اس نسخہ کی نقل وکتابت سے ۷ر شوال ۱۱۷۸ھ کو جمعہ کے دن فارغ ہوا، قلم واضح نسبۃً جلی نستعلیق ہے۔

(ب) یہ نسخہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے خاص شاگرد ملک الشعراء میر قمرالدین منت سونی پتی کی ملکیت میں رہا ہے، میر قمرالدین کے دستخط، مہر اور ان کے قلم کی عبارتیں اور چند حاشیے بھی ثبت ہیں۔

(ج) ازالۃ الخفاء کے سب سے پہلے مطبوعہ نسخے کی اساس اسی نسخے پر ہے، ازالۃ الخفاء کے ناشر اور مرتب مولانا محمد احسن نانوتوی نے اس کتاب کی تصحیح کے لئے کل تین نسخوں سے استفادہ کیا تھا جس میں سے یہ نسخہ بھی شامل تھا، مولانا محمد حسن صاحب نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"(نسخہ) سوم المعیٰ زمن جناب مولانا محمد نورالحسن کاندھلوی مرحمت کردند" (ازالۃ الخفاء طبع اول بریلی، جلد دوم ص ۲۸۴)۔

چونکہ پہلی اشاعت کی کتابت کے لئے یہی نسخہ استعمال ہوا تھا اس لئے اس کے حاشیہ پر مطبوعہ نسخہ کے کاتب کے قلم سے نشانات وصفحات نمبر درج ہیں۔

البدور البازغہ مکتوبہ ربیع الثانی سن ۱۲۰۲ھ (دسمبر ۱۷۸۷ء) بقلم محمد طاہر، کاتب کی تحریر سے تأثر ہوتا ہے کہ وہ حضرت شاہ صاحب کے شاگرد ہیں، عمدہ خوش قلم اور غالباً صحیح نسخہ ہے۔

اس نسخہ کے اختتام پر درج ترقیمہ کاتب کے ابتدائی الفاظ سے کاتب کی حضرت شاہ صاحب سے نسبت اور تعلق کا علم ہوتا ہے، لکھا ہے:

"تم الکتاب من تصانیف مولانا مرشدنا وسندنا......"

ہمارے ذخیرے کی کتابوں میں ایک اور قابل ذکر نسخہ المقدمۃ السنیہ کا ہے، المقدمۃ السنیہ کے قلمی نسخوں کی تعداد بہت کم ہے مولانا زید ابوالحسن فاروقی دہلوی نے المقدمۃ السنیہ کو چار قلمی نسخہ کی مدد سے مرتب کر کے شائع کرا دیا تھا، اسی اشاعت کے بنیادی نسخوں میں ہمارا نسخہ بھی شامل ہے۔

یہ نسخہ تیس ورق یا ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے، تحریر عمدہ نستعلیق ہے یہ نسخہ شروع ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء) کا لکھا ہوا ہے۔ یہاں یہ بھی ذکر کر دینا چاہئے کہ المقدمۃ السنیہ پر حضرت شاہ

عبدالعزیز نے مفصل حاشیہ لکھا تھا، اس کا بھی ایک نسخہ جو اسی کاتب روح اللہ کشمیری کے قلم سے ۱۲۴۷ھ کا لکھا ہوا ہے، ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

ایک نسخہ دعائے اعتصام کا ہے جو اگرچہ کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے مگر اس کو عموماً شاہ صاحب کی نادر تصانیف میں گنا جاتا ہے۔ ہمارے ذخیرہ میں دعائے اعتصام کا جو نسخہ ہے اس پر کاتب کا نام سنہ کتابت درج نہیں، مگر راقم سطور کا خیال یہ ہے کہ یہ نسخہ شاہ محمد عاشق صاحب کے قلم کا ہے۔

سرور المحزون کے دو نسخے ہیں جو ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) اور ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) کے لکھے ہوئے ہیں، دونوں کا کوئی امتیاز نہیں ہے جس کا یہاں ذکر کیا جائے۔ اسی طرح ایک نسخہ رسالہ دانشمندی کا ہے جو ۱۸۸۱ء (۱۲۹۸، ۹۹ھ) کا لکھا ہوا ہے، دو نسخے شاہ ولی اللہ کے وصیت نامے کے ہیں جس میں ایک ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء) کا دوسرا جو رسالہ دانشمندی کے ساتھ شامل ہے یہ بھی ۱۸۸۱ء (۱۲۹۸، ۹۹ھ) کا لکھا ہوا ہے۔

ہمارے خاندانی ذخیرے میں حضرت شاہ صاحب کی جو کتابیں موجود تھیں ان میں سے ایک اہم نسخہ مسوّی کا بھی تھا، یہ نسخہ حضرت شاہ صاحب کے درس میں ۱۱۶۴ھ میں پڑھا گیا تھا، اس نسخہ پر اس درس کی ابتدائی تاریخ ۱۳ر شوال ۱۱۶۴ھ (ستمبر ۱۷۵۱ء) درج ہے، لکھا ہے، "۱۳ر شوال ۱۱۶۴ھ روز شنبہ وقت عصر شروع بقرأت بحضرت استادی الشیخ المصنف نمودہ شدہ"۔ یہ نسخہ بھی ملک الشعراء امیر قمر الدین منت سونی پتی کی ملکیت میں رہا ہے، سرورق پر ان کی تحریر اور مہر ثبت ہے۔

افسوس ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی لکھی ہوئی سند واجازت کی وہ سطریں ضائع ہو گئیں جس میں شاگرد کا نام بھی تحریر تھا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس وقت یہ نسخہ کس حال میں ہے۔

میں اسی پر اپنی گذارشات کو ختم کرتا ہوں، ممنون ہوں کہ مولانا عطاء الرحمٰن صاحب قاسمی نے اس مؤتمر سیمنار میں راقم کو یاد فرما کر اس کی عزت افزائی کی بہت بہت شکریہ۔

# شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف کے خدا بخش لائبریری میں محفوظ قلمی نسخے

## (ایک تعارف)

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری☆

عارف باللہ اور امام الملۃ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی شخصیت عجائب روزگار میں سے تھی۔ اسے ہمہ جہت اور ہشت پہلو کہنا بے جا نہ ہوگا کیوں کہ آپ بیک وقت مترجم و مفسر قرآن، شارح حدیث، واضع اصول تفسیر، فقیہ، عارف کامل، ادیب، مصنف اور شاعر تھے۔ آپ مصلح قوم تھے۔ آپ کی فکر ارفع اور خیالات بلند تھے۔ ان میں سمندر کی سی گہرائی اور سمندر جیسی وسعت پائی جاتی ہے۔ آپ کے کارنامے متنوع اور کثیر الجہات ہیں۔ آپ کی مقدس ہستی صرف برصغیر ہندو پاک کے لئے ہی نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام کے لئے سرمایۂ افتخار و مایۂ ناز تھی۔ آپ کے علمی، ادبی اور عملی کارناموں کی معنویت و افادیت سدا بہار ہے۔ آپ کی ذات گرامی سرچشمۂ کمالات اور منبع فیوض و برکات تھی۔ اور بقول شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ:

> "امام الملۃ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز کی مقدس ہستی ان ممتاز ہستیوں میں سے ہے، جن کے وجود سے اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوۃ والتحیہ) کو دیگر امم پر امتیاز اور شرف بخشا ہے۔ منبع الفیوض الربانیہ اور قاسم الحکم الازلیہ، آقائے نامدار حضرت خاتم النبیین علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ الصلوۃ والسلام سے ایسی نسبت رکھنے

---

☆ ڈائریکٹر، خدا بخش لائبریری، پٹنہ

والے اشخاص جیسی کہ آفتاب سے آئینہ کو ہے، ملتِ مسلمہ میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب موصوف انہی میں سے ایک ہیں۔ ان کی تصانیف، ان کے مضامین عالیہ، ان کے اعلیٰ پایہ کے تلامیذ، ان کے سلاسل علوم ظاہر یہ اور معارف باطنیہ کا علی مرالدہور جاری ہونا ان کے منتسبین کا تقویٰ اور علم میں بے نظیر ماہر ہونا بتلا رہا ہے کہ یہ مقدس ہستی منظور نظر الٰہی اور مخلصین عباد اور مجددین امت میں خصوصی شان رکھنے والی تھی اور ہے۔ صرف ہندوستان کے مسلمانوں ہی پر ان کی ذاتِ بابرکات سے فیض یاب ہونے کا شرف مخصوص نہیں رہا، بلکہ ان کے فیوض سے سید مرتضیٰ بلگرامی ثم الزبیدی (شارح قاموس وشارح احیاء العلوم وصاحب عقود الجواہر المنیفہ وغیرہ) حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی ثم المکی حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی دہلوی ثم المدنی وغیرہم رحمہم اللہ تعالےٰ حضرات نے ملک عرب، مصر، شام، مغرب اقصیٰ وغیرہ کے مسلمانوں کو بھی بہت بڑے درجے تک مالا مال فرمایا۔ اس ہستی پر اہل ہند جس قدر بھی ناز کریں، بجا ہے، اور ان کے بحار فیض سے تشنگان جس قدر بھی اپنی پیاس بجھائیں مفید اور کارآمد ہے۔ انہی کے فیوض غیر متناہیہ ہندوستان اور بیرون ہند کے مسلمانوں کے لئے آج مشعل ہدایت اور رہنمائے طریقت ہیں"۔ (۱)

یوں تو شاہ صاحب کے کارنامے بے شمار اور کمالات بے حساب ہیں، لیکن میری ناقص رائے میں آپ کی مصنفانہ شان سب سے زیادہ نمایاں ہے اور دائمی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے جتنی بھی تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں وہ اپنی معنویت اور افادیت میں کسی عظیم کتب خانے سے کم اہمیت اور وقعت نہیں رکھتیں۔ آپ کی تصانیف کی صحیح تعداد متعین کرنا مشکل ہے اس لئے کہ آپ کے سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے ان کی تعداد مختلف بتائی ہے۔ مثلاً مولوی فقیر محمد جہلمی نے حدائق الحنفیہ میں ۲۸ر کتابوں کے نام درج کئے ہیں، جب کہ پروفیسر ایوب قادری نے مولوی رحمان علی کی عربی تصنیف تذکرہ علمائے ہند کے اردو ترجمے کے ساتھ جو وقیع اضافے کئے ہیں، ان میں شاہ صاحب کی ۳۲ر کتابوں کے نام درج کئے ہیں۔ لیکن مولوی محمد رحیم بخش نے

(۱) الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر) ۱۳۵۹ھ ص: ۱۲۔

حیات ولی میں آپ کی ۵۱ ضخیم کتابوں اور مختصر رسالوں کی تفصیلات بیان کی ہیں اور اس سلسلہ میں حسب ذیل نوٹ بھی تحریر کیا ہے:

"شاہ صاحب کی تصنیفات کثرت سے ہیں اور ان کے مطالب و مقاصد نہایت مفید و دلچسپ ہیں۔ لیکن افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ باوجود تحقیقات کے چند مشہور کتابوں کے علاوہ اور کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ تاہم جو کتابیں ہمیں اس وقت تک دستیاب ہوئیں اور جنہوں نے ہندوستان و عرب دونوں میں ایک عجیب مذاق علمی پھیلا رکھا ہے، ذیل کے نقشے میں ہیں جن سے ان کے مقاصد و مطالب کی مختصر کیفیت معلوم ہوتی ہے"(۱)۔

البتہ مولانا معراج محمد بارق نے بلاغ المبین میں شاہ صاحب کی ۵۴ تصانیف کی تفصیلات بیان کی ہیں (۲)۔

ان اختلافات کے باوجود شاہ صاحب کی اہم اور نمائندہ تصانیف کا پتہ لگانا دشوار نہیں چنانچہ ذیل میں آپ کی ان تصانیف کی فہرست درج کی جاتی ہے جن سے آپ کے نظریات وافکار کا علم ہوسکتا ہے اور جنہوں نے دائمی اہمیت اور وقعت حاصل کرلی ہے۔

## عربی تصانیف:

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ۲۔ فتح الخبیر ۳۔ المسوی (شرح الموطا)
۴۔ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف ۵۔ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید
۶۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ۷۔ قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین
۸۔ فیوض الحرمین ۹۔ الدر الثمین فی مبشرات النبی الکریم
۱۰۔ تاویل الاحادیث ۱۱۔ قصیدۃ الحبیب فی مدح سید العرب والعجم
۱۲۔ الاربعین ۱۳۔ حسن العقیدۃ
۱۴۔ القول الجمیل ۱۵۔ تراجم البخاری

(۱) حیات ولی، ص: ۲۹۵۔
(۲) بلاغ المبین، از شاہ ولی اللہ دہلوی: مرتب معراج محمد بارق (مکتبہ تجلی۔ دیوبند)

۱۶۔ المقدمۃ السنیۃ　　۱۷۔ عوارف الانتباہ فی اسناد الحدیث
۱۸۔ مکاتیب عربی　　۱۹۔ رسالہ در باب (وحدۃ الوجود وحدۃ الشہود)
۲۰۔ المقالۃ الوصیۃ (متعلق وصیت)۔

## فارسی تصانیف:

۱۔ فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن　　۲۔ الفوز الکبیر، شرح فتح الخبیر
۳۔ مصفی، شرح موطا　　۴۔ الطاف القدس
۵۔ انفاس العارفین
۶۔ شرح رباعیتین (حضرت خواجہ باقی باللہ کی دو رباعیوں کی عارفانہ شرح)
۷۔ سطعات　　۸۔ انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ
۹۔ سرور المحزون فی سیر الامین والمامون　　۱۰۔ فیض عام
۱۱۔ ہمعات　　۱۲۔ لمعات
۱۳۔ خیر کثیر　　۱۴۔ شفاء القلوب
۱۵۔ البدور البازغہ　　۱۶۔ رسائل تفہیمات
۱۷۔ لسان العین فی مشائخ الحرمین　　۱۸۔ وصیت نامہ
۱۹۔ عطیۃ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ　　۲۰۔ مکتوبات
۲۱۔ الدادفی مآثر الاجداد

شاہ صاحب کی مندرجہ بالا عربی وفارسی تصانیف میں سے چند کے قلمی نسخے خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہیں۔ ان کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

### ۱۔ حجۃ اللہ البالغہ:

یہ عبادات و معاملات سے متعلق انتہائی اہم اور لاجواب تصنیف ہے۔ اس کو ہم شاہ صاحب کی شاہکار تصنیف قرار دے سکتے ہیں۔ مصنف محترم نے اس میں نظام شرعی کی بڑے ہی دل نشین اور حکیمانہ انداز میں ترجمانی کی ہے۔ ... مسلکی اختلاف کی

بھی تعبیر و توضیح کی گئی ہے۔ اور وحدت دین جیسے نازک اور اہم مسئلہ سے بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں علوم خمسہ یعنی فقہ، حدیث، اخلاق، تصوف اور فلسفہ کی چاشنی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور بقول حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ:

"شاہ ولی اللہ صاحب پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جن کی عربی تصانیف، بالخصوص حجۃ اللہ البالغہ میں اہل زبان کی سی روانی، قدرت اور ادباء عرب کی سی عربیت ہے اور وہ ان بے اعتدالیوں سے پاک ہیں جو عجمی علماء کی عربی تحریر میں پائی جاتی ہیں"۔(۱)

شاہ صاحب کی اس اہم تصنیف کا ایک بہت سی حسین اور دیدہ زیب قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ اس میں ندرت یہ ہے کہ عربی تصنیف ہونے کے باوجود اس کی کتابت خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب بہت خوشخط ہے۔ اسی لئے کتابت بھی جاذب نظر ہے۔ کتابت بڑے اہتمام سے کی گئی ہے۔ سرورق کی لوح ذہبی (سونے کی) ہے۔ اس کی دیگر خصوصیات اس طرح ہیں:

تعداد اوراق = ۳۵۳۔ سطر = ۱۹ سطری = کتابت = ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء)

آغاز = کتاب کا آغاز حسب ذیل کلمات سے ہوتا ہے:

الحمد لله الذی فطر الانام علی ملة الاسلام والاهتداء وجبلهم علی الملة الحنفية السمحة السهلة البيضاء ثم انهم غشيهم الجهل وقعوا اسفل السافلين......الخ

اختتام = کتاب کا اختتام کاتب کے حسب ذیل ترقیمہ پر ہوتا ہے:

تمت تمام شد این کتاب بموجب فرمائش جناب منشی محمد حسن صاحب دام اقبالہ، بتاریخ دوازدہم ماہ ربیع الثانی ۲۲ سنہ جلوسی مطابق ہجری ۱۲۴۵۔ فقط۔

## ۲۔ المسوی شرح الموطا:

(عربی) یہ شاہ صاحب کی ایک اور بے نظیر تالیف ہے اور جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر

(۱) الفرقان۔ (شاہ ولی اللہ نمبر) ۱۳۵۹ھ ص ۳۰۔

ہے یہ موطا امام مالک کی شرح ہے۔ یہ بات تو ہر شخص کے علم میں ہے کہ موطا صحیح احادیث کا مجموعہ ہے جسے بہت ہی زیادہ چھان بین اور کمال تحقیق سے حضرت امام مالک (ابوعبداللہ مالک بن انس الاصبحی والمدنی) نے مدون کیا تھا۔

شاہ صاحب نے عربی زبان میں اس کی تحقیق کی ہے اور پھر اسی تسلسل میں ہر ایک حدیث کی بڑے ہی عالمانہ، محققانہ اور شگفتہ انداز میں تشریح کی ہے اور اسی ضمن میں بہت سے فقہی مسائل کی بھی توضیح فرما دی ہے۔ جس سے ان احادیث کے مطالعہ و مفاہیم سمجھنے میں بڑی سہولت ہو جاتی ہے۔ ہمارے بیشتر علماء کا خیال ہے کہ مسوی کو محض ایک شرح تصور نہ کرنا چاہئے، بلکہ علم حدیث اور علم فقہ پر ایک مستقل تصنیف سمجھنا چاہئے۔

اس موقر تصنیف کا اہم قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے، اس کی تفصیلات اس طرح ہیں:

تعداد اوراق = ۳۲۲۔ مسطر = ۱۹ سطری

تاریخ کتابت = ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء)

کاتب = قاضی عبدالرحمٰن بن قاضی اسمٰعیل

زیر نظر نسخہ خط نسخ میں بہت خوبصورت لکھا گیا ہے۔

کتاب کا آغاز حسب ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

الحمد للہ الذی انزل علیٰ عبدہٖ الکتاب قیماً ......

امابعد فیقول العبد الفقیر الیٰ رحمۃ اللہ الکریم احمد المدعو بولی اللہ بن عبدالرحیم ...... الخ

## ۳۔ التعلیق علی ابواب البخاری: (عربی)

اس کا بھی ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں دستیاب ہے۔ یہ ۱۷۰ اوراق پر مشتمل ہے، آخری چند اوراق غائب ہیں۔ مسطر گیارہ سطری ہے۔ خط نسخ میں تحریر کیا گیا ہے۔ لیکن کاتب کم سواد ہے اس لئے کتابت بھی اچھی نہیں ہے۔ اس کا آغاز حسب ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

الحمد للہ وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد وآلہٖ وصحبہ وسلم امابعد لیقول الفقیر الیٰ رحمۃ اللہ الکریم المدعو بولی اللہ بن

عبدالرحیم......الخ.

خدابخش لائبریری پٹنہ میں شیخ محمد بلگرامی الہ آبادی کے ہاتھ کا لکھا ہوا مکمل نسخہ بخاری شریف کا موجود ہے۔ یہ نسخہ شاہ ولی اللہ کے درس میں رہا ہے۔ اس پر ایک اجازت نامہ انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، جس کے اخیر میں لکھا ہوا ہے کہ:

"کتبهُ بیدهٖ الفقیر الی رحمة الله الکریم الودود، ولی الله بن عبدالرحیم بن وجیهه الدین العمری نسباً، الدهلوی وطناً، الاشعری عقیدتًا، الصوفی طریقتاً، والحنفی عملاً والحنفی والشافعی درسًا".

## ۴۔القول الجمیل فی بیان سواء السبیل: (عربی)

شاہ صاحب کے اس اہم رسالہ کا بھی ایک قلمی نسخہ خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ زیادہ اچھی حالت میں نہیں ہے۔ جگہ جگہ سے کرم خوردہ ہے۔

اوراق = ۳۹۔ مسطر: ۱۱ سطری

خط = نسخ کاتب کم سواد ہے۔ اس لئے کتابت کا معیار بھی اچھا نہیں ہے۔

آغاز =

الحمد لله الذی خلق قلوب بنی آدم مستعداً لفیضان الانوار مهنا لابداع المعارف والاسرار وبعث الانبیاء المصطفین الخیار داعین وهادین الحر طرق اکتسابها بالطاعات والاذکار ثم جعل لهم ورثة یقومون بعلمهم ورشدهم من العلماء الراسخین الابرار الابدال......الخ

اختتام =

واجاز فی المشکوة المصابیح والصحیح البخاری وغیره من الصحاح الستة الثقة الثبت حاجی محمد افضل عن الشیخ احمد السرهندی بسندهٖ الطویل المذکور فی مقامه وهذا آخرُ ما اردنا ایرادهُ فی هذه الرسالة والحمد لله اولاً وآخراً وظاهراً وباطنًا تم هذا الرسالة۔

## ۵۔ رسالہ شاہ ولی اللہ: (عربی)

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود سے متعلق شاہ صاحب کا ایک مختصر لیکن اہم رسالہ۔ اصلاً یہ جناب آفندی اسماعیل بن عبداللہ الرومی کے استفسار کے جواب میں ہے۔ انہوں نے دریافت کیا تھا کہ شیخ محی الدین بن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود اور شیخ احمد سرہندی کے فلسفۂ وحدۃ الشہود میں کیا فرق ہے اور دونوں میں سے کون حق پر ہے؟ شاہ صاحب نے اپنے جواب میں دونوں کے بارے میں ضروری تفصیلات بیان فرما کر اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ بنیادی طور پر دونوں میں کوئی مغایرت نہیں ہے۔ اور دونوں ہی حق پر ہیں۔

خدا بخش لائبریری میں اس اہم رسالہ کا بھی ایک قلمی نسخہ دستیاب ہے۔ اس کے سلسلہ میں ضروری تفصیلات اس طرح ہیں:

اوراق = ۱۔۹۔ مسطر: ۲۲ سطری

خط = نستعلیق سال کتابت اور کاتب کا نام = درج نہیں

آغاز =

من العبد الضعیف احمد المدعو بولی اللّٰہ بن عبدالرحیم الدھلوی عفی اللّٰہ تعالیٰ عنہ و وفقہ لما یحب ویرضاہ اما بعد فانی احمد الیکم اللّٰہ الذی...... الخ

شاہ صاحب کا یہ رسالہ ایک مجموعہ میں شامل ہے جس میں حسب ذیل تین مخطوطات یک جا مجلد ہیں:

۱۔ رسالہ شاہ ولی اللہ (ورق=۱-۹)

۲۔ کلمات الحق، از غلام یحییٰ (ورق=۱۰-۲۰)

۳۔ دمغ الباطل، از شاہ رفیع الدین صاحب (ورق=۲۰ب-۲۶۲)

دمغ الباطل اصلاً کلمات الحق کی رد میں ہے۔

مذکورہ بالا تین رسائل کا ایک اور مجموعہ بھی خدا بخش لائبریری میں موجود ہے جن کی بیشتر

تفصیلات بھی سابقہ رسائل کی مانند ہیں۔ البتہ تعداد اوراق اور سطر مسطر میں فرق ہے۔ اس مجموعہ کے اوراق کی مجموعی تعداد ۳۵۶ اور مسطر ۲۰ سطری ہے۔

۱۔ رسالہ شاہ ولی اللہ (ورق = ۱-۱۱)

۲۔ کلمات الحق (ورق = ۱۲-۲۴)

۳۔ دمغ الباطل (ورق = ۴۲-۳۶۵)

## ۶۔ فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن (فارسی)

قرآن کریم کا مختصر لیکن جامع ترجمہ فارسی زبان میں، مع حواشی، مسمی بہ فتح الرحمٰن۔ شاہ صاحب کا یہ ترجمہ اور یہ تشریح حواشی بے حد مقبول ہوا اور اہل علم حضرات نے دل کھول کر اس کی پذیرائی کی۔ یہ ترجمہ مع حواشی متعدد بار زیور طبع سے آراستہ بھی ہو چکا ہے۔ شاہ صاحب نے ترجمہ کی زبان اس وقت کے لحاظ سے، سادہ اور سلیس رکھی ہے۔ اسی لئے اس میں روانی اور شگفتگی بھی نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔ حواشی اور تشریحی کلمات مختصر لیکن جامع اور معانی و مفاہیم سے لبریز ہیں۔ اسی لئے ہر زمانے اور ہر طبقہ کے علماء نے انہیں پسند کیا ہے اور ان کی ستائش کی ہے۔ قرآن کریم کے مترجمین میں مولوی نذیر احمد دہلوی اپنا منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کا ترجمہ کلام پاک تمام تر اختلافات کے باوجود بڑی ندرت کا حامل ہے اور ایک زمانے میں کافی مقبول رہا اور متعدد بار شائع بھی ہوا۔ مترجم محترم (ڈپٹی نذیر احمد صاحب) نے اپنے ترجمہ کے مقدمہ میں دیگر مباحث کے ساتھ شاہ صاحب کی قرآنی خدمت کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اور آپ کے ترجمہ قرآن کو تراجم مابعد کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "فی الحقیقت قرآن کریم کے مترجم ہونے کے لئے جتنی باتیں درکار ہیں، ترجمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب میں علی الوجہ الکمال پائی جاتی تھیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا صاحب کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں میں ایسی وسیع ہے جو کہ بس ان کا ہی حصہ تھا۔ اب کوئی ایک عمر صرف کرے تو اس کو یہ بات نصیب ہو، اور وہ بھی شاید۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت، بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب ان کے پیش نظر

ہیں، اور وہ ان میں سے جس کو راجح پاتے ہیں، اختیار کر لیتے ہیں۔ جب ایک خاندان کے، ایک چھوڑ، تین تین ترجمے لوگوں کو مل گئے۔ ایک فارسی مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کا، اکٹھے دو، اردو۔ ایک شاہ عبدالقادر صاحب اور ایک شاہ رفیع الدین صاحب کا، تو اب ہر ایک کو ترجمہ کا حوصلہ ہو گیا، مگر خاندان شاہ ولی اللہ صاحب کے سوا کوئی شخص مترجم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ وہ ہرگز قرآن کا مترجم نہیں، بلکہ مولانا شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے بیٹوں کے ترجموں کا مترجم ہے کہ ان ترجموں میں اس نے کچھ ردو بدل، تقدیم و تاخیر کر کے جدید ترجمے کا نام کر دیا"۔

خدا بخش لائبریری میں اس اہم تفسیر کے کئی قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ ان میں جو نسخہ سب سے زیادہ اہم ہے وہ دو جلدوں میں ہے۔ ان دونوں کی تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

جلد اول = سورۂ الفاتحہ تا سورۂ مریم۔

اوراق = ۳۸۱ ۔ مسطر = ۱۴ سطری

اس جلد کا آغاز حسب ذیل عبارت سے ہوتا ہے۔

حمد نا محدود خدای را تبارک و تعالیٰ کہ برافت نامہ قرآن را برای بندگان خود نازل ساخت......الخ

جلد دوم = سورۂ طٰہٰ تا سورۂ الناس۔

اوراق = ۳۳۴ (۳۸۲ - ۷۱۵) دونوں جلدوں کا تسلسل برقرار رکھنے کی غرض سے اوراق کے نمبروں کی تعداد میں بھی تسلسل برقرار رکھا گیا ہے۔ یعنی دوسری جلد ورق ۳۸۲ سے ۷۱۵ کو محیط ہے۔

تاریخ کتابت = ۲۷ ربیع الاول ۱۱۸۱ھ (مطابق = ستمبر ۱۷۶۷ء)۔

ترقیمے سے معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے اس کی کتابت اپنے مرشد مولوی محمد عاشق صاحب کے حکم سے کی ہے۔

ترقیمہ:

الحمد للہ المستعان والصلوۃ علی نبی آخر الزمان وآلہ وصحبہ اھل الفضل والاحسان علی ان وفق لی المنان بتسطیر کلامہ ذی الحج

والبرهان المدعو بفتح الرحمان فی ترجمة القرآن لقدر الوسع والامکان من مترجمات افضل علماء الفرمان وقدوة اهل الایقان صاحب الجود والامتنان سیدنا ومولانا حضرت شیخ ولی اللہ رضی اللہ عنه لامتثال امر شیخی ومن به اعتصامی العارف باللہ الخالق الشیخ محمد عاشق دام اللہ برکاته الی یوم التناد ومسلمه علی رؤس المسترشدین الی ابدالاباد بید عبده الضعیف المحتاج الی رحمة اللہ صفی اللہ بن شیخ فقیر اللہ علیهما العفووالغفر ان یوم الجمعة وقت الضحوة فی سبع وعشرین من ربیع الاول سنة احدی وثمانین بعد الالف والمائة من هجرة النبویة علی صاحبها افضل التحیة وقد کتب هذه الترجمة المتبرکة فی مدة طویلة وحرج کثیرة فوفقنی اللہ باختتامه فله الحمد حمداً کثیراً و الشکر شکر اعظیماء اللهم اغفرلهٗ ولوالدیه ولمرشده ولاسناذه ولمن نظر فیه بحرمت النبی الکریم وآله واصحابه واتباعه اجمعین برحمتک یا ارحم الرحمین.

یلوح الخط فی القرطاس دهرا
وکاتبه رمیم فی التراب

## ۷۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء:

شاہ صاحب کی یہ بہت ہی اہم اور مبسوط تصنیف ہے۔ اس کا خاص موضوع خلافت راشدہ اور قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔ اسی ضمن میں آپ نے نبی، خلیفہ، صدیق اور محدث جیسی اہم اصطلاحوں کی تعریف اور تشریح بھی کی ہے۔ نیز خلیفہ کے اوصاف اور منصب خلافت کی اہمیت وافادیت پر بھی عالمانہ اور محققانہ روشنی ڈالی ہے۔ شاہ صاحب کی اس اہم تصنیف کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''خلفائے راشدین کی خدمت کا ثبوت، قرآن مجید سے، اس کتاب کی بہترین

بحثوں میں سے ہے، جو نکات وحقائق سے لبریز ہے خصوصاً آیت تمکین، آیت استخلاف، آیتِ اذن قتال، آیت اعراب (قل للمخلفین من الاعراب)، آیات (محمد رسول اللہ والذین معه) آیت یریدون لیطفئوا نور اللہ، آیت شوریٰ (سورۂ شوریٰ) آیت (اومن کان میتاً فاحییناه) (سورۂ انعام) کی جیسی تفسیر کی ہے اور اس کے ضمن میں قلم سے جو نکات ومعارف نکل گئے ہیں وہ کسی بڑی سے بڑی تفسیر میں نہیں مل سکتے۔"(۱)

خوش نصیبی سے شاہ صاحب کی اس معرکۃ الآراء تصنیف کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے جو کئی لحاظ سے بڑا اہم اور نادر ہے۔ اس کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

اوراق: مجموعی طور پر ۵۰۶ اوراق۔ ضخامت کے سبب کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کر کے جلد بندی کرائی گئی ہے۔ پہلے حصہ میں ۲۵۷ اوراق اور دوسرے حصہ میں ۲۵۸ تا ۵۰۶ اوراق ہیں۔

مسطر=۱۹ سطری۔ کاتب: حاجی گل محمد

خط=نستعلیق۔ سال کتابت: ۱۲۱۳ھ (۲۶ر شعبان) (۱۸۹۵ء)

آغاز= کتاب کا آغاز حسب ذیل کلمات سے ہوتا ہے:

الحمد للہ الذی بعث الینا اشرف الرسل داعیاً الٰی اقوم السبل وجعل اصحاباً زرائه فی عبده وخلفائه من بعدہٖ لتم النعمة ونعم الرحمة واشهدان لا الٰه الا اللہ وحدہٗ واشهدان محمداً عبدہٗ ونبیهٗ الذی لانبی بعدہٗ وصلی اللہ علیه وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین......الخ.

اختتام= کتاب کا خاتمہ کاتب کے حسب ذیل ترقیمے پر ہوتا ہے:

تمت هذه النسخة المبارکه من یدالفقیر حاجی گل محمد بعون اللہ المستعان روز شنبه شهر شعبان تاریخ بست وششم ۱۲۱۳ هجری۔

کتابت بہت اہتمام سے خط نستعلیق میں کی گئی ہے۔ اوراق پر جدول شنگرفی بنائی گئی ہے۔ متن میں ذیلی عنوانات اور فصول بھی شنگرفی ہیں۔ کتاب لائق مطالعہ اور کتابت دیدہ زیب ہے۔

(۱) الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر، ۱۳۵۹ھ) ص: ۳۴۵

## ۸۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر = (فارسی)

قرآن کریم کی تفسیر کے اصول و مبادی سے متعلق مختصر لیکن بے حد اہم رسالہ۔ یہ حسب ذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول: در بیان علوم پنجگانہ کہ قرآن عظیم بطریق تنصیص بیان آن فرمودہ است۔

باب دوم: در بیان وجوہ خفاء معانی نظم قرآن بنسبۃ اذہان اہل زمان وازالۂ خفا باوضح بیان۔

باب سوم: در بیان اسلوب بدیع قرآن۔

باب چہارم: در بیان فنون تفسیر وحل اختلاف واقع در تفسیر صحابہ وتابعین۔

باب پنجم: در ذکر جملہ صالحہ از شرح غریب قرآن واسباب نزول آں کہ مفسران را حفظ آں ممنوع ومحظور۔

خدا بخش لائبریری میں اس اہم وقیع رسالہ کے دو عمدہ نسخے محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک کی جداگانہ حیثیت ہے، جب کہ دوسرا دیگر رسائل کے ساتھ مجلد ہے۔ ذیل میں پہلے ہم جداگانہ حیثیت کے نسخہ کی تفصیلات پیش کرتے ہیں:

اس کا مکمل عنوان اس طرح درج ہے: تفسیر الفوز الکبیر مع تفسیر فتح الخبیر۔ اس میں اوراق کی مجموعی تعداد ۸۸ب ہے۔ خط: نستعلیق عمدہ ہے۔ نسخہ بہت اہتمام سے کتابت کیا گیا ہے۔ عناوین اور ابواب سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ نسخہ قابل دید اور لائق مطالعہ ہے۔ مسطر: ۱۶ سطری ہے۔

آغاز = اس کا آغاز حسب ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

نعم الٰہی در بارۂ ایں بندۂ ضعیف بے شمار اند واجل آنہا توفیق فہم قرآن عظیم است۔ ومن حضرت رسالت پناہ علیہ الصلوٰۃ والسلام امابعد می گوید فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم عاملہما اللہ تعالیٰ بلطفہ العظیم ورا ہے از فہم کتاب اللہ کشادند خواست کہ بعضی نکات نافعہ در تدبر کلام اللہ یاران را بکار آید...... وسمیتہا بفوز الکبیر فی اصول التفسیر وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت وہو حسبی ونعم الوکیل...... الخ۔

اختتام =

وھذا آخر ما اوردناہ فی الرسالۃ المسماۃ بفتح الخبیر مما لا بد منہ

فی علم التفسیر و الحمد للّٰہ اولاً و آخراً وظاھراً وباطناً وصلی اللّٰہ علیٰ سیدنا وآلہٖ وصحبہ اجمعین۔

فوزالکبیر کا دوسرا نسخہ جو مجموعہ رسائل میں شامل ہے۔اس کی تفصیلات اس طرح ہیں:

اوراق=۱۸۳تا۲۰۶۔ مسطر:۱۹سطری

خط= نستعلیق کاتب: بچھمی رام پنڈت

تاریخ کتابت: درج نہیں۔

یہ رسالہ جس مجموعہ میں شامل ہے اس میں حسب ذیل آٹھ رسائل مجلد ہیں اور سب کے اوراق کے نمبر مسلسل ہیں، جن کی مجموعی تعداد ۲۱۲ ہے۔

۱۔ رسائل در مسائل فقہ۔ (ورق ۱-۵) مصنف نامعلوم

۲۔ شرح بر شرح ہدایۃ الحکمۃ: از محمد رشید الدین (ورق ۶-۱۰)

۳۔ ترجمہ عبارات عربیہ تحفہ اثنا عشریہ، از شاہ عبدالقادر (ورق ۱۱-۷۷)

۴۔ احکام الاراضی، از قاضی محمد اعلیٰ بن حامد بن محمد صابر فاروقی التھانوی (ورق ۷۹-۱۱۵)

۵۔ ترجمہ رسالۂ رویا: مترجم مرزا رضی الدین علی، عرف مرزا محمد جان (ورق ۱۱۶-۱۴۴)

۶۔ فوزالکبیر، از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (ورق ۱۴۵-۱۸۲)

۷۔ حق المبین، از محمد رشید الدین (ورق ۱۸۳-۲۰۶)

۸۔ رسالۂ عقائد از محمد رشید الدین (ورق ۲۰۷-۲۱۲)

اس کے مصنف بھی محمد رشید الدین معلوم ہوتے ہیں۔

تمام رسائل کی کتابت یکساں ہے۔اس لئے کاتب بھی سب کا ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔

## ۹۔ قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین:

یہ حضرات شیخین (حضرت ابوبکر صدیقؓ اور خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ) کی فضیلت اور دیگر خلفائے کبار وصحابۂ کرام پر آپ کی افضلیت کے بحث میں ایک مبسوط رسالہ ہے۔اس کی اہمیت وافادیت کو اس کی ضخامت سے نہیں، بلکہ موضوع کی وسعت اور مباحث کی جامعیت سے جانچنا بہتر ہوگا۔شاہ صاحب کا یہ کمال ہے کہ وہ اختصار اور ایجاز سے بڑے ہی حسین اور پُراثر

انداز میں کام لیتے ہیں اور مختصر الفاظ میں ایک جہان معانی سمو دیتے ہیں۔ آپ کا یہی وصف اس رسالے میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ بقول صاحب حیات ولی:

''اس کتاب کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ جناب شاہ صاحب نے اول ایک ایسی کلی صفت بیان کی ہے جو افضلیت کی مدار علیہ ہے۔ ازاں بعد یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مخصوص صفت جس پر افضلیت کا دارومدار ہے، بہ وجہ کمال صرف حضرات شیخین یعنی جناب صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہی تھے، ان کے سوا دوسرے صحابۂ کرام میں نہیں پائی جاتی تھی۔ پھر اس بحث کو یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ نقلی اور عقلی دلائل سے مدلل کیا ہے۔ اس کے بعد حضرات شیخین کے تاثر بیان کئے گئے ہیں اور جو مطاعن کہ مخالف فرقے کے لوگ ان حضرات پر کرتے ہیں ان کے الزامی و تحقیقی جوابات بڑی دھوم سے دیئے گئے ہیں......'' (ص:۳۰۶)۔

آخر میں شاہ صاحب نے اپنے ایک مکاشفہ کا بھی ذکر کیا ہے جس سے حضرات شیخین اور دیگر خلفاء وصحابہ کے بارے میں آپ کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

اس کا ایک انتہائی اہم اور قیمتی نسخہ خدا بخش لائبریری کے ذخائر کو زینت بخش رہا ہے۔ اس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

اوراق = ۲۳۳۔ مسطر = ۱۹ سطری

خط = نستعلیق بعض اوراق پر حواشی بھی درج ہیں۔

آغاز =

الحمد للہ بعث عبدہ محمد صلی اللہ علیہ سلم الی العالمین لیکون رحمة لهم وهدیً و فضله علی جمیع خلقه فآدم من دون تحت لو انه یبتغون منه ندی''......الخ

اختتام =

قلت وممن روی ان الصدیق رضی اللہ عنہ البسه فی النوم الشیخ الکبیر العارف باللہ علی بن وهب البخاری قال رایت ابابکر الصدیق رضی اللہ عنہ فی النوم فقال لی یاعلی قدامرت ان البسک هذه الطاقیة واخرج من کمه طاقة ووضعها علی راسی فاستیقظت

والطاقية بعينها علي راسي. تمت تمام شد

خط = نستعلیق (معمولی)۔ تاریخ کتابت درج نہیں۔

بیشتر اوراق پر کثرت سے حواشی تحریر کیے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس نسخہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

کاتب کا ترقیمہ نہیں ہے جس سے کاتب کے نام اور سال کتابت وغیرہ کا علم ہوتا۔

## ۱۰۔ مصفی شرح موطا: (فارسی)

شاہ صاحب نے موطا امام مالک کی ایک شرح عربی میں تصنیف فرمائی تھی۔ اس کا نام آپ نے مسوّیٰ تجویز فرمایا تھا۔ اسی کی شرح آپ نے فارسی میں بھی تحریر فرمائی جس کا عنوان آپ نے مصفی منتخب فرمایا۔ یہ بات تو تمام اہل علم کے علم میں ہے کہ کتب احادیث میں موطا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کی تدوین حضرت امام مالک نے انتہائی محنت، دقت نظر اور کمال تحقیق سے کام لے کر فرمائی تھی۔ یہ مجموعہ احادیث علماء و محدثین کے حلقوں میں بہت ہی مقبول رہا ہے۔ شاہ صاحب نے ان احادیث کی جو تشریح فرمائی ہے وہ بے حد مفید اور کار آمد ہے۔ اس سے آپ کی مصنفانہ اور محدثانہ شان بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ آپ کے تبحر علمی اور فن حدیث سے غیر معمولی شغف کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس اہم شرح کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری کے ذخائر کی زینت میں اضافہ کر رہا ہے۔ اس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

اوراق = ۳۰۲۔ مسطر = ۲۱ سطری۔

خط = نستعلیق عمدہ کاتب = سید بہادر علی لکھنوی۔

تاریخ کتابت: = ۵ محرم ۱۲۰۶ھ (ستمبر ۱۷۹۱ء)

ہر ورق پر بکثرت حواشی مرقوم ہیں۔

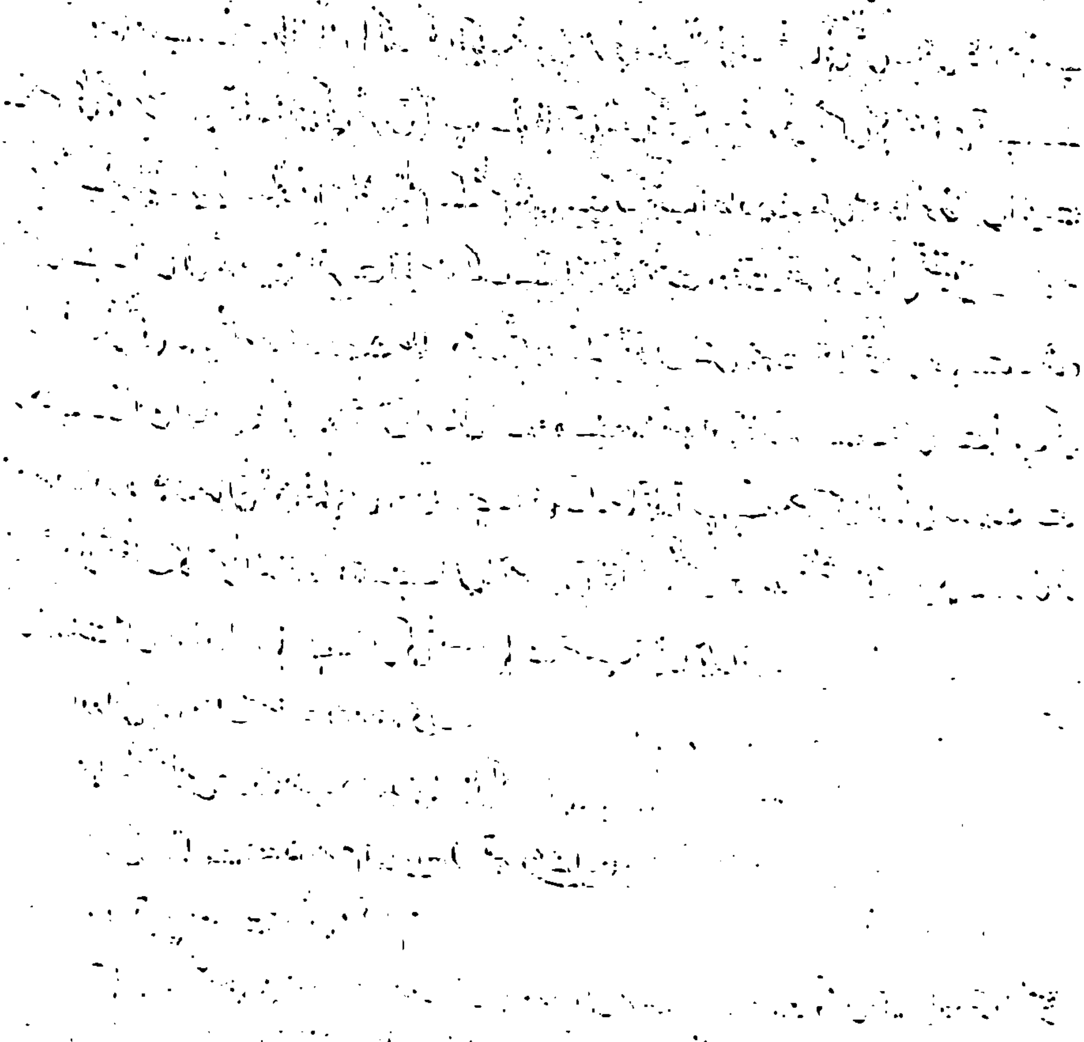
آغاز = ”نعمتہای حضرت باری جل مجدہٗ بیرون از حد احصا است و نعمتی کہ زیادہ تر از جمیع نعمتہا بعد نعمت ایجاد و رزق تو اں دانست بعثت انبیاء است“۔ الخ

ترقیمہ =

تمام شد بعون اللہ تعالیٰ ہذا کتاب المصفا ترجمہ المسوی بتاریخ پنجم شہر محرم الحرام ۱۲۰۶ھ
یوم جمعہ بخط خام ناقص الخط فقیر احقر العباد سید بہادر علی لکھنوی عفی عنہ تحریر یافت۔

غریق رحمت یزداں کسی باد
کہ کاتب را بالحمد کند یاد

اور آخر میں بطور "سوغات" شاہ صاحب کی تحریر کا عکس پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں جس میں آپ نے روایت حدیث کی ایک سند پیش کی ہے۔ یہ تحریر لائبریری میں محفوظ الجامع الصحیح کے قلمی نسخے پر ثبت ہے۔ اور اس پر شاہ رفیع الدین صاحب کے دستخط بھی ہیں۔



[illegible]

والمقامات الجليلة جميعها الا قراءتنا من كتاب البيع الى كتاب الادب فانها بالاجازة. وكذلك قرأت عليه اكثر غالبها وطرفا من البغوى وغيرها من الكتب المشهورة وهو تلميذ الامير محمد زاهد بن القاضى محمد اسلم الحسينى الهروى وهو تلميذ ملا محمد فاضل تلميذ ملا يوسف القواسمى تلميذ ميرزاجان تلميذ ملا محمود الشيرازى تلميذ ميرزا جلال الدين الدوانى تلميذ ابيه مولانا اسعد الدوانى تلميذ شرف الدين عبد الرحيم الجرمى الصديقى روى مشكوة المصابيح عن العلامة امام الدين على بن مبارك شاه الصديقى الساوجى عن مؤلفه الامام ولى الدين محمد بن عبد الله بن الخطيب التبريزى رحمة الله عليه قال ذلك بلسانه وكتبه بيده الفقير الى رحمة الله الكريم الودود ولى الله احمد بن عبد الرحيم بن وجيه الدين بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود عفى الله عنه وعنهم والحقه واياهم باسلافهم الصالحين العمرى نسبا الدهلوى وطنا الاشعرى عقيدة الصوفى طريقة الحنفى عملا والحنفى الشافعى تدريسا خادم التفسير والحديث والفقه والعربية والكلام وله فى كل ذلك تصنيف والحمد لله اولا وآخرا ظاهرا وباطنا ذى الجلال والاكرام كان ذلك يوم الثلاث الثالث والعشرين من الشوال سنة ١١٥٩ [?]

عفا[?]

الى حفظ حضرت الدار الاورات
بلا شبهة كتبه الفقير محمد رضى الدين

# رام پور رضا لائبریری میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیفات کے قلمی نسخے

ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی☆

رام پور رضا لائبریری علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ یہ لائبریری ذخیرۂ مخطوطات کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ یہاں عربی، فارسی، اردو، ترکی، پشتو اور دیگر زبانوں کے پندرہ ہزار مخطوطات کے علاوہ پانچ ہزار مغل عہد کی قلمی تصاویر و تین ہزار اسلامی خطاطی کے نمونے محفوظ ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصنیفات میں سے اکثر کتابوں کے قلمی نسخے رام پور رضا لائبریری میں موجود ہیں جن میں سے بعض نہایت اہم ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ان مخطوطات کی فہرست مختصر تعارف کے ساتھ پیش کی جارہی ہے۔

## فارسی مخطوطات

مخطوطہ نمبر فارسی ٦٦: حضرت شاہ صاحب کی تصانیف میں ایک اہم تصنیف الفوز الکبیر ہے، جو اصول تفسیر سے متعلق ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری میں موجود ہے۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر: مصنفہ شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۱۴، ۱۷۰۳) (۱۱۷٦-۱۷٦۲)۔

ورق ۱۲۹، سطر ۱۵، سائز ۱۷×۳۰، خط عمدہ نسخ سن کتابت ۱۱۷۹ھ کاتب: حضوراللہ۔

☆ اسسٹنٹ لائبریرین رام پور رضا لائبریری رام پور

کشمیری۔

ابتداء: نعم الٰہی درباره ایں بنده ضعیف بے شمار اند......۔

خاتمہ: فرغت من تسوید الرساله المسماة بفتح الحر بما لا بد منه فی علم التفسیر التی صنفها العالم...... قدكان الفراغ من التسوید رجب المرجب ۱۸۷۹ء علی ید...... حضور الله کشمیری۔

شاہ صاحب کی یہ کتاب اصول تفسیر کے موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے جس میں انہوں نے فہم قرآن کی مشکلات کا علمی تجربہ پیش کیا ہے۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی اس میں بعض اصول جو شاہ صاحب نے اپنے ذوق و وجدان اور فہم قرآن کی بنا پر لکھ دیئے ہیں، دوسری کتابوں کے سیکڑوں صفحات کے مطالعے سے حاصل نہیں ہوسکتے۔

مخطوطہ نمبر فارسی ۱۳۰: فتح الرحمٰن قرآن مجید کا فارسی ترجمہ، جلد اول۔

ورق: ۱۹۷، سائز ۱۷×۲۵ خط معمولی نستعلیق، تاریخ کتابت ندارد

یہ جلد قرآن مجید کے نصف اول کا ترجمہ ہے۔ ورق اب سے ۴ب تک مقدمہ ہے۔

مخطوطہ نمبر فارسی ۱۳۱: فتح الرحمٰن، جلد دوم یہ نصف آخر کا ترجمہ ہے جو سورہ کہف سے شروع ہو رہا ہے

ورق: ۲۲۰، سائز: ۱۷×۲۵ خط معمولی نستعلیق، تاریخ کتابت ندارد

ترقیمہ: قد وقع الفراغ من ترجمة القرآن الشریف حقایق ومعارف آگاه میاں شاه ولی الله قدس سره فی وقت الضحی یوم التاسع وعشرون من شهر رمضان۔

مخطوطہ نمبر ۲۹۰: ہوامع شرح حزب البحر فن اوراد

ورق: ۱۰۵، سائز ۱۷×۲۵، خط عمدہ نستعلیق، تاریخ کتابت ندارد۔

یہ نسخہ نہایت خوبصورت مطلا مذہب ہے۔ ابتداء میں طلائی لوح ہے۔ ابتدائی عبارت جس سے کتاب کی غرض و غایت معلوم ہوتی ہے اس طرح ہے:

الحمد لله...... امابعد میگوید فقیر ولی الله عفی عنه ایں کلمه چند است که از سمائب الهام بر دل ایں فقیر ریخته در اثنای خواندن حزب البحر که دعائیست مشهور از ملهمات شیخ عظیم القدر ابوالحسن الشاذلی قدس

سرہ مسمی بھوامع۔

مخطوطہ نمبر ۴۱۹: قرۃ العینین بہ تفضیل الشیخین، فن عقائد، یہ کتاب شیخین (حضرت ابوبکر وعمر) کی فضیلت میں ہے۔

ورق: ۲۰۶، سائز ۲۳×۳۰ سینٹی میٹر، خط عمدہ نستعلیق، سنہ کتابت ندارد۔

کتابت دو قلم کی ہے، ورق ۲۷ الف تک خط جلی نستعلیق۔ اس کے بعد خط خفی معمولی نستعلیق، عنوانات سرخ روشنائی سے درج ہیں، ابتداء: الحمد للہ امابعد میگوید فقیر ولی اللہ عفی عنہ کہ برادر عزیز خواجہ محمد امین اکرمہ اللہ تعالیٰ بشہودہ از سر تفضیل شیخین رضی اللہ عنہما سوال کردند......

مخطوطہ نمبر ۴۲۰: ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء، فن عقاید، یہ کتاب بھی خلفائے راشدین کی خلافت کے ثبوت اور نظام خلافت کی ضرورت پر محیط ہے۔

ورق: ۶۳۶، سائز ۱۸×۲۹، خط معمولی نستعلیق، سنہ کتابت ندارد۔

ابتدائے کتاب میں شاہ صاحب نے کتاب کی غرض وغایت اس طرح بیان کی ہے۔

الحمد للہ...... امابعد میگوید فقیر حقیر ولی اللہ عفی عنہ کہ دریں زمانہ بدعہ تشیع آشکار شد ونفوس عوام بشبہات ایشاں منتشر بہ گشت واکثر اہل ایں اقلیم در اثبات خلافۃ خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین شکوک بھم رسانیدند......

مخطوطہ نمبر ۴۲۱: بلاغ المبین، فن عقائد۔

ورق ۷۸، سطر ۱۳، سائز ۱۷×۲۴ خط معمولی نستعلیق، سنہ کتابت ۱۲۳۸ھ

ابتداء: الحمد للہ... ایں رسالہ ایست نامیدہ بلاغ المبین کہ آیات کلام رب الانام واحادیث صحیحہ رسول ﷺ وآثار صحابہ کرام واخبار اولیاء عظام اندران ترجمہ نمودہ آمد......

ترقیمہ: بحسب ارشاد فیض بنیاد مولوی مکرمی مولانا رشید الدین خاں صاحب دامت ارشادہم بلاغ المبین (۱۱۶۶) بتاریخ بیست وچہارم شہر رجب ۱۲۳۸ در بلدہ اجمیر اتمام وسمت اختتام پذیرفت کتبہ میر شاہ علی۔

مخطوطہ نمبر ۱۰۰۴: الطاف القدس فی معرفۃ لطائف النفس، فن سلوک۔

یہ کتاب لطائف باطنی کی تشریح اور تصوف کے بنیادی مسائل کی توضیح میں ہے۔

ورق: ۱۰۰، سطر ۱۱، سائز ۱۵×۲۱، خط عمدہ نستعلیق، سنہ کتابت ۱۲۸۸ھ۔

ابتداء: الحمد للہ...... امابعد میگوید فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدھلوی، احسن اللہ الیہ ولی مشایخہ وابویہ این ورقی چند است مسمی بالطاف القدس فی معرفۃ لطائف النفس دربیان حقیقت قلب وعقل ونفس وروح......۔

خاتمہ: انتہت رسالہ الطاف القدس والحمد للہ اولا وآخر...... تمت ۲۰/رجب ۱۲۸۸ھ۔

مخطوطہ نمبر ۱۰۰۵: ہمعات، فن سلوک۔

ورق: ۳۸، سطر، ۲۱، سائز: ۱۵×۲۴ سینٹی میٹر سنہ کتابت ۱۱۸۲ھ۔

لائبریری کا یہ نسخہ بہت اہم ہے کیونکہ اس کی کتابت شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے کی ہے، ترقیمہ کی عبارت یوں ہے: "تمام شد نسخہ ہمعات وقت چاشت روز شنبہ تاریخ ششم از ماہ شعبان در سنہ ۱۱۸۲ ہجری بدست فقیر عبدالقادر بن مصنف الکتاب عفی عنہ ورفعت درجتہ" آمین۔

مخطوطہ نمبر ۱۰۰۶: المقالۃ الوضیۃ، فن سلوک۔

ورق: ۱۴، سطر ۹، سائز ۱۵×۲۳، خط نستعلیق، سنہ کتابت ندارد۔

ابتداء: الحمد للہ...... اما بعد میگوید ولی اللہ عفی عنہ ایں کلمات چند است کہ اولاد واحباب خود را وصیت میکنم سمیتہا بالمقالۃ الوضیہ فی النصیحہ والوصیہ حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

مخطوطہ ۲۳۱۳: انفاس العارفین فن تذکرہ صوفیاء۔

ورق: ۱۵۶، سطر ۱۱، سائز ۱۷×۲۹ سینٹی میٹر، خط نستعلیق، سنہ کتابت ندارد۔

ابتداء میں جن کا ذکر کتاب میں آیا ہے ان کے نام کی فہرست ہے سب سے پہلا نام ان کے والد شاہ عبدالرحیم کا ہے آخر میں شیخ تاج الدین کا ذکر ہے۔

آخر میں تین ورق کا رسالہ جزء اللطیف فی ترجمۃ عبدالضعیف ہے جو خود شاہ صاحب کے حالات پر مشتمل ہے۔

مخطوطہ ۲۲۳۱۴: انفاس العارفین، فن تذکرہ صوفیاء۔

ورق: ۲۰۲، سطر ۱۳، سائز: ۱۶×۲۵ سینٹی میٹر، خط معمولی نستعلیق، تاریخ کتابت ندارد۔

ترقیمہ: بندہ مولف میگوید عفی عنه که چون در این کتاب مستطاب احوال شیخین جلیلین حضرت بزرگ شیخ عبدالرحیم و حضرت شیخ ابوالرضا محمد قدس سره تمام شد۔

# عربی مخطوطات

رام پور رضا لائبریری کے ذخائر مخطوطات میں حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ قرآن کریم کے متعدد نادر و نایاب قلمی نسخے محفوظ ہیں، جن کا اجمالی تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مخطوطہ نمبر عربی ۲۱۴: قرآن مجید مع فارسی ترجمہ۔

ورق ۴۷۴، سطر ۱۳، سائز: ۱۳×۲۲ سینٹی میٹر، سن کتابت ۱۲۱۰ء۔

قرآن مجید کا بہترین نسخہ ہے شروع میں مطلا و مذہب لوح ہے درمیان میں شاہ صاحب کے فارسی ترجمہ کو سونے سے لکھا گیا ہے۔

مخطوطہ نمبر ۲۱۹: قرآن مجید مع فارسی ترجمہ۔

ورق: ۵۹۳، سطر: ۹، سائز: ۲۳×۳۶ سنٹی میٹر سنہ کتابت غالباً درمیان ۸، ۱۲۶۶ء شاہ ولی اللہ صاحب کے فارسی ترجمہ کے ساتھ قرآن مجید کی نہایت خوبصورت کاپی ہے، متن عمدہ نسخ اور ترجمہ بہترین نستعلیق میں ہے۔ متن کی شروعات خوبصورت ڈبل پیچ عنوان سے ہوتی ہے۔ ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ نواب سید محمد سعید خاں بہادر والی رامپور کے حکم پر لکھا گیا تھا اور خط نسخ میں متن کی کتابت میاں جی عبداللہ رامپوری نے اور ترجمہ کی کتابت خط نستعلیق میں محمد رحیم اللہ رامپوری نے کی ہے۔

مخطوطہ نمبر ۲۲۰: قرآن مجید مع ترجمہ فارسی۔

ورق: ۲۰۹، سطر ۵، سائز: ۱۷×۲۳ سنہ کتابت غالباً تیرہویں صدی ہجری۔

قرآن مجید کے اس خوبصورت نسخے میں شاہ صاحب کا فارسی ترجمہ اور شاہ عبدالقادر کا

اردو ترجمہ شامل ہے۔

مخطوطہ نمبر ۲۲۱: قرآن مجید مع ترجمہ فارسی۔

ورق: ۳۰۵، سطر ۱۵، سائز ۱۵×۲۶.۷، سنہ کتابت تیرہویں صدی ہجری، حاشیہ پر شاہ ولی اللہ کا فارسی ترجمہ تحریر ہے۔

مخطوطہ نمبر ۷۰۱: المسوی من احادیث الموطاء، فن حدیث۔

ورق: ۲۸۵، سطر، ۱۹، سائز ۱۶×۲۸، سنٹی میٹر، کتابت تیرہویں صدی ہجری۔ یہ موطا امام مالک پر شاہ صاحب کی عربی شرح ''مسوی'' کا قلمی نسخہ، قدرے کرم خوردہ ہے۔

مخطوطہ نمبر ۷۹۶: صحاح فن حدیث۔

ورق: ۳۸، سطر ۲۱، سائز: ۱۵×۲۲، سنہ کتابت تیرہویں صدی ہجری۔

صحیح بخاری پر شاہ ولی اللہ دہلوی کی تعلیقات کا مجموعہ ہے، یہ نسخہ شاہ رفیع الدین دہلوی کے عہد کا لکھا ہوا ہے۔

مخطوطہ نمبر ۱۰۱۸: کتاب الاربعین حدیثاً فن حدیث۔

ورق، ۱، سطر: ۱۵، سائز ۱۹×۲۶، سنہ کتابت ۱۲۵۳ھ۔

چالیس احادیث کا مجموعہ، اس کتاب کے پانچ قلمی نسخے موجود ہیں۔

مخطوطہ نمبر ۸۸۶: الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین۔

ورق: ۶، سطر: ۱۸، سائز: ۱۵×۲۳، سنٹی میٹر، زمانہ کتابت چودہویں صدی ہجری از نزاکت علی۔ یہ ان مبشرات کا مجموعہ ہے جو مصنف نے خواب یا الہام کے ذریعہ نبی ﷺ سے حاصل کی تھیں۔

مخطوطہ نمبر ۱۹۶۱: المقدمۃ السنیہ: فن عقائد۔

ورق: ۴، سطر: ۲۳، سائز: ۱۴×۲۰، سنہ کتابت۔

یہ کتاب خلافت ابوبکر کی حمایت اور اہل تشیع کے رد میں ہے۔ کتابت غلام حسین بن نور محمد کی ہے۔

مخطوطہ نمبر ۱۷۳۲: العقیدۃ الحسنہ، فن عقائد۔

ورق: ۲، سطر: ۲۱، سائز ۱۷×۲۵، سنہ کتابت تیرہویں صدی ہجری۔

اس کتاب میں اسلام کے بنیادی عقائد کو اہل سنت کے مسلک اور قرآن وحدیث کی روشنی میں جامع طریقہ پر بیان کیا گیا ہے۔

مخطوطہ نمبر ۱۳۵۵: الجواہر المضیہ فی حلیہ خیر البریہ، فن ادعیۃ الصلوۃ۔

ورق: ۷، سطر: ۱۲، سائز: ۱۲×۱۸، خط نستعلیق، زمانہ کتابت تیرہویں صدی ہجری۔

مخطوطہ نمبر ۱۹۶۱: الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف، فن اصول فقہ حنفی۔

ورق ۱۵، سطر ۲۳، سائز: ۱۴×۲۰، خط نستعلیق، سنہ کتابت ۱۲۰۶ھ کتابت از غلام حسین بن نور محمد۔

مخطوطہ نمبر ۲۱۶۷: فیوض الحرمین، فن سلوک۔

ورق، ۳۵، سطر، ۱۷، سائز، ۱۹×۲۹، زمانہ کتابت تیرہویں صدی ہجری۔

یہ کتاب قیام حجاز کے زمانہ کے مشاہدات، حقائق باطنی اور مسائل تصوف سے تعلق رکھتی ہے۔

مخطوطہ نمبر ۳۱۶۸: البدور البازغۃ، فن سلوک۔

ورق ۶۵، سطر، ۲۵، سائز ۲۰×۳۲.۵، خط نستعلیق، زمانہ بارہویں صدی ہجری۔

نسخہ مصنف کی حیات میں تیار ہوا ہے۔

یہ کتاب بھی فلسفہ دینی کے بیان پر مشتمل ہے بقول علی میاں ندوی، اس کتاب میں حجۃ اللہ البالغہ کے مقابلہ میں مضامین کی کثرت ہے۔

مخطوطہ نمبر ۳۱۶۸: التفہیمات الالہیہ، فن سلوک۔

ورق، ۱۵۷، سطر، ۲۶، سائز: ۲۰×۳۲، خط نستعلیق، زمانہ بارہویں صدی ہجری۔

مصنف کے عہد کا نہایت اہم کاپی ہے۔ یہ کتاب شاہ صاحب کے واردات قلبی اور وجدانی مضامین پر مشتمل ہے۔

مخطوطہ نمبر ۱۹۶۱: رسالہ فی وحدۃ الوجود، فن سلوک۔

ورق ۶، سطر، ۲۳، سائز: ۱۴×۲۰، خط نستعلیق از غلام حسین سنہ کتابت ۱۲۰۶ھ۔

# حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فقہی رجحانات

(مفتی) فضیل الرحمن ہلال عثمانی☆

ہر قانون میں کچھ بنیادی اصول اٹل اور پائیدار اور نا قابل تغیر ہوتے ہیں، کیونکہ اس کے بغیر کوئی قانون اپنی ہستی کو برقرار نہیں رکھ سکتا اس قانون کی اپنی کوئی متعین شکل باقی نہیں رہ سکتی۔ وہ ایک پگھلے ہوئے مادے کی طرح ہر سانچے میں ڈھل سکتا ہے اور ہر وقت اپنی شکل بدل سکتا ہے۔

قانون کے بنیادی اصول اٹل اور پائیدار ہونے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمیشہ باقی رہنے والے قانون میں اتنی لچک بھی ہو جو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں انسانوں کی رہنمائی کر سکے اور انسانی ترقی میں آڑے نہ آئے۔

گویا قانون کی خوبی یہ ہوئی کہ وہ اٹل اور پائیدار اصولوں پر قائم ہو اور اتنا لچکدار ہو کہ ہر زمانے کے ترقی پذیر تمدن کی رہنمائی کر سکے۔ اسلامی قانون تین پائیدار، اٹل اور نا قابل تغیر اصولوں پر قائم ہے۔

(۱) قطعی اور صاف احکام: جو قرآن حکیم یا ثابت شدہ حدیثوں میں دیئے گئے ہیں۔ جیسے شراب اور سور کا حرام ہونا، چوری، زنا اور جھوٹا الزام لگانے کی سزائیں، میت کے ترکے میں وارثوں کے حصے۔

(۲) اصولی احکام: جو قرآن مجید اور ثابت شدہ حدیثوں میں بیان ہوئے ہیں مثلاً ہر وہ چیز جو نشہ پیدا کرے حرام ہے۔ مرد، عورتوں کے اوپر قوام و نگراں ہیں۔ لیکن دین کے وہ طریقے جن

---

☆ ڈائریکٹر ادارہ دارالسلام اسلامی مرکز مالیر کوٹلہ پنجاب۔

کے منافع کا تبادلہ باہمی رضامندی سے نہ ہو باطل ہیں۔

(۳) حدود: جو قرآن مجید اور حدیثوں میں اس لئے مقرر کی گئی ہیں کہ ہم اپنی آزادیٔ عمل کو ان کے اندر محدود رکھیں، کسی حال میں ان سے آگے نہ بڑھیں، مثلاً ایک سے زیادہ شادیوں میں بیک وقت ایک مرد کے نکاح میں چار عورتوں کی مشروط حد — طلاق کے لئے زیادہ سے زیادہ تین کی حد —— وصیت کے لئے ایک تہائی مال کی قید۔

اسلامی قانون کا یہ اٹل، قطعی اور واجب الاطاعت حصہ اسلامی تہذیب کی بنیادی شکل وصورت متعین کرتا ہے۔ یہ اصولی احکام منزل کے لئے نشانِ راہ (Signal posts) کا کام دیتے ہیں۔ یہ نشان ہماری ترقی کو روکنے والے نہیں ہیں بلکہ ہمیں سیدھی راہ پر لگانے اور ہمارے سفرِ زندگی کو بے راہ روی سے بچانے کے لئے ہیں۔ یہ نشان ٹھیک اس جگہ لگائے گئے ہیں جہاں انسانی قوت فیصلہ غلطی کر کے راہِ راست سے ہٹ سکتی ہے۔

اسلامی قانون کا دوسرا حصہ وہ ہے جو اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتا ہے۔ اور اس قانون کو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں ترقی پذیر بناتا ہے یہ حصہ چار عناصر اور اجزاء پر مشتمل ہے۔

(۱) تعبیر احکام: یعنی جن الفاظ میں حکم دیا گیا ہے ان کا مفہوم سمجھنے اور اس کا منشاء متعین کرنے کی کوشش کرنا، احکام کی تعبیر میں اہل علم کی رائے کا اختلاف پہلے بھی رہا ہے، اور آئندہ بھی رہے گا۔ جس طرح ایک ہی قانون کی تعبیر اور تاویل میں ججوں کی رائے مختلف ہوتی ہے اس سے قانون میں غور وفکر کا موقع ملتا ہے اور ترقی کی راہیں کھلتی ہیں۔

(۲) قیاس: یعنی جس معاملے مین کوئی صاف حکم نہ ملتا ہو اس میں کتاب وسنت سے ملتے جلتے حکم کو جاری کرنا جس کی کتاب وسنت میں نظیر مل سکے، مقدمات میں عام طور پر دوسرے مقدموں کے فیصلے بطور نظیر اور مثال کے دیئے جاتے ہیں۔ ٹیکنیکل اور اصطلاحی زبان میں "علت مشترکہ" کی تلاش کو قیاس کہا جاتا ہے۔

اس کو آسانی کے لئے ایک مثال سے سمجھ لیجئے:

قرآن مجید میں کچھ آیتیں ہیں جن کی تلاوت پر سجدہ کرنا ضروری ہوتا ہے، سجدہ کی ایک

مخصوص شکل ہے، جس میں پیشانی زمین پر رکھی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص نماز میں آیت سجدہ پڑھے اور رکوع کرتے ہوئے سجدہ تلاوت کی بھی ساتھ ہی نیت کرلے تو صرف نماز میں اس کی اس نیت کی وجہ سے رکوع میں ہی سجدہ تلاوت ادا ہوجائے گا نماز سے باہر سجدہ کی آیت پڑھے تو رکوع کافی نہ ہوگا سجدہ ہی کرنا پڑے گا۔

ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لئے کہ آیت سجدہ کی تلاوت پر سجدہ کرنے کا منشا تعظیم اور اظہار عظمت ہے، رکوع میں عظمت کا اظہار اتنا نہیں ہے جتنا سجدہ میں ہے اس لئے نماز سے باہر آیت سجدہ کی تلاوت پر رکوع کرنا کافی نہ ہوگا، سجدہ ہی کرنا ہوگا۔

مگر نماز میں معاملہ ذرا مختلف ہے کہ نماز میں رکوع اور سجدہ دونوں تعظیم کے اظہار میں یکساں، میں دیکھئے قرآن مجید میں ہے:

"وَخَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ (ص: ۲۴) (سجدہ میں گر گئے اور خدا کی طرف متوجہ ہوئے)۔

قرآن مجید کی آیت (نص) سے ثابت ہے کہ نماز میں رکوع اور سجدہ دونوں مشابہ ہیں۔ مشابہت کی اس علت سے یہ مسئلہ قیاس کے ذریعہ سامنے آیا۔

اس قیاس سے کوئی نیا مسئلہ نہیں نکالا گیا بلکہ آیت کے منشا کو ظاہر کردیا گیا۔ جس کے لئے بہرحال سمجھ بوجھ اور تفقہ کی ضرورت ہے۔ عام آدمی اس طرح مسئلے ثابت نہیں کرسکتا، یہ فقیہ کی ہی نظر ہے کہ ہر باریک پہلو تک پہنچ جاتی ہے۔

(۳) استحسان: یعنی مباحات کے وسیع دائرے میں حسب ضرورت قیاس جلی سے اقوی دلیل جو اسلام کی روح سے مطابقت رکھتی ہو اس کے مطابق قوانین وضع کرنا اس کو بھی ایک مثال سے سمجھ لیجئے۔

شریعت میں درندے جانوروں کا جھوٹا ناپاک ہے کیونکہ درندوں کا گوشت حرام ہے۔ ان کا کھانا جائز نہیں ہے۔ لعاب دہن گوشت سے بنتا ہے وہ بھی ناپاک ہے اگر درندہ کسی چیز میں منہ ڈال دے تو اس کا لعاب دہن (منہ کا تھوک) اس میں مل جانے کی وجہ سے وہ چیز ناپاک ہوجائے گی۔

اس اصول کا تقاضہ یہ تھا کہ جس طرح درندوں کا جھوٹا ناپاک ہے اسی طرح ان پرندوں کا

جھوٹا بھی ناپاک ہو جن کا گوشت کھایا جانا جائز نہیں ہے۔

مگر دیکھا گیا کہ درندہ کھاتے وقت اپنی زبان سے مدد لیتا ہے جس سے اس کا لعاب اس چیز میں مل جاتا ہے مگر پرندہ چونچ کے ذریعہ زبان پر لے جاتا ہے تو اس چیز میں چونچ لگتی ہے زبان نہیں لگتی جس سے لعاب دہن مل سکے چونچ ہڈی ہے اور ہڈی پاک ہے۔

اس دلیل کی وجہ سے اس پہلو کو ترجیح دی گئی کہ حرام پرندے کا جھوٹا ناپاک نہیں ہے۔

(۴) اجتہاد: یعنی شریعت کے اصول اور ہدایات کی روشنی میں ان معاملات کو واضح کرنا جن میں کوئی نظیر نہ ملتی ہو۔

مذکورہ بالا چاروں چیزیں۔ تعبیر احکام، قیاس، استحسان اور اجتہاد تمدن کو روز افزوں ضروریات اور متغیر حالات کے لئے قانون سازی کا دروازہ کھلا رکھتی ہیں۔

مگر جس طرح ہر راہ رو کا یہ حق تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ کسی قانونی مسئلہ پر فیصلہ صادر کر دے، اس کے لئے قانونی تعلیم اور ذہنی تربیت کا ایک خاص معیار دنیا میں ہر جگہ ہر قانون کے لئے ضروری ہوتا ہے جس پر پورا اترے بغیر کوئی شخص ماہرانہ رائے زنی کا اہل نہیں مانا جا سکتا۔ اسی طرح

- تعبیر احکام کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اس زبان کی نزاکتوں سے واقف ہو جس زبان میں یہ احکام دیئے گئے ہیں۔ ان حالات سے واقف ہو جن میں ابتداء یہ احکام دیئے گئے تھے، قرآن کے انداز بیان کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور حدیث کے ذخیرے پر وسیع نظر رکھتا ہو۔
- قیاس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اتنی لطیف قانونی حس رکھتا ہو جو ایک معاملے کو دوسرے معاملے پر قیاس کرتے ہوئے ان کی مماثلت کے پہلوؤں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکے ورنہ ایک حکم کو دوسرے حکم پر منطبق کرنے میں وہ غلطی سے نہیں بچ سکتا۔
- استحسان کے لئے بھی ناگزیر ہے کہ آدمی اسلام کے مزاج اور اس کے نظام زندگی کو اچھی طرح سمجھتا ہو تاکہ مباحات کے دائرے میں جو قوانین وضوابط تجویز کرے وہ اس نظام زندگی کے مجموعے میں صحیح طور پر جذب ہو سکیں۔
- اجتہاد کے لئے شریعت کے احکام میں گہری بصیرت اور معاملات زندگی کا عمدہ فہم ہونا

چاہئے اور صرف عام فہم ہی نہیں بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے فہم درکار ہے۔

ان علمی اور ذہنی صلاحیتوں سے بڑھ کر ایک اور چیز بھی درکار ہے جس کے بغیر اسلامی قانون کا ارتقا کبھی صحیح خطوط پر نہیں ہوسکتا اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ اس کام کو انجام دیں ان کے اندر اسلام کی پیروی کا ارادہ اور خدا کے سامنے اپنی جواب دہی کا احساس موجود ہو۔

## ۲۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ:

اجتہاد کے متعلق ان تمہیدی کلمات کے بعد آیئے دیکھتے ہیں کہ محدث دہلوی حضرت شاہ ولی اللہ کے فقہی رجحانات کیا ہیں، اور فقہ کے میدان میں ان کی مجتہدانہ کاوشوں کا کیا اثر پڑا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی ولادت بارہویں صدی ہجری اٹھارہویں صدی عیسوی کی ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۴ر شوال ۱۱۱۴ھ مطابق ۲۱ر فروری ۱۷۰۳ء (چہار شنبہ بدھ) ہے۔ ان کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم فقہ میں مسلک حنفی کے پیرو تھے، شاہ ولی اللہ کی نشو ونما بھی اسی خاندانی ماحول میں ہوئی۔ اور وہ بھی عملاً فقہ حنفی سے وابستہ رہے۔

چنانچہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں شیخ محمد بلگرامی الہ آبادی کے ہاتھ کا لکھا ہوا مکمل نسخہ بخاری شریف کا موجود ہے۔ یہ نسخہ شاہ ولی اللہ کے درس میں رہا ہے۔ اس پر ایک اجازت نامہ انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، جس کے آخیر میں لکھا ہوا ہے کہ:

"كتبهٔ بيدهٖ الفقير الى رحمة الله الكريم الودود، ولى الله بن عبدالرحيم بن وجيهه الدين العمرى نسباً، الدهلوى وطناً، الاشعرى عقيدتاً، الصوفى طريقتاً، والحنفي عملاً والحنفى والشافعى درساً"

یہ تحریر ۱۱۵۹ھ کی ہے۔

خاندانی طور پر اگر چہ وہ فقہ حنفی کے مقلد اور پیروکار تھے مگر اس میں شک نہیں کہ حضرت شاہ صاحب میں اجتہادی صلاحیت اور مجتہدانہ بصیرت موجود تھی۔ مولانا عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں کہ:

"ہم شاہ ولی اللہ کو حنفی اور شافعی ہر دو فقہ میں مجتہد منتسب مانتے ہیں"۔

اب یہ سمجھ لیجئے کہ مجتہد منتسب کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ اصل میں مجتہد دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک مجتہد مطلق اور دوسرے مجتہد منتسب، مجتہد مطلق وہ ہوتا ہے جس میں تین باتیں پائی جائیں۔ ایک

تو یہ کہ فقہ کے مسائل جن اصول اور قواعد کے تحت مستنبط ہوتے ہیں ان اصول وقواعد میں مجتہد مطلق یا مجتہد مستقل خود تصرف کرتا ہے۔ یعنی اصول وقواعد بھی مقرر کرتا ہے اور اصولوں کے تحت مسائل کا استنباط بھی کرتا ہے۔ دوسری بات مجتہد مطلق میں یہ ہوتی ہے کہ اُس کے پاس احادیث وآثار کا کافی ذخیرہ موجود ہوتا ہے اور ان حدیثوں کے احکام سے وہ خوب باخبر ہوتا ہے۔ اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون سی حدیثیں فقہ کا ماخذ ہیں؟ اور وہ مختلف روایات میں تطبیق کر کے یا کسی روایت کو ترجیح دے کر اُسی روایت کا مفہوم متعین کرتا ہے۔ تیسری بات مجتہد مطلق میں یہ ہوتی ہے کہ جب اُس کے سامنے ایسے فروعی مسائل پیش کیے جائیں جن کا اُس سے پہلے جواب نہ دیا گیا ہو تو وہ اپنے اجتہاد کے ذریعے ان کا جواب دیتا ہے۔ یعنی وہ کلیات سے فروعات کا استخراج کرتا ہے۔ مجتہد منتسب میں یہ فرق ہوتا ہے کہ وہ فقہ کے اصول وقواعد نہ تو خود متعین کرتا ہے اور نہ اُن اصول وقواعد میں اپنی طرف سے کوئی تصرف کرتا ہے بلکہ کسی مجتہد کی مستقل پیروی کر کے اُس کے مقرر کیے ہوئے اصولوں کو مان لیتا ہے۔ باقی مجتہد منتسب میں مجتہد مطلق کی دوسری اور تیسری صفتیں پائی جاتی ہیں۔

لہٰذا حضرت شاہ صاحب اس لحاظ سے مجتہد منتسب ہیں کہ وہ اصول فقہ میں امام ابوحنیفہ کی پیروی کرتے ہیں لیکن بذاتِ خود ان کی احادیث پر نظر ہے اور انہیں معلوم ہے کہ کون سا مسئلہ کس حدیث سے نکلا ہے وہ مختلف روایات میں تطبیق بھی دیتے ہیں اور کسی ایک روایت کو وہ ترجیح دے کر اس کے مفہوم کی تعیین کرتے ہیں نیز کلیات سے فروعی مسائل کا وہ جواب دیتے ہیں جو اس سے پہلے نہیں دیا گیا تھا۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ فقہ حنفی کے مجتہد ہیں۔ (ملاحظہ ہو شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ صفحہ: ۱۹۴، تالیف مولانا عبید اللہ سندھی شائع کردہ سندھ ساگر اکیڈمی لاہور ۱۹۴۴ء)۔

فقہ کے میدان میں شاہ صاحب کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلکی تعصب اور فقہی جمود کو دور کر کے ذہنوں میں وسعت پیدا کی۔ کیونکہ فقہی مکاتب وجود میں آنے کے بعد معاملہ صرف اتنا ہی نہیں رہا کہ اپنے امام کی پیروی کی جائے بلکہ دوسرے ائمہ کی تنقیص تک جا پہنچا، شاہ صاحب یہ نہیں کہتے کہ امام ائمہ اربعہ کی تقلید سے نکل جائیں مگر وہ علماء دین پر زور دیتے ہیں کہ وہ

اجتہادی بصیرت سے کام لیں۔ حضرت شاہ صاحب کے اس فقہی رجحان کو آگے بڑھانے میں علماء دیوبند کا کردار نہایت شاندار ہے۔ ائمہ اربعہ کا احترام ان کی خدمات کا اعتراف ان کی فقہی رائے پر بصیرت کے ساتھ غور کرنا ہر مسلک کے دلائل کا غیر جانبدارانہ جائزہ اور کسی کی بھی تنقیص سے بچتے ہوئے امکان خطا کو تسلیم کرتے ہوئے ترجیح دینے کی روش یہ حضرت شاہ ولی اللہ کی فقہ میں بالغ نظری کا فیضان ہے اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب کے فکری اور فقہی رجحانات کے امین صحیح معنیٰ میں علمائے دیوبند ہیں۔

شاہ صاحب بعض مسائل میں فقہ شافعی کی طرف بھی رجحان رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب کی تصنیف المسوّیٰ اور المصفّٰی کا مطالعہ کیا جائے تو ایسے مسائل سامنے آتے ہیں کہ جن میں شاہ صاحب کا رجحان فقہ شافعی کی طرف معلوم ہوتا ہے۔

فقہ کے تعلق سے شاہ صاحب کی تصنیف ''الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف'' کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے مختلف مکاتب فقہ میں اختلاف اور اس کے اسباب پر بڑی موثر گفتگو کی ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب میں صحابہ کرام اور تابعین کے اختلاف کے علاوہ فقہاء مذاہب کے اختلاف کے اسباب اور اہل حدیث اور اہل رائے کے درمیان اختلاف کے کیا اسباب ہیں پھر یہ کہ ابتدائی صدیوں میں فقہ کے متعلق لوگوں کا کیا رویہ تھا اور بعد کے ادوار میں کیا تبدیلی آئی۔ ان تمام باتوں پر بڑی جامع بحث کی ہے۔ یہ کتاب شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ دارالنفائس بیروت سے شائع ہو چکی ہے۔ اور فرید وجدی نے اپنی کتاب دائرۃ المعارف کے مادہ ''جید'' میں شاہ صاحب کی اس پوری کتاب کو شامل کر لیا ہے۔

اسی موضوع پر شاہ صاحب کی ایک اور کتاب بھی ہے جس کا نام ''عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید'' ہے۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے اجتہاد کے احکام مجتہد کی قسمیں مذاہب اربعہ کی تقلید پر بڑی موثر گفتگو کی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مغلیہ دور حکومت میں جو فقہی جمود طاری ہو چکا تھا شاہ صاحب کی کوششوں سے وہ جمود ٹوٹا ہے اور مسلکی تعصب دور ہوا ہے۔

# شاہ ولی اللہؒ کی دعوت رجوع الی القرآن الکریم

پروفیسر بدرالدین الحافظ☆

اس عنوان کے تحت گفتگو کرنے کے لئے کئی سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں، پہلا سوال یہ کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے عوام کو فہم قرآن کی طرف توجہ دلانے کی کیوں ضرورت محسوس کی۔

دوسرا یہ کہ آپ کے نزدیک ترجمہ قرآن کی ضرورت کے کیا اسباب و محرکات تھے؟

پہلے سوال کے پیش نظر ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۷۳۲ء میں جب آپ حرمین شریفین سے واپس وطن تشریف لائے تو آپ نے یہاں کے معاشرہ کا جو حال دیکھا وہ انتہائی تکلیف دہ تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد مرکزی حکومت ٹوٹ چکی تھی، ہر طرف لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا ماحول تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں:

> ”امراء رنگ رلیوں میں تھے، صوفیا خانقاہ کی جاگیروں اور سرنگیوں تالیوں میں تھے اور علماء جاہ طلبیوں اور سلاطین کی درباداریوں میں تھے۔ بادشاہ دین و دنیا کے ہر خیال سے آزاد ہو کر بزرگوں کی دولت، رقص و سرود کے تماشوں اور حسن و جمال کے بازاروں میں لٹا رہے تھے۔ رعایا بدحال اور ستمگروں کے مظالم سے پامال ہو رہی تھی،،[1]۔ مقدمہ فتح الرحمٰن میں حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں، اس زمانہ میں نظری طور پر تو قرآن کریم دین و شریعت کا سرچشمہ تسلیم کیا جاتا تھا مگر مسائل و احکام میں فقہی جمود اور بحث و استدلال میں فلسفیانہ موشگافیوں نے جڑ پکڑ لی تھی۔ محفلیں سجا

(۱) مرتبہ پروفیسر ظفر احمد نظامی، شاہ ولی اللہ حیات و افکار۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی، ۲۵، ۲۰۰۱ء۔

☆ سابق صدر شعبۂ عربی ہندو یونیورسٹی بنارس۔

کر لوگ تصوف اور قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھتے تھے مگر ان میں قرآن کے حلقے بنانے کا رواج نہ تھا۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ قرآن کا سمجھنا اور اس پر غور کرنا علماء کا کام ہے اور ان کے لئے صرف تلاوت کافی ہے۔ قرآن کے درس و تدریس کے ماحول میں بھی قرآن فہمی سے زیادہ تفسیر خوانی پر توجہ صرف ہوتی تھی۔

حضرت شاہ صاحب نے ان حالات کے پیش نظر لوگوں کو بڑی دردمندی سے سمجھایا: "اگر تم انصاف سے کام لو تو نزول قرآن کا اصلی فائدہ یہ ہے کہ اس سے نصیحت حاصل کی جائے اور اس کی ہدایت سے رہنمائی لی جائے۔ قرآن کا صرف تلفظ مقصود نہیں ہے اگرچہ وہ بھی غنیمت ہے"۔ آپ نے فرمایا "مسلمانوں نے یہ کیا شیوہ اختیار کرلیا ہے کہ وہ قرآن کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، اس شخص کو بھلا کیا حلاوت نصیب ہوسکتی ہے جو قرآن کے معنی کو نہیں سمجھتا"[(۱)]۔ چونکہ اس زمانہ کے علماء بھی بے راہ روی کا شکار تھے اس لئے آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا: اے بے عقلو! جنہوں نے اپنا نام علماء رکھ چھوڑا ہے تم تو یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو، صرف صرف و نحو نیز معانی میں غرق ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ علم یہی ہے۔ یاد رکھو علم یا تو قرآن کی کسی محکم آیت کا نام ہے یا سنت ثابتہ قائمہ کا۔ تم کو چاہئے کہ قرآن سیکھو، پہلے اس کے حل طلب لغات کو حل کرو، سبب نزول کا پتہ چلاؤ اور متعلقہ مشکل مقامات کو سمجھو۔ اس طرح رسول اللہ کی جو حدیث صحیح ثابت ہو چکی ہے اسے محفوظ کرو"[(۲)]۔ اس طرح شاہ صاحب مسلمانوں کی جہالت اور ناواقفی کا واحد علاج ان کو قرآن کریم کی طرف توجہ دلانے میں سمجھا کیونکہ قرآن ایک دستور الٰہی ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے لئے روشنی ہے، قرآن احکام سے زیادہ حکمت ہے، تلاوت سے زیادہ ہدایت کی کتاب ہے، یہی تو انسانی زندگی کی ترقی کی ضمانت ہے مگر اس کے لئے فکری بصیرت اور علمی شعور کی بلندی کی ضرورت ہے جو گہرے مطالعہ اور بالغ نظری کی متقاضی ہے۔

شاید اسی لئے غیر مسلموں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ گلیڈاسٹون نے برطانوی پارلیمنٹ مین قرآن کریم کا ایک نسخہ اٹھا کر کہا تھا کہ جب تک مسلمانون میں یہ کتاب موجود ہے ان پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ شاہ صاجب اس حقیقت سے ملت کو آشنا کرانا

(۱) مقدمہ فتح الرحمٰن۔

(۲) ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری۔ مولانا عبیداللہ سندھی سیمنار ۹۴ء مکتبہ شاہد کراچی ۴۱۔

چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے گھر میں رکھی ہوئی اس بیش بہا نعمت اور گراں قدر انمول دولت کی قدر و قیمت کو سمجھیں۔ اور دیکھیں تو سہی کہ قرآن کس طرح ان کے فکری شعور اور عقل کو جھنجوڑنے کے لئے خطاب کر رہا ہے۔

"ان شر الدّواب عند اللّٰہ الصم البکم الذین لایعقلون" (انفال:۲۲)

"یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔" یہاں انسان کو بدترین جانور کہنے کا مقصد یہی ہے کہ انسان جانوروں سے اپنی قوت فکر اور عقل و شعور کی مختارانہ صلاحیت کی بنا پر ہی تو ممتاز ہوا۔ اور جب وہ اس کا استعمال ہی نہ کرے تو پھر جانور سے بھی بدتر ہے۔ اسی مفہوم کو دوسری جگہ وضاحت کے ساتھ فرمایا: "لھم قلوب لایفقھون بھاولھم اعین لایبصرون بھاولھم آذان لایسمعون بھا اولٰئک کالانعام بل ھم اضلّ اولٰئک ھم الغافلون" (الاعراف:۱۷۹) ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں ہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں ہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھو گئے ہیں۔

اس کے بعد لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ علم کے بغیر تمہاری کوئی گتھی سلجھنے والی نہیں اور قرآن کا سب سے پہلا پیغام علم ہی تو ہے، یہی تو علم انقلاب لانے والی کتاب ہے جس کا سب سے پہلا جملہ: اقرأ باسم ربک الذی خلق ہے۔

سورۂ اقرأ کی ان آیات کے ذریعہ اگرچہ اب سے پندرہ سو سال قبل آنحضرت ﷺ کو خصوصی خطاب فرمایا گیا تھا مگر حقیقتاً یہ تو قیامت تک کے لئے تعلیم کے ایک جامع منصوبہ کا اعلان تھا۔ چاہے اقوام متحدہ نے اب کروڑوں ڈالر خرچ کر کے "سب کے لئے تعلیم" کا منصوبہ بنایا ہے۔ ہاں فرق یہ ہے کہ قرآن کے تعلیمی منصوبہ کی شرط یہ تھی (اقراء) سب کچھ پڑھو، دنیا کے ہر فن کا علم حاصل کرو مگر باسم ربک خدا کے نام کی شمولیت کے ساتھ، اس کو جدا نہ ہونے دینا ورنہ بھٹک جاؤ گے۔ آج کھلی آنکھوں سے دیکھ لیجئے جہاں علم کے ساتھ رب کا نام نہیں ہے وہاں لوگ عالم ہو کر بھی بہک رہے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب اسی حقیقت کے پیش نظر ملت کو صرف تعلیم کی طرف

لانے کے خواہشمند نہیں تھے بلکہ قرآن کی تعلیم سے قریب کرنا چاہتے تھے تاکہ مومن کا گم شدہ سرمایہ گھر میں ضرور آئے مگر ایمان کی پونجی کو داؤں پر لگائے بغیر۔

پھر شاہ صاحب کی دعوت رجوع الی القرآن اس لئے تھی کہ اس میں کائنات کے اسرار ورموز کا مطالعہ کرنے کے مواقع ہیں، ان کو دیکھو سمجھو اور کائنات ارضی وسماوی کے خالق کا شعور پیدا کرو۔ ".......... آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق" (فصلت:۵۲) عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں یہاں تک کہ یہ بات کھل جائے گی کہ وہ واقعی برحق ہے۔

شیخ سعدی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

برگ درختان سبز درنظر ہوشیار — ہرورقے دفتریست معرفت کردگار

آؤ دیکھو! قرآن کا مطالعہ تمہیں تاریخ اور جغرافیہ کی سوجھ بوجھ اور علم وآگہی سے قریب کرے گا، "الم تر کیف فعل ربک باصحب الفیل" یہ اصحب فیل کون تھے؟ کب تھے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ جب اس کی تلاش کرتے ہوئے کتب بینی کے بحر بیکراں میں غواصی کروگے تو بے پناہ علم وعرفان سے بہرہ ور ہوگے۔

اسی طرح عاد وثمود، قوم تبع، ملکہ سبا، یاجوج ماجوج، ہاروت ماروت اور انبیاء کرام کے واقعات تمہیں تاریخی اور جغرافیائی طویل وعریض دنیا کی سیر کرادیں گے: "لایلف قریش الفھم رحلۃ الشتآء والصیف" قریش کا سردی گرمی کا تجارتی سفر مختلف سمتوں میں کیوں تھا؟ کس طرح سورج سردی گرمی میں اپنا رخ بدلتا ہے، کن ملکوں میں کس طرح اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ذرا قرآن کی طرف آؤ تو سہی، جب ہی تو خریطۂ عالم کی سیر کروگے اور سرسبزی وشادابی کے دل موہ لینے والے قدرتی مناظر تمہاری نگاہوں کو روک، روک کر زبان حال سے اپنی دلکش داستانیں سنائیں گے۔

اور جب ادبی ذوق کی چاشنی قاری کو اپنی طرف راغب کرے گی تو مسجع مقفع عبارت آرائی، نظم وترتیب کا حسن، تشبیہات وامثلہ کی فنی اہمیت، بین الاقوامی زبانوں کے درمیان اپنا لوہا

منوالے گی۔

اس کے علاوہ میرے خیال میں شاہ صاحب کی دوررس نگاہ نے قوم کا کچھ اس طرح بھی اندازہ لگایا ہوگا کہ مسلمان عرصہ دراز سے شاہی سلطنت یا نوابوں راجاؤں کی محکومی کے خوگر ہو چکے ہیں، ڈکٹیٹر شپ کی فرمانبرداری ان کا مزاج بن گئی ہے پھر اس سے زیادہ جاہل عوام ناعاقبت اندیش عالموں اور نام نہاد صوفیوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نہ ان کی اپنی کوئی فکر ہے نہ حریت فرد کا شعور، نہ دینی سوجھ بوجھ نہ سیاسی دوراندیشی، اس لئے اس بھٹکے ہوئے راہی کو اب سوئے حرم لانے کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ حضرت شاہ صاحب ملک کی سیاسی بے چینی، گروہ بندی اور مرکز کی کمزوری کے پیش نظر اس نوشتہ دیوار کو بھی بخوبی سمجھ رہے ہوں گے کہ اب جلد یا بدیر "سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ" جیسا کہ شاہ صاحب کے وصال کے بعد ایک صدی کے اندر ہی ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کو جنگ آزادی کا پہلا مجاہد قرار دیا گیا ہے۔ شاہ صاحب نے سوچا ہوگا کہ اس قوم کے دل ودماغ سے کاخ امراء کے رعب و دبدبہ کی دیواروں کو ہلا دیا جائے، ان پرانے قلعوں اور محلوں کے نقش کہن کو مٹا دیا جائے تاکہ ان کے ذہنوں میں حریت فرد، دینی تشخص اور آزادی فکر کا بیج بویا جاسکے اور انہیں جمہوری فکر سے قریب لایا جائے مگر آج کی جمہوریت نہیں جس میں افراد گنے جاتے ہیں تولے نہیں جاتے۔

شاہ صاحب ان کو اس قرآنی جمہوری معیار سے آگاہ کرنا چاہتے تھے جس میں روئے زمین پر مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک بلالحاظ رنگ ونسل قد اور وزن دیہاتی اور شہری تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ سب کے لئے کھلا اعلان تھا "وانتم الاعلون ان کنتم مومنین" شاہ صاحب یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ چھوڑو یہ دنیا کے سہارے، مالک کائنات سے قربت کے لئے نہ امیر سلطان ہونے کی شرط ہے، نہ عالم وفاضل ہونا ضروری ہے، نہ حسن وجمال کی دلفریبی درکار ہے، نہ مالداری اور جہانداری مطلوب ہے۔ وہاں کا معیار صرف ایک ہے: ان اکرمکم عند اللہ اتقکم" اے مسلمانو! بہت دربارداری کر چکے، بہت خانقاہوں میں جبہہ سائی ہوگئی، اب

اُس ایک سجدہ میں سرنگوں ہو جاؤ۔ جو ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے سامنے کوئی ایسا ترجمہ بھی تو ہونا

چاہئے، جس میں غیر ضروری طوالت کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف نفس مطلب کو مروجہ آسان فارسی زبان میں پیش کیا گیا ہو۔ اس سلسلہ میں اس زمانہ کی تقریبا ۷۵ / تفاسیر ملکی اور غیر ملکی پر نظر ڈالی مگر وہ آپ کے معیار پر پوری نظر نہ آئیں۔ ان تفاسیر کا مختصر تعارف مولانا مسعود عالم قاسمی صاحب نے اپنی کتاب ''شاہ صاحب کی قرآنی فکر کا مطالعہ'' میں کرایا ہے۔ اور حضرت شاہ صاحب نے مقدمہ فتح الرحمان میں فرمایا کہ ''ہر زمانہ میں علماء دین اور اکابر اہل یقین نے تفسیر واحادیث پر متنوع کتابیں لکھی ہیں مگر کسی گروہ نے اطناب کی شاہراہ اختیار کی اور کسی نے کوچہ اختصار اپنایا، کسی نے عجم کی زبان میں گفتگو کی تو کسی نے عربی زبان میں موتی بکھیرے۔ یہ زمانہ جس میں ہم ہیں اور یہ ملک جس میں ہم ساکن ہیں اس میں مسلمانوں کی خیر خواہی تقاضا کرتی ہے کہ روزمرہ کی متداول اور سلیس فارسی زبان میں اظہار فضیلت اور عبارت آرائی، متعلقہ قصوں اور توجیہات کا تذکرہ کئے بغیر قرآن عظیم کا ترجمہ کیا جائے تا کہ عوام وخواص یکساں طور پر سمجھ سکیں۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ نے یہ بھی ضرورت محسوس کی کہ فہم قرآن کے لئے کچھ ایسے جامع رہنما اصول بھی ہونے چاہئیں جنکی روشنی میں کلام الٰہی کے مفہوم ومعانی تک پہونچنا آسان ہو۔ چنانچہ آپ نے اس مقصد کے لئے کئی کتابیں تحریر فرمائیں۔

(۱) تفسیر فتح الرحمان۔ (۲) الفوز الکبیر فی اصول التفسیر۔
(۳) فتح الخبیر بما لا بد حفظہ فی علم التفسیر (۴) زہراوین (ترجمہ سورۂ بقرہ وآل عمران۔
(۵) المقدمۃ فی قوانین الترجمۃ۔

ان کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے ذہن میں قرآن کی اشاعت کا بہت واضح نقشہ موجود تھا اور اسی کی بنا پر وہ ملت اسلامیہ کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے الفوز الکبیر کے باب اول میں تحریر فرمایا ہے: والمحقق ان القصد الاصلی من نزول القرآن تھذیب النفوس البشریة ورفع العقائد الباطلة ونفی الاعمال الفاسدة'' اور انہی تین مقاصد کو سامنے رکھ کر ہم شاہ صاحب کی سماجی اصلاح پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ شاہ صاحب کی تحریک قرآن فہمی کے تین پہلو ہیں ایک تو مہلک رسوم ورواج اور مشرکانہ عقائد وخیالات کی عام وبا کے لئے قرآن کو مؤثر علاج کی حیثیت سے متعارف کرانا۔ کیونکہ جتنی قربت

قرآن سے ہوگی مشرکانہ خیالات واعمال سے اسی قدر دوری ہوتی چلی جائے گی اور جب تک قرآن کی اشاعت عام نہ ہوگی یہ برائیاں ختم نہ ہوسکیں گی۔ دوسرے یہ کہ قانون اور شریعت کی اساس اور سرچشمہ اول کی حیثیت سے قرآن کو پیش کرنا کہ زندگی کے تفصیلی معاملات میں وہی مرجع اور قول فیصل قرار پائے۔ تیسرے یہ احساس پیدا کرنا کہ جب لوگ قرآن کی طرف رجوع کریں گے تو ان کی علمی ذہنی اور فکری سطح بھی بلند ہوتی چلی جائے گی اور علم وفکر کا منبع ان کے ہاتھ آجائے گا پھر وہ اپنے مسائل کے حل کے لئے در بدر کی ٹھوکریں نہ کھائیں گے۔

تاریخ شاہد ہے کہ شاہ صاحب کی اس تحریک سے آئندہ قرآن کی اشاعت کا رجحان بڑھا۔ ترجمہ اور تفسیر کی طرف لوگ راغب ہوئے اور امت قرآن خوانی کے مرحلہ سے نکل کر قرآن فہمی کے دور میں داخل ہوئی۔ پھر یہ اثرات بعد کے ادوار میں بھی واضح طور پر محسوس کئے گئے اور آج تک موجود ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے فرزند اکبر شاہ عبدالعزیزؒ نے تفسیر عزیزی لکھی۔ ان کے بعد شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن کریم کا اردو ترجمہ کیا اور آپ کے بھائی شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن کریم کا اردو ترجمہ کیا اس کے حاشیہ پر تفسیر موضح قرآن تحریر فرمائی۔ اور ان دونوں تراجم میں شاہ عبدالقادر کا ترجمہ اور تفسیری فوائد اس وقت کے اسلوب زبان کے لحاظ سے اور علمی لحاظ سے بھی بقول علماء کرام الہامی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے حضرت شاہ عبدالقادر کے عظیم کارنامے موضح قرآن کو اردو کے ارتقائی دور کے لحاظ سے سہل زبان میں منتقل کیا جس کا ذکر حضرت شیخ الہند نے مقدمہ میں فرمایا ہے اور اس کے حواشی کی خدمت (چار سپاروں کے علاوہ) مولانا شبیر احمد عثمانی نے انجام دی۔ اس کے بعد بھی شاہ ولی اللہؒ کی تحریک قرآن فہمی کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور مولانا اخلاق حسین قاسمی نے محاسن موضح قرآن تحریر فرما کر اس ارتقائی سلسلہ کو مزید آگے بڑھایا ہے۔ فجزاھم اللہ خیر الجزاء۔

# حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کا نظریہ ارتفاقات

## (نظام تکوینی وحیات انسانی)(۱)

پروفیسر سید محمد اجتبا ندوی ☆

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مایہ ناز تصنیف حجۃ اللہ البالغہ اپنے مضامین ومباحث کے اعتبار سے نادرۂ روزگار تصنیف ہے جس میں بعض ایسے مضامین تحریر کئے گئے ہیں جن کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہماری اسلامی تاریخ اور کتب خانے پہلی بار ان سے روشناس ہوئے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب میں اصلاً شریعت کے اسرار وحکم، مقاصد اور اغراض اور حدیث وسنت کی وضاحت اور تشریعی نظام کا بیان بہت واضح اور مفصل طور پر کیا ہے۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو اور اس کو مزید واضح اور دنیا وآخرت میں نجات وفلاح کا ذریعہ قرار دینے سے قبل یہ ضروری سمجھا کہ دنیا کے تکوینی نظام اور انسانی زندگی سے متعلق اور سماجی وتمدنی حالات کا ایک خاکہ پیش کر دیں، جس کو انہوں نے اپنی کتاب کے تیسرے مبحث میں ارتفاقات کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ ہم مندرجہ ذیل سطروں میں ان ہی ارتفاقات کا مختصر سا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

"ارتفاقات" کے عنوان سے شاہ صاحب نے یہ بیان کرنا چاہا ہے کہ ایک معتدل ومتوازن زندگی دنیا میں کس طرح گذاری جائے اور انسان ایک دوسرے سے جائز طور پر کیسے باہم تعاون،

(۱) مبحث البر والاثم (شرعی بحث) سے قبل کا مبحث۔

☆ سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اتحاد، ہم آہنگی و یکجہتی کے ساتھ نفع حاصل کر سکے۔ ارتفاق عربی کا لفظ ہے جس کا مادہ ''رفق'' ہے اس کے معنی فائدہ اور مدد اور سہولت حاصل کرنا اور بہم پہونچانا ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں اس طرح ذکر آیا ہے، ''ويهيِّءُ لكم من أمركم مرفقا'' (الکہف:۱۶) ایک دوسری آیت میں ہے ''نعم الثواب وحسنت مرتفقا'' (الکہف:۳۱)۔

لسان العرب میں ہے، ''وترافق القوم وارتفقوا صاروا رفقاء'' یعنی لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رواں دواں ہوئے جس کی بنا پر ایک دوسرے کے رفیق کہلائے۔ موجودہ عرب معاشرہ میں بھی ''مرافق'' کا ذکر انہی جیسی چیزوں سے متعلق ہوتا ہے جو انسان کے لئے مفید و کارآمد اور گھریلو و سماجی نظم و ضبط سے ہوں۔ اس لغوی تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن امور سے انسانی معاشرہ خوشگوار و کامیاب ہو سکے اور انسان آرام و عافیت کی زندگی گذار سکے انہیں ارتفاقات کہتے ہیں۔ یعنی نفع بخش تدبیریں یا انتظامی سہولتیں۔

حضرت شاہ صاحب نے اس عنوان ''ارتفاقات'' کے تحت انسانی زندگی کو خوشگوار، خوش بخت اور خوش نصیب بنانے کے لئے اس کے انفرادی و اجتماعی اور دنیوی و اخروی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کو شریعت کے مطابق بنانے پر زور بھی دیا ہے اور اس کے لئے رہنمائی بھی کی ہے۔ شاہ صاحب کی یہ بحث اولیت و سبقت کا درجہ رکھتی ہے۔ اور بظاہر کسی اور نے اس تفصیل و انداز سے اس موضوع کو بیان نہیں کیا ہے۔ شاہ صاحب نے زندگی گذارنے کے لوازمات اور اقتصادیات و معاشیات کا رشتہ دین و اخلاقیات سے جوڑا ہے اور ان کا کہنا یہ ہے کہ بغیر اس مضبوط و مستحکم رشتہ کے انسانی زندگی پرسکون اطمینان بخش اور خوشگوار نہیں ہو سکتی۔

شاہ صاحب نے اپنے اس مبحث کو دس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں ''ارتفاقات'' کو حاصل کرنے کی کیفیت اور طریقہ کا تذکرہ کیا ہے اور سب سے پہلے اس جانب توجہ مبذول کی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ اپنی ضروریات کیسے پوری کرے۔ انسان فطری طور پر کھانے پینے، دھوپ، شدید گرمی اور بارش سے بچنے اور سردی میں حرارت حاصل کرنے کے لئے اپنے کو آمادہ پاتا ہے۔ ان سب چیزوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی رہنمائی کی ہے۔ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں دو مثالیں پیش کی ہیں۔ ایک

شہد کی مکھی کی جو مختلف پھلوں اور پھولوں سے خوشبو اور مٹھاس جمع کرتی ہے، گھر "چھتہ" بناتی ہے، اور اپنے سربراہ "یعسوب" کے حکم کی مکمل طور پر بجا آوری کرتی ہے۔ ان سب کی کوششوں اور تعاون سے شہد تیار ہو جاتا ہے۔ اور دوسری مثال چڑیا کی دی ہے جو اپنی غذا حاصل کرتی ہے، پیاس بجھانے کے لئے پانی تک پہونچتی ہے، نقصان پہونچانے والے جانوروں اور شکاریوں سے دور رہتی ہے، اپنا گھر بناتی ہے اور نر و مادہ مل کر اپنے بچوں کی نگہداشت اور پرورش کرتی ہیں۔ ان دونوں مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل میں ایک ایسا طریقہ ڈال دیتا ہے کہ وہ فطری طور پر یہ سارے کام انجام دیتی ہیں۔

مگر انسان چونکہ امتیازی رتبہ اور بلند مقام رکھتا ہے اس لئے اس کو ان ضرورتوں اور لوازمات کو پورا کرنے کے لئے اس فطری رہنمائی کے ساتھ تین باتوں کو شامل کیا گیا۔

۱- سب سے پہلے ایک مکمل اور بھرپور طرز زندگی گذارنے کی جانب رہبری کی گئی، جس سے اس کا مقصد ملک و آبادی میں ایک صالح نظام قائم کرنا ہوا اور اپنے نفس کی اصلاح و پاکیزگی، اعلیٰ اخلاق سے آراستگی، عذاب آخرت سے نجات کی فکر، اور لوگوں کا اعتماد و اعتبار حاصل کرنا بھی پیش نظر رہا۔

۲- انسان، ارتفاق، ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ نفاست و دلفریبی، نیز آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون بھی چاہتا ہے، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ خوبصورت بیوی، مزیدار و خوش ذائقہ کھانا، عمدہ اور دیدہ زیب لباس اور شاندار و عالیشان دولت کدہ کا مالک ہو۔

۳- "ارتفاق" کو مزید نفع بخش و کارآمد بنانے کے لئے اپنی عقل و دانش کو استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ خود اپنی کوشش و تدبیر سے زیادہ کامیابی حاصل نہیں کر پاتا تو دوسرے دانشوروں اور اہل رائے سے مشورہ لیتا ہے اور انسانی ضروریات میں اضافہ بھی کرتا ہے اور زیادہ نفع بخش و کارآمد بنالیتا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں چیزیں ہر انسان کو میسر نہیں ہو پاتیں خواہ اس کا سبب مزاج کے اختلاف یا عقل و دانش کا فرق و تفاوت ہو۔ لہٰذا شاہ صاحب نے ارتفاق کی دو قسمیں بیان کی ہیں:

(۱) پہلی قسم کا تعلق گاؤں اور دیہی علاقوں اور پہاڑ کی چوٹیوں اور دور دراز رہنے والوں سے

ہے، جسے شاہ صاحب ارتفاق اول سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۲) اس قسم کا تعلق شہر وآباد علاقے، اور ترقی یافتہ شہروں میں بسنے والوں سے ہے، وہاں اجتماعی زندگی کی بھیڑ بھاڑ ضروریات کا انبار اور تجربات کی کثرت ہوتی ہے، شاہ صاحب اسے ارتفاق دوم سے یاد کرتے ہیں۔

ان دونوں کے بعد ایک تیسری قسم آتی ہے جس کا تعلق سیاست اور انتظام سے ہے۔ اسی کے نتیجہ میں ارتفاق کی چوتھی قسم ابھر کر سامنے آتی ہے، جسے خلافت عامہ کہتے ہیں۔ اس چوتھے ارتفاق کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے شاہ صاحب ان لوگوں کے باہمی ربط وتعلق کے قائم رہنے پر زور دیتے ہیں جو مختلف اور دور دراز کی مسافتوں میں قیام پذیر ہیں۔ شاہ صاحب اس ربط پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اسی طرح ضروری ہے جس طرح کہ ایک شہر کے اشخاص کے مابین ابتدائی اور محدود حالت میں ناگزیر تھا۔

اس اختصار کے بعد شاہ صاحب کسی قدر تفصیل سے ارتفاقات کو دس ابواب میں بیان کرتے ہیں۔

باب اول میں انسان کے مافی الضمیر کی ادائیگی کے سلسلہ میں زبان کی اہمیت بیان کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ انسان کے جسم، لباس شکل وہیئت اور کردار واعمال کی پاکیزگی وبہتری کی جانب توجہ دلاتے ہیں، اور اسی سے متعلق انسان کو زرعی، صنعتی اور رہائشی نظم وضبط کو قائم اور متحرک رکھنے کے لئے اصول وقواعد کی جانب رہنمائی کرتے ہیں۔ شاہ صاحب اس امر پر زور دے کر لکھتے ہیں کہ تمام انسانوں کو ایک ہی کام اور ایک ہی پیشہ اختیار نہیں کرنا چاہئے بلکہ صلاحیتوں اور رجحانات کے مطابق معاش کے لئے مختلف ذرائع ووسائل اپنانے چاہئیں۔

دوسرے باب میں آداب معیشت بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مفید شکل وصورت نقصان دہ چیزوں سے اجتناب اور نفع بخش امور کا حصول کس طرح ممکن ہے۔ شاہ صاحب ان امور کی رہنمائی کرتے ہوئے کھانے پینے، پہننے اور رہن سہن میں ترقی اور کامیابی کے ذرائع اختیار کرنے پر زور دیتے ہیں اور اس کے سلسلہ میں نقصانات سے بچنے کی راہ دکھاتے ہیں اور نفع بخش طریقوں کو اختیار کرنے کو مستحب کہتے ہیں۔ اسی طرح عورت ومرد دونوں کے لئے انسانی

اندر واخلاق اور خوش کلامی و نرم خوئی اپنانے کو ترقی و کامرانی کا راز قرار دیتے ہیں۔

تیسرے باب میں گھریلو انتظام، خاندانی تعلقات، انسانی روابط اور اہل خانہ کے باہم میل جول اور خوشگواری و ناخوشگواری کے حالات کو منظم کرنے اور اس کو بہتر طور سے انجام دینے سے متعلق امور بیان کئے ہیں۔

چوتھا باب معاملات سے متعلق ہے اس میں تجارت لین دین رزق کا حصول انسانی ضروریات کے تبادلے خواہ وہ سونے چاندی سے ہو یا اور کوئی ذریعہ، حصول رزق میں سے کھیتی آب پاشی، چراہ گاہیں بحر و بر میں پائے جانے والے معدنیات، نباتات، حیوانات اور صنعتیں ہو سکتی ہیں۔

پانچویں باب میں شاہ صاحب نے شہری، زندگی کو بہتر طور سے گذارنے اور اس کو کسی ایک فرد کے واسطے سے منظم کرنے کے بارے میں اصول وضوابط بیان کئے ہیں۔ انہوں نے آخر میں ملکوں اور شہروں کی تباہی و ویرانی کے دو سبب لکھے ہیں:

(۱) بیت المال اور خزانے پر بوجھ بن جانا جس سے اس میں تنگی اور کمی پیدا ہو جائے۔

(۲) عوام اور رعایا پر ناقابل برداشت ٹیکس اور مال گذاری مقرر کرنا جو ان کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے۔

چھٹے باب میں شاہ صاحب نے بادشاہوں اور حکمرانوں کے اخلاق وصفات بیان کئے ہیں، انہیں چاہئے کہ اعلیٰ اخلاق کے مالک ہوں، ان میں رعب و داب ہو، خیر خواہی اور حمیت کا برتاؤ ہو، اور اسی کے ساتھ عقل و دانش اور فراست کا بھرپور ملکہ پایا جاتا ہو۔ ایسی صورت میں بادشاہ اور حکمراں کی فرمانبرداری واجب ہے۔

ساتویں باب میں بادشاہ اور حکمرانوں کے مددگار اور کارندوں کی شرطیں بیان کی ہیں۔ خاص طور سے ان کے اندر امانت اور دیانتداری، اطاعت اور خیر خواہی اور سرکاری احکام کے نافذ کرنے کی صلاحیت کا پایا جانا از حد ضروری ہے۔ ٹیکس کی وصولی کے سلسلہ میں اس کا لحاظ رکھنا کہ وہ منصفانہ ہوں اور نقصان دہ نہ ہوں۔ فوج و لشکر کے لئے ضروری ہے کہ وہ انتہائی فعال، متحرک اور تربیت یافتہ ہوں، بالکل اسی طرح جیسے کہ گھوڑے کو قابو میں کرنے والا سائیس ہوتا ہے۔ بادشاہ اور حکمراں کے کارندے اور مددگار پانچ قسم کے ہوتے ہیں۔ قاضی "جج" سپہ سالار، شہر کا

منتظم اعلیٰ، ٹیکس کی وصولیابی کرنے والا اور سرکاری اخراجات کا ذمہ دار۔

آٹھویں باب میں خلیفہ منتخب کرنے کی ضرورت بیان کی گئی، کیونکہ خلیفہ ریاستوں اور صوبوں کو مربوط و مستحکم اور رعایا و امت کو متحد رکھ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل نے یہ مطالبہ کیا:

**ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل اللہ** "ہمارے لئے بادشاہ مقرر کیجئے تا کہ یہ راہ خدا میں جنگ کرسکیں"، انبیاء کرام علیہ السلام نے بادشاہوں کو صراط مستقیم کی جانب رہنمائی کی۔ بادشاہ وحکمران کے لئے آدمیوں اور کار پرداز اہل کاروں اور دولت وثروت کا ہونا بھی ضروری ہے اسے ہمیشہ بیدار و ہوشمند رہنا چاہئے تا کہ وہ نظام حکومت کو منصفانہ رکھ سکے۔

نویں اور دسویں باب ارتفاقات اور عوام میں اس کی اثر انگیزی سے متعلق وضاحت کی گئی ہے ان کا ہر آباد ملک وخطہ میں ہونا ضروری ہے اور فطرت سلیمہ ان پر یقین بھی رکھتی ہے صرف کم عقل اور سرکش انسان ہی ان کا مخالف ہوگا۔

آخری باب میں حق وعدل اور خیر وفلاح کی نشر واشاعت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ شریعت کا مقصود بھی یہی ہے، اور اس کا تحفظ ضروری ہے اور یہی سب سے افضل و پاکیزہ عمل بھی ہے۔

شاہ صاحب ترقی یافتہ معاشرہ ومتمدن زندگی کے لئے کھیل تماشہ، شطرنج میں انہماک، کبوتر بازی، شکار کی لت اور فضول ولایعنی کاموں میں مصروفیت کو بے حد خطرناک اور تباہ کن قرار دیتے ہیں، جن میں انہماک سے حکومتوں اور سلطنتوں کا زوال یقینی ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحب نے ارتفاقات کے نام سے ایک منظم، مستقل، بااختیار اور مستحکم وعادلانہ حکومت کا مکمل نقشہ پیش کیا، یہ ان کی روشن ضمیری اور پیش بینی کا بہت بڑا ثبوت ہے، انہوں نے مغل حکومت کی کمزوری بلکہ زوال پذیری محسوس کرلی تھی اس لئے اس کے سامنے کتاب وسنت کی روشنی میں یہ رہنما اصول پیش کئے جو نہ صرف اپنے عہد کے حکمرانوں کی توجہ مبذول کرانے کے لئے تھے بلکہ رہتی دنیا کے لئے ایک پاکیزہ، صاف ستھرے، انصاف پسند، مثالی، حکومت اور صالح معاشرہ کی تشکیل کے لئے ایک دستور ونقشہ تیار کر دیا تھا، اگر اس پر عمل کیا جاتا تو کامیابی وکامرانی، خوشحالی وخوش بختی قدم چومتی، اور انسانیت امن وسلامتی، راحت واطمینان سے ہمکنار ہو جاتی۔

# حضرت شاہ ولی اللہؒ کا سیاسی اور سماجی فلسفہ

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی☆

حضرت شاہ ولی اللہؒ ۱۷۰۳ تا ۱۷۶۴ یگانہ عصر، جلیل القدر، اور عظیم المرتبت متبحر عالم اور چوٹی کے اعلیٰ مفکر تھے۔ وہ زبردست حکیمانہ بصیرت اور ہمہ گیر مجتہدانہ ذہن کے مالک تھے۔ انہوں نے اٹھارہویں صدی کے وسط میں مسلمانوں کی زوال پذیر حالت کا گہرا جائزہ لیا جو بہت بڑی حد تک مغلیہ سلطنت کے زوال کا نتیجہ تھی اور کچھ اس کا سبب بھی۔ اور ان کی مذہبی، اخلاقی اصلاح اور معاشی اور سیاسی ترقی کا ہمہ جہتی منصوبہ تیار کیا۔

اس صدی کے قیامت خیز ہنگاموں کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کے بااثر امرا میں ایرانی اور تورانی یعنی شیعہ سنی اختلاف کے مرض نے جو شہنشاہ عالم گیر کی زندگی تک دبا رہا ان کی وفات کے بعد نے زبردست خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی، اور صرف پچاس سال کی مدت میں یعنی ۱۷۰۷ء سے لے کر جنگ پلاسی یعنی ۱۷۵۷ تک دہلی کے تخت پر دس تاج دار بٹھائے گئے اور معزول کئے گئے۔ ان میں سے صرف چار اپنی موت سے مرے۔

صوبوں کے گورنر خودمختار ہو گئے، اور مغل شہنشاہ کی حیثیت محض ایک دعا گو مرشد یا کٹھ پتلی کی رہ گئی۔ جنوبی ہند میں مرہٹوں کی طاقت ایک مستقل اور بڑی زبردست طاقت بن گئی، اور مغلیہ سلطنت کے وجود کے لئے زبردست خطرہ بن گئی۔ دہلی کے شمال مشرق میں روہیلہ حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے مقابل اودھ میں بھی ایک حکومت قائم ہو گئی۔ دونوں کے والی ایک دوسرے کے

☆ سابق ایم پی سابق استاد شعبہ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

زبردست حریف تھے۔ دہلی کے جنوب مغرب میں جاٹوں کی طاقت ابھری اور شمال مغرب میں سکھ طاقت بھی مغلیہ سلطنت کے سیاسی اقتدار کے لئے زبردست چیلنج تھی۔

ان طاقتوں اور قوتوں کے تصادم سے ملک کا چپہ چپہ میدان کارزار بن گیا اور تین سو سالہ مغلیہ سلطنت کا سیاسی اقتدار عملاً ختم ہو کر رہ گیا۔ ان جنگ جو اور متحارب قوتوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے بیرونی طاقتوں سے ساز باز کیا۔ ایک گروہ نے نادر شاہ کو بلایا تو دوسرے گروہ نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور اس طرح سے وطن اور اہل وطن دونوں کو زبردست جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

دوسری طرف یوروپ کی سفید فام طاقتیں جو ملک کے ساحلی علاقوں میں قدم جما چکی تھیں اور آپس میں ایک دوسرے کی، تجارتی اور سیاسی اغراض و مفاد کی وجہ سے، زبردست حریف تھیں انہوں نے ہندوستان کی خانہ جنگی اور سیاسی صورت حال سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا بالخصوص ایسٹ انڈیا کمپنی نے دوسرے یوروپین حریفوں سے آگے بڑھ کر اس سیاسی صورت حال سے زیادہ فائدہ حاصل کیا اور ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں فتح یاب ہو کر بنگال، بہار اور اڑیسہ پر قابض ہو گئے۔

شاہ صاحب کے انداز فکر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے مسلم سماج کا تصور صرف اونچے اور متوسط طبقے تک محدود نہ تھا جیسا کہ علی گڑھ تحریک اور اے ایم یو کالج علی گڑھ کے بانی کا تھا بلکہ اس میں غریب دست کار، مزدور اور کسان اور محنت کش سب طبقے شامل تھے۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کا گہرا جائزہ لینے اور ان کے طرز زندگی میں اصلاح کا نقشہ بنانے میں سید احمد خاں کے برعکس کسی ایک طبقے کو نہیں بلکہ پورے مسلم سماج کو مدنظر رکھا ان کے انقلابی، اصلاحی منصوبے کے بنیادی اصول یہ تھے۔

۱۔ اسلام کے مذہبی فکر میں جو جمود پایا جاتا ہے، اور اس کے مختلف فرقوں اور فقہی مذاہب میں جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں، اور جنہوں نے مستقل نزاع کی صورت اختیار کر لی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تنگ نظری کے باعث جزئیات کو کلیات اور اصولوں سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لئے دین کے اصل سرچشمے یعنی قرآن مجید تک پہونچ کر عقلی اور استدلالی

رنگ میں اس کی تفسیر پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ خود ان کے الفاظ تھے کہ شریعت مصطفوی کے لئے وقت آ گیا ہے کہ دلیل اور برہان کے وسیع پیرایوں میں ملبوس ہو کر ظاہر ہو۔

ہندوستان اور دوسرے ملکوں کا جائزہ لینے کے بعد ان کے غور و فکر اور ذہن رسا نے یہ فیصلہ کیا کہ تمام خرابیاں جو دن بدن ملک کو تباہی اور بربادی کی طرف لے جا رہی ہیں ان کا اصل باعث وہ نظام ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی پر چھایا ہوا ہے اور جس کی بنا اس ملوکیت اور شاہ پرستی پر ہے جو اپنی افادیت بالکل ختم کر چکی ہے۔ شاہ صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ ساری تباہیوں اور بربادیوں کا واحد علاج فک کل نظام ہے یعنی ایسا ہمہ گیر اور مکمل انقلاب جو سماج کے معاشی یا سیاسی، غرض کہ ہر ڈھانچے کو پوری طرح بدل ڈالے کیونکہ ان کے زمانے کا ہر نظام خواہ اس کا تعلق کسی بھی شعبۂ زندگی سے ہو، ملوکیت ہی کا پروردہ تھا اور وہ سارے امراض اور خرابیاں جو ملوکیت یا شہنشاہیت کے ساتھ لازم ہوتے ہیں ہر ایک نظام میں سرایت کر چکے تھے۔ اصلاح کی کوئی صورت اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ ہر ایک نظام کہنہ کو منہدم کر کے اس کی جگہ نظام نو تعمیر کیا جائے۔

شاہ صاحب فوجی انقلاب کے حامی تھے مگر اس فوجی انقلاب کے جو جہاد کے اصولوں پر مبنی ہو یعنی جس کا نصب العین سب سے بہتر اور برتر ہو اور جس کا ہر مجاہد ذاتی اغراض سے یہاں تک بلند ہو کہ خود اپنی شخصیت کو فنا کر چکا ہو اور نصب العین کی خاطر قربان ہو جانے کو اپنی زندگی تصور کرے، ان کے خیال میں اس قسم کا انقلاب پیشہ ور سپاہیوں کے ذریعہ نہیں آ سکتا بلکہ ان رضا کاروں ہی کے ذریعے آ سکتا ہے جن کی تربیت خاص طور پر کی گئی ہو، اور جو نصب العین کو پوری طرح سمجھتے ہوں اور جو اس کو کامیاب بنانے کے لئے قربان ہو جانا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیں۔

۱۷۸۹ء کا عظیم فرانسیسی انقلاب جو ساری دنیا کے انقلاب پسندوں کے لئے نشان راہ تھا، نصف صدی کے بعد برپا ہونے والا تھا اور کمیونزم کے بانی کارل مارکس اور اس کے رفیق عزیز اینگلز کی پیدائش سے تقریباً سو سال پہلے اور یورپ کے صنعتی انقلاب سے تقریباً چار دہائیاں پہلے شاہ صاحب نے حسب ذیل معاشی اور سیاسی اصول اور نظریات دنیا کے سامنے پیش کئے۔

۱۔ دولت کی اصل بنیاد محنت ہے اور مزدور اور کاشت کار قوت نہیں باہمی تعاون شہریت اور اجتماعی زندگی کی روح ہیں جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لئے کام نہ کرے، ملک کی دولت

میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

۲۔ جوے، سٹہ اور عیاشی کے اڈے ختم کئے جائیں اس لئے کہ ان کی موجودگی میں تقسیم دولت کا صحیح اور منصفانہ نظام قائم نہیں ہوسکتا اور نہ ملک کی قومی دولت میں اضافہ ہوسکتا ہے بلکہ ملک کی دولت بہت سی جیبوں سے نکل کر صرف ایک طرف سمٹ آتی ہے۔ اس زمانے میں جاگیرداری اور خاص خاص منصبوں اور وظیفوں کی اجارہ داری نے اقتصادی نظام کو بالکل درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ بادشاہ، امراء، اور جاگیردار شاہانہ زندگی گذارنے، رنگ رلیاں منانے اور عیش پرستی کے لئے کاشت کاروں اور محنت پیشہ افراد کا خون چوستے تھے۔ اور خانقاہ نشین پیشہ ور فقراء نام نہاد علماء نے یوروپ کے کلیسائی نظام کو ہندوستان میں قائم کر رکھا تھا۔ یہ سارے طبقے محنت سے نا آشنا تھے اور ان کے ذریعہ ملک کی دولت میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ ملک کے لئے بارگراں تھے۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ کے باب سیاست المدنیۃ کے آخر میں لکھتے ہیں:

اس زمانہ میں ملک کی بربادی کا سبب، زیادہ تر یہ دو چیزیں ہیں:

۱۔ خاص خاص طبقے اس کے عادی ہوگئے ہیں کہ کچھ کئے دھرے بغیر اپنے خاص امتیاز کی بناء پر مثلاً یہ کہ وہ قاری ہیں یا عالم یا ان کا تعلق شعراء یا سجادہ نشینوں یا فقراء کے اس حلقے سے ہے جس کو بادشاہوں کی طرف سے عطیئے اور وظیفے ملتے رہتے ہیں یا اس قسم کی دریوزہ گری کا کوئی ڈھنگ نکال کر خزانہ شاہی سے رقمیں وصول کرتے ہیں، اور ملک کی دولت کے وسیع دامن کو تنگ کرتے ہیں ان کا مطمح نظر ملک کی کوئی خدمت نہیں ہے بلکہ رقمیں وصول کرنا اور اپنا ذریعہ معیشت فراہم کرنا ہی ان کا نصب العین ہوجاتا ہے اور یہ طبقے ملک کے لئے بارگراں ہوتے رہتے ہیں۔

۲۔ کاشت کاروں، سوداگروں اور دست کاروں پر بھاری بھاری ٹیکس لگائے جاتے ہیں اور ان کے وصول کرنے میں انتہائی سختی سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عاجز آکر وفادار رعایا بغاوت پر اتر آتی ہے جسے فرو کرنے کے لئے جبر و تشدد سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور بے انتہا فوجی طاقت صرف کرنی پڑتی ہے ملک کی فلاح اور بہبود اس میں ہے کہ ٹیکس کم سے کم ہوں اور دفاع پر صرف بقدر ضرورت صرف کیا جائے۔

شاہ صاحب کے نزدیک اقتصادی عدم توازن نے مذہب کے سر بہ فلک قلعوں کو مسمار کیا

ہے، اس لئے سماج کی اقتصادی اصلاح، مذہبی اور اخلاقی، اور اصلاح اور روحانی کمالات اور ترقی کے لئے سب سے بڑی ضرورت ہے وہ سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح کو انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا اہم جزو قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں وہ لکھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا کی حالت یہ تھی کہ عیش و عشرت اور حد سے بڑھے ہوئے شاہانہ تکلفات کے مرض نے ملک اور قوم کو اقتصادی عدم توازن کی تباہیوں میں مبتلا کر رکھا تھا یہ مرض ایران اور روما وغیرہ میں وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے دل میں القا کیا کہ وہ اس مرض کا ایسا علاج کریں کہ نہ صرف مرض ختم ہو بلکہ وہ زہریلا مادہ بھی فنا ہو جائے، جس کی وجہ سے یہ مرض پیدا ہوا ہے۔ پس آنحضرتؐ نے ان اسباب و وجوہات پر غور فرمایا جن سے اس مرض کے جراثیم نشو و نما پا رہے تھے۔ پھر ایک ایک مرض کی تشخیص کر کے ان کی ممانعت فرما دی۔

حضور ﷺ کی بعثت کے وقت ساتویں صدی عیسویں میں ایران اور روما کی سلطنتیں عروج پر تھیں مگر اقتصادی عدم توازن نے ان کی جڑیں بالکل کھوکھلی کر دی تھیں۔ شاہ صاحب انہی دونوں شہنشاہیتوں کی مثال سے اقتصادی خرابیوں کا تجزیہ کرتے ہیں اور مشاہدے کے لئے اپنے زمانے کے بادشاہوں کی مثال پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ایران اور روما کی سابق تاریخ ہمارے لئے روشن مثال ہے اور جو کچھ تم اپنے ملک میں دیکھ رہے ہو اس سے ایران اور روما کی حالت کا اندازہ کر لو اہل ثروت نے دولت اور ثروت کے ساتھ فلسفہ اور سائنس کی تحقیقات نے ایجادات کا راستہ کھولا، نئی نئی صنعتوں نے فروغ پایا اور ملک تمدن کے لحاظ سے اعلیٰ درجے پر پہونچ گیا لیکن بدقسمتی سے اہل ثروت اور حکمراں طبقے میں عیش و عشرت، اقتدار پرستی اور ایک دوسرے کے مقابلے میں تفاخر کے مرض پیدا ہو گئے اور ارباب حکومت کے اس ٹھاٹھ نے سوسائٹی کا مزاج بگاڑ کر رکھ دیا۔ نئے نئے فیشن امیرانہ شان و شوکت اور شاہانہ تکلفات نبھانے کے لئے ہر ایک صاحب اقتدار اپنے ماتحت کو لوٹنے لگا۔ جاگیردار اور زمیندار کاشت کاروں کا خون چوسنے لگے اور جو مزدوروں پر اختیار رکھتے تھے وہ غریب مزدوروں پر ہر قسم کی زیادتی اور ظلم کرنے لگے با اقتدار طبقے کی تمام عملی اور فکری قوتیں ملک اور دولت کی ترقی کے بجائے عیش و عشرت کے شاہانہ تکلفات، نفع اندوزی اور استحصال بالجبر پر صرف ہونے لگیں اور ماتحت طبقے اتنے زیادہ گر گئے کہ ان کی زندگی کھیت جوتنے والے

بیلوں اور بوجھ اٹھانے والے گدھوں گھوڑوں کی مانند ہو گئی زرکشی اور زراندوزی کے لئے قانون بنا دیئے گئے۔

مزدور اور کسان اگر برسر اقتدار طبقے سے سرتابی کرتا تو اسے طرح طرح کی سزائیں سہنی پڑتیں اور اگر وہ ان کے احکام کی تعمیل کرتا تو لامحالہ بار بردار گھوڑوں اور گدھوں کی طرح زندگی گذارنے پر مجبور ہوتا۔ یہ دونوں طبقے اپنے اپنے حالات میں اتنے زیادہ غرق ہو گئے کہ ان کے سامنے پیدائش انسان کا حقیقی مقصد نہ رہا۔ برسر اقتدار یا حکمران طبقے کو عیش اور دولت کی چمک دمک نے اندھا کر دیا اور دوسرا طبقہ پیٹ کی فکر میں ایسا سرگرداں ہوا کہ فکر مستقبل کی صلاحیت بھی ختم کر بیٹھی، اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام دولت سمٹ کر چند افراد کے ساتھ مخصوص ہو گئی جن کا سربراہ بادشاہ تھا۔ اقتصادی عدم توازن اور اعلیٰ طبقوں کی شان و شوکت، اور عیش پرستی نے ایک تیسرے طبقے کو جنم دیا جو آرام طلب، تن آسان، سرکار پرست خوشامدیوں کا طبقہ تھا۔ یہ بادشاہ سے مختلف عنوانوں سے رقمیں وصول کرتا رہتا تھا۔ ان میں وہ صاحب فن اہل علم بھی تھے جو فن اور علم کے نام پر روپیہ وصول کرتے تھے مگر ان کا مطمح نظر محض ذاتی اغراض، ذاتی اقتدار اور ذاتی جاہ و جلال کا حصول ہوتا تھا۔ خانقاہ نشینوں کا ایک گروہ تھا جو تقدس کے نام پر وظیفے حاصل کرتا تھا۔ ایک جماعت فنون لطیفہ و ادب و شاعری کے نام پر رقمیں اینٹھتی تھی کہ شان خسروانہ یہی ہے کہ فنون لطیفہ کے ماہروں کی قدر کی جائے اور ان کی سرپرستی کی جائے یہ تمام گروہ جن کو لازمہ تمدن تسلیم کیا گیا تھا درحقیقت مفت خوروں کے گروہ تھے جو ملک اور قوم کی خدمت کے بجائے اپنی خداداد صلاحیتیں مٹھی بھر شاہ پرستوں کی اغراض اور ان کی خوشنودی کے لئے صرف کرتے تھے، یہ ملک اور ملک کے محنت کش طبقوں پر بار تھے۔ اس طرح ملک کے عام باشندے دن بدن افلاس، فلاکت، مفلسی اور تباہ حالی میں مبتلا ہو کر روحانی فلاح و بہبود سے محروم ہو رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جو تمام مخلوق کا پروردگار ہے، رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا تاکہ آپ روحانی اصلاح کے ساتھ اقتصادی تباہ حالی بھی ختم فرمائیں اور معیشت کے ایسے اصول تلقین فرمائیں جن سے اقتصادی امراض کے مسموم جراثیم کا قلع قمع ہو جائے۔

اپنے اس نظریہ کو ذہن نشین کرانے کے لئے کہ اقتصادی حالات کا روحانی اور مذہبی حالات

پر کیا اثر پڑتا ہے، شاہ صاحب نے ایک مثال پیش کی جس سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کس قسم کی حکومت کی حمایت کرتے تھے چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

"ایک ایسی قوم فرض کرو جس میں ملوکیت نہ ہو، جو شاہانہ شان و شوکت اور عیش پرستی کے لوازمات سے محفوظ ہو۔ ہر قوم اقتصادی طور پر آزاد ہو، اور ٹیکسوں کے بوجھ سے اس کی کمر دوہری نہ ہوئی ہو ایسی قوم کو یہ فراغت میسر ہوگی کہ وہ دین و ملت کے کام انجام دے سکے۔ اخلاقی اور روحانی ترقی حاصل کر سکے گی۔ لیکن اگر اس قوم کی گردن پر ملوکیت، شاہ پرستی اور سرمایہ کا بھوت سوار ہو جائے تو اس کے ہوش و حواس گم ہو جائیں گے اور وہ انسانی شرف و عظمت سے گر کر چوپایوں کی سی زندگی گذارنے پر مجبور ہو جائے گی، جن کو رات دن پیٹ کی فکر رہتی ہے اور پھر بھی یہ جہنم بھرنے نہیں پاتا۔

شاہ صاحب کے خیال میں سونے اور چاندی کے انباروں سے زیادہ خطرناک وہ طرز معاشرت ہے جو امیر و غریب میں امتیاز قائم کر کے غریبوں کے دلوں میں سرمایہ داری کی ہوس پیدا کرتا ہے۔ سونے چاندی کے برتن، زرق برق ریشمی اور بیش قیمت لباس، فیشن اور تکلفات امیروں کے دماغ میں کبر و غرور اور برتری کا تصور پیدا کرتے ہیں۔ اور ناداروں کے دلوں میں حرص و طمع وہ اضطراب پیدا کر دیتی ہے جو ان کو رشوت ستانی، چوری، خیانت اور عصمت فروشی اور دوسرے جرائم پر آمادہ کرتا ہے۔ غرض کہ سماجی زندگی کے بیش قیمت تکلفات، سرمایہ داری اور شاہ پرستی وہ زہریلے جراثیم ہیں کہ جب تک قانون ان کی اجازت دیتا رہے گا سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں گی۔ دوسری طرف نادار اور حریص لوگوں میں جرائم کا میلان بڑھتا رہے گا۔

شاہ صاحب ایسے طبقوں کی خوش حالی کو جوان تکلفات سے مرصع ہو اور جس سے اقتصادی حالت بگڑ جائے "رفاہیت بالغہ" سے تعبیر کرتے ہیں، اور اسے سوسائٹی کے لئے بدترین جرم اور اس کے خلاف جنگ کو مقدس جہاد قرار دیتے ہیں۔ ان کی تصانیف رفاہیت بالغہ کی مذمت سے بھری ہوئی ہیں۔

شاہ صاحب کا عقیدہ تھا کہ خود غرض انسانوں کی اغراض و مفاد پرستی جب اجتماعی شکل اختیار کر کے ملک کے امن و امان، باشندگان ملک کے اطمینان، آزاد کاروبار، خوش حالی، فارغ البالی،

آزادی رائے، حقوق انسانیت اور حقوق شہریت پر ڈاکے ڈالنے لگے تو جبرہ دست ظالم وجابر حکومت کو ختم کر دینا، حق وصداقت کا تقاضا اور عدل وانصاف کا مطالبہ ہوگا کیونکہ یہ جبرہ دست ظالم وجابر طاقت سارے انسانوں کے لئے بالخصوص اس ملک کے نظام کے لئے جو ایک جسم کی حیثیت رکھتا ہے، کینسر جیسا مرض ہے۔ ہر ایک ہمدرد انسانیت کا فیصلہ یہی ہوگا کہ اس کا آپریشن کر دیا جائے، ورنہ سارا ملک موت کے گھاٹ اتر جائے گا اور تباہ وبرباد ہو جائے گا۔ لہٰذا ہر حق پرست کا مذہبی اور اخلاقی فرض یہ ہے کہ وہ اس مرض کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے جان کی بازی لگا دے۔

شاہ صاحب کا دوسرا اہم معاشی اصول یہ ہے کہ مزدور، کاشت کار اور وہ افراد جو ملک اور قوم کے لئے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں۔ ان کی ترقی اور خوش حالی ہی ملک اور قوم کی اصل ترقی اور خوش حالی ہے۔ جو معاشرہ محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے اور جس میں مزدوروں اور کاشت کاروں پر بھاری ٹیکس لگائے جاتے ہوں، ملک اور قوم کا دشمن ہے اس کا خاتمہ ہونا چاہئے، حاجت مند مزدوروں کی رضامندی قابل اعتبار نہیں جب تک کہ محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امداد باہمی کے اصول پر لازم ہوتی ہے۔ جو پیداوار اور آمدنی جو تعاون باہمی کے اصول پر نہ ہو خلاف قانون ہے۔

کام کرنے والوں یعنی مزدوروں اور کاشت کاروں کے کام کے اوقات محدود ومتعین کئے جائیں۔ انہیں اتنا وقت ضرور ملنا چاہئے کہ وہ اپنی روحانی اور اخلاقی اصلاح کر سکیں اور ان میں اپنے مستقبل کے بارے میں غور وفکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ یوروپ میں صنعتی انقلاب کے بعد انیسوی صدی اور اس کے بعد بیسوی صدی میں مزدور تنظیموں کی طرف سے یہی مطالبہ پیش کیا گیا اور بہت سے ملکوں میں اس مطالبہ کو منظور کیا گیا لیکن مزدوروں اور کام کرنے والوں کی مادی فلاح اور بہبود کے لئے سب سے پہلے شاہ صاحب نے یہ نظریہ پیش کیا۔ تعاون باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے اس کو تعاون باہمی ہی کے اصول پر جاری رہنا چاہئے جس طرح تاجروں کے لئے جائز نہیں کہ وہ غلط قسم کی مسابقت یا مقابلے سے تعاون باہمی کو نقصان پہونچائیں، اسی طرح حکومت کے لئے بھی درست نہیں کہ وہ بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ اور ترقی میں رکاوٹ ڈالے۔

جو کاروبار دولت میں گردش کو کسی خاص طبقے کے اندر محدود کرے وہ ملک اور ملکی معیشت

کے لئے تباہ کن ہے۔ شاہانہ نظام زندگی جس میں مٹھی بھر افراد یا چند خاندان کے عیش و عشرت کے سبب دولت کی صحیح اور منصفانہ تقسیم میں خلل واقع ہو یا رکاوٹ پیدا ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد سے جلد ختم کر کے عوام کی مصیبتیں ختم کی جائیں اور انہیں مساویانہ زندگی بسر کرنے کا موقعہ فراہم کیا جائے۔

شاہ صاحب نے مندرجہ ذیل بنیادی سیاسی اصول پیش کئے تھے۔ جن میں سے بعض ان کے بعد بعض سیاسی مفکرین کے نزدیک فلاح Welfare اور جمہوری مملکتوں کے بنیادی اصول قرار پائے۔ مثلاً یہ کہ مملکت یا اسٹیٹ زمین کی مالک ہے۔

زمین کا مالک حقیقی اللہ ہے اور ظاہری نظام کے لحاظ سے اسٹیٹ یا مملکت ہے کسی بھی ملک کے شہریوں کی حیثیت وہی ہے جو کسی مسافر خانے میں ٹھہرنے والوں کی ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حق انتفاع میں دوسرے کی دخل اندازی ممنوع ہے۔

سارے انسان برابر ہیں کسی کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ اپنے کو مالک ملک یا مالک قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے۔ اور نہ کسی کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ کسی صاحب اقتدار کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرے۔

اسٹیٹ کے سربراہ کی حیثیت وہی ہے جو کسی وقف کے متولی کی ہے۔ وقف کا متولی اگر ضرورت مند ہے تو وہ اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ ملک کے عام باشندہ کی طرح زندگی گذار سکے۔

بلا تفریق ولحاظ مذہب ونسل یہ ہر شہری کا پیدائشی حق ہے کہ اسے روٹی کپڑا مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کر سکے حاصل ہونی چاہئے یہ اس کے بنیادی حقوق ہیں اسی طرح مذہب، نسل یا رنگ کے اختلاف یا تفریق کے بغیر عام باشندگان ملک کے معاملوں میں یکسانیت کے ساتھ عدل وانصاف، ان کے جان و مال کی حفاظت، ان کی عزت وناموس کی حفاظت ملکیت وشہریت کے بنیادی حقوق ہیں۔

اپنی زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر ملت کا بنیادی حق ہے۔

ان حقوق کو حاصل کرنے کی شکل یہ ہے کہ ملک میں خود مختار علاقے قائم کئے جائیں جو ایسے معاملوں میں آزاد ہوں اور وہ ایسے سیاسی نظام سے منسلک ہو جائیں جو قومی لحاظ سے اقتدار اعلیٰ کا

مالک ہو۔ لیکن اُسے یہ حق حاصل نہ ہو کہ وہ کسی مخصوص مذہب، مخصوص تہذیب کی کسی اکائی پر حملہ کر سکے۔ اس طرح شاہ صاحب نے ملکوں کے لئے صحیح اور جمہوری فیڈرل یا وفاقی نظام کا صحیح اصول پیش کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ مرکزی حکومت کے محدود اختیارات کا نظریہ تاکہ یہ ملک میں صحیح جمہوریت قائم ہو سکے اور اقلیتیں اکثریت کی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون رہیں، واضح رہے کہ یہ نظریہ انہوں نے تقریباً دوسو برس پہلے پیش کیا تھا اِس سے ان کی سیاسی فراست اور دوراندیشی کا اندازہ ہوتا ہے اپنے اس انقلابی منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے مغلیۂ سلطنت کے بعض باثر امراء کے ذریعہ جن میں نواب نجیب الدولہ اور آصف جاہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، کے ذریعہ کوشش کی اور اپنے ان نظریات کی اشاعت کے لئے متعدد کتابیں لکھیں، مثلاً حجۃ اللہ البالغہ، جس کا شمار اہم ترین اسلامی تصانیف میں ہے۔ اور اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ میں درس دینا شروع کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے فارسی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تاکہ پڑھے لکھے مسلمان بھی براہ راست اسلامی تعلیمات کے سرچشمہ یعنی قرآن تک پہونچیں۔

شاہ صاحب کے عقیدے کے مطابق، اسلامی تعلیمات کے مطابق جہاد کا مقدس فرض پورے تقدس کے ساتھ وہی لوگ ادا کر سکتے ہیں جن کی تربیت خاص مقاصد کے حصول کے لئے خاص طور پر کی گئی ہو، اور جن کا ہر فرد اپنے ذاتی اغراض کو کلیۃً ختم کر کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکا ہو۔

شاہ صاحب ایران اور روم کی جابرانہ شہنشاہیوں اور ان کے ملوکانہ نظام کے ذریعہ عوام کی اقتصادی بدحالی کی مثال میں اپنے زمانے کے نظام حکومت کو پیش کرتے ہیں اور ایسے نظام کو ختم کرنے کو انبیاء علیہم السلام کی خصوصاً حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"تباہ حال شہری جن پر درندہ صفت انسانوں کا تسلط ہو اور ان کو اپنی حفاظت اور دفاع کی پوری طاقت حاصل نہ ہو، جسد انسانی کے لئے آکلہ ہے کہ انسان اس وقت تک تندرست نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسے یعنی آکلہ (یا کینسر) کو کاٹ کر پھینک نہ دیا جائے اور جو ڈاکٹر بھی اس انسان کے مزاج کو درست کرنے اور اس کی صحت کو بحال کرنے کی طرف توجہ کرے گا اس کے

لے ضروری ہوگا کہ پہلے اس سرطان اور آکلہ کا پورا آپریشن کر ڈالے۔ تھوڑی سی برائی کو عمل میں لانا جب کہ اس کا نتیجہ خیر کثیر اور بہت بڑی سمجھداری ہو واجب ادا ضروری ہو جاتا ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ، باب الجہاد، بحوالہ علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد دوم مصنف حضرت مولانا سید محمد میاں صفحات: ۲۳،۲۴)

یہ خیال کہ حضرت شاہ صاحب کی سیاسی تحریک کا خاص مقصد سلاطین مغلیہ کو بچانا بالکل غلط ہے اور شاہ صاحب اور وطن کی تاریخ پر بہت بڑا ظلم ہے۔ (علماء ہند کا شان دار ماضی جلد دوم ص:۲۶) بلکہ آپ کے خیال میں ملک ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح صرف اسی صورت میں ہے کہ دور حاضر کے نظام کی تمام دھجیاں اڑادی جائیں اور ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کیا جائے۔ آپ کا نصب العین یہی تھا کہ فک کل نظام ہی سیاسی اور سماجی زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب کی بنیاد ہو سکتا ہے۔ (علماء ہند کا شاندان ماضی جلد دوم، ص:۲۷)

ان کے نزدیک یہ انقلاب تب ہی برپا ہو سکتا تھا کہ جب رائے عامہ آپ کے اصلاحی نظریوں کو اپنا لیتی۔ اس کے لئے جنگ و جہاد سے پہلے تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے ملک میں چند مرکز قائم کئے گئے۔ علمی اور عملی تربیت کا سب سے بڑا مرکز دہلی تھا جس کو شاہ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے فرزند، و جانشیں شاہ عبدالعزیز نے قائم رکھا، دوسرا مرکز رائے بریلی دائرہ شاہ علم اللہ میں تھا۔ اس مرکز سے ٹیپو سلطان کا بھی روحانی تعلق تھا۔ اس کے علاوہ تین مرکز اور بھی تھے مدرسہ نجیب آباد مدرسہ مولانا محمد مبین ٹھٹھہ ہند، اور اودھ کا دارالحکومت لکھنؤ۔

(علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم صفحات: ۲۹ تا ۳۲)

اگر چہ شاہ صاحب کے زمانے میں مغل شہنشاہ کی فوجی طاقت اور سیاسی اقتدار دونوں بمنزلہ صفر کے تھے لیکن شہنشاہیت کی عظیم الشان تحریک نے شہنشاہ کی تعظیم و تکریم کو تقریباً مذہبی عقیدے کی حیثیت دے دی تھی یہی وجہ تھی کہ جب کسی مغل بادشاہ کو قتل کر دیا جاتا، یا معزول کر دیا جاتا تو فتنہ پرور طاقتیں مجبور ہو جاتی تھیں کہ اکبر اور عالمگیر کی اولاد ہی میں سے کسی کو معزول یا مقتول شاہ کا جانشین بنائیں، شہنشاہ ملک کا حقیقی مالک سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں صوبوں کے گورنر خود مختار ہو گئے تھے مگر اپنی حکومت کے جواز کے لئے وہ شہنشاہ کی سند ضروری سمجھتے تھے چنانچہ برہان الملک نے شہنشاہ کی وزارت حاصل کر کے ... حکومت قائم کی اور نظام الملک آصف

جاہ نے امیر الامراء کا منصب عالی حاصل کر کے دکن میں اپنی سلطنت قائم کی مرہٹے تک اس قسم کے منصب حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھے چنانچہ باجی راؤ پیشوا اور مہاراجی سندھیا کو امیر الامراء کا منصب مل گیا اس طرح ان کے نزدیک بھی زوال پذیر اور سسکتی ہوئی مغلیہ شہنشاہیت تعظیم و تکریم اور حفاظت کی مستحق ہوئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی تک نے اپنے تسلط اور جواز کے لئے مغل شہنشاہ شاہ عالم سے سند دیوانی لینی ضروری سمجھی اور دہلی فتح کرنے کے بعد بھی نصف صدی سے زائد تک دہلی کے تخت پر مغل شہنشاہ کو بٹھائے رکھا۔ شاہ صاحب کے مکمل اور ہمہ گیر انقلاب کا نعرہ مدت بادشاہ اور شاہ پرستون کے لئے پیغام فنا نہ تھا بلکہ ان تمام طاقتوں اور قوتوں کے لئے بھی پیغام موت تھا۔ جو سلطنت مغلیہ کا جانشین بننا چاہتی تھیں یا پیشہ ورسپاہیوں کی مدد سے ملک کے چپے چپے پر جاگیردارانہ نظام قائم کئے ہوئے تھیں۔ بادشاہوں، نوابوں اور امراء کے علاوہ حضرت شاہ صاحب نے ان علماء مشائخ اور شعرا کی مذمت کی جو ملوکانہ نظام کے حامی تھے ان گروہوں نے شاہ صاحب کے نصب العین کی شدید مخالفت کی لیکن ان شدید مخالفتوں کے باوجود شاہ صاحب نے پوری طاقت اور استقامت سے ایک انقلابی نصب العین پیش کیا۔

شاہ صاحب کے مکمل اور ہمہ گیر انقلاب کا نعرہ طرف جانشین بننا چاہتی تھی، بادشاہ اور شاہ پرستوں کے لئے پیغام فنا نہ تھا بلکہ ان تمام طاقتوں اور قوتوں کے لئے بھی پیغام موت تھا جو سلطنت مغلیہ کا پیشہ اور پیشہ ورسپاہیوں کے باوجود ملک کے چپے چپے پر جاگیردارانہ نظام قائم کے ہوئے تھیں، بادشاہوں، نوابوں اور امراء کے علاوہ حضرت شاہ صاحب نے ان علماء مشائخ اور شعراء کی مذمت کی جو اس نظام کے حامی تھے، ان گروہوں نے بھی شاہ صاحب کے نصب العین کی شدید مخالفت کی لیکن ان شدید مخالفتوں کے باوجود شاہ صاحب نے پوری قوت اور سے انقلابی نصب العین پیش کیا اور اپنے معاشی نظام اس ملوکانہ کے حامی تھے۔

# شاہ ولی اللہ دہلوی اور عربی زبان وادب میں ان کی خدمات

پروفیسر زبیر احمد فاروقی ☆

شاہ ولی اللہ دہلوی بلاشبہ ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے اور آپ کی عبقریت کے مختلف پہلو ہیں جن میں محدث کی حیثیت تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ تاہم ان کی عربی زبان وادب کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ لیکن اس مقالہ میں بنیادی کوشش عربی زبان وادب میں آپ کے مرتبہ کا تعین کرنے پر مرکوز ہے۔ البتہ بعض دوسرے پہلوؤں کا مختصر تذکرہ ناگزیر ہونے کی وجہ سے سرسری طور پر کر دیا گیا ہے۔

آپ نے جس خاندان میں آنکھیں کھولیں وہ خاندان ادب اور ثقافت کے میدان میں ایک امتیازی مقام رکھتا تھا۔ آپ کے والد شاہ عبدالرحیم ایک جید عالم تھے اور ان ممتاز علماء میں سے ایک تھے جنہوں نے فتاوی عالمگیری کی تدوین میں مدد کی تھی۔ علامہ صدیق حسن قنوجی آپ کے خاندان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "آپ کا گھر ہندوستان میں علم دین کا گھر تھا جس کے افراد صرف منقولات میں ہی نہیں بلکہ معقولات میں بھی مشائخ ہند اور اصحاب علم وفضل سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان کے کسی بھی علاقے میں مسلمانوں کے کسی دوسرے گھر کو علم دین کے میدان میں یہ شرف حاصل نہیں ہے"۔(۱)

(۱) الامام احمد بن عبدالرحیم المعروف بالشاہ ولی اللہ الدہلوی۔ ص: ۳۶۔ مصنف: ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندوی۔

☆ صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

شاہ ولی اللہ نے بچپن میں زیادہ تر درسی کتابیں اپنے والد رحمہ اللہ سے ہی پڑھیں۔ ان میں علم نحو میں کافیہ اور شرح جامی، تفسیر میں المدارک اور بیضاوی، حدیث میں شمائل ترمذی، مشکوۃ المصابیح اور صحیح بخاری، علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ، اصول فقہ میں حسامی اور توضیح وتلویح، منطق میں شرح شمسیۃ اور شرح المطالع، فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمت، علم کلام میں شرح عقائد نسفی، شرح المواقف اور تصوف میں عوارف المعارف اور الرسائل النقشبندیہ، طب میں موجز القانون، معانی وبیان میں المختصر والمطول اور علم ہیئت وحساب میں چند کتابیں شامل ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ اپنے والد سے اخلاق اور تصوف کا درس بھی لیتے رہے۔

صرف سات سال کی عمر میں آپ نے قرآن کریم حفظ کر لیا اور ۱۵ رسال کی عمر میں ظاہری اور باطنی علوم کی تعلیم مکمل کر لی۔ اس موقع پر آپ کے والد نے ایک دعوت فاخرہ کا اہتمام کیا جس میں کچھ اہم علماء ومشائخ اور احباب کو مدعو کیا۔ حاضرین نے بلند آواز میں آپ کو مبارکباد دی اور اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد آپ کے علم وفضل کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل گئی خود حضرت محدث دہلوی نے تذکرہ کیا ہے کہ ان کے والد نے اس مجلس میں آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور آپ کو تدریس اور بیعت کی اجازت عطا کی اور اس آیت کریمہ کو بار بار پڑھا:

فلما بلغ أشده واستوى آتيناه حكما وعلما وكذلك نجزي المحسنين(۱)۔

والد کے انتقال کے بعد خود منصب تدریس پر فائز ہوئے اور تقریبا بارہ سال تک یہ خدمت انجام دینے کے بعد عازم حرمین شریفین ہوئے۔ اور مدینہ منورہ میں رہ کر شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی کی شاگردی اختیار کی۔ ان سے صحاح ستہ کا درس لیا اور تدریس حدیث کی اجازت حاصل کی۔ شیخ ابو طاہر کے علاوہ آپ شیخ وفد اللہ بن سلیمان المغربی اور شیخ تاج الدین حنفی کے حلقۂ درس میں بھی شرکت کرتے تھے۔

حرمین شریفین میں آپ نے مکمل دو سال تک قیام کیا اور اس دوران وہاں کے علمی اور روحانی سرچشموں سے مکمل فیض حاصل کیا۔

ویسے تو آپ کی خدمات کا دائرہ تفسیر، فقہ، حدیث، کلام اور اصلاح وتجدید پر محیط ہے لیکن علم

(۱) ایضا: ص: ۱۲، ۱۳

حدیث کی تدریس کے سلسلہ میں آپ نے جو اصلاحی اور انقلابی طریقہ اختیار کیا اس کی بناپر آپ محدث کے لقب سے مشہور ہوئے اور حدیث کی تدریس میں آپ کے اختیار کردہ طریقہ کو طریقہ ولی اللہی کے نام سے جانا گیا۔

بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ سفر حج کے دوران ان کا جہاز چند دنوں کے لئے یمن کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ اس دوران انہیں یہ خبر ملی کہ بندرگاہ سے قریب ایک گھر میں ایک معمر عالم اور محدث مقیم ہیں۔ آپ نے ان کی خدمت میں حاضر ہوکر حدیث کی اجازت طلب کی۔ شیخ نے دریافت کیا حدیث کس سے پڑھی ہے؟ شیخ نانوتوی نے شاہ عبدالغنی کا نام لیا جنہیں وہ نہیں جانتے تھے۔ پھر دریافت کیا شاہ عبدالغنی نے حدیث کس سے پڑھی؟ کہا شاہ اسحاق سے۔ شیخ انہیں بھی نہیں جانتے تھے۔ پھر دریافت کیا شاہ اسحاق کے استاد کون تھے؟ جواب دیا گیا شاہ عبدالعزیز دہلوی۔ آخری نام سنتے ہی شیخ کے چہرے پر بشاشت کے آثار ظاہر ہوئے اور مولانا نانوتوی کو حدیث کی اجازت دیدی اور فرمایا کہ شاہ ولی اللہ کی مثال شجر طوبیٰ کی سی ہے۔ اسی طرح جہاں بھی شاہ ولی اللہ کا طریقہ (حدیث) پایا جاتا ہے وہاں جنت بھی پائی جاتی ہے اور جو مکان اس طریقہ سے خالی ہے وہ جنت سے بھی خالی ہے''۔(۱)

علامہ عبدالحی حسنی، شبلی نعمانی، شیخ مسعود ندوی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہم اللہ نے مختلف مواقع پر اپنی تحریروں میں شاہ ولی اللہ کے بے مثال علمی، روحانی اور اصلاحی مرتبہ کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمۃ کی وفات سے چار سال قبل ۱۱۱۴ھ مطابق ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت اپنے عروج پر پہونچنے کے بعد زوال کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ اورنگ زیب کے بعد پے در پے جو لوگ منصب حکومت پر فائز ہوئے وہ ہر اعتبار سے نہایت کمزور تھے، اس زمانے میں شاہزادوں اور گورنروں نے حکومت کے خلاف بغاوتیں کیں اور اپنی الگ حکومتیں قائم کیں اور مسلمانوں کا خون ناحق بہانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے لگے۔ شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے اپنی ۶۳ سالہ حیات میں اورنگ زیب کے بعد دس بادشاہوں کو سلطنت مغلیہ کے تخت پر یکے بعد دیگرے فروکش ہوتے ہوئے دیکھا۔

(۱) الارواح الثلاثۃ، ص: ۲۰۷۔

پ شاہ صاحب کے عہد اور آپ کے کارناموں کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے مولانا مسعود عالم ندوی رقمطراز ہیں:

"اگر آپ اس زمانے کے درمیان جس میں امام کی نشو ونما ہوئی اور آپ کی فکر سلیم اور آپ کی طرف سے امت کے امراض و انحطاط کے اسباب کے صحیح ادراک کے درمیان موازنہ کریں تو آپ کا قلب شدید حیرت سے دوچار ہوگا۔ آپ کی نشو ونما ایک ایسے زمانہ میں ہوئی جو انتشار اور جہالت کا زمانہ تھا اور جس میں مملوک و عوام کے درمیان فواحش کا دور دورہ تھا۔ ایسے دور میں آپ دنیا کے سامنے اپنی تالیفات پیش کرتے ہیں جس میں اندھی تقلید سے احتراز کرتے ہوئے تاریخ اور انسانی سماج پر ایک صاحب بصیرت کی حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں اور ان کے باریک حقائق میں کتاب و سنت کے سرچشموں سے فیضیاب ہوتے ہوئے غور و خوض کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ کی تالیفات اور آپ کی فکر کے نتائج قریب و بعید ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ کیا آپ ان تالیفات کی زبان اور ان میں معانی و نظریات و افکار کی پیشکش اور ان کی بحوث کی تہوں میں بکھرے ہوئے حقائق میں اس نجس اور رذیل ماحول کا کوئی اثر دیکھتے ہیں جس کی مثال قوموں کی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے؟ آپ حجۃ اللہ البالغہ اور اس کی صاف ستھری زبان کو دیکھئے، کیا اس ملک میں ہندوستان کی گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے؟(۱)۔

فارسی کے ساتھ ساتھ آپ کو عربی تحریر پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ عربی میں آپ کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغہ ہے جسے آپ نے اپنے شاگرد رشید شیخ محمد عاشق کی درخواست پر تحریر فرمایا۔ اس کتاب کے بارے میں آپ کے صاحبزادے شیخ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے امیر حیدر بلگرامی کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر کیا ہے!

"کتاب حجۃ اللہ البالغہ اسرار حدیث کے موضوع پر آپ کی سب سے اہم کتاب ہے، اس علم کے بارے میں آپ سے قبل کسی نے اس طرح گفتگو نہیں کی"۔

عارف باللہ مرزا مظہر جان جاناں دہلوی نے ان الفاظ میں آپ کی تعریف کی ہے:

---

(۱) مولانا مسعود ندوی: تاریخ الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۱۳۸ [illegible]

شیخ ولی اللہ نے ایک نئے طریقہ کی وضاحت کی۔ اسرار و معارف کی تحقیق اور غوامض علوم کی تحقیق میں آپ کا ایک خاص اسلوب ہے۔ آپ علماء ربانیین میں سے ہیں۔ محققین صوفیہ میں ایسے لوگوں کی مثال بہت کم ملتی ہے جنہوں نے علم ظاہر اور علم باطن کو ایک جگہ جمع کیا ہو اور ان علوم کے بارے میں گفتگو کی ہو"۔(۱)

شاہ ولی اللہ دہلوی کے کارناموں میں سے ایک اہم کارنامہ عربی زبان میں تعبیر و بیان پر مکمل قدرت حاصل کرنا ہے۔ فارسی چونکہ اس وقت کی سرکاری زبان تھی اس لئے اس میں مہارت حاصل کرنا اس قدر حیرتناک نہیں ہے جس قدر عربی زبان میں۔ خاص طور پر اس لئے کہ صرف دو سالوں کے علاوہ آپ نے اپنی تعلیم و تربیت اور تدریسی زندگی کا سارا حصہ بلاد عربیۃ سے باہر گزارا۔ اس کے علاوہ آپ کا زمانہ عربی زبان و ادب کے تعلق سے ایک تاریک دور شمار کیا جاتا ہے۔ آپ نے جس دور میں آنکھیں کھولیں اس دور میں عالم عرب میں مختلف سیاسی اور غیر سیاسی اسباب کی بنا پر عربی ادب پر ایک جمود کی کیفیت طاری تھی اور بقول احمد حسن زیات "عربی زبان نہایت بے سروسامانی اور کمزوری کے عالم میں آخری سانسیں لے رہی تھی" اس دور میں معانی سے زیادہ مرصع اور مسجع عبارت تحریر کرنے پر تمام تر توجہ مرکوز تھی۔ اس وقت کے نثری نمونوں میں ایک طرف حریری کی مقامات تھی تو دوسری طرف مقدمہ ابن خلدون "اول الذکر ظاہری رونق والے لیکن بے معنی اور مصنوعی اسلوب کی نمائندگی کر رہی تھی اور دوسری پر معنی اور محکم فطری اسلوب کی۔"(۲) اگر ایک طرف عوام پر مقامات کے اسلوب کا جادو چل رہا تھا تو دوسری طرف خواص ابن خلدون کے اسلوب کو ترجیح دیتے تھے۔ شاہ ولی اللہ کی عربی نثر سلیس عربی انشاء کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ آپ کی تالیفات حجۃ اللہ البالغہ، البدور البازغۃ اور التفہیمات الالہیۃ کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے مقامات کے عامیانہ اسلوب سے بچتے ہوئے ابن خلدون کا علمی اور منطقی اسلوب اختیار کیا ہے۔ اسلامی فلسفہ اور حکمت جیسے خشک مضامین کو فصیح اور پختہ اسلوب میں پیش کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ مختلف اوقات میں اسے مختلف مطابع نے

---

(۱) شیخ عبدالحی حسنی: نزہۃ الخواطر ج ۶ ص: ۴۰۵۔

(۲) احمد حسن الزیات: تاریخ الادب العربی (اردو ترجمہ) ص: ۶۰۲۔

شائع کیا ہے۔ مطبع صدیقی بریلی نے ۱۲۸۶ھ میں مطبع بولاق مصر نے ۱۲۹۶ھ میں اور مطبع دار احیاء العلوم بیروت نے ۱۴۱۰ھ میں اس عظیم الشان کتاب کو شائع کیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان میں یہ کتاب صرف متن یا ترجمہ کے ساتھ متعدد بار شائع ہوئی۔

آپ کے طرز تحریر کا اندازہ کرنے کے لئے حجۃ اللہ البالغہ سے مندرجہ ذیل مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:

"اعلم أن من اعظم انواع البر الایمان بصفات الله تعالیٰ واعتقاد اتصافه بها فانه یفتح بابا بین هذا العبد وبینه تعالیٰ ویعده لانکشاف ما هنالک من المجد والکبریاء، واعلم أن الحق تعالی أجل من أن یقاس بمعقول أو محسوس أو یحل فیه صفات کحلول الاعراض فی محالها أو تعالجه العقول العامیة او تتناوله الالفاظ العرفیة ولابد من تعریفه الی الناس لیکملوا کمالهم الممکن لهم فوجب ان تستعمل الصفات بمعنی وجود غایاتها ولا بمعنی وجود مبادیها فمعنی الراحة إفاضة النعم لا انعطاف القلب و الرقة"[1]۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے آپ کی تالیفات اور خاص طور پر حجۃ اللہ البالغۃ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

آپ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی، ایک عبقری اور نابغہ اسلام تھے۔ مفسر، محدث، فقیہ، متکلم اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ عربی تحریر پر آپ کو قدرت حاصل تھی۔ آپ ایک سیال قلم کے مالک اور باکمال مولف تھے۔ آپ کی بعض کتابیں ایسی ہیں کہ ان کے طرز پر اور کوئی دوسری کتاب نہیں لکھی گئی۔ خاص طور پر اصول تفسیر میں الفوز الکبیر، خلافت خلفاء میں ازالۃ الخفاء، وجوہ اختلاف میں رسالۃ الانصاف۔ اور جہاں تک آپ کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا تعلق ہے تو وہ اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے جس میں دین کے حقائق، تطبیق عقل ونقل اور دینی ودنیاسی نظام کا بیان ہے[2]۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی کتاب تاریخ علم کلام میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے بارے میں لکھا ہے

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ، ص: ۶۳۔

(۲) ابوالحسن علی ندوی: مختارات من ادب العرب، ص: ۱۰۸۔

کہ شاہ ولی اللہ کی معجز بیانی، علمی نکات اور اسرار شریعت و معالم دین کے عمیق مطالعہ کے سامنے امام غزالی، رازی اور ابن رشد کی خوبیاں ماند پڑ گئیں (۱)۔

آپ کی دوسری اہم کتاب جو فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں ہے "التفہیمات الالہیۃ" کے نام سے ہے، اس کتاب کا موضوع علوم شریعت، تصوف، اخلاق، سیاست اور تمدن ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قوم کے ہر طبقہ کو مخاطب کیا ہے اور ان کے افعال پر ایک مخلص اور ہمدرد مصلح کی حیثیت سے تنقید کی ہے:

بادشاہوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فرضاء الملأ الأعلى ان تنصبوا في كل ناحية وفي كل مسيرة ثلاثة ايام واربعة ايام اميرا عادلا ياخذ للمظلوم حقه من الظالم ويقيم الحدود ويجتهد ان لا يحصل فيهم بغي ولاقتال ولا ارتداد و لاكبيرة، ويفشوا الإسلام وتظهر شعائرة، وياخذ لفرائضهٔ كل احد ويكون لأمير كل بلد شوكة يقدر بها على اصلاح بلده ولايكون له شوكة يتمتع بسببها ويعصى على السلطان وينصب في كل اقليم كبير اميرا يعلده القتال فقط، يكون جمعه اثنا عشر الفا من المجاهدين لا يخافون فيه لومة لائم يقاتلون كل باغ وعاد، فإذا كان ذلك فرضاء الملأ الأعلى ان يفتش حينئذ من التكلمات المنزلية والعقود ونحوهما حتى لايكون شئ إلا موافق الشرع حتى يأمن الناس من كل وجه (۲)۔

حجۃ اللہ البالغہ اور التفہیمات الالہیۃ کے علاوہ عربی میں آپ کی معروف تصانیف درج ذیل ہیں:

☆ الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف بین الفقہاء المجتہدین

☆ یہ کتاب شرکۃ المطبوعات العلمیہ مصر سے ۱۳۲۷ھ میں شائع ہوئی، پھر مصر ہی کے

---

(۱) التفہیمات: ص: ۲۱۶۔

(۲) ڈاکٹر زکی مبارک: المدائح النبویۃ فی الأدب العربی: ص: ۱۵، بحوالہ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی: عربی میں نعتیہ کلام۔

مکتبہ المنصورۃ نے اسے شائع کیا اس کے بعد ہندوستان سے متعدد بار شائع ہوئی اور پھر مشہور عربی عالم شیخ عبد الفتاح ابو الغدہ کی تصحیح اور تعلیقات کے ساتھ دار النفائس بیروت سے شائع ہوئی۔

☆ البدور البازغۃ فی الکلام یہ کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے طرز پر ہے مجلس علمی ڈابھیل سے ۱۳۵۴ھ میں شائع ہوئی۔

☆ القول الجمیل فی بیان سواء السبیل۔ یہ کتاب تصوف کے تین مشہور طریقوں قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ سے متعلق ہے۔ اس کے دو قدیم قلمی نسخے ندوۃ العلماء لکھنؤ کی لائبریری میں موجود ہیں جن میں سے ایک سید قطب مہدی حسنی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو شاہ عبد العزیزؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے اور دوسرا نسخہ نواب صدیق حسن خاں کی لائبریری سے حاصل کیا گیا ہے۔

یہ کتاب مطبع الجمیلۃ مصر سے ۱۲۹۰ھ میں شائع ہوئی۔ اردو میں اس کا ترجمہ مولانا خرم علی البلہوری (م ۱۲۷۱ھ) نے ۱۲۶۰ھ میں کیا ہے جو پہلے مطبع درخشانی اور پھر مطبع نظامی کانپور سے ۱۲۷۸ھ اور ۱۳۰۷ھ میں علی الترتیب شائع ہوا۔

☆ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید۔ عربی زبان میں یہ رسالہ اجتہاد اور تقلید کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔

☆ الفتح الخبیر۔ عربی زبان میں قرآن کریم کی مختصر تفسیر اور مشکل الفاظ کی وضاحت۔

عربی نثر کے علاوہ عربی شاعری کے میدان میں بھی شاہ صاحب نے اپنی شعری صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ آپ نے اپنے شعری سرمایہ میں ایک دیوان چھوڑا ہے جو مخطوطہ کی شکل میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی لائبریری میں موجود ہے۔ یہ دیوان آپ کے صاحبزادے شیخ عبد العزیز محدث دہلوی نے جمع کیا تھا اور اس کی ترتیب آپ کے دوسرے صاحبزادے شاہ رفیع الدین کے ہاتھوں انجام پائی۔ یہ مخطوطہ سید احمد شہیدؒ کے برادر شیخ محمد اسحاق بن عرفان کا تحریر کردہ ہے۔ اس نسخے کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۷۷ ہے اور ہر صفحہ پر ۱۸ سے لے کر ۲۱ اشعار ہیں۔ اس میں حضور ﷺ کی شان میں کہا گیا مشہور قصیدہ "اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم" بھی شامل ہے

ان کے علاوہ مطبع مجتبائی دہلی نے ۱۲۹۸ھ میں شاہ صاحب کے چند قصائد پر مشتمل ایک مختصر مجموعہ شائع کیا ہے جس میں مذکورہ بالا قصیدہ کے علاوہ آپ کے تین اور قصائد قصیدہ ہمزیہ، قصیدہ تائیہ اور قصیدہ لامیہ شامل ہیں۔

حضور ﷺ کی شان گرامی میں کہے گئے اشعار کو اردو میں نعت کہتے ہیں جبکہ عربی میں ان کے لئے مدح یا مدیح کا لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن ادب عربی کی تاریخ میں حضور کی شان میں کہے گئے مدحیہ قصائد کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو شعر کی دوسری اصناف کو حاصل ہے۔ اس کی وجہ بقول ڈاکٹر زکی مبارک یہ ہے کہ جن حضرات نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی تھی ان کا شمار زیادہ مشہور اور قادر الکلام شعراء میں نہیں ہوتا ہے۔ (۱)

ہندوستانی نعت گو شعراء کی فہرست بہت طویل ہے ان میں حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، شیخ عبد المقتدر کندی، شیخ احمد تھانیسری، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبد العزیز، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا حبیب الرحمان عثمانی، مفتی محمد شفیع، مولانا عبد الرحمان سیوہاروی اور مولانا اعزاز علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شیخ یوسف بن اسماعیل النبہانی نے جو بیروت کے ایک صوفی منش صاحب علم مسلمان تھے۔ ۱۳۲۰ھ میں "المجموعۃ النبہانیۃ فی المدائح النبویۃ" کے نام سے چار جلدوں میں عربی میں کہی جانے والی نعتوں کو جمع کیا ہے یہ مجموعہ صرف عرب شعراء کی عربی نعتوں پر مشتمل ہے اور میری معلومات کے مطابق ابھی تک ہندوستانی شعراء کی عربی نعتوں کا کوئی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا۔ ضرورت ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے اور ریسرچ اسکالرز اس ضرورت کو پورا کرنے کی طرف توجہ کریں۔ خاص طور پر اس لئے کہ ہندوستان میں عربی میں شاعری کرنے والوں کی اکثریت علماء دین پر مشتمل ہے اور انہوں نے عام طور سے مدیح نبوی کے موضوع کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہے۔ اس لئے کہ وہ شعراء کی اس جماعت میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے جن کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے: "الشعراء يتبعهم الغاوٗن" ان ہندوستانی شعراء میں شاہ ولی اللہ دہلوی کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

---

(۱) علامہ شبلی نعمانی: تاریخ علم کلام، ص: ۶۰، بحوالہ ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندوی: الامام احمد الخ۔

قصیدہ ''اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم'' شاہ صاحب کا ایک طویل قصیدہ ہے جو ۱۰۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے تعارف میں شاہ صاحب فرماتے ہیں: ''سید المرسلین ﷺ کی مدح اور آنحضرت کے مناقب کی اشاعت اور آنجناب کی نبوت پر دلائل کا ذکر ہے۔ بے شبہ مثمر برکات اور موجب درجات ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بائیہ قصیدہ سواد بن قارب صحابی کے قصیدہ کے اتباع میں کہا گیا ہے۔ ان کا قصیدہ جب حضور کے گوش مبارک تک پہونچا تو آپ نے اسے شرف قبولیت بخشا۔ اس ضعیف کا قصیدہ اگرچہ اس درجہ کا نہیں ہے کہ اسے فصحاء و بلغاء کے قصائد کے برابر رکھا جائے لیکن یہ بھی آنحضرت ﷺ کی نبوت کے دلائل پر مشتمل ہے''۔

مکتبہ مجتبائی دہلی نے اس قصیدہ کو شاہ صاحب کے چند اور قصائد کے ساتھ ایک مختصر مجموعہ کی شکل میں ۱۳۰۸ھ میں شائع کیا ہے۔

شاہ صاحب نے اس قصیدہ کو دس فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی فصل میں عرب شعراء کی روایت کے مطابق تشبیب کے اشعار، جن میں زمانہ کے حوادث کا بیان ہے جس کا مقابلہ کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ کی روح مبارکہ سے مدد حاصل کرنا اور آپ کے مناسبت کا ذکر ضروری ہے۔

دوسری فصل میں آنحضرت کے مناقب میں سب سے عظیم منقبت یعنی شفاعت کبری کا ذکر ہے، اس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

ملاذ عباد الله ملجأ خوفهم　　　إذا جاء يوم فيه شيب الذوائب

(آپ بندگان خدا کے لئے جائے پناہ اور بحالت خوف ان کے لئے ٹھکانہ ہیں ایسے روز جبکہ گیسو سفید ہو جائیں گے یعنی روز قیامت)۔

تیسری فصل میں آپ کی آمد کے بارے میں انبیاء سابقین کی بشارت اور آپ کے نسب کا تذکرہ ہے، یہ فصل اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

سلالة اسماعيل والعرق نازع　　　واشرف بيت من لوى بن غالب

(آپ حضرت اسماعیل کی نسل سے ہیں اور اصل، فرع کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور آپ کا تعلق لوی بن غالب کی اولاد کے سب سے بہتر قبیلہ سے ہے)۔

چوتھی فصل میں دلائل نبوت کے ساتھ ساتھ آپ کے شمائل و اخلاق کا تذکرہ ہے، اس فصل کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

جميل المحيا أبيض الوجه ربعة جليل كراديس ازج الحواجب

(آپ کا چہرہ خوبصورت اور مائل بہ سفیدی ہے، آپ کا قد درمیانہ ہے، آپ کے سر کی ہڈیاں بھری ہوئی اور قوی ہیں اور آپ کے ابرو باریک اور دراز ہیں)۔

پانچویں فصل میں مزید دلائل نبوت اور آپ کی بعثت سے قبل کے حالات کا تذکرہ ہے۔ یہ فصل اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

أتانا مقيم الدين من بعد فترة وتحريف أديان وطول مشاغب

(آپ ہمارے پاس گزشتہ پیغمبر کے بعد ایک مدت گذر جانے پر دین قائم کرنے والے کی حیثیت سے تشریف لائے، اس مدت میں مذاہب میں کافی تحریف کی جا چکی تھی اور فتنہ وتباہی کا بازار گرم تھا)۔

چھٹی فصل کے سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اس فصل میں کچھ اور دلائل نبوت کا بیان ہے اور حضور ﷺ کی شریعت میں دعوت فکر ہے، یہ فصل اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

وأقوى دليل عند من تم عقله علی أن شرب الشرع اصفی المشارب

(ایک کامل عقل والے انسان کے نزدیک آپ شرع کے سب سے صاف وپاک ہونے کی دلیل ہیں)۔

تواطي عقول في سلامة فكرة علی كل مايأتي به من مطالب

(عقول سلیمہ کا آپ کی لائی ہوئی شریعت کے تمام امور کی صحت پر متفق ہونا)۔

ساتویں فصل مزید دلائل نبوت کے بیان کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ کے معجزات میں غور وفکر پر مشتمل ہے:

براهين حق او ضحت صدق قوله رواها ويروى كل شب وشائب

(براہین حق نے دعوی نبوت کے بارے میں آپ کے قول کی صداقت کو واضح کر دیا ہے اور یہ ایسے براہین حق ہیں جن کی روایت ہر پیر وجوان نے کی ہے اور کر رہا ہے)۔

آٹھویں فصل آپ کے آل واصحاب کے لئے دعا اور ان کی شجاعت اور نجابت اہل بیت کے تذکرہ پر مشتمل ہے:

اذا ما اثاروا فتنة جاهلية تقود بحر زاخر من كتائب

(جب کبھی وہ لوگ آپ کی دشمنی میں جاہلیت کا فتنہ کھڑا کرتے ہیں اور اس کے لئے بحر زخار جیسا لشکر جمع کرتے ہیں)۔

يقوم لدفع الباس اسرع قومة بجيش من الابطال غر السلاهب

(آپ کافروں کے شر کو دفع کرنے کے لئے تیزی سے بہادر سپاہیوں کے ساتھ جن کے گھوڑوں کی پیشانیاں سفید ہیں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)۔

نویں فصل میں مسلمانوں کے طبقات کا ذکر ہے جنہوں نے مختلف زمانوں میں دین متین کی حفاظت کی ہے اور ان کے لئے دعا کی گئی ہے:

يؤيد دين الله فی کل ذروة عصائب تتلو مثلها من عصائب

(ہر زمانہ میں یکے بعد دیگرے مسلمانوں کی جماعتیں خدا کے دین کی حفاظت کرتی رہی ہیں)۔

دسویں فصل عشق رسول کے بیان اور آپ سے نسبت کے تذکرہ پر مشتمل ہے:

فمن شاء فيذكر جمال بثينة ومن شاء فليغزل يحب الزيانب

(جس کا جی چاہے وہ جمال بثینہ کا تذکرہ کرے اور جس کا جی چاہے وہ زینب کی محبت میں غزل خواں ہو لیکن میں تو اپنے حبیب محمد ﷺ کا تذکرہ کروں گا جب دوسرے عشاق اپنی اپنی محبوباؤں کا ذکر کریں)۔

قصیدہ کی گیارہویں اور آخری فصل میں آنحضرت ﷺ کے اعلی المرسلین اور شافع اور روز محشر ہونے کا ذکر ہے:

اس فصل کا ابتدائی شعر یہ ہے:

وصلى عليك الله يا خير خلقه ويا خير مأمول ويا خير واهب

(اے مخلوق خدا میں سب سے افضل، اے سب سے بہتر جائے امید اور سب سے بہتر عطا کنندہ آپ پر خدا اپنی رحمت بھیجے)۔

مذکورہ بالا مجموعہ میں اس قصیدہ کے علاوہ شاہ صاحب کے تین اور قصائد ہمزیہ، قصیدہ ثانیہ

اور قصیدہ لامیہ بھی شامل ہیں۔ قصیدہ ہمزیہ حضور ﷺ کی مدح میں ہے اور اس کی تقسیم بھی مضمون کے اعتبار سے چھ فصلوں میں کی گئی ہے۔ قصیدہ کی پہلی دو فصلیں تشبیب اور عشق کے بیان میں ہیں اور باقی چار فصلوں میں حضور ﷺ کی تعریف و توصیف ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے یہ قصیدہ شاعر رسول حسان بن ثابتؓ کے ہمزیہ قصیدہ سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ جس کا مطلع ہے:

"عفت ذات الأصابع فالجزاء    الی عذراء منزلها خلاء"

(شام میں ذات الاصابع، الجزاء اور عذرا نامی مقامات مٹ چکے ہیں اور میدان میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ یہ وہ جگہیں ہیں جہاں اسلام سے پہلے حضرت حسان اکثر جایا کرتے تھے اور ملوک غسانہ کی مدح کرتے تھے)۔

شاہ صاحب کے قصیدہ کا مطلع ہے:

اذا اخبرت یوما عن ضیاء    فلا تلهج ببدر أو ذکاء

(اگر تم کسی روز کسی روشنی کی خبر دینا چاہو تو آفتاب یا چودھویں کے چاند یعنی بدر کامل سے تشبیہ مت دو)۔

آنحضرت ﷺ کی شان میں کہے گئے یہ قصائد اپنے اسلوب کی پختگی کے لحاظ سے کسی طرح بھی مشاہیر عرب شعراء کے نعتیہ قصائد سے کمتر نہیں ہیں۔ اگر چہ شاہ صاحب نے ازراہ کسر نفسی اور تواضع انہیں عرب کے فصحاء بلغاء کے قصائد کی ہمسری کرنے کے قابل نہیں سمجھا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شاہ صاحب کے جس دیوان کا اوپر تذکرہ کیا گیا اس کی نسبت شاہ صاحب کی طرف کچھ لوگوں کی نظر میں مشکوک ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ابھی تک اس کی طباعت اور اشاعت کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ لیکن بہر حال جن قصائد کی نسبت یقینی ہے وہ عربی میں آپ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

# شاہ ولی اللہ دہلوی کا اقتصادی نظریہ

پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی ☆

شاہ ولی اللہ کی پیدائش (۱) کو تین سو سال گزر گئے ہیں۔ اس مدت میں دنیا نے کئی انقلاب دیکھے۔ ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا زوال، انگریزی حکومت کا قیام اور اس کے بعد ہندوستان کی آزادی۔ امت مسلمہ کی زوال پذیری برابر جاری ہے۔ شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت وژرف نگاہی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا اس وقت کے معاشرے کا تحلیل وتجزیہ اور اس پر تنقید وتبصرہ آج بھی اتنا ہی درست ہے۔ کیونکہ تاریخ نے گذشتہ زمانہ کے تعلق سے اس کی تائید وتصدیق کی ہے۔ اپنی معرکۃ الآرا تصنیف حجۃ البالغہ میں قوموں کے عروج وزوال کے بارے میں وہ رقم طراز ہیں:

”اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل ترقی جاری رہے تو اس کی صنعت وحرفت اعلیٰ کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر حکمراں جماعت آرام وآسائش اور زینت وتفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنا لے تو اس کا بوجھ قوم کے کاریگر طبقات پر اتنا بڑھ جائے گا کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگا۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔ اس وقت وہ گدھے اور بیلوں کی طرح صرف روٹی کمانے کے لئے کام کریں گے۔ جب انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہوتی ہے تو خدائے تعالیٰ انسانیت

---

(۱) فروری: سن ۱۷۰۳ء۔

☆ سابق صدر شعبۂ فارسی جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی

کو ان سے نجات دلانے کے لئے کوئی راستہ ضرور الہام کرتا ہے یعنی ضروری ہے کہ قدرت الٰہیہ انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے اس ناجائز حکومت کا بوجھ اتار دے"۔

اپنے عہد اور اس کے بعد بھی وہ شاید اکیلے ایسے عالم ہیں جنہوں نے زوال اور انحطاط کے اصل سبب تک پہنچنے اور اس کی نشاندہی کرنے کی جراءت کی ہے۔ بلا کسی مبالغہ کے ان کے علم و عرفان اور مجتہدانہ اقدامات کی بناء پر ان کو امام ابن تیمیہ، ابن قیم، غزالی اور حضرت مجدد الف ثانی کی صف میں رکھا جا سکتا ہے۔ پھر ان کو یہ امتیاز بھی حاصل رہا کہ ان کا خاندان اور ان کے اعقاب کئی پشتوں تک اسلامی علوم اور ترویج شریعت کا کام انجام دیتے رہے۔ قرآن وحدیث کے حوالے سے ہندوستان میں جو خدمات اس خاندان نے انجام دی ہیں دوسرا تو اس سے لگا بھی نہیں کھاتا، مدرسہ رحیمیہ کا قیام تو ہندوستان میں علم الحدیث کے احیاء کا سبب بنا۔ رسم ورواج اور بدعات نے سنت کی جگہ پر قبضہ کر لیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمانہ کی گرد اس کی آب وتاب کو دبا دے گی۔

ایک طرف تو شاہ صاحبؒ نے علم الاخلاق اور علم الاجتماع میں علم الاقتصاد و علم المعیشت کے مقام و درجہ کا تعین کیا ہے۔ قدیم وجدید نظریے اور فلسفے میں دوسرے علوم اور شاخوں سے تو بحث کی گئی ہے لیکن بہت ہی کم فلسفیوں نے اقتصادیات اور معیشت کو قابل اعتناء سمجھا ہے۔ مارکس نے اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں تسلسل سے اپنا نظریہ پیش کیا اور دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ مارکس شاہ صاحب کے بعد عالم وجود میں آیا ہے اور اس نے اپنے اقتصادی نظریہ کو پیش کرتے وقت مذہب کو اپنی اسکیم سے خارج کر دیا بلکہ اپنے نظریہ میں مذہب کو عادلانہ اشتراکی نظام کا دشمن قرار دیا جبکہ شاہ صاحب نے "عدل وانصاف" جیسی خدائی صفت کو اس بحث میں داخل کر کے علم الاقتصاد کو مذہب کا پابند کر دیا ہے۔

شاہ صاحبؒ حجۃ اللہ البالغہ میں "عدالت" کی تعریف اس طرح کرتے ہیں: "عدالت ایک ایسے ملکہ کا نام ہے جس کے ذریعہ سے تدبیر منزل، سیاست مملکت اور اسی قسم کے اجتماعی معاملات کے لئے سہولت اور آسانی کے ساتھ ایک عادل اور پر از خیر نظام قائم ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کا نام ہے جس سے ایسے لطیف افکار عالیہ اور سیاسیات عالیہ پھوٹ نکلتے ہیں

جو اللہ تعالیٰ اور اس کے عالم روحانیت کے نزدیک ٹھیک اور مناسب ہوں"[1]۔ شاہ صاحبؒ برخلاف ان تمام نظریوں کے جن کی اساس علم الاجتماع کو علم الاخلاق کے تابع کرنے پر ہے تاکہ دنیا کو جنت ارضی بنایا جاسکے۔ لیکن شاہ صاحب کا عقیدہ ہے کہ اس نظریہ کو عمل میں لانے کے لئے ایک ایسا اجتماعی اقتصادی نظام وجود میں لانا ضروری ہے جو افراط وتفریط سے پاک ہو اور عدل وانصاف پر مبنی ہو۔ اگر قوموں کے جسم میں فاسد معاشی نظام کا خون رواں دواں رہے گا تو اجتماعی اخلاق وجود میں نہیں آسکتا۔

شاہ صاحبؒ نے اس کی مزید وضاحت اس طرح سے کی ہے، "انسان کی زندگی اجتماعی زندگی کے بغیر ناممکن ہے، لہذا وہ ہمیشہ کسی نہ کسی جماعت کا فرد ہو کر ہی زندہ رہ سکتا ہے اور یہ ہماری قدرت سے باہر ہے کہ ہم کسی ایک فرد کے فضائل سے اس طرح بحث کریں کہ جس جماعت کی جانب وہ منسوب ہے اس سے بالکل قطع نظر کرلیں اس لئے کہ اس کے بغیر ہم یہ کیسے جان سکتے ہیں کہ جس جماعت سے اس کا تعلق ہے اس کے اندر وہ کون سے اوصاف ہیں جن سے فضائل ومحاسن اخلاق میں مدد ملتی یا رکاوٹ پیدا ہوتی ہے"[2]۔

"حقیقت حال یہ ہے کہ انسان نہ صرف کسی ایک بلکہ بہت سے روابط کے ساتھ ناگزیر طور پر مربوط ہے اور اس طرح وہ اپنے کنبہ کا بھی عنصر ہے، شہر وقریہ کا بھی، قوم کا بھی فرد ہے اور پھر تمام انسانی دنیا کا بھی"[3]۔

شاہ صاحب نے "مبحث ارتفاقات" میں خصوصیت سے اس کا تذکرہ کیا ہے اور اجتماعی اخلاق کی برتری انفرادی اخلاق پر تسلیم کی ہے۔ شاہ صاحب نے اجتماعی اخلاق کے لئے صرف ایک ہی فضیلت کو معیار ومیزان قرار دیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"عدالت ہی ایک ایسی اساس ہے کہ جب انسانی اطوار زندگی مثلاً نشست وبرخاست، خواب وبیداری، رفتار وگفتار اور شکل ولباس وغیرہ میں اس کا لحاظ کیا جائے تو اس کو ادب کہتے ہیں اور جب مالی حیثیت یعنی جمع وخرچ کے امور میں اس کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کا نام کفایت ہے

(۱) حجۃ البالغہ ج۲، ص ۶۸، ۶۹۔

(۲) اخلاق وفلسفہ اخلاق ص:۱۱۱۔

(۳) ایضاً ص:۲۲۵۔

اور اگر تدبیر منزل میں اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو وہ آزادی (سول لبرٹی) کہلاتی ہے اور اگر تدبیر مملکت میں اس کو بنیاد بنایا جائے تو اس کو سیاست کہا جاتا ہے اور اگر اس کو باہمی اخوت و محبت اور تعلقات میں اساس بنایا جائے تو اسی ''عدل'' کو حسن معاشرت کا نام دیا جاتا ہے''(۱)۔

تفہیمات میں مسلم سوسائٹی کے ہر گروہ کو مخاطب کر کے ان کے معاشی نقائص ایک ایک کر کے گنوائے ہیں، امیروں کو خطاب کر کے فرمایا ہے:

''اے امیرو! دیکھو! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تا کہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں۔ تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو، اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ کسی اور طرف منعطف نہیں ہوتی''۔

سپاہیوں سے خطاب کر کے فرماتے ہیں:

''تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ جو با آسانی تمہیں اخروی زندگی کے نتائج تک پہنچا دے...... دیکھو اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے کم رکھا کرو، پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں اور مسکینوں کی مدد کیا کرو، اور کچھ اتفاقی مصائب اور ضرورتوں کے لیے پسماندہ بھی کیا کرو''۔

مشائخ اور پیروں کو بھی للکارا ہے:

''ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض لوگوں کو اس لئے مرید کرتے ہیں تا کہ ان سے نکے وصول کریں''۔

غرضیکہ ہر طبقہ کو انہوں نے مخاطب کر کے اس کو ایک باعزت اور متوازن زندگی گزارنے کی تلقین کی ہے تا کہ معاشرہ میں کوئی طبقہ دوسرے گروہ پر بوجھ نہ بن جائے بلکہ ہر فرد کسب معاش کرے۔

''تمہارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو اگر تم ایسا کرو گے تو خدا تمہیں

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ، ص ۲۹، بنقل از الفرقان بریلی ص: ۲۲۹ شاہ ولی اللہ کا ایک خاص نظریہ از مولانا حفظ الرحمٰن۔

معاش کی راہ سجھائے گا جو تمہارے لئے کافی ہوگی"۔

اے اولادِ آدم! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو جس میں وہ آرام کرلے، اتنا پانی جس سے سیراب ہو، اتنا کھانا جس سے بسر ہو جائے، اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے، ایسی بیوی جو اس کے رہن سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو تو یاد رکھو کہ دُنیا کامل طور سے اس شخص کو مل چکی ہے چاہئے اس پر شکر خدا کرے۔

.......بہرحال کوئی نہ کوئی راہ کمائی کی آدمی ضروری اختیار کرے"۔

حجۃ اللہ البالغہ اور مکتوبات میں تفصیل سے ان عوامل کی نشاندہی کی ہے جن سے ملک کی معیشت اور اقتصاد پر برا اثر پڑتا ہے۔

سرکاری خزانہ یا بیت المال پر ناکارہ اور بیکار لوگوں کا بوجھ اور کاشتکاروں، بیوپاریوں اور پیشہ وروں پر بھاری ٹیکس اور اس کی وصولی میں حکومت کی جانب سے سختی، حجۃ میں ان اسباب کے بیان کو اس نکتہ پر ختم کیا ہے "ملک اور سلطنت کی آبادی سستے محصول اور فوج اور عہدیداروں کے بقدرِ ضرورت تقرر پر ہے چاہئے کہ اس زمانہ کے لوگ ہوشیار ہو کر سیاست کے اس راز کو سمجھیں"۔

افسوس! شاہ صاحبؒ کی پیدائش ایک زوال پذیر معاشرہ میں ہوئی جس کی تباہی و بربادی کی طرف انہوں نے بہت پہلے ہی اشارہ کردیا تھا۔ اگر وہ ترقی پذیر یا افراد کی قدر کرنے والے معاشرہ میں پیدا ہوتے تو یقیناً ان کو علمی دنیا میں وہ مقام ملتا جس کے وہ مستحق ہیں۔ ان کی حجۃ اللہ البالغہ کو 'Das Capital' سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوتی۔ نہ معلوم کتنی اکادمیاں ان کے نام پر قائم ہوتیں اور کتنی یونیورسٹیوں اور اعلیٰ درسگاہوں کے مختلف شعبوں میں ان کے افکار کی بنیاد پر تحقیقی کام ہو رہے ہوتے۔ ان کے اقتصادی نظریات کو بنیاد بنا کر تقابلی مطالعات کئے جاتے اور وہ کس طرح سے اشتراکی اور سرمایہ دارانہ سماج کے درمیان میں تعادل و توازن رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں، سرمایہ کے اضافہ میں وہ کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں جس کا ذکر انہوں نے اپنی تحریروں میں تفصیل سے کیا ہے۔ وہ تمام چیزیں جن سے ترقی میں رکاوٹ پڑتی ہے ان سے بھی بحث کی ہے۔ ہمارے مذہبی علما کو مالی امور کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ احساس رہتا تھا کہ شاید یہ صرف دنیاداری پر ہی محمول ہوگا اور عام طور پر لوگ ہمارے بارے میں

اچھی رائے نہیں قائم کریں گے۔ شاہ صاحبؒ علم المعیشت کو علم الاخلاق کے تحت لے آئے اور علم الاخلاق تو مذہب ہی کا ایک گوشہ ہے۔

کاش! ان کا مطالعہ ہر ہر پہلو سے کیا جاتا۔ بہ حیثیت مورخ، عالم مجتہد، دانشور، معلم، مترجم، مصنف، ادیب، شاعر، محدث، ماہر اقتصادیات اور سب سے بڑھ کر نباض ملتِ ہم تو ایک ایسے ناقدرے معاشرے کے افراد ہیں جو کھنڈر پر بیٹھ کر ماتم کناں ہیں لیکن اس سے ناواقف کہ اس کھنڈر میں ایک بہت بڑا خزانہ چھپا ہوا ہے جو ہمارے ہی بزرگ چھوڑ گئے ہیں۔

دلے دارم ز خود خالی، حبابش می تواں گفتن
درو کیفیتے، جوش شرابش می تواں گفتن

(شاہ ولی اللہ دہلوی)

# شاہ صاحبؒ اور ان کی سیاسی بصیرت

پروفیسر ظفر احمد نظامی☆

حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو اسلامی ہند کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اُن کی کثیر الجہات شخصیت نابغۂ روزگار تھی۔ انہیں بیک وقت مجدد اعظم، حکیم الامت، امام علم وفن اور مصلح امت ہونے کا فخر حاصل تھا۔ وہ ایک زبردست عالم دین تھے اور ایک درویش باصفا بھی۔ ایک مفسر تھے اور مفکر بھی۔ معلم تھے اور محدث بھی۔ مصنف تھے اور شاعر بھی۔ ماہر سیاسیات تھے اور نباض معاشیات بھی۔ غرضیکہ وہ نہ صرف دینی علوم کا بحر ذخار تھے بلکہ دنیوی علوم میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ ان کے اجداد نے عرب سے ترک وطن کر کے ہندوستان پہنچ کر رہتک (ہریانہ) میں سکونت اختیار کر لی تھی جو اُس دور میں اسلامی ثقافت کا مرکز تھا۔ وہاں انہوں نے ایک دینی مکتب بھی قائم کیا تھا۔ بادشاہ وقت نے امور افتا کے لئے ان کے جن بزرگ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی ان کا نام شمس الدین مفتی تھا۔

شاہ صاحب کی ولادت مغلیہ سلطنت کے چھٹے وارث محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے چار سال قبل ۱۰ ارفروری ۱۷۰۳ء بروز چہار شنبہ بوقت طلوع آفتاب اپنی ننہال یعنی قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر واقع اترپردیش میں ہوئی۔ ان کے والد شاہ عبدالرحیم نے ان کا نام قطب الدین رکھا اور ولی اللہ کو بھی ان کے نام کا جزو بنا دیا۔ اگرچہ وہ قطب الدین کے نام سے مشہور نہ ہوئے بلکہ ولی اللہ کے نام سے شہرت پائی اور آج تک اسی نام سے مشہور و مقبول ہیں۔

---

☆ صدر شعبہ سیاسیات جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

دیسے ان کا تاریخی نام عظیم الدین تھا۔

شاہ صاحب نے تعلیمی مراحل اپنے والد عبدالرحیم کی نگرانی میں طے کیے۔ والد کی وفات کے بعد بھی وہ تقریباً بارہ برس تک دہلی میں اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس دوران انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے صدیوں بعد بھی علم حدیث نشرواشاعت کا طالب ہے۔ لہٰذا انہوں نے ۱۷۳۰ء میں مکہ مکرمہ پہنچ کر دوبار فریضہ حج کی سعادت حاصل کی اور تقریباً چودہ ماہ تک حرمین شریفین میں قیام پذیر ہوکر مشائخ حرمین سے حدیث کا درس لیا اور بزرگانِ وقت سے کسب فیض کرتے رہے۔

دہلی واپسی کے بعد شاہ صاحب کا بیشتر وقت درس وتدریس میں صرف ہوا ان کی نگرانی میں تحصیل علم کرنے والوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوا کہ محمد شاہ بادشاہ نے شاہجہاں آباد کوچہ فولاد خاں میں واقع ایک وسیع وعریض حویلی شاہ صاحب کے حوالے کردی تاکہ درس وتدریس کے امور میں مزاحمت نہ ہو، اور تشنگان علم شاہ صاحب کے بحار علوم سے سیراب ہوسکیں۔ عمر کا باقی حصہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گزارنے کے بعد شاہ صاحب ۲۰/اگست ۱۷۶۴ء کو بوقت ظہر دہلی میں اپنے خالق حقیقی سے جاملے اور مہندیان میں مدفون ہوئے۔

شاہ صاحب کی ولادت کے چار سال بعد اورنگ زیب نے ۱۷۰۷ء میں وفات پائی اور انہوں نے اورنگ زیب کے بعد یکے بعد دیگرے کئی سلاطین کو سریر آرائے سلطنت ہوتے دیکھا جن میں بہادر شاہ اول معز الدین جہاں دار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، محمد شاہ عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی شامل ہیں، ان سلاطین کے ادوار میں ظہیر الدین محمد بابر کی قائم کردہ عظیم الشان مغلیہ سلطنت بالاقساط رو بہ زوال ہوکر پارہ پارہ ہوتی رہی اور اہل دل خون کے آنسو روتے رہے۔ سادات بارہہ کے عروج، ان کی بادشاہ گری کے کرتبوں، سکھوں، مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں کی بغاوتوں اور نادر شاہ کے سنگ دلانہ حملوں جیسے واقعات وحادثات نے دہلی کی عظمت پارینہ کے حسن کو تاراج کردیا تھا۔ اس کے امن پسند باشندوں کے لئے اپنی عزت وناموس بچانا دشوار ہوگیا۔ ان کے ذہن، عقل سے محروم ہوکر رہ گئے۔ سلطنت مغلیہ کو گہن لگ چکا تھا۔ معاشرہ زوال آمادگی کا شکار تھا اور سیاست انفرادی مفادات کے دائرے میں گھرتی جارہی

تھی، اخلاقی اقدار کو زنگ لگ رہا تھا اور مرکز کی چولیں ہل رہی تھیں۔ شاہانِ وقت عیش و عشرت میں غرق تھے، انہیں نہ سلطنت کی فکر تھی نہ حکومت کا خیال، رعایا کی فلاح سے ان کے دل خالی تھے البتہ اگر فکر تھی تو بس اپنے ناؤ نوش کی۔ چنانچہ امراء نے سازشوں کا جال بچھا کر صوبوں میں خود مختاریاں قائم کرلیں۔ سارا ملک سیاسی نبرد آزمائیوں کا شکار ہوکر رہ گیا اور رعایا کی زندگی سے امن و سکون رخصت ہوگیا۔

فوج کا حال ابتر تھا۔ بددیانتی عام ہوگئی تھی۔ حکم عدولی وقت کا اصول بن گئی تھی بغاوت نے انضباط کی جڑیں کھوکھلی کردی تھیں۔ ایک مضبوط و مستحکم عسکری نظام کی عدم موجودگی نے سلاطین وقت کو دوسروں پر منحصر کر کے خود اعتمادی کے جذبہ سے محروم کردیا تھا۔ آزاد صوبہ داریاں قائم ہوگئی تھیں۔ آمدنی کے ذرائع مفقود ہوگئے تھے اور اقتصادی حالت زوال پذیر تھی۔ سلطنت سمٹ کر "سلطنتِ شاہ عالم، از دلی تا پالم" ہوکر رہ گئی تھی، پروفیسر خلیق احمد نظامی کے الفاظ میں "مرہٹے، سکھ، جاٹ، روہیلے سب میں ملک گیری کی ہوس پیدا ہوگئی تھی۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں باغیانہ قوتیں کام کررہی تھیں۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا اور شاہانِ مغلیہ کا تاج طوفانی موجوں کی آغوش میں کھلونا بنا ہوا تھا[1]۔"

مسلم معاشرہ پر دنیا پرستی غالب آچکی تھی۔ روحانی عظمتیں مادیت کی پستی میں جاسوئی تھیں۔ ان کے اندر نہ عزم باقی تھا نہ ہی حمیت، نہ راست گوئی تھی نہ مذہبی رجحان، مذہبی گمراہی نے ان کے وجود کو منتشر کردیا تھا جس کے سبب کتاب و سنت سے بے اعتنائی امت مسلمہ کا خاصہ بن گئی تھی۔ علماء سو نے دین کو اپنی جاگیر سمجھ کر دنیا داری کو اپنا وطیرہ بنالیا تھا۔ قرآن و حدیث کو طاقوں میں سجا کر علم و عمل کو نذر نسیاں کردیا گیا تھا۔ الحاد و بے دینی کا چلن عام تھا اور مسلمانوں کے سنبھلنے کی کوئی امید باقی نہ تھی۔

شاہ صاحب نے ان حالات کا مشاہدہ کیا اور ہندوستان کے سیاسی عوارض کی تشخیص کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مذہبی معاملات سے بے اعتنائی اور دینی علوم سے بے راہ روی ہی مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب تھی اور سلطنت مغلیہ کے زوال کی اصل وجہ مغل سلاطین کی عیش پسندی، غفلت شعاری اور معاشی بدحالی تھی۔ تاہم کف افسوس ملنے کے بجائے انہوں نے یہ

(۱) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، محمد ظفر احمد نظامی (نئی دہلی: ۲۰۰۱ء) ص: ۷۹۔

اعلان کیا کہ ''مجھے خدا نے شرف بخشا ہے کہ میں اس زمانہ کا مجدد، وصی اور قطب ہوں، اگر خدا نے چاہا تو میری کوششوں سے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہو جائے گی''۔(۱) اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے مجدد ثابت ہوئے۔ انہوں نے اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنایا اور شریعت کے قوانین کی توجیہہ و تفسیر کتاب و سنت کے مطابق کی۔ قوانین کو حضور اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور ان کے اقوال وارشادات کی روشنی میں مرتب کیا اور ایک ایسے قطب وقت ثابت ہوئے کہ جنہوں نے منشائے خداوندی اپنے دور کے حالات وضروریات کے مطابق انسانوں پر منکشف کیا۔ تصنیف و تالیف کے ذریعہ شاہ صاحب نے مسلمانوں پر ان حقائق کا انکشاف کیا جو نہ تو ان پر ظاہر تھے اور نہ جن کا انہیں وقوف ہی تھا۔ اپنی تصانیف سے انہوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ کو جہل کی تاریکیوں سے پاک کر کے نور سے پُر کر دیا۔ انہوں نے فارسی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا تا کہ لوگ اسے اپنی مروجہ زبان میں پڑھ کر کلام الٰہی سے آگاہ ہو کر بدعات اور مشرکانہ معتقدات سے دامن بچانے میں کامیاب ہو سکیں۔ اسی طرح فارسی زبان میں تفسیر کے اصول پیش کئے، حجۃ اللہ البالغہ عربی زبان میں عبادات و معاملات سے متعلق ان کی ایسی تصنیف ہے جسے دنیائے اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ غرضیکہ اپنی بے شمار تصانیف کے ذریعہ شاہ صاحب نے اپنے مشن اور جدوجہد سے کام لے کر مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی سعی کی۔ انہوں نے اپنے دور کی مروجہ بدعات کی جانب لوگوں کو متوجہ کیا اور انہیں اسلام کی اصل روح سے واقف کرایا۔ ان کے نزدیک معاشی توازن کی عدم موجودگی میں معاشرہ انحطاط پذیر ہو گیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے معاشرہ کے اس انحطاط کے لئے سلاطین، امراء، مشائخ، عام پیشہ وروں، فوجیوں، طالب علموں اور عام مسلمانوں، غرضیکہ سماج کے سبھی طبقوں کو ذمہ دار ٹھہرایا اور ان میں سے ہر ایک سے خطاب کر کے انہیں ان کی کمزوریوں سے آگاہ کیا اور پستی سے بلندی تک پہنچنے کے طریقوں سے واقف کرایا۔

شاہانِ سلف سے خطاب کرتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا:

''اے بادشاہو! اس زمانے میں ملاء اعلیٰ کی مرضی اس امر پر مستقر ہو چکی ہے کہ تم تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو جب تک مسلم، شرک سے

(۱) ایضاً، ص: ۱۳۰

بالکلیہ جدا نہ ہو جائے اور اہل کفر وفسق کے سرکش رہنما کمزوروں کے گروہ میں شامل نہ ہو جائیں اور یہ کہ ان کے قابو میں پھر کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جس کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں''۔(۱)

کفر اور اسلام کے مابین فرق کو واضح کر دینے کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا کہ سلاطین کو چاہئے کہ وہ ہر تین یا چار دن کی مسافت پر اپنا ایسا حاکم مقرر کریں جو عدل وانصاف کا مجموعہ ہو، دلیر ہو اور ظالم سے مظلوم کا حق ادا کروا سکتا ہو اور سرکشوں کا سر کچل سکتا ہو۔ تاکہ لوگوں میں بغاوت اور سرکشی کے جذبات نہ ابھر سکیں۔ کسی کو گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی جرأت نہ ہو۔ اسلام کا کھلے بندوں اعلان ہو اور اس کے شعائر کا علانیہ اظہار ممکن ہو۔ ہر شخص اپنے فرائض کی ادائیگی کرے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کا خیال رکھا جائے کہ حاکم خود غرض ہو کر اپنے نفع گیر ہونے پر مائل نہ ہو جائے۔(۲)

شاہ صاحب نے حکمرانوں کو ہدایت کی کہ علاقہ میں ایسے امیر مقرر کیے جائیں جو جنگی مہارت میں بھی حصہ لے سکتے ہوں اور ان کے اختیار میں بارہ ہزار فوج رہے جو ایسے افراد پر مشتمل ہو جن کے دلوں میں جہاد کا ولولہ موجزن ہو اور جو ہر سرکش سے جنگ کی صلاحیت رکھتے ہوں۔(۳)

امراء سے خطاب کرتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا:

''کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ تم دنیا کی فانی لذتوں میں ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو اور جب قوی ہوتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔ تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانے کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم وگداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو، اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف منعطف نہیں ہوتی''۔(۴)

فوجی سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے شاہ صاحب نے فرمایا:

---

(۱) تفہیمات: ص ۱۱۱ (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) ایضاً

اے فوجیو اور عسکریو! تمہیں خدا نے جہاد کے لئے پیدا فرمایا تھا، مقصد یہ تھا کہ اللہ کی بات اونچی ہوگی اور خدا کا کلمہ بلند ہوگا اور شرک اور اس کی جڑوں کو تم دنیا سے نکال پھینکو گے۔ لیکن جس کام کے لئے تم پیدا کئے گئے تھے اسے تم چھوڑ بیٹھے۔ تم شراب پیتے ہو، بھانگ کے پیالے چڑھاتے ہو، داڑھیاں مُنڈواتے ہو اور مونچھیں بڑھاتے ہو، عام لوگوں پر زیادتیاں ظلم کرتے ہو حالانکہ جو کچھ ان کا لے کر کھاتے ہو اس کی قیمت ان تک نہیں پہنچتی''۔(۱)

شاہ صاحب نے انہیں ہدایت کی کہ وہ صالحین اور غازیوں کا لباس زیب تن کریں اور ان کی وضع قطع اختیار کریں۔ پنج وقتہ نمازیں ادا کریں۔ عام لوگوں کے مال سے بچیں، جنگ کے میدان میں ڈٹے رہیں اور نیتوں کو درست کریں۔(۲) اسی طرح عام پیشہ وروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنے رب کی عبادت سے خالی الذہن ہو چکے ہیں۔ اپنے فرضی بنائے ہوئے معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہیں، مدار اور سالار کا حج کرتے ہیں، بعض لوگ فال بازی، ٹوٹکے اور گنڈے وغیرہ کا پیشہ اختیار کرتے ہیں اپنی عورتوں اور بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے۔ ان میں سے بعض شراب خوری کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ عورتوں کو کرایہ پر چلا کر پیٹ بھرتے ہیں، ان خامیوں سے آگاہ کرتے ہوئے شاہ صاحب نے انہیں ہدایت کی وہ اپنی صبحیں اور شامیں خدا کی یاد میں بسر کیا کریں۔ دن کو اپنے پیشہ میں صرف کریں اور راتیں اپنی عورتوں کے ساتھ گزاریں۔ اپنے خرچ کو اپنی آمدنی سے کم رکھیں اور جو رقم بچ جایا کرے اس سے مسافروں اور مسکینوں کی مدد کیا کریں(۳)۔

شاہ صاحب نے مشائخ کی اولاد کی حالت پر اظہار افسوس کیا کہ وہ ٹکڑیوں اور ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ لوگوں کو محض اس لئے مرید کرتے تھے کہ ان سے ٹکے وصول کر سکیں اور ایک شریف علم سیکھ کر دنیا بٹور رہے تھے۔ اسی طرح غلط کار علماء پر ان کی حیثیت واضح کرتے ہوئے انہیں ہدایت کی کہ وہ قرآن سیکھیں، اس کی لغات کو حل کریں، اس کے سبب نزول کا پتہ چلائیں، صحیح احادیث کو محفوظ کریں۔ جو سنت ہے اسے سنت ہی سمجھیں نہ کہ فرض کا درجہ دیں۔ اپنے فرائض پر توجہ دیں۔(۴) انہوں نے طلبہ کو ہدایت کی کہ علم کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو

---

(۱) ایضاً، ص: ۲۱۷ (۲) ایضاً (۳) ایضاً، ص: ۲۱۴ (۴) ایضاً

رواج دیں۔ واعظوں اور زاہدوں کو ہدایت کی کہ وہ مقام احسان کی طرف لوگوں کو بلائیں، اسے خود سیکھیں پھر دوسروں کو دعوت دیں۔ ''کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ سب سے بڑا کرم اللہ کا وہ ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے پہنچایا ہے۔ صرف وہی ہدایت ہے جو آپ ﷺ کی ہدایت ہے''(۱)۔

اسی سلسلہ میں شاہ صاحب نے عام مسلمانوں سے خطاب کر کے ان کے دلوں کو جھنجھوڑا اور انہیں بیدار کرنے کی سعی کی۔ ان کی غیرت کو للکارا اور ان کے قائم کردہ رسوم رواج پر تنقید کی۔ انہیں اوہام پرستی اور شیطانی وسوسوں سے دور رہنے اور ان پر یقین نہ کرنے کی تلقین کی۔ شاہ صاحب نے ان پر واضح کیا کہ ان کے اخلاق سو چکے ہیں۔ وہ بے جا حرص میں مبتلا ہیں، ان پر شیطان نے قابو پالیا ہے۔ مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے حقوق برباد کرنے کے ذمہ دار ہیں، حرام ان سے قریب اور حلال دور ہو چکا ہے لہٰذا انہیں ہدایت کی کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کو نکاح کے ذریعہ پوری کریں۔ حیثیت کے مطابق خرچ کریں اور اسی قدر کمائیں کہ جس سے ان کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ دوسروں پر بوجھ نہ بنیں، بادشاہوں اور حکمرانوں پر بھی بار نہ ہوں۔ صبح، شام اور پچھلی راتوں کے ذکر کا خیال رکھیں، اللہ کی تسبیح، قرآن کی تلاوت اور احادیث اور ذکر کے حلقوں میں شامل ہوں، عاشورہ، شب برأت میں کھیل تماشوں اور تقریبات کی دعوتوں اور بری رسموں سے پرہیز کریں۔ زکوٰۃ ادا کریں، نمازوں کی پابندی کریں روزوں کا اہتمام کریں(۲)۔ علی میاں کے الفاظ میں:

> ''ان خصوصی خطابات میں شاہ صاحب کے دل کا درد، اسلامی محبت کا جوش، دعوت کا جذبہ اور زور قلم اس نقطہ عروج پر ہے جس کی مثال مصلحین و ناقدین اور ان کی کتابوں میں ملنی مشکل ہے''(۳)۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے ان خطابات سے پہلے شاہ صاحب غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مذہبی امور سے بے اعتنائی اور دینی علوم سے لاتعلقی ہی مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب ہے اور سلطنت مغلیہ کے زوال کی وجہ مغل حکمرانوں کی عیش پسندی، غفلت شعاری اور معاشی بدحالی ہے۔ ان کے نزدیک اقتصادی بدحالی کا سبب ملک کی بدانتظامی اور سیاسی افراتفری تھا۔

(۱) ایضاً، ص: ۲۱۷ (۲) ایضاً، ص: ۲۱۸

(۳) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ''تاریخ دعوت و عزیمت'' جلد پنجم ص: ۳۲۳

اسی لئے معاشرہ کے انحطاط کو شاہ صاحب نے ہر طبقہ کی بے راہ روی سے منسوب کیا اور ان پر ان کی کوتاہیوں، خامیوں اور ذمہ داریوں کو واضح کیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے امام غزالیؒ اور علامہ ابن جوزیؒ جیسے شہرہ آفاق علماء و داعیان دین و معلمین اخلاق کے بعد شاہ صاحب کے کارناموں کو سب سے زیادہ روشن اور تابناک بتایا ہے جنہوں نے معاشرے کے مختلف طبقوں سے خطاب کیا اور ان کے امراض و عوارض کو ان پر واضح کیا اور ان کا علاج بتایا(۱)۔ انہوں نے بادشاہوں، وزیروں اور امراء کے نام اعلانات اور ہدایات جاری کرنے کا جرأت مندانہ اقدام کیا جو درج ذیل ہیں(۲)۔

(۱) فتحیابی کے بعد جاٹوں کے علاقوں اور ان کے قلعوں کو فتح کرنے کی جدوجہد کی جائے (۲) خالصہ کو کشادہ کیا جائے (۳) جاگیر عطا کرنا صرف بڑے بڑے امراء کے لئے مخصوص ہو، چھوٹے چھوٹے منصب داروں کو جاگیر نہ دی جائے۔ انہیں نقد رقومات ہی دی جانی چاہئیں (۴) فتنہ و فساد میں ملوث دشمنوں کو جاگیر و منصب سے بے دخل کیا جانا چاہئے (۵) شاہی فوج کی از سرِ نو تربیت کی جانی چاہئے اور صرف انہی افراد کو داروغہ مقرر کیا جائے جو نجیب، بہادر اور شفیق ہوں، اور تہہ دل سے بادشاہ کے خیر خواہ ہوں، فتنہ پردازوں کو معزول کر کے دوسرے لوگوں کو داخل رسالہ کیا جائے۔ ملازموں کی تنخواہیں فوری طور پر ادا کی جائیں تاکہ وہ سودی قرض لینے پر مجبور نہ ہوں، ٹھیکہ کی علت ختم کی جائے، اور دیندار امین مقرر کئے جائیں (۷) قاضی اور محتسب کے عہدوں پر ایسے افراد کو مقرر کیا جائے جو رشوت ستانی میں ملوث نہ رہے ہوں۔ (۸) مسجدوں کے ائمہ کو بہتر تنخواہیں دی جائیں، نماز با جماعت کا اہتمام ہو اور رمضان کی بے حرمتی کی ممانعت کی جائے۔ (۹) بادشاہ اور امراء عیش و عشرت میں مشغول نہ ہوں۔ وہ گزشتہ گناہوں سے توبہ کریں اور آئندہ گناہوں سے بچتے رہیں۔

اس اعلان نامہ یا ہدایت کے آخر میں شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ ''سردست اگر ان کلمات پر عمل کریں تو مجھے امید ہے کہ بقائے سلطنت، تائید غیبی اور نصرت الٰہی میسر ہوگی''(۳)۔ اگر سلاطین وقت اور امراء شاہ صاحب کی ان ہدایات پر عمل پیرا ہوئے ہوتے تو یقیناً ان کا زوال اس قدر جلد نہیں ہوتا لیکن انہوں نے اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا اور اس پر عملی طور سے توجہ نہ دی۔

(۱) ایضاً (۲) خلیق احمد نظامی شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ص: ۸۰،۸۱ (۳) ایضاً

تاہم شاہ صاحب مایوس نہیں ہوئے اور یہی کوشش کرتے رہے کہ سلطنت مغلیہ زوال پذیر نہ ہو۔ انہوں نے مرہٹوں کی دست برد سے شاہان مغلیہ کو آزاد رکھنے کے لئے نجیب الدولہ کو مدد کے لئے راضی کر لیا اور احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے مرتبہ "شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات" میں نجیب الدولہ کے نام سات خطوط شامل ہیں، ان میں شاہ صاحب نے اسے "رئیس المجاہدین" اور "امیر الغزاۃ" کے القاب و خطابات سے یاد کیا ہے اور اس کی ہمت بندھائی ہے۔ انہوں نے اسے لکھا تھا کہ تم جیسے جیسے مرہٹوں اور جاٹوں کے خلاف کمر بستہ ہو گے ویسے ویسے ان کا طلسم پارہ پارہ ہو جائے گا۔ ویسے بھی نجیب الدولہ شاہ صاحب سے مشورے لیتا رہتا تھا اور مشکلات میں انہی سے رجوع کرتا تھا۔ جب صفدر جنگ نے جاٹوں سے ساز باز کر لی تو نجیب الدولہ نے شاہ صاحب کو اس کی اطلاع دی۔ شاہ صاحب نے جواب میں لکھا کہ "جاٹوں کی شکست عالم بالا میں طے ہو چکی ہے، تمہیں بالکل گھبرانا نہ چاہئے، اگر مسلمانوں کی ایک جماعت ان کے ساتھ شریک ہو گئی ہے تو ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں"(۱)۔

اسی طرح شاہ صاحب نے مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کے لئے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اس نے ۱۷۵۹ء میں پنجاب پر تسلط کر لیا اور دہلی کا ارادہ کیا۔ ۱۷۶۰ء میں پانی پت کے میدان میں ڈھائی مہینے تک مرہٹوں سے مقابلہ کرتا رہا۔ انجام کار جنوری ۱۷۶۱ء میں انہیں شکست دینے میں کامیاب رہا۔ لیکن شاہان مغلیہ نے احمد شاہ ابدالی کی اس فتح سے فائدہ نہیں اٹھایا اور شاہ عالم ثانی بہار سے اس سے ملاقات کرنے تک نہ آیا۔ شاہ عالم کو اس وجہ سے بلایا جا رہا تھا کہ وہ انگریزوں کے اثر سے آزاد ہو سکے اور دہلی آ کر اپنے اقتدار کی از سر نو تنظیم کر کے اسے مستحکم کر سکے۔

نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی کی دعوت کے پس پشت شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت کارفرما تھی لیکن شاہان وقت نے اس موقع کو بھی رائگاں جانے دیا۔ اس سلسلے میں پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی رقم طراز ہیں کہ:

> "مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کی کسی تحریک میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی مرکزیت و وحدت کو برقرار رکھنے کی تدبیر سوچتے۔ شاہ صاحب اپنے

---

(۱) ایضاً۔

مجوزہ نظام میں اکبر، جہان گیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدار اعلیٰ کو بحال دیکھنا چاہتے تھے لیکن اس طرح مطلق العنان بادشاہوں کے بجائے انصاف کی حکومت قائم ہو''(۱)۔

اس سلسلے میں مولانا محمد سرور رقم طراز ہیں:

''شاہ صاحب نے خوب سمجھ لیا تھا کہ شہنشاہیت کا دور ختم ہو گیا اب اگر کوئی حکومت بنے گی تو اس کی اساس کوئی اور ہو گا''(۲)۔

غرضیکہ شاہ صاحب نے مسلمانوں کے مختلف علمی و فقہی طبقوں کے خیالات میں مطابقت کے پہلو نمایاں کیے اور ان کے درمیان صلح و آشتی کے جذبات بیدار کرنے کی سعی کی اور اعتدال پسندی کا راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے تعلیمی نصاب کے پرانے ڈھانچے میں اصلاحات کیں اور اس کے مناسب ترجمے کا اہتمام کیا۔ معاشرے کے مختلف طبقات سے خطاب کیا اور ان کی غلط روی کے خوفناک نتائج سے باخبر کیا۔ کتاب و سنت کی روشنی میں ان کے اقتصادی مسائل کے حل سے واقف کرایا۔ ان پر حکمرانی کے صحیح احوال واضح کیے اور حاکم و محکوم کے درمیان خوشگوار تعلقات استوار کرنے کی پہل کی۔ تدریس و دعوت کے ذریعہ مسلمانوں میں دینی جذبہ بیدار کیا۔ یہی سبب ہے کہ برصغیر میں آج جتنے سلسلے جاری ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق شاہ صاحب کی ذات بابرکات سے ہے۔ انہوں نے قرآن پاک کا فارسی زبان میں ترجمہ کر کے بڑا شاندار کارنامہ انجام دیا۔ جو تبلیغ دین کا سبب بنا۔ علمی، تصنیفی اور تدریسی کاموں کے ساتھ ساتھ زبوں حالی کے اس پرآشوب دور میں سیاسی مفکر اور مدبر کی حیثیت سے انہوں نے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے احمد شاہ ابدالی تک کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ ان واقعات سے اس حیثیت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نہ صرف سیاسی مفکر تھے بلکہ عملی انسان بھی تھے۔ یہی وجوہات ہیں کہ انہوں نے مغلیہ سلطنت کو زوال آمادگی سے بچانے کی عملی کوششیں کیں۔ اس سلسلے میں ''القول الجلی'' کے مطالعہ سے ان کی سیاسی بشارتوں کی تہیں کھل جائیں گی جو تاریخی حقائق پر مبنی ہیں۔

شاہ صاحب نے جس تحریک کا آغاز کیا وہ محض ایک خطہ یا علاقہ تک محدود نہ تھی وہ پورے

---

(۱) ایضاً۔ (۲) ایضاً۔

ہندوستان کو محیط تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صرف مسلمانوں کو ہی کیوں مخاطب کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس عہد میں ہندوستان کی باگ ڈور مسلمانون کے ہاتھ میں تھی اسی لئے انہیں مسلمانوں ہی سے خطاب کرنا پڑا۔ دراصل ان کی دعوت کے اصول پوری انسانیت کا احاطہ کرتے تھے۔ اسی لئے ان کی تحریک میں ہمہ گیر تھی۔ یہ شاہ صاحب کی ذات بابرکات ہی کا فیضان ہے کہ برصغیر میں اسلام کو اس کی اصل شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اور ایشیا کے اس خطہ میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور جیسی عظیم الشان درس گاہیں اپنی قربانیوں سے قلوب کو منور کر رہی ہیں اور بغیر کسی سرکاری اعانت کے امت مسلمہ کی مدد سے جاری و ساری ہیں۔

# شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ

حکیم ظل الرحمٰن ☆

بڑی مدت میں خالق بھیجتا ہے ایسا فرزانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستور میخانہ

شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ پر مجھ جیسے ناچیز کم علم آدمی کا جس کا حال یہ ہو کہ تخیل میرا ناقص ناکمل ہے زباں میری، قلم اٹھانا میرے لئے تو دشواریوں کا باعث ہے ہی مگر یہ خوف بھی غالب ہے کہ میری یہ تحریر کہیں آپ حضرات کے لئے تضیع اوقات کا موجب نہ بن جائے۔ مگر مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب جیسے اکابر کے حکم کی نافرمانی بھی ممکن نہیں ہے۔ بدیں وجہ یہ تحریر آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

## ۱۔ شاہ صاحب کا دور اور مملکت ہندوستان!

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت افراتفری کا شکار ہو چکی تھی، مراٹھے مرکزی حکومت کی کمزوری اور امراء کی طالع آزمائی کے نتیجہ میں ایک ملک گیر طاقت بن گئے تھے اور دہلی کی سلطنت پر قبضہ کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ہولکر اور رگھوناتھ نے مل کر جاٹوں کی مدد سے ۱۷۵۷ء میں دہلی پر حملہ کیا۔ سندھیا نے پورے ہندوستان پر قابض ہونے کا بیڑا اٹھایا۔ اور روہیل کھنڈ کے چند علاقوں کو پامال کرنا شروع کر دیا۔ ۱۷۶۰ء میں مرہٹوں نے دہلی میں داخل ہونا

☆ رکن اسلامی فقہ اکیڈمی ہند، مفتی دارالعلوم مئو

شروع کیا اور لال قلعہ پر قبضہ کر کے شاہ عالم کے بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا۔

اس دور میں شاہ ولی اللہؒ نے غیر معمولی عزم اور حوصلہ سے کام لیا۔ ان کی کوششوں سے احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان کا رخ کیا اور ۱۷۶۱ء میں پانی پت کا وہ معرکہ پیش آیا جس نے مراٹھوں کی قوت کو پاش پاش کر دیا اور بقول شیخ محمد اکرام مصنف آب کوثر، ہندوستان میں عدل اور انصاف کی جو کوششیں ہو رہی تھیں شاہ صاحب نے ان کو تقویت پہنچائی، جناب مولانا مودودی صاحبؒ کے الفاظ ہیں:

"شاہ صاحب کی ہمہ جہت تجدیدی کاوشوں کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ فرخ سیر محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے دور انتشار میں ان نظریات اور ذہن کا آدمی کیسے پیدا ہو گیا؟ اس تاریک زمانہ میں نشو ونما پا کر اگر ایسا انسان مفکر و مبصر منظر عام پر آتا ہے جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے۔ تقلیدی علم اور صدیوں کے جمے ہوئے تعصبات کے بند توڑ کر ہر مسئلہ زندگی پر محققانہ اور مجتہدانہ نظر ڈالتا ہے اور ایسا لٹریچر چھوڑ جاتا ہے جس کی زبان، انداز بیان، خیالات، نظریات کسی چیز پر بھی موجود ماحول کا کوئی اثر نہیں دکھائی دیتا۔ بلاشبہ وہ مغلوں کے زوال کی آندھیوں کو نہ روک سکے لیکن شاہ صاحب کی کوششوں سے سیلاب کے اس زور میں بھی مساجد، مدرسے اور خانقاہیں سلامت رہ گئے اور دینی انحطاط سے محفوظ رہے یہ بھی انکا بہت بڑا کارنامہ ہے"۔

## ۲- خاندان!

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا اصلی نام احمد بن عبدالرحیم تھا۔ والد نے عرفیت ولی اللہ رکھی اور پورے ہندوستان میں اسم با مسمی ہو کر شاہ ولی اللہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ شاہ صاحب ۴ر شوال المکرم ۱۱۱۴ھ مطابق ۲۱ر فروری ۱۷۰۳ء بروز بدھ اپنی ننھیال قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر یوپی میں پیدا ہوئے اور ۹ محرم الحرام ۱۱۷۶ھ مطابق ۲۱ر اگست ۱۷۶۲ء بروز شنبہ بوقت ظہر بعمر ۶۱ سال اس دار فانی سے دار البقاء تشریف لے گئے اور اپنے خالق حقیقی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

شاہ صاحب کی والدہ شیخ محمد صاحب پھلتی کی صاحبزادی فخر النساء تھیں جو شرعی علوم اور

آداب شریعت وطریقت سے آراستہ وپیراستہ تھیں۔ والد کی وفات کے بعد بھی شاہ صاحب اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ واقع مہندیان دہلی میں بارہ سال تک درس وتدریس میں مشغول رہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ والد صاحب زندگی کے اصول کے لئے درج ذیل شعر شاہ صاحب کو سنایا کرتے تھے:

آرائش دوگیتی تفسیر این دوحرف است — با دوستان تلطف بادشمناں مدارات

"زندگی کی راحت دو باتوں میں پوشیدہ ہے ایک یہ کہ دوستوں کے ساتھ لطف وکرم کا برتاؤ کیا جائے اور دوسرے دشمنوں کے ساتھ خاطر ومدارات کا سلوک اختیار کیا جائے۔"

شاہ صاحب کی شادی ۱۴ سال کی عمر میں ان کے ماموں عبیداللہ صاحب پھلتی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ شاہ صاحب کی یہ اہلیہ جب وفات پاگئیں تو آپ نے سید ثناء اللہ صاحب پانی پتی کی صاحبزادی ارادت بی بی سے نکاح فرمایا۔ شاہ صاحب کے والد اپنے وقت کے عالم، بزرگ اور صاحب طریقت شخصیت تھے۔ فتاوی ہندیہ کی تدوین ان ہی کی مرہون منت ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب الابداد فی ماثر الاجداد میں تحریر فرمایا ہے کہ ان کا نسب جناب حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ دوم سے ملتا ہے۔

## ۳۔ شاہ صاحب کا مشن!

شاہ صاحب نے اپنے مشن کی خود تفصیل بیان فرمائی ہے جو بحوالہ انفاس العارفین ص ۴۰۷، درج ذیل ہے:

"خاکسار پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے مجھے خلعت فاتحیہ (تجدید دین کا منصب) سے نوازا اور اس آخری دور کا آغاز میرے ہاتھوں سے کرایا اور مجھے اس طرف رہنمائی کی گئی کہ فقہ میں پسندیدہ مسالک کو یکجا کر کے فقہ حدیث کی نئے سرے سے بنیاد رکھوں اور مجھے کمالات اربعہ ابداع خلق، تدبیر اور ترقی جو اس کائنات کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور انسانی نفوس کی استعداد اور ان کے کمال اور انجام کو جاننے کا علم عطا کیا گیا ہے اور یہ دونوں علوم اس قدر اہم ہیں کہ اس فقیر سے پہلے موجودہ دور میں کوئی انسان ان کی گرد تک نہیں پہنچا ہے۔

اس دور میں وہ حکمت عملی (شرعی تدبیر) جس کے ذریعہ امت کی اصلاح کی جاسکتی ہے مجھے پوری طرح ودیعت کی گئی ہے۔ اگر میرا ہر بال زبان بن جائے تو بھی کما حقہ اس کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

شاہ صاحب کے افکار فقہ و تصوف کے مسائل میں جو اعتدال اور تطبیق کا جوہر ملتا ہے وہ اگرچہ ان کو اپنے والد سے بھی ورثہ میں ملا تھا لیکن اصل میں ان کے استاد حرمین شریفین شیخ ابو طاہر مدنی صاحب کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا۔ اس ضمن میں ایک اور اہم بات بھی درجہ اصل رکھتی ہے۔ جو شاہ صاحب نے فیوض الحرمین میں تحریر فرمائی ہے وہ دربار نبوت کی بشارت ہے جو درج ذیل ہے:

"خدا تعالیٰ کا ارادہ ہو چکا ہے کہ تمہارے ذریعہ امت مرحومہ کی ایک خاص شیرازہ بندی ہو اور اس میں اجتماعیت پیدا ہو"۔

## ۴۔ شاہ صاحب کے علمی کارنامے!

شاہ صاحب نے سب سے پہلے اس تصور کی تردید کی کہ "قرآن کریم خدا کا کلام ہے اس لئے اسے سمجھنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔" اور بتایا کہ قرآن کریم امت کے عقاید اور اعمال کی اصلاح کا واحد اور موثر ترین ذریعہ ہے اور خود قرآن کریم اس کو سمجھنے اور عمل کرنے کی ہدایت دیتا ہے لہذا اسے عوامی زبانوں میں ترجمہ کر کے عام لوگوں تک اس کا پیغام پہنچانا ہی اصل دین کی خدمت ہے اور آپ نے قرآن کریم کا فارسی زبان میں جو اس وقت سرکاری زبان تھی اور اہل علم کی اکثریت اس سے واقف تھی ترجمہ فرمایا اور اس کا نام فتح الرحمٰن رکھا۔ اس پر مختصر تفسیری حواشی تحریر فرمائے۔ ترجمہ کا آغاز ۱۰ ذی الحجہ ۱۱۵۰ھ کو حرمین میں ہوا اور تکمیل کا سنہ ۱۱۵۵ھ ہے۔

اس کے علاوہ شاہ صاحب کی تصانیف سو سے زائد بتائی جاتی ہیں لیکن مصنف حیات ولی اللہ نے یہ تعداد ۵۱ تحریر کی ہے اور مولانا علی میاں ندوی صاحب نے ۵۳ تحریر فرمائی ہے۔ تعداد ۵۳ کی تفصیل حضرت مولانا حکیم محمد اسلام صاحب انصاری میرٹھی نے اپنی کتاب "ملت اسلام کی محسن شخصیات" میں مفصل تحریر فرمائی ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ شاہ صاحب کی سب سے اہم تصنیف ہے ہندوستان میں مسلمانوں کا سواد

اعظم مسلک حنفی پر ہے اس لئے یہاں کے فکر و تمدن کو ملحوظ رکھتے ہوئے ائمہ فقہ کی تقلید کا درس دیا
چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں: ص ۳۲۵۔

"ساری امت یا امت کا معتد بہ حصہ ان چاروں مدون مذاہب حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی پر متفق ہو چکا ہے کہ آج ہمارے زمانے میں ان کی تقلید جائز ہے اور اس میں کئی مصلحتیں ہیں جو مخفی نہیں ہیں خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ ہمتیں پست ہو چکی ہیں اور لوگوں کے دلوں میں خواہشات نے گھر کر لیا ہے اور ہر آدمی اپنی رائے پر فخر کر رہا ہے"۔

۵- حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب نے دین فہمی کے کچھ اصول بیان فرمائے ہیں!

(۱) جب قرآن کریم میں کوئی حکم صراحتاً موجود ہو تو محدثین کے نزدیک کسی دوسری چیز کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) اگر قرآن کریم میں گنجائش ہو تاویل کی اور مختلف مطالب کا احتمال ہو تو سنت کا فیصلہ نافذ ہوگا اور قرآن کریم کا وہی مفہوم درست سمجھا جائے گا جس کی تائید سنت سے ہوتی ہو۔

(۳) اگر قرآن کریم کسی حکم کے متعلق بالکل ہی خاموش ہو تو عمل سنت پر ہوگا وہ سنت فقہاء میں متعارف ہو اور معلوم ہو یا کسی شہر کے ساتھ مخصوص یا کوئی خاص خاندان اسے روایت کرے۔ کسی نے اس پر عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو محدثین اسے قابل اعتماد سمجھیں گے۔

(۴) جب کسی مسئلے پر صحیح حدیث مل جائے تو کسی امام یا مجتہد کی ایسی رائے کی پرواہ نہ کی جائے، نہ کوئی اور اثر قبول کیا جائے جو اس حدیث کے خلاف ہو۔

(۵) جب پوری کوشش کے باوجود کوئی حدیث نہ ملے تو صحابہ و تابعین کرام کے ارشادات پر عمل ہوگا اور اس میں کسی قوم یا شہر کی قید کی تخصیص نہیں ہوگی۔

(۶) اگر کسی مسئلے پر جمہور فقہاء اور خلفاء متفق ہوں تو اسے کافی سمجھا جائے گا۔

(۷) اگر فقہا میں اختلاف ہو تو زیادہ متقی کی اور ضابطے کے مطابق جو حدیث صحیح ہو اور جو روایت زیادہ مشہور ہو اسے قبول کیا جائے گا۔

(۸) اگر علم و فضل ورع، تقوی، حفظ و ضبط میں سب برابر ہوں تو اس مسئلے میں متعدد اقوال تصور ہوں گے جس پر جی چاہے عمل کرے اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور نہ اس میں

کوئی تنگی پیدا کی جائے۔

(۹) اگر ۸ میں تسکین بخش کامیابی نہ ہو تو قرآن وسنت کے عمومات، اقتضاء اور ارشادات پر غور کیا جائے گا اور مسئلہ زیر بحث کے نظائر کے حکم کو دیکھا جائے گا اور حکم کا استخراج کیا جائے گا۔ اصول فقہ کے مروجہ اصول وقواعد پر اعتماد نہ کیا جائے گا بلکہ طمانیت قلب اور ضمیر کے سکون پر اعتماد کیا جائے گا جس طرح متواتر روایات میں اصل چیز راویوں کی کثرت نہیں ہے بلکہ اصل سے دل کا اطمینان وسکون ہے۔

یہ نو اصول پہلے بزرگوں (صحابہ وتابعین) کے طریقہ کار سے ماخوذ ہیں۔

(حجۃ اللہ البالغۃ: ص/۱۱۵)

۶-شاہ صاحب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ موجودہ مسالک ائمہ اربعہ کو عوام الناس کے لئے مسلک اور علماء کرام کے لئے مکاتب فکر قرار دیتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں کہ کسی مسئلہ پر فتوی دیتے وقت چاروں ائمہ کی آراء پر نظر رکھنی چاہئے اور جس مکتب فکر کی رائے میں امت کی سہولت ہو اسی پر فتوی دینا چاہئے، کیونکہ اسلام آسانیوں کا مذہب ہے وہ واضح طور پر اعلان کرتا ہے: "لا یکلف اللّٰہ نفساً الا وسعھا" خود خلیفہ وقت نے جب امام مالکؒ کے مسلک کو پوری سلطنت پر لازم کرنا چاہا تو امام مالکؒ نے منع فرمایا کہ سلطنت کے مختلف حصوں میں صحابہ کرام کی بیان کردہ احادیث لوگوں کے علم میں ہیں اور یہ ممکن ہے کہ ان میں سے بہت سی احادیث میرے علم میں نہ ہوں لہذا وہاں پر انہی احادیث کی روشنی میں فتوی دیا جائے گا میری رائے ضروری نہیں ہوگی۔

شاہ صاحب نے اپنے شاگردوں کو جو وصیت فرمائی ہے وہ ان کے دینی نظریات کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔

فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد وعمل میں کتاب وسنت کے ساتھ تمسک کرے اور ان دونوں کو اپنا مشغلہ بنائے اور ہر دو میں سے کچھ حصہ روزانہ پڑھے۔ اگر نہ پڑھ سکے تو چند اوراق کے ترجمہ سنے اور عقاید میں اسلاف اہل سنت کی روش اختیار کرے اور ائمہ سلف نے جن موشگافیوں کو نہ کیا ہو ان سے بچا جائے اور خام کار معقولات کی شک آفرینیوں سے بچے اور فروعی

مسائل میں ان علماء و محدثین کا اتباع کرے جو حدیث اور فقہ دونوں سے بہت جامع طور پر واقف ہوں اور فقہی مسائل میں ہمیشہ ان محدثین کا اتباع کرے جو کتاب و سنت کے مطابق پیش کرتے ہوں۔ امت کو اپنے اجتہاد کو کتاب و سنت پر پیش کرنے سے کبھی استغناء نہیں کرنا چاہئے اور ضدی قسم کے فقیہ حضرات کی کہ کتاب و سنت سے اعراض جن کا شیوہ ہے بات نہیں سننی چاہئے اور ان سے دور رہنے میں خدا کا قرب تلاش کرنا چاہئے۔

بظاہر شاہ صاحب فقہ حنفی سے مانوس ہیں اگرچہ ان کا خاندانی مسلک فقہ عراقی ہے لیکن شاہ صاحب جمود اور توفیقی فقہ سے بیزار ہیں اس لئے فقہی نظام سے کبھی کبھی اختلاف بھی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ''میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ امت کا کسی ایسے آدمی کے متعلق جو غلطی بھی کرتا ہو اور صحیح بھی کہتا ہو یہ عقیدہ رکھنا کہ اس کی اطاعت ضروری ہے اور جسے وہ واجب کہے اسے واجب سمجھنا چاہئے یہ قطعاً کفر ہے کیونکہ اس شخص سے مدتوں پہلے سے یہ موجود ہے۔ علماء نے اسے حفظ اور ضبط کیا ہے اور رواۃ نے اسے بیان کیا ہے۔ فقہاء نے اس کے مطابق فیصلے فرمائے ہیں۔ لوگوں نے علماء کی تقلید کو صرف اس لئے متفقہ طور پر قبول کیا کہ وہ درحقیقت شریعت آنحضرت ﷺ سے راوی ہیں اور علم ان کا مشغلہ ہے اور وہ ہم سے زیادہ جانتے ہیں لیکن اگر حدیث صحیح ہو، محدثین اس کی صحت کے شاہد ہوں، عامۃ المسلمین نے اس پر عمل کیا، معاملہ واضح ہو چکا ہو پھر اس پر صرف اس لئے عمل نہ کیا جائے کہ امام یا متبوع نے اس کے مطابق فتوی نہیں دیا، بڑی گمراہی ہے۔

شاہ صاحب کی تجویز یہ ہے کہ اس فقہی جمود کو توڑنے کے لئے مختلف مسالک کو باہم آمیز کیا جائے تفہیمات ص: ۲۱۲، ج: ا میں فرماتے ہیں:

''ملاء اعلیٰ کی طرف سے میرے دل میں یہ ڈالا گیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعی دونوں ائمہ کے مذاہب امت میں مشہور ہیں اور کثرت اتباع اور کثرت تصنیف کے اعتبار سے مشہور ہیں اور جمہور فقہاء اور محدث و مفسر اور متکلم اور صوفی شافعی مذہب کے پابند تھے اور اکثر بادشاہ اور یونان کے رہنے والے حنفی مسلک کے پابند تھے اور ملاء اعلیٰ کی نظر میں حق اور صحیح یہ ہے کہ دونوں مذاہب کی جزئیات کو کتب حدیث پر پیش کیا جائے اور معلوم رہے کہ دونوں مذاہب کے اہل علم

نے فن حدیث میں تصنیفات کی ہیں جو مسائل احادیث کے موافق ہوں قبول کیے جائیں اور جن کی اصل حدیث نہیں ہے انہیں کلیتاً ساقط کر دیا جائے اور نقد و نظر کے بعد جن مسائل میں اتفاق پیدا ہو جائے اسے دانتوں سے تھام لیا جائے۔ اگر اختلاف ہو تو انہیں دو قول تصور کر لیا جائے اور دونوں پر عمل صحیح سمجھا جائے۔ یہ اختلاف قراءت قرآن کی طرح سمجھا جائے یا رخصت و عزیمت پر محمول کیا جائے یا تنگی سے نکلنے کی دو راہیں اختیار کر لی جائیں یا دونوں کو مباح تصور کر لیا جائے اس سے آگے نہیں جانا چاہیے''۔

شاہ صاحب نے ہندوستان میں حنفیت کی اکثریت دیکھی اور حجاز میں ان کو شوافع کی کثرت نظر آئی۔ اگر شاہ صاحب نجد میں اور سوڈان میں حنبلیت اور مالکیت بھی ملاحظہ فرما لیتے تو ان ہی وجوہ کی بنا پر ان کو بھی ساتھ ملا لیتے اور ان کے ساتھ بھی اتحاد کو ضروری سمجھتے۔ اگر ان مسالک میں اتحاد دین کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے تو مذاہب اربعہ میں اتحاد اور آرزو اس تقاضہ کو پورا کرے گی اور شاہ صاحب ان مصالح کو اسلام کی روح تصور فرماتے ہیں جس کے لئے وہ بے حد فکر مند ہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ ہمیں دو چیزوں میں فرق کرنا ہوگا ایک مسلک حنفیہ اور دوسری کٹر حنفیت خود علماء احناف حالات اور معاملات کی سہولتوں کے پیش نظر ائمہ اربعہ کے مسالک پر فتوی دیتے رہے ہیں جناب مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلویؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مسلک مالکیہ پر فتاوی موجود ہیں۔

۷- علماء احناف کا یہ عقیدہ ہے کہ:

امام مالکؒ، امام احمد ابن حنبلؒ، امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی تمام آرا برحق ہیں اور ان حضرات نے دین اور مذہب کی تشریح قرآن و حدیث کی بنیادوں اور آثار صحابہ کی بنیادوں پر کی ہے۔ اختلافات کی بنیاد اسباب حدیث کی ترجیحات ہیں۔ مثلاً امام مالکؒ اہل بیت کی روایت شدہ احادیث کو ترجیح دیتے ہیں۔ امام شافعیؒ اہل مدینہ کی بیان کردہ احادیث کو ترجیح دیتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ ضعیف حدیث کو بھی یہ کہہ کر قبول فرما لیتے ہیں کہ یہ روایت ہی کے اعتبار سے تو ضعیف ہے مضمون کے اعتبار سے نہیں۔ لہٰذا نہ ہونے سے تو ہونا بہتر ہے۔ امام ابوحنیفہؒ

احادیث کو قبول کرنے سے پہلے قرآن واحادیث اور آثار صحابہ کی درایت پر پرکھتے ہیں اور پورا اترنے پر ہی قبول کرتے ہیں۔

آج کے علماء کرام کے اختلافات میں شدت کی وجہ پر مجھے مولانا قاری محمد طیب صاحب کے صاحبزادے جناب مولانا محمد سالم قاسمی صاحب کی ایک بات یاد آرہی ہے۔

اسلام چار حصوں پر مشتمل ہے: ۱۔ دین ۔۲۔ مذہب یا شریعت ۔۳۔ مسلک ۔۴۔ مشرب۔ ہم نے چاروں کو دین بنالیا ہے اور اس کی بنیادوں پر باہم دست وگریباں ہیں۔

شاہ صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ ان کے عہد میں مسلم اقتدار کے زوال کا ایک بڑا سبب شیعہ سنی آویزش اور تورانی وایرانی امراء کی باہمی کشمکش تھی۔ یہ باہمی مخاصمت اس قدر شدید تھی کہ مغلیہ سلطنت کے ختم ہوجانے کی بھی ان کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ شاہ ولی اللہؒ نے ان کے درمیان اختلاف دور کرانے کی کوشش کی۔ انہوں نے ازالۃ الخفاء میں خلافت کے مسئلے پر مصالحانہ انداز سے بحث کی اور ابتدائی تین خلفاء کے متعلق شیعوں کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں بہت سے سنیوں کا خیال تھا کہ شیعہ مسلمان نہیں ہیں۔ شاہ صاحب نے بڑی جرأت کے ساتھ اس قسم کے خیالات کے خلاف آواز بلند کی اور صاف صاف اعلان کیا کہ شیعہ مسلمان ہیں۔ شاہ صاحب کی ان کاوشوں کا حیات بخش ثمر یہ حاصل ہوا کہ برعظیم ہندوستان کے مختلف اسلامی فرقوں میں مفاہمت ورواداری کی فضا قائم ہوئی اور وحدت ملت کی ایک بنیاد رکھنے میں وہ کامیاب ہوئے۔

## شاہ صاحب کا طرز تحریر:

شاہ صاحب کے طرز تحریر کے بارے میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ فرماتے ہیں:

''شاہ صاحب پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر جوامع کلم النبی ﷺ کے طرز گفتگو کی پیروی کی ہے۔ حتی الوسع وہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا کا اظہار ان ہی لغات اور ان ہی محاورات سے کریں جو لسان نبوت اور زبان رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں''۔

سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں:

"شاہ صاحب کی تحریر سے معلوم ہوگا کہ فضل وعلم کا ایک دریا ہے جو کسی شوروغل کے بغیر سکون اور آرام سے بہ رہا ہے اور خس وخاشاک کی گندگی سے پاک وصاف ہے"۔

جناب مولانا علی میاں صاحب فرماتے ہیں:

"شاہ ولی اللہ صاحب پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جن کی عربی تصانیف میں اہل زبان کی سی روانی وقدرت اور اہل عرب کی سی عربیت ہے"۔

## منظوم کلام:

شاہ صاحب عربی وفارسی میں نظم کہتے تھے۔ عربی نظم اطیب النغم کے نام سے نبی کریم ﷺ کی مدح ولغت میں ایک بسیط قصیدہ ہے۔ اس کے علاوہ مزید تین اور قصیدے ہیں۔ آپ کا عربی دیوان بھی ہے جس کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جمع کیا ہے اور شاہ رفیع الدین صاحب نے مرتب کیا ہے۔ فارسی میں بھی آپ کی چند غزلیں اور رباعیاں ہیں جو کلمات طیبات اور حیات ولی میں موجود ہیں۔ فارسی میں آپ امین تخلص فرماتے ہیں۔ (شرح حجۃ اللہ البالغہ ص:۴۵)

جناب مولانا سعید احمد پالن پوری شارح حجۃ اللہ البالغہ فرماتے ہیں:

"آپ کی تحریروں میں تحقیقی اور علمی نکات کے ساتھ ساتھ سوز واخلاص اور خیرخواہی کے جوہر پائے جاتے ہیں جس کے باعث وہ تحقیقی تصانیف ہونے کے ساتھ ایک دینی مصلح کا پیغام اور اخلاقی معلم کا درس بن گئی ہیں۔ آپ کی تصانیف نہایت پرفتن وپرآشوب زمانہ کی ہیں لیکن اکثر وبیشتر تصانیف میں اس کی کہیں جھلک نظر نہیں آتی۔ نہایت توازن واعتدال کے ساتھ قلم کورواں رکھا ہے اور مرکزی نقطہ خیال سے تجاوز نہیں فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ آپ ایک نئے اسلوب کے بانی ہیں اور جداگانہ طرز کے بانی وموجد ہیں جو جامعیت، زور بیان، تحکم واعتماد اور فصاحت وبلاغت میں نبی کریم ﷺ کے طرز تکلم سے مشابہ ہے۔ نیز باوجود عجمی نژاد اور ہندوستانی ہونے کے آپ نے عربی فصاحت وبلاغت کا ایسا بے نظیر نمونہ پیش کیا ہے جس کی عظمت کے اہل زبان بھی معترف ہیں۔ مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری استاد دارالعلوم دیوبند کے حجۃ اللہ البالغہ کی بسیط شرح ۵؍جلدوں میں تصیف فرمائی ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔

شاہ صاحب کے سیاسی نقطہ فکر کا اندازہ ان کے بعض خطابات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

## ۸۔شاہ صاحب کے چند خطابات!

(۱) پیرزادوں کو خطاب:

"میں ان پیرزادوں سے جو کسی استحقاق کے بغیر باپ دادا کی گدیوں پر بیٹھے ہیں کہتا ہوں کہ یہ کیا دھڑے بندیاں تم نے کر رکھی ہیں؟ کیوں تم میں سے ہر ایک اپنے طریقہ پر چل رہا ہے اور کیوں اس طریقہ کو سب نے چھوڑ رکھا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ پر اتارا تھا؟ تم میں سے ہر ایک امام بن بیٹھا ہے۔ اپنی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور اپنے کو ہادی و مہدی سمجھتا ہے حالانکہ وہ ضال و مضل ہے"۔

(۲) علماء کو خطاب:

"میں ان طالبان علم سے کہتا ہوں جو کہ اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں کہ بے وقوفو! تم یونانیوں کے علوم اور صرف ونحو و معانی میں پھنس گئے ہو اور سمجھتے ہو کہ علم اسی کا نام ہے حالانکہ علم تو کتاب اللہ کی محکم آیات یا پھر وہ سنت ہے جو رسول سے ثابت ہو"۔

(۳) واعظوں، عابدوں اور خانقاہ نشینوں سے خطاب:

"اے زہد کے مدعیو! تم ہر وادی میں بھٹک نکلے اور ہر رطب و یابس کو لے۔ بیٹھے تم نے خلق خدا پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا حالانکہ تم فراخی کے لئے مامور کیے گئے تھے۔ تم نے مغلوب الحال عشاق کی باتوں کو محور فکر بنا لیا حالانکہ یہ چیزیں پھیلانے کی نہیں بلکہ لپیٹ کر رکھ دینے کی ہیں"۔

(۴) امراء اور دولت مندوں سے خطاب:

"تم فانی لذتوں کی طلب میں ڈوب گئے اور علوم سے بے فکر ہو گئے کہ ان کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ علانیہ شراب پی جا رہی ہے اور تم روک نہیں سکتے۔ زنا کاری شراب اور قمار بازی کے اڈے بر سر عام بن گئے ہیں اور تم انہیں ختم نہیں کرتے جسے تم ضعیف پاتے ہو اسے کھا جاتے ہو جسے قوی پاتے ہو اسے چھوڑ دیتے ہو کھانوں کی لذت، عورتوں کے ناز و انداز، کپڑوں اور مکانات کی لطافت میں اس طرح ڈوب گئے ہو کہ کبھی خدا کا خیال تمہیں نہیں آتا۔

### (۵) مسلم حکمرانوں کے فوجیوں سے خطاب:

"تم کو اللہ نے جہاد کے لئے، اعلائے کلمۃ الحق کے لئے، شرک اور اہل شرک کا زور توڑنے کے لئے فوجی بنایا تھا، اس کو چھوڑ کر تم نے گھوڑ سواری اور ہتھیار بندی کو پیشہ بنالیا۔ اب جہاد کے مقصد اور نیت سے تمہارے دل خالی ہیں پیسہ کمانے کے لئے سپاہی گری کا پیشہ کرتے ہو بھنگ اور شراب پیتے ہو، بندگان خدا پر ظلم ڈھاتے ہو خدا کی قسم! تم کو ایک روز دنیا سے جانا ہے۔

### اہل حرفہ سے خطاب:

"تم میں امانت و دیانت رخصت ہوگئی ہے۔ اپنے رب کی عبادت سے تم غافل ہو گئے ہو اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگے ہو۔ مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو۔ یہ تمہارے بدترین افعال ہیں۔ تم میں سے جو شخص خوشحال ہو جاتا ہے وہ اپنے لباس اور کھانے پر اتنا خرچ کرتا ہے کہ اس کی آمدنی اس کے لئے کافی نہیں ہوتی اور اہل و عیال کی حق تلفی کرنی پڑتی ہے۔

### بادشاہوں سے خطاب:

ملاءِ اعلیٰ کی رضا یہ ہے کہ تم ایسے بادشاہ ہو کہ:

☆ ہر علاقہ اور تین چار دن کی ہر مسافت پر ایک صاحب عدل امیر مقرر کرد جو ظالم سے مظلوم کا حق لے سکتا ہو اور شرعی حدود قائم کر سکتا ہو۔

☆ اور اس کی کوشش کرے کہ عوام کی طرف سے سرکشی اور فساد پیدا نہ ہو اور اسلام بالکل فاش اور اعلانیہ ہو جائے اس کے شعائر کھلم کھلا ظاہر ہوں اور ہر شخص اپنے فرائض منصبی کو اختیار کرے۔

☆ ہر شہر کے امیر کے پاس اس قدر قوت و شوکت ہو جس کے ذریعہ سے اپنے شہر کی اصلاح پر وہ قابو پا سکے مگر اتنی شوکت و قوت نہ ہو کہ اس سے خود نفع کمانے لگے اور بادشاہ وقت سے سرکشی کرنے لگے۔

☆ ہر صوبہ میں ایک بڑا امیر بھی مقرر ہو جس کے ذمہ صرف جنگ کی ذمہ داری عائد کی

جائے۔اس کی فوجی جمعیت ایسے بارہ ہزار مجاہدوں کی ہو جو اللہ کی راہ میں کسی ملامت سے خوف زدہ نہ ہوں اور ہر سرکش باغی سے جنگ کر سکتے ہوں۔

جب یہ سب ہو چکے تب چاہیے:

☆منزل نظامات اور اور معاشرتی قوانین اور عقود و معاملات کی جانچ پڑتال کی جائے اور اسی قسم کی دوسری باتوں کی بھی۔اور کوئی بات ایسی نہ رہ جائے جو شریعت کے مطابق نہ ہو تا کہ لوگ ہر لحاظ سے امن و عافیت کی زندگی بسر کر سکیں۔

ظاہر خلافت والے جو شرعی حدود و جہاد کے ساز و سامان کی تیاری، سرحدی علاقوں کی ناکہ بندی و حفاظت، وفود کو انعام و اکرام، صدقات، محصول مال گزاری وغیرہ کی وصولیابی پھر ارباب استحقاق پر ان کی تقسیم، مقدمات کے فیصلے، یتیموں کی نگرانی، مسلمانوں کے اوقاف کے انتظام، نیز راستوں، سڑکوں اور مساجد وغیرہ کی تعمیر اور اسی قسم کے اور کاموں کے لئے جو افراد مقرر ہوں میں ان کو خلافت ظاہری سے تعبیر کرتا ہوں ان لوگوں کے لئے سیرت رسول ﷺ میں بہترین نمونے ہیں اور حدیث کی کتابوں میں ان کی تفصیل موجود ہے۔

## مسلم عوام سے خطاب:

تم نے تمام مکروہ اور تباہ کن رسموں اور رواجوں کو زندگی کا جز بنا لیا ہے۔حلال مال تم لوگوں کے لئے بدمزہ ہو گیا ہے اور حرام میں بے حد دلچسپی ہو گئی ہے۔کہیں عورتیں مردوں پر حاوی ہیں اور کہیں مردوں نے عورتوں کو ذلیل بنا رکھا ہے۔شادی بیاہوں میں بے پناہ فضول خرچیاں کی جا رہی ہیں۔بیوہ عورتوں کی شادیوں کو مکروہ بنا لیا ہے۔موت اور غمی کو بھی جھوٹی رسموں کی وجہ سے عید بنا لیا ہے۔نمازوں سے غفلت اور خوش گپیوں میں انہماک بڑھتا جا رہا ہے۔بعض لوگوں نے اپنی بسر اوقات کا دارومدار بادشاہوں اور امیروں کے وظیفے اور انعامات پر کر رکھا ہے۔ایسے مفت خوروں کی وجہ سے سلاطین کے خزانے خالی ہو رہے ہیں اور رعایا پر غیر معمولی بوجھ بڑھتا جا رہا ہے اور فرمایا کہ سچ فرمایا ہے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے وہ ضعیف الایمان مسلمان دیکھے ہیں جنہوں نے بزرگوں اور صلحا کو اللہ کے بالمقابل رب بنا لیا ہے۔جو کلام نبوت

میں تحریف کرتے ہیں اور نبی کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لئے ہیں اور گنہ گار میرے لئے۔ تم بھی آخر کار اپنے سے پہلے کی امتوں کے طریقے اختیار کرلوگے اور یہود ونصاریٰ کی طرح اپنے اولیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالوگے۔

شاہ صاحب کے بارے میں بعض شعراء نے نذرانے پیش کئے ہیں ان میں ایک نظم جناب ماہر القادری صاحب کی ہے جو شاہ صاحب کی حیات کی منھ بولتی تصویر ہے۔ نذر ناظرین ہے:

تو مبلغ تھا حدیث فخر موجودات کا ۔ تیرے آتے ہی جنازہ اٹھ گیا بدعات کا
تو مفسر بھی، محدث بھی، فقیہ وشیخ بھی ۔ کون اندازہ لگائے تیرے محسوسات کا
میں سمجھتا ہوں مشیت کا وہی مفہوم تھا ۔ تو نے جو مطلب لیا قرآن کی آیات کا
تیرے ارشادات میں سامان تسکین وضمیر ۔ روح ایماں نقطہ نقطہ تیرے ملفوظات کا
سادگی اسلام کی پھر سے نمایاں ہوگئی ۔ نور جب پھیلا جہاں میں تیری تفہیمات کا
تیرے وارث ہیں ترے نور ہدایت کی شبیہ ۔ اب بھی چرچا ہے جہاں میں تیری تعلیمات کا

آخر میں میں آپ حضرات کا شکر گذار ہوں کہ باوجودیکہ میں اپنی اس تحریر میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا حق ادا نہیں کرسکا اور آپ کی کسی علمی تشفی کا بھی سبب نہیں بن سکا، لیکن اس کے باوجود آپ نے بہت تحمل سے سماعت فرمائی اور میری تمام کمزوریوں کو آپ نے بخش دیا یہ آپ کی بندہ پروری ہے ورنہ.............

حکیم رند سا پاپی بھلا بخشش کے قابل تھا ۔ مگر بے حد کریمی ہے مزاج بندہ پرور میں

# شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات

ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی☆

غالباً چودہ یا پندرہ سال کی عمر ہوگی جب اپنے دادا محترم حافظ محمد یوسف صاحب کی معیت میں پہلی بار مہندیان میں درگاہ شاہ ولی اللہ میں حاضری دی۔ فاتحہ خوانی اور ایصال ثواب کے بعد دادا محترم نے شاہ صاحبؒ کے اجداد، خاندان کی دینی خدمات اور مجاہدانہ کارناموں کا جس طرح ذکر کیا اس نے دل و دماغ پر ایسا اثر مرتب کیا کہ شاہ صاحب کے ہفتے عشرے میں شاہ صاحب کی درگاہ پر حاضری دینے لگا اور یہ سلسلہ تادمِ تحریر برقرار ہے۔

استاذی محترم مفسر قرآن مولانا محمد یوسف صاحب فقیر دہلوی کو شاہ ولی اللہ کے خاندان سے ایسی محبت اور عقیدت تھی کہ انہوں نے وصیت کی تھی کہ میری قبر شاہ عبدالقادرؒ کے قدموں میں ہو۔ خدا نے ان کی اس خواہش کو پورا بھی کیا اور آپ کی تدفین مرقد شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے پائنتی ہی ہوئی۔ مولانا موصوف جب بعد نماز فجر مسجد حوض والی (چوڑی والان، دہلی) میں کلام پاک کی تفسیر بیان کرتے تو تفسیر سے پہلے شاہ صاحب کا ترجمہ سناتے اور پھر اسی ترجمے کی روشنی میں تفسیر ہوتی۔

مولانا یوسف صاحب کے ذاتی کتب خانے میں شاہ ولی اللہؒ کی متعدد عربی فارسی تصنیفات اور ان کے اردو ترجمے بڑی احتیاط کے ساتھ محفوظ تھے۔ مولانا اپنی کتابیں بہت کم لوگوں کو مطالعہ کے لئے دیتے۔ احقر کو یہ سعادت حاصل ہے کہ رجحان طبع کے پیش نظر مولانا نے متعدد کتابیں پڑھنے کے لئے دیں۔ کتاب دیتے وقت اس کتاب کی خصوصیت اور افادیت پر

☆ لکچرر شعبۂ اردو ڈاکٹر ذاکر حسین کالج، نئی دہلی۔

روشنی ڈالتے اور اخیر میں تاکید کرتے کہ آٹھ دن بعد یہ کتاب میرے پاس آجانی چاہئے۔ وعدہ خلافی ہوئی تو آئندہ کوئی کتاب نہیں ملے گی۔ چنانچہ شاہ صاحب کی تصنیفات میں سے حجۃ اللہ البالغہ، الخیر الکثیر، البلاغ المبین، انفاس العارفین، القول الجمیل اور چہل حدیث کے اردو ترجے مولانا یوسف صاحب نے مطالعے کے لئے دیے اور وقت مقررہ پر تمام کتابیں انہیں لوٹا دیں۔ مولانا کا قاعدہ تھا کتاب واپس ہونے کے مہینے دو مہینے بعد اس کتاب کے تعلق سے سوال ضرور کرتے کہیں کوئی الجھن ہوتی یا بات سمجھ میں نہ آتی تو بڑی شفقت سے سمجھاتے، میں نے دیکھا شاہ ولی اللہی خاندان کے اذکار پر اکثر آپ کا چہرہ تمتما جاتا۔ کبھی آنکھیں نم ہو جاتیں کبھی دایاں ہاتھ اپنے زانو پر زور سے مارتے اور کہتے یوسف کتنا بدنصیب ہے۔ کاش اس وقت ہوتا۔ اور اتنا کہنے کے بعد وہ کھو جاتے۔ سلسلہ گفتگو منقطع ہو جاتا۔

گذشتہ دنوں مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب نے حکم دیا کہ احقر شاہ صاحب کے سیاسی مکتوبات پر ایک مضمون تحریر کرے۔ میں نے عرض کیا کہ شاہ صاحب سے عقیدت اپنی جگہ مگر میں اس کا اہل نہیں کہ شاہ صاحب کے افکار ونظریات پر قلم اٹھاؤں۔ میں زبان وادب کا ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ شاہ صاحب جیسی فقید المثال ہستی پر کچھ لکھنا میرے لئے سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ لیکن مفتی صاحب نے اصرار کیا کہ "مضمون تو آپ ہی کو لکھنا ہوگا"، ممکن ہے اس موضوع کے تعلق سے ان کے یہاں کچھ "تحفظات" ہوں۔ ان کے شدید اصرار پر شاہ صاحب کے سیاسی مکتوبات اور متعلقات کا مطالعہ کیا اور جو کچھ سمجھ سکا اسے یہاں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

اس حقیقت سے کون انکار کرے گا کہ شاہ ولی اللہ نابغۂ روزگار تھے۔ اپنے دور کے مجدد اور عظیم المرتبت شخصیت تھے۔ مولانا غیاث الحسن مظاہری نے ماہنامہ دینی مدارس نئی دہلی کا خصوصی شمارہ شاہ ولی اللہ نمبر شائع کیا تھا اس شمارے میں مولانا سید احمد احمد ہاشمی کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "یہ حضرت شاہ صاحب ہی کا کمال فضل ہے کہ آپ نے قرآن وحدیث سے ہندوستان کا مستحکم رشتہ اور ربط پیدا کیا اور حکمتِ دین سے قلوب کو منور کیا، مسالک کے اختلافات میں مفاہمت کی راہیں استوار کیں۔ فرق باطلہ کی گمراہیوں کو واضح کیا

اور قرآن کریم کے ترجمے کے ذریعے عام مسلمانوں میں ہدایت الٰہی کے فہم کو آسان تر بنانے کی سعی فرمائی لیکن ان تمام تر خدماتِ جلیلہ کے علاوہ حضرت شاہ صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ملک کے زوال پذیر معاشرہ میں ایک طرف صالح انقلاب لانے اور تمدن معاشرت کی غیر اسلامی بے راہ روی کو دور کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف انہوں نے ملک کے مسائل کی جانکاری کو بھی اپنا فریضہ فکر و عمل بنایا اور ملک کی گرتی ہوئی ساکھ اور اس کے آبرومندانہ وقار کو بچانے کے لئے تمام تر تدابیر کیں۔ ایوانِ حکومت کی بے اعتدالیوں، عیش کوشیوں اور سیاسی بصیرت سے تہی مائیگی نے جس طرح حکومت کو کمزور اور بے بال و پر بنادیا تھا حضرت شاہ صاحب نے اپنی آخری کوشش کی کہ اس گرتی ہوئی عمارت کو بچالیں اور تاریخ کے کھنڈرات میں دفن ہونے سے اسے محفوظ کردیں یہ کوشش کامیاب بھی ہوتی اور اگر احمد شاہ ابدالی کے بعد ہندوستان کے اقتدارِ اعلیٰ کو ہوش و آگہی سے کچھ بھی حصہ ملا ہوتا، تو ملک کی تاریخ میں انگریزی اقتدار کو پناہ نہ ملتی جس کے لئے حضرت شاہ صاحب کے بعد سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز اور علمائے ہند کو عظیم قربانیاں دینی پڑیں......"

واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کا عہد مسلمانوں کے محض سیاسی اقتدار اور مغلیہ حکومت کے زوال ہی کا زمانہ نہ تھا بلکہ مسلمان (عوام وخواص) ذہنی، روحانی، اخلاقی علمی اور معاشرتی اعتبار سے متزلزل اور بتدریج پستی کی طرف جا رہے تھے۔ اکبر کے دور میں جس طرح مسلمانوں کے تشخص پر کاری ضرب لگی تھی اس نے مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو بڑی حد تک کچل دیا تھا۔ اورنگ زیب نے مسلمانوں کے تشخص کے زوال کو سمجھ کر ہی اسلامی قوانین نافذ کئے تھے لیکن بقول شخصے اسلامی تعلیمات کو قلب و نظر میں سمونے اور خدا اور رسول ﷺ کی محبت سے لوگوں کے دلوں کو سرشار کرنے کے لئے جس قسم کے ہمہ گیر نظام کو وضع کرنے اور پھر اس نظام کو چلانے والے ذی علم اور صاحب بصیرت و بصارت کی ضرورت تھی ان کا کوئی معقول انتظام نہ کرسکا۔ اکبر کے درباریوں اور مشیروں میں ابوالفضل، فیضی اور شاہ مبارک جیسے ذہین لوگ تھے لیکن اورنگ زیب کو اپنی تعمیری اور فلاحی تحریک کے لئے اعلیٰ کردار واوصاف کے وہ لوگ نہ مل سکے جن کی مدد سے وہ لوگوں کے

دلوں کی سیاہی کو دھونے کا انتظام کر سکتا۔

شاہ ولی اللہ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) سے چار سال پہلے پیدا ہوئے۔ اورنگ زیب کے بعد ہندوستان کے حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ اورنگ زیب کے جانشین اس کی میراث کو سنبھال نہ سکے۔ انہوں نے تخت و تاج کے حصول کے لئے آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے بہت پہلے مغلیہ دربار میں شیعہ سنی کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا جو امرا (اُمَرا) اور وزراء گروہوں میں بٹے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں اس قدر منہمک اور مستعد رہتے تھے کہ انہیں کبھی اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے دشمنوں (مرہٹے، سکھ، جاٹ اور روہیلے) کے عزائم بھانپنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ شیعہ سنی کو اور سنی شیعہ کو شکست دینے کے لئے سازشوں میں لگے رہتے تھے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد تو ان گروہوں نے اپنے ڈھب کے شہزادوں کو تخت نشین کرانے کے لئے باقاعدہ اودھم مچا دیا کہ تخت و تاج ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن کے رہ گئے۔ مغل شاہزادے امرا اور لشکری جنہیں عہد جہانگیری اور عہد شاہجہانی کے عیش و عشرت نے بگاڑ دیا تھا اب اور زیادہ عیش و عشرت اور بے عملی میں ڈوب گئے اور عام باشندے جن میں کسان کاریگر اور تاجر شامل تھے حکومت کے حد سے زیادہ مطالبوں کے نیچے پس کر رہ گئے۔ فوج پست ہمت ہو گئی اس کے سربراہ بدچلن ہو گئے اور ریاکار علماء کی تعداد نے ترقی کی۔

مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند اپنی کتاب ''تاریخ تحریک آزادی ہند'' میں رقم طراز ہیں:

''مایوسی کی گھنگھور گھٹا اور روز افزوں دل شکستگی کی فضا میں اسلام کے ایک تیسرے مکتب خیال کی بنیاد رکھنے والا نمودار ہوا۔ ان کا نام شاہ ولی اللہ تھا۔ وہ دلی میں ۱۷۰۳ء ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے ان کے سامنے سماج، حکومت، مذہب، اخلاق اور سیاست کے چند نہایت پیچیدہ مسائل تھے۔ فرقہ پروری اور اختلافات بھی اس زمانہ میں عام تھے۔

علماء جو احکام اور رسم عبادات کو بنیاد قرار دیتے تھے اور وہ لوگ جو باطنی اصول کو ماننے والے تھے اور جو باطن کے تزکیہ پر زور دیتے تھے ان دونوں میں اختلافات تھے۔

اسی طرح فقہا کے چار مصلوں اور شیعہ اور سنی میں اختلافات تھے۔ مسائل کو سوچنے اور رائے قائم کرنے کے طریقوں میں بھی اختلافات تھے کچھ لوگ آنکھ بند کر کے

احکام فقہ کی اتباع یعنی تقلید کے قائل تھے۔ جب کہ دوسرے ایسے لوگ تھے جو احکام الہیہ کی شرح کے لئے وسیع میدان رکھتے تھے یعنی اجتہاد کے قائل تھے۔ کچھ لوگ اسلام کے احکام کی شرح فلسفہ یونان سے کرنے کی مذمت کرتے تھے دوسرے لوگ عقل اور منطق کے استعمال کو احکام الہی کے فہم وادراک کے لئے ضروری قرار دیتے تھے۔ ان باتوں کے علاوہ مسائل اصول اخلاق وسیاست میں اور اس بارے میں کہ سلطنت کے زوال واخلاق کی گراوٹ کے کیا اسباب ہیں باہم اختلاف تھے۔

ولی اللہ نے ان تمام مسائل پر ایسے انداز سے بحث کی جو طبع زاد اور انوکھا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ اختلافات کی جڑ پر ضرب لگائیں۔ ذاتی مخالفتوں سے لوگوں کو ماورا کریں۔ اور مختلف نقطۂ خیال میں ہم آہنگی پیدا کریں۔ مذہبی احکام کے معاملات میں ان کا خیال تھا کہ بحث اور ثبوت کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا اور عقل کل رکھتا ہے یعنی عالم اور حکیم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ہر فعل لازمی طور پر مبنی بر عقل ہوتا ہے اور انسان کا کام ہے کہ وہ دلائل سے ان کا پتہ لگائے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کے ذریعہ جو وحی نازل کی ہے وہ اس کی مرضی کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ ''قرآن کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ کسی شخص کو سوائے صاف صاف دلائل کے اور کسی طرح قائل کرے'' انہوں نے یہ قرار دیا کہ قانون (شریعت) کی راہ اور تصوف (یعنی طریقت) کی راہ، یہ دونوں راہیں متضاد نہیں ہیں بلکہ ایک ہی درخت کے دو قسم کے پھل ہیں انہوں نے اس نزاع کو اس طرح ختم کرنے کی کوشش کی جو دو گروہوں کے فلسفیوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں تھی، جس میں ایک گروہ تو صرف وجود الہی کو مانتا تھا اور دوسرا اس کی ذات وصفات دونوں کا قائل تھا۔ انہوں نے ان دونوں میں ہم آہنگی، ان کی مشترک باتوں پر زور دے کر پیدا کی۔ اسی طرح انہوں نے فقہ کے چار مسلکوں میں جو بنیادی یکسانیت تھی اس پر زور دے کر اور مؤطا امام مالک سے ان کا سلسلہ ملا کر اختلافات کو دور کیا۔

اٹھارہویں صدی کی باہمی خانہ جنگیوں میں اصل معاملہ تورانی نسل، سنی امرا اور ایرانی نژاد شیعوں کا جھگڑا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے ایک کتاب ازالۃ الخفا لکھی جس میں انہوں نے چاروں خلفا کے فضائل وکمالات کا اس انداز میں تذکرہ کیا جس سے دونوں میں

اتحاد کی شکل پیدا ہو جائے۔
تاہم ان کی اس خواہش کا کہ وہ ہر فرد کو عقل سے کام لینے پر آمادہ کریں اور جس رسی میں باندھ کر علماء عوام کو گھسیٹ رہے تھے اس سے ان کو آزاد کریں۔ اس سے زیادہ بہتر مظاہرہ کسی اور بات سے نہیں ہوا کہ انہوں نے قرآن کا ترجمہ فارسی میں کر دیا۔ یہ لوتھر کے طرز کا ایک بیباکانہ فعل تھا جس کا منشا تھا کہ انسان کو مقدس احکام الٰہیہ کے فہم کے لئے خود اپنے عقل و دل کو استعمال کرنے کا حق ہے۔

سیاست کے میدان میں غالباً وہ واحد مسلم مفکر تھے جو اس امر پر صاف دماغ رکھتے تھے کہ اخلاق، سیاست اور اقتصادیات میں کتنا گہرا رشتہ ہے ان کے نزدیک اخلاق کے دو پہلو ہیں۔ ایک پرائیویٹ یا انفرادی اور دوسرا پبلک یا معاشرتی، لیکن دوسرے کی قیمت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ معاشرتی اخلاقیات میں وہ عدل کو سب سے اونچا مقام دیتے ہیں جو ہمارے ذاتی کردار میں مہذب برتاؤ، خوش خلقی اور آداب گفتار کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور جو مالی معاملات میں اقتصادی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور اجتماعی زندگی میں شہری آزادی کو جنم دیتا ہے۔ اور جب یہ صفت مساوات انسانی، باہمی محبت اور انسانی برادری کی بنیاد بن جاتی ہے تو معاشرتی نیکی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ جب انسان عدل اختیار کرتے ہیں تو وہ ایک نیک کردار سوسائٹی کی تعمیر کرتے ہیں۔ جو عین مرضی الٰہی ہے۔

یہ نیک کردار سوسائٹی اس وقت خراب ہو جاتی ہے جب دولت کی فراوانی ہوتی ہے اور اپنی بھوک کو پورا کرنا انسانی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ جب دولت مندوں پر غرور ونخوت غالب آجاتا ہے اور عیش و عشرت اور اسراف بے جا زندگی کے خاص مقاصد بن جاتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمزوروں کو کچل کر اور کسانوں، تاجروں اور کاریگروں کا خون چوس کر دولت میں اضافہ کیا جائے۔ اس طرح ملک کی اقتصادیات غلط راستوں پر پڑ جاتی ہے۔ اس بات پر زور دیا جاتا ہے۔ آخر کار بیکار پرورش پانے والوں کے مطالبات کے اضافہ سے جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے لیکن جو کوئی مفید کام انجام نہیں دیتے شاہی خزانہ خالی ہو جاتا ہے۔
ان حالات کا علاج ان کے نزدیک یہ تھا کہ پورے نظام کو توڑ دیا جائے (فک کل

نظام) انسانی معاملات میں عدل کو قائم کیا جائے اور باہمی میل جول کو پھر سے قائم کیا جائے۔

ولی اللہ کے فلسفہ میں ان تصورات کے قیمتی عناصر موجود تھے۔ جن کی اگر قاعدے سے نشوونما کی جاتی تو وہ ہندوستان کی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کر دیتے لیکن بدقسمتی سے زمانہ خلاف تھا اور فلسفی کے ذرائع و وسائل ناکافی تھے۔ (اردو ترجمہ قاضی محمد عدیل عباسی، ناشر ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ص: ۲۵۸، تا ۲۶۰)۔

"شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات" کا یہی پس منظر ہے۔ ان خطوط کو پروفیسر خلیق احمد نظامی نے نہ صرف مرتب کیا ہے بلکہ فارسی خطوط کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ کتاب میں موصوف کا بیش قیمت مقدمہ ہے جن سے ان خطوط کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان خطوط میں شاہ صاحب نے سیاسی زوال اور انتشار کے اسباب پر بصیرت افروز گفتگو کی ہے اور ملک کے اقتدار اعلیٰ کو بتایا ہے کہ کس طرح حالات کی درستگی کی کوشش بارآور ہو سکتی ہے۔ ان خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب محض عالم دین نہیں تھے، وہ خانقاہ میں رہ کر خانقاہ سے باہر شہر دہلی اور پورے ہندوستان کو دیکھ رہے تھے۔ باری تعالیٰ نے انہیں خاص بصیرت و بصارت عطا کی تھی۔ وہ روشن دل ہی نہیں روشن دماغ بیدار مغز بھی تھے۔ ماضی، حال اور مستقبل پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان خطوط میں سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ ملک کی اقتصادیات پر جو تبصرہ ملتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ شاہ صاحب ایسے عالم دین تھے جو اقتصادیات جیسے موضوع پر ایک ماہر اقتصادیات کی طرح غور و فکر کر سکتے تھے۔

شاہ صاحبؒ کے سیاسی مکتوبات پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سید ازہر شاہ فرماتے ہیں:

"اس دور کے حالات کو سامنے رکھ کر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان انقلابی حالات نے شاہ صاحب کو ایک خاص نقطۂ نظر سے سوچنے، احیا اسلام کے لئے اپنی زبان و قلم کو حرکت میں لانے، اور شاہان وقت کی آغوش اقتدار میں پلی بڑھی ہوئی بدعات و منیات کے ناجائز مذاق کے مقابلے میں ایک خاص اسلوب سے اسلام کی حکمت و حقیقت کو بے نقاب کرنے پر متوجہ اور مجبور کیا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قدرت کو خود بداعتقادی، گمراہی سیاسی انحطاط، اخلاقی زوال اور ملکی انتشار کے اس دہکتے ہوئے

آتشکدہ پر پانی ڈالنا اور دور دور تک اس کی پھیلی ہوئی خوفناک لپٹوں کو سرد کرنا مقصود تھا کہ شاہ ولی اللہ اس دورِ انحطاط میں فکر و ذہن کی سلامتی ارادہ اور عمل کی پختگی، دقیقہ رسی، اور حکمت آموزی کا ایک سورج بن کر سامنے آئے۔ ورنہ برے ماحول میں اچھے آدمی کی تخلیق، شور زمین میں سنبل و ریحان کی پیدائش اور کاہلی و سستی، گرانجانی و اعضا شکستگی کی اس زہر آلود فضا میں مسجد کے ایک حجرے اور مدرسہ کی چہار دیواری سے جہادِ سیف و قلم کی رعد آسا آواز کا بے ساختہ بلند ہو جانا عادتاً اگر مستبعد نہیں تو حیرت افزا ضرور ہے۔ غرض ادھر سے دیکھئے یا اُدھر سے اس رخ پر نظر ڈالئے، یا اس پر بات ایک ہی نکلتی ہے اور وہ یہ کہ شاہ ولی اللہؒ اپنے دور کے بہت بڑے مفکر اپنے زمانے میں احیاءِ فرض و سنت کے مخلص داعی اور زوالِ امت کی ساری پیچیدگیوں کو صحیح طور پر سمجھنے والے ایک دیدہ ور انسان تھے......"

اس مختصر سے مضمون میں ان تمام سیاسی مکتوبات کا جائزہ لینا آسان نہیں، صرف چند خطوط یا ان کے اقتباسات (اردو ترجمہ) شامل کئے جا رہے ہیں شاہ صاحب کے ذہن رسا، اعلیٰ فکر وسیع مطالعہ اور گہری فلسفیانہ نظر کے لئے فارسی خطوط یا ان کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

ان سیاسی مکتوبات میں پہلا خط مغل بادشاہ وزراء اور امراء کے نام ہے۔ خط کا اردو ترجمہ یہ ہے:

## ترجمہ مکتوب اول

## بجانب

## بادشاہ و وزیر و امراء

بعد حمد و صلوٰۃ، یہ چند کلمات ہیں جن کی تحریر کا باعث بادشاہ اسلام، امراء اور جمہور مسلمین کی خیر خواہی ہوئی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا ہے، "خیر خواہی دین[1] ہے۔" اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ اگر ان کلمات کے بموجب عمل کریں گے تو امورِ سلطنت کی تقویت، حکومت کی بقاء اور عزت کی بلندی ظہور پذیر ہوگی۔

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
اُنچہ استاد ازل گفت بگوی گویم

(یعنی مجھ کو آیئنے کے پیچھے طوطی کی مانند رکھا ہے، جو کچھ ''استادِ ازل'' نے کہا ہے وہی میں کہتا ہوں)۔

کلمۂ اول: اصل اصول جس پر حکومت کی بہتری اور ملتِ بیضا کی رونق موقوف ہے یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کی خوشنودی کے لئے یہ بات لازم کرلیں کہ جب فتح یابی نصیب ہو اور مخالف شکست یافتہ ہو تو سب سے پہلی چیز جس کے اجزاء کا مضبوط ارادہ کریں، جاٹوں کے علاقوں اور ان کے قلعوں کے فتح کرنے کی جدوجہد ہو۔ اس کام میں دینی دنیاوی دونوں فائدے ہیں۔ منجملہ ان ضروری کاموں کے ''بدمعاشوں کی'' سرزنش کرنا بھی ہے، تاکہ کوئی زمیندار اس قسم کی شوخی اور بے باکی کا خیال بھی دماغ میں نہ لائے۔

کلمۂ دوم: یہ کہ خالصہ کو کشادہ تر کرنا چاہئے، خصوصاً وہ علاقہ جو دہلی کے ارد گرد ہے۔ آگرہ، حصار اور دریائے گنگ اور حدود سہرند تک سب کا سب علاقہ یا اس میں کا اکثر خالصہ ہو، کیونکہ امور سلطنت میں ضعف کا سبب خالصہ کی کمی اور خزانہ کی قلت ہوا کرتی ہے۔

کلمۂ سوم: یہ کہ جاگیر عطا کرنا، بڑے بڑے امراء کے لئے مخصوص ہو۔ چھوٹے چھوٹے منصب داروں کو نقد دینا چاہئے (جاگیر نہ دی جائے) جیسا کہ عہد شاہجہاں میں قاعدہ تھا۔ اس لئے کہ چھوٹے منصب دار جاگیروں پر قابو نہیں پاتے، اس لئے ٹھیکہ دینے کی احتیاج ہوتی ہے، اسی وجہ سے وہ اکثر اوقات مفلس رہتے ہیں اور اپنے آپ کو کارہائے پادشاہی میں پوری طرح مشغول نہیں کرسکتے۔

کلمۂ چہارم: یہ کہ جو لوگ اس فتنہ میں غنیم کے ساتھ ہوئے ہیں ضروری ہے کہ ان کو جاگیر و منصب اور خدمت سے بے دخل کردیں تاکہ ان کے لئے یہ چیز سزا کے قائم مقام ہو جائے، اور دوسرے لوگ اس قسم کے مواقع پر ''حق نمک'' کی ادائیگی کے راستے سے نہ بھٹکیں۔

کلمۂ پنجم: یہ کہ افواجِ بادشاہی کی ترتیب عمدہ طریقے پر کرنی چاہئے۔ اور یہ ترتیب تین طریقوں سے ہوسکتی ہے۔

(۱) وہ داروغہ مقرر کیے جائیں جو مندرجہ ذیل تین صفتوں سے متصف ہوں۔

الف۔ نجیب ہوں۔

ب۔ بہادر ہوں اور اپنے ساتھیوں پر شفیق ہوں۔

ج۔ تہہ دل سے بادشاہ کے خیر خواہ ہوں۔

(۲) جن لوگوں سے اس فتنہ میں بے غیرتی اور نمک حرامی سرزد ہوئی ہے ان کو معزول کر کے دوسروں کو داخل رسالہ کیا جائے۔

(۳) یہ کہ ملازموں کی تنخواہیں بغیر تاخیر کے ان کو ملنی چاہئیں، اس لئے کہ تاخیر کی صورت میں وہ لوگ سودی قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور ان کا اکثر مال ضائع ہو جاتا ہے۔

کلمۂ ششم: "خالصہ" سے ٹھیکہ دہندگی کی رسم موقوف کر دی جائے۔ دین دار، واقف کار امین ہر جگہ مقرر کر دیئے جائیں۔ ٹھیکہ دینے میں ملک خراب ہوتا ہے اور رعیت پائمال و بدحال ہو جاتی ہے۔

کلمۂ ہفتم: یہ کہ قاضی و محتسب ایسے لوگوں کو بنایا جائے جن رشوت ستانی کی تہمت نہ لگائی گئی ہو اور مذہب اہل سنت و جماعت رکھتے ہوں۔

کلمۂ ہشتم ..................

کلمۂ نہم: ائمہ مساجد کو اچھے طریقے پر تنخواہ دی جائے، نماز باجماعت کی حاضری کی تاکید اور ماہِ رمضان کی بے حرمتی کی ممانعت پورے طور پر کی جائے۔

کلمۂ دہم: یہ کہ بادشاہِ اسلام اور امرائے عظام ناجائز عیش و عشرت میں مشغول نہ ہوں۔ گزشتہ گناہوں سے سچے دل سے توبہ کریں، اور آئندہ گناہوں سے بچتے رہیں۔ بالفعل اگر ان دس کلمات پر عمل کریں گے، مجھے امید ہے کہ بقائے سلطنت، تائید غیبی اور نصرت الٰہی میسر ہوگی، وماتوفیقی الا باللہ، علیہ توکلت والیہ انیب یعنی مجھے توفیق اللہ ہی سے حاصل ہوگی، اور اسی کی ذات پر میرا توکل ہے، اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

اس خط کے بعد پہلے اور دوسرے خطوں پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

"ان مکتوبات میں پہلا خط مغل بادشاہ وزراء اور امراء کے نام ہے۔ اس میں شاہ

صاحبؒ نے سیاسی زوال اور انتشار کے اسباب پر بصیرت افروز گفتگو کی ہے اور ملک کے "اقتدار اعلیٰ" کو بتایا ہے کہ کس طرح حالات کی درستگی کی کوشش بار آور ہو سکتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ "خالصہ" کا علاقہ بڑھایا جائے تاکہ بادشاہ کو صوبہ داروں اور جاگیرداروں کی اقتصادی غلامی سے نجات ملے، جاگیریں عطا کرنے میں احتیاط اور دور بینی سے کام لیا جائے، چھوٹی چھوٹی جاگیریں، سیاسی اور اقتصادی انتشار کا سبب بن جاتی ہیں، چھوٹے جاگیردار اپنی جاگیروں پر پوری طرح قابو نہیں پاتے، مجبور ہو کر ٹھیکہ دیدیتے ہیں، اس طرح اگر ایک طرف بدنظمی میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسری جانب کاشتکاروں پر مظالم ہوتے ہیں۔ ضروری ہے کہ جاگیر صرف بڑے بڑے امیروں کو دی جائے تاکہ وہ اپنی طاقت اور شوکت کے ذریعہ اپنے علاقوں کو قابو میں رکھ سکیں، یہیں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے بلا استثناء جاگیرداری کی مخالفت کیوں نہیں کی، اس سلسلہ میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں:

۱- قرونِ وسطیٰ کے سیاسی نظام اور حالات میں جاگیرداری ایک حد تک ضروری تھی، اور اس کو اس وقت تک قطعی نہیں مٹایا جاسکتا تھا جب تک پورے سیاسی نظام کی بنیادیں نہ تبدیل کردی جائیں۔ سیاسی نظام کی بنیادیں تبدیل کرنا ان فرمانرواؤں کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ نے ایسی انقلابی تجویز ان کے سامنے پیش کرنی لایعنی خیال کی جو ان کے امکان سے باہر ہو۔

۲- اس وقت ملک کا عام سیاسی ماحول حد درجہ خراب تھا، بدنظمی اور انتشار نے حالات کو حد درجہ بگاڑ دیا تھا۔ اگر جاگیرداری کو بالکل ہی ختم کیا جاتا تو جاگیرداروں کا ایک بڑا طبقہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتا اور اس طرح بدنظمی اور بڑھ جاتی۔ شاہ صاحبؒ نے پوری حقیقت بینی کا ثبوت دے کر صرف ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش فرمائی ہے جن کی موجودگی میں حکومت کی مشینری بالکل ہی حرکت نہیں کرسکتی تھی۔

علاوہ ازیں اسی مکتوب میں شاہ صاحبؒ نے غدار لوگوں کو سزا دینے اور فوجوں کو صحیح اصولوں پر منظم کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ انہوں نے بادشاہ کو خاص طور سے اس بات کی طرف متوجہ کیا ہے کہ سپاہیوں کی تنخواہیں وقت پر دی جائیں اور ان میں نظم وضبط کا اعلیٰ معیار قائم رکھنے کی سعی کی جائے۔ مقروض سپاہی فوج کے لئے لعنت اور

قوم کے لئے ایک بوجھ ہے۔ وہ اس وقت تک اپنی خدمات بجا طور پر انجام نہیں دے سکتا جب تک کہ اس کو مستقل ''اقتصادی طمانیت'' حاصل نہ ہو۔

آخر میں شاہ صاحبؒ نے بادشاہ اور وزراء کو متنبہ کیا ہے کہ غفلت اور سُستی سے حالات خراب سے خراب تر ہو جائیں گے، انہیں چاہئے کہ عیش ونشاط کو ختم کریں اور ہمت وجرأت کے ساتھ بقائے سلطنت کے لئے کوشاں ہوں۔ ایسی صورت میں تائید الٰہی بھی ان کو حاصل ہوگی اور فتح ونصرت ان کے ہم رکاب ہوگی۔

اس مجموعے کا دوسرا خط احمد شاہ ابدالی کے نام ہے۔ یہ خط شاہ صاحبؒ کے ادیبانہ کمال، تاریخ دانی اور سیاسی بصیرت کا شاہکار ہے، شروع میں ہندوستان کے تاریخی واقعات مختصراً اس طرح بیان کئے ہیں کہ ان کو سمجھ لینے کے بعد ملک کی سیاسی نبض شناسی کا کام ایک غیر ملکی کے لئے بھی آسان ہو جاتا ہے۔ فتنہ اور فساد کے زمانہ میں انتشار کے حقیقی اسباب کا تجزیہ بہت مشکل کام ہے۔ عموماً انسان کی نظر ظاہری حالات سے اس درجہ متاثر ہو جاتی ہے کہ اصلی سبب تک پہنچنے میں ناکام رہتی ہے، لیکن شاہ صاحبؒ نے سیاسی انتشار اور زوال کے اسباب کو حیرت انگیز سیاسی بصیرت کے ساتھ سمجھا اور سمجھایا ہے۔ راجپوتوں، مرہٹوں اور جاٹوں وغیرہ کے تاریخی حالات پر روشنی ڈالی ہے، ان کی اصلی قوت کا اندازہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ چوتھ کی نوعیت بتائی ہے، اور مرہٹوں کے با اقتدار ہو جانے کے اسباب پر مورخانہ نظر ڈالی ہے۔ نظام الملک کے مرہٹوں اور انگریزوں سے تعلقات پر اشارہ کرتے ہوئے دکن کے سیاسی حالات کو بیان کیا ہے، پھر بتایا ہے کہ مرہٹے ظاہر میں کثیر تعداد میں معلوم ہوتے ہیں، حقیقت میں وہ قلیل ہیں، ان کے ساتھ جو لوگ شریک ہو جاتے ہیں، ان کی تعداد دیکھ کر یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ خود ان کی تعداد بہت زبردست ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کے ایک دستہ کو شکست دیدی جائے تو ساری جماعت میں انتشار پیدا ہو جائے۔ فرماتے ہیں:

''دراصل قوم مرہٹہ قلیل اند ملحق بایں طائفہ کثیر، در برہم زدن یک صف جماعہ کہ ملک بہ ایشاں انداز ہم می پاشند واصل قوم مرہٹہ بہمیں شکست ضعیف می شود''۔

پھر فر[illegible] کے درمیان

ان لوگوں کی "گڑھیاں" ہیں۔ مرکزی علاقہ کے قلب وجگر میں ایسی مخالف طاقتوں کا وجود سیاسی اعتبار سے سخت خطرناک ہے۔ شاہانِ مغلیہ نے اکبرآباد اور دہلی کو "بہ منزلہ دو حویلی" اس لئے رکھا تھا کہ جاٹ اور راج پوت دونوں ان کی شوکت وسطوت سے مرعوب رہیں۔ دہلی کا اثر سہرند وغیرہ پر پڑنے اور اکبرآباد سے راجپوتانہ متاثر ہو۔ شاہ صاحبؒ نے یہاں Geo-Politics کا ایک دلچسپ راز بیان کردیا ہے۔

اس کے بعد جاٹوں کی طاقت کی نوعیت واضح کرتے ہیں، اور ان کی جمعیت کو منتشر کرنے اور طاقت کو توڑنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ جاٹوں کے قبضہ میں جو علاقے ہیں وہ ان کے اپنے نہیں ہیں۔ انہوں نے دوسروں سے غصب کئے ہیں، ان علاقوں کے اصلی مالک ابھی موجود ہیں۔ اگر کوئی ان مالکوں کو مدد دیدے تو وہ خود جاٹوں کو ان کے مقبوضہ علاقوں سے نکال کر پھینک دیں اور اس طرح یہ مسئلہ بھی حل ہوجائے۔

جاٹوں اور مرہٹوں کی حالت بیان فرمانے کے بعد شاہ صاحبؒ نے امراء اور وزراء کی سازشوں اور غداریوں کی طرف بھی اشارہ کردیا ہے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک غیر ملکی جو ملک کے حالات سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتا امراء پر بلا سوچے اعتماد کرلے اور پھر ان کی غداری سے حالات اور زیادہ ناگفتہ بہ ہوجائیں۔

ان سب حالات کو بتادینے کے بعد شاہ صاحبؒ نے اقتصادی تفصیلات بیان فرمائی ہیں، لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کے محصولات ۷، ۸ کروڑ سے کم نہیں، لیکن ان کو وصول کرنے کے لئے غلبہ اور شوکت کی ضرورت ہے، اس کے بغیر ایک کوڑی بھی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ جس علاقے پر جاٹوں کا تصرف ہے اس کے محاصل ایک کروڑ سے کم نہیں، راجپوتانہ کا خراج ۲ کروڑ ہے، بنگال سے ایک کروڑ روپیہ سالانہ وصول ہوتا تھا۔ پھر اودھ کے حالات بیان کئے ہیں، اور بتایا ہے کہ صفدر جنگ کی اقتصادی حالت ہی نے اس کو بادشاہ کے خلاف علم بغاوت اٹھانے کی ہمت دلائی تھی۔ ۲ کروڑ روپیہ اودھ کے محاصل تھے، صفدر جنگ ایک کروڑ روپیہ صرف کرتا تھا، اور ایک کروڑ جمع کرتا تھا، اس "اقتصادی فراغت" نے بغاوت کی راہیں دکھادیں۔

سلطنت مغلیہ کی اقتصادی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے شاہی ملازمین کی زیادتی

جاگیرداروں کی کثرت اور خزانہ کی قلت کے اثرات بیان کرتے ہیں اور پھر بتاتے ہیں کہ ان سب باتوں نے سوداگروں اور صنعت پیشہ لوگوں کو تباہ کر دیا ہے اور وہ:

"بانواعِ ظلم وضیق معیشت گرفتار شدہ اند"۔

شاہ صاحبؒ کو جس طبقہ کی تباہی اور بربادی کا سب سے زیادہ خیال تھا وہ سوداگروں اور اہلِ حرفت ہی کا تھا۔ وہ اس طبقہ کو ملک کی اقتصادیات کا مرکزی نقطہ سمجھتے تھے۔ ملک کی عام اقتصادی حالت پر ان کے خیالات اور بنیادی تصورات پر مجموعی حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ اس طبقہ کی بربادی کو ملک کی بربادی سے تعبیر کرتے تھے۔

غرض اس طرح ملک کے سیاسی اور اقتصادی حالات بیان کرنے کے بعد شاہ صاحبؒ نے مسلمانوں کی غربت اور کسمپرسی پر نہایت غمگین لہجے میں گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ افلاس اور تباہی نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے:

"دریں زمانہ پادشاہے کہ صاحبِ اقتدار وشوکت باشد وقادرِ برشکست لشکر کفار ودور اندیش، جنگ آزما، غیر ملازماں آنحضرت موجود نیست۔ لاجرم برآں حضرت فرض عین است قصدِ ہندوستان کردن وتسلط کفار مرہٹہ برہم زدن وضعفائے مسلمین را کہ دردست کفار اسیر اند، خلاص فرمودن"۔

اس خط کے نتیجہ میں پانی پت کا میدان کارزار سجا، اس جنگ کی تاریخی اہمیت سے تاریخ کا ہر طالبِ علم واقف ہے، لیکن یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مدرسہ رحیمیہ کا ایک مدرس اس تاریخی جنگ کے نقشے تیار کر رہا تھا، اس خط کے مطالعہ کے بعد شاہ صاحب کی سیاسی خدمات کا ایک اہم پہلو روشن ہو جاتا ہے۔

تیسرا خط شاہ عالم کی والدہ نواب زینت المحل کے نام ہے، اور غالباً اس زمانہ میں لکھا گیا ہے جب شاہ عالم عالی گہر خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے، کہ قلعۂ معلّٰی کی بیگمات بھی شاہ صاحب سے عقیدت اور ارادت رکھتی تھیں اور پریشانی کے موقعوں پر ان کی دعا اور روحانی امداد کی طالب ہوتی تھیں۔

اس کے بعد نہایت [illegible] خطوط [illegible] نجیب الدولہ کے نام ہیں، ان

مکتوبات سے اگر ایک طرف شاہ صاحبؒ اور روہیلہ سردار نجیب الدولہ کے باہمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف یہ چیز بھی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شاہ صاحب کس طرح اس زمانہ کے حالات کا مطالعہ کر رہے تھے اور کس جذب اور انہماک کے ساتھ "امیر الغزاۃ"، "رئیس المجاہدین" کے خطاب سے مخاطب کر کے اس کے مذہبی جذبہ کو متاثر کرتے تھے، اور کامیابی کی بشارتیں دے دے کر اس کی ہمت اور جرأت کو بڑھاتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"در پردۂ غیب برانداختین ایں دو فرقۂ ضالہ یعنی مرہٹہ و جٹ مصمم شدہ است"۔

پھر فرماتے ہیں جوں ہی تم کمر ہمت باندھو گی اُن کا طلسم پارہ پارہ ہو جائے گا۔ بعض خطوط کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ابدالی فوجوں کی نقل و حرکت کا بھی علم رہتا تھا اور حالات و ضروریات کو ملحوظ رکھ کر وہ لوگوں کو ہدایات دیتے رہتے تھے۔ نجیب الدولہ بھی شاہ صاحب سے مشورہ لیتا تھا اور مشکلات میں رجوع کرتا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ جب جنگ کے لئے گھر سے روانہ ہو تو فقیر کو اطلاع دے دینا تا کہ وہ خدا کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق دعا کرتا رہے۔

جب صفدر جنگ نے جاٹوں سے ساز باز کر لی تو نجیب الدولہ نے گھبرا کر شاہ صاحبؒ کو خط لکھا۔ جواب میں ارشاد فرمایا کہ عزیز من! جاٹوں کی شکست عالم بالا میں طے ہو چکی ہے، تمہیں بالکل گھبرانا نہ چاہئے۔ اگر مسلمانوں کی ایک جماعت ان کی شریک ہو گئی ہے، تو ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں۔

"خدائے تعالیٰ دستش آں جماعہ مسلمین بند خواہد کرد، قتال نخواہند کرد"۔

نجیب الدولہ کے بعد ۱۶ خط شیخ محمد عاشق پھلتیؒ کے نام ہیں، ان مکتوبات میں شاہ صاحبؒ نے بادشاہ سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے۔ ملک کے عام حالات پر جگہ جگہ تشویش اور پریشانی کا اظہار کیا ہے۔ ابدالی کے حملوں کی اطلاعات ان خطوط میں اکثر جگہ ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے پھلت اور بوڈھانہ کی سلامتی اور فوجوں کی پامالی سے بچنے کے لئے بہت ہی خلوص سے دعائیں مانگی ہیں، آنے والے حوادث سے اکثر موقعوں پر آگاہ کیا ہے۔ ایک مرتبہ رمضان کے موقعہ پر پھلت میں اعتکاف کے لئے شیخ محمد عاشق نے لکھا تو شاہ صاحبؒ نے جواب دیا:

"دریں حالت خانہ راگذاشتن ...... از آداب مصالح ظاہر دور می نماید"۔

مکتوب بستم غالباً ۱۱۶۷ھ مطابق ۵۴-۱۷۵۳ء میں لکھا گیا ہے۔ جب صفدر جنگ کا انتقال ہوا ہے، اس زمانہ میں بقول شاہ صاحب اربابِ حل وعقد کی تلون مزاجی کا یہ عالم تھا کہ صبح کو ایک رائے قائم کرتے تھے اور شام کو توڑ دیتے تھے۔ روپے کی کمی تھی اور ساتھ ہی جنگ کے طول پڑ جانے کا ڈر دامن گیر تھا۔

مکتوب بست و دوم میں شیخ محمد عاشقؒ کو (جنہوں نے حالات کے پیش نظر دہلی سے منتقل ہو جانے کا مشورہ دیا ہوگا) لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نظر کرم یہاں اور وہاں یکساں ہے، پھر خواہ مخواہ کہیں منتقل ہو جانے کی تکلیف ہم کیوں اٹھائیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

"ومحتمل کہ بودن بعض نفوس اینجا سبب حوادث اینجا باشد"۔

اسی نوعیت کی بات دوسرے خط میں دہراتے ہیں۔ مکتوب سیزدہم میں لکھتے ہیں:

"امروز افواہ شنیدہ شد کہ تشویشِ خواطر آورد کہ افواج ڈرانیہ بہ طرف بارہہ می رود، آرے جہت تشویش خاطر پیدا شد۔ ہرچند ظنِ غالب است کہ طرف پھلت وبوڈھانہ کارے نداشتہ باشند، بالجملہ از فضل الٰہی امید قوی داریم کہ خدائے تعالیٰ شمار ا از جمیع آفات سلامت دارد واین معنی از دل می جوشد، ہرچند بحسب ظاہر تشویشے می آید وتدبیر اصلاح کردہ می شود"۔

قول الجلی کی یہ عبارت اس سلسلہ میں قابلِ غور ہے:

"ہم دراں ہنگامہ باین خاکسار سرفراز نامہ ارشاد فرمودہ بودند کہ افواہ آنست کہ افواج درانیاں بطرف بارہہ می رود، ازیں جہت تشویش پیدا خاطر شد، ہرچند ظن غالب آنست کہ بطرف پھلت وبڈھانہ کارے نداشتہ باشند بالجملہ از فضل الٰہی امید قوی داریم کہ خدائے تعالیٰ شمار او مارا از جمیع آفات سلامت دارد واین معنی از دل می جوشد، ہرچند بحسب ظاہر تشویشے می آید ...... پس ہم چناں کہ ارشاد شدہ بود بظہور نمود کہ افواج درانیہ بمسافت سہ چہار گوردہ از قریہ پھلت رسید تاخت وتاراج کردہ، ہر دو قریہ مذکورہ بہ ہمہ وجوہ بسلامت ماندند وہمچنیں قصبہ بڈھانہ بہمہ جہات محفوظ ماند [illegible] مسکن حضرت ایشاں است ہم از جہت دستبرد

عمارتیان وہم از جہت مصادرہ کہ بر سر خانہ ہائے شہر مقرر شدہ بود محفوظ ماند واذیتی نرسید" (ص:۲۲۶)۔

آخر میں متفرق خطوط ہیں جو سید احمد روہیلہ، آصف جاہ، تاج محمد خاں بلوچ نواب مجد الدولہ، نواب عبداللہ خاں کشمیری اور حافظ جار اللہ کے نام لکھے گئے ہیں، ان خطوط کا مقصد ملک کے مختلف سیاسی لیڈروں کو اپنا ہم خیال بنا کر حالات کی درستگی کے لئے تیار کرنا ہے۔

گوئے توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں نمی آید سواراں راچہ شد

کہہ کہہ کر عمل کی ترغیب دیتے ہیں۔ وزیر الملک آصف جاہ کو لکھتے ہیں کہ آں عزیز القدر کا ہندوستان میں کافی اقتدار ہے، ہم فقیر اس بات کے امیدوار ہیں کہ آں عزیز "رفعِ مظالم" اور "تغیر رسوم بد" کے لئے کوشاں ہوں۔

اس تجزیے کے بعد راقم پہلے خط کے کلمۂ نہم کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے۔ آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے بادشاہ وزرا اور امرا سے مخاطب ہیں کہ "ائمہ مساجد کو اچھے طریقے پر تنخواہ دی جائے اور نماز باجماعت کی تاکید کی جائے......"

اس جمہوری دور میں جبکہ مسجد کے جملہ امور وقف بورڈ اور منتظمہ کمیٹی کے سپرد ہیں تو ائمہ مساجد اپنی تنخواہوں کے لئے پریشان رہتے ہیں جو مشاہرے یا تنخواہیں مقرر ہیں وہ اس قدر قلیل ہیں کہ روزمرہ کے اخراجات بمشکل پورے ہوتے ہیں۔ اور آج اپنی تنخواہوں میں اضافے کے لئے ائمہ کرام حکمراں طبقے سے رجوع کر رہے ہیں اور عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔ ذرا غور کیجئے جو امام آپ کی نماز کی قیادت کر رہا ہے اگر وہ معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہوگا تو کس طرح یکسو ہو کر امامت کے فرائض انجام دے گا۔

(۲) مجموعے کا دوسرا خط طویل ہے جو کتاب کے صفحہ ۸۳ سے شروع ہو کر صفحہ ۹۸ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ خط احمد شاہ ابدالی کے نام ہے جس پر پروفیسر خلیق احمد نظامی تبصرہ کر چکے ہیں۔ اسی خط کے تعلق سے اعتراض کیا گیا کہ ہندوستان میں جو سیاسی افراتفری، بددیانتی، غداری اور مغلیہ عسکری نظام کی ابتری تھی۔ ان برائیوں کے استیصال کے لئے اپنے دست وبازو میں اتنی طاقت

نہ پائی اور اپنی سلطنت کو امن عامہ اور احترام آئین وقوانین کو پھر سے زندہ کرنے میں عاجز دیکھا تو مجبوراً انہیں احمد شاہ ابدالی کو آواز دینی پڑی۔ اس دور کے ملکی حالات اور سیاسی صورت حال پر نظر ڈالئے تو نظر آئے گا کہ شاہ صاحب نے بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد دو ایسی طاقتوں کا انتخاب کیا جن کے ذریعہ سے مفسدانہ عناصر کی سرکوبی کی جاسکتی تھی۔

(۱) نجیب الدولہ یعنی روہیلے۔

(۲) احمد شاہ ابدالی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ ”شاہ صاحب نے ان دونوں کے انتخاب میں بے پناہ سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا تھا۔ روہیلوں کی عسکری طاقت اور صلاحیت پر سر جدوناتھ سرکار نے اپنی کتاب مغل سلطنت کا زوال (Fall of The Muqhal Empire) جلد اول صفحہ ۵۳، ۵۱ پر بحث کی ہے۔ نجیب الدولہ کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں سپاہیانہ بہادری، سیاسی تدبر، دور بینی اور صلاحیت جہانبانی سب کچھ تھا۔ جلد دوم صفحہ ۴۱۵ پر وہ لکھتا ہے بلکہ وہ سوائے احمد شاہ ابدالی کے اپنے تمام معاصرین میں لاثانی تھا۔

He Had No Equal in that age Except Ahmad Shah Abdali (Vol. II p. 415)

شاہ صاحبؒ کی سیاسی بصیرت اور حقائق شناسی کا یہ کمال تھا کہ انہوں نے دو ایسی عظیم المرتبت شخصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جن کو بیسویں صدی کا ایک مشہور مورخ اٹھارویں صدی کی سب سے زیادہ قابل شخصیتیں تصور کرتا ہے۔

سچائی یہ ہے کہ اعتراض کرنا بہت آسان ہوتا ہے اور کسی بات کی حقیقت تک پہنچنا اس کے مقابلے میں انتہائی مشکل...... بعض لوگ جن کی سوچ منفی ہوتی ہے وہ ہر بات میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتے ہیں۔ ان کے لئے اعتراض کرنا معمولی بات ہوتا ہے۔ یہاں یہ بآسانی اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب نے اپنے گھر پر دوسروں کو چڑھا دینے اور اپنے ملک میں دوسروں کو کھل کر کھیلنے کی دعوت کیوں دی؟

پروفیسر نظامی ان اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ نادر شاہ کے حملے (۱۷۳۹ء)

نے مغلیہ سلطنت کا سارا ڈھانچہ بے جان کر دیا تھا۔ مرکز سے علاحدہ صوبوں میں خودمختاریاں قائم ہوگئی تھیں۔ سعادت علی خاں نے اودھ میں، علی وردی خاں نے بنگال میں، نظام الملک نے دکن میں آزاد حکومتوں کی بنا ڈال دی تھی۔ پنجاب میں سکھوں کا اقتدار بڑھنے لگا تھا۔ مغربی اور جنوبی علاقوں میں مرہٹوں نے تسلط قائم کر لیا تھا اور بہار، اڑیسہ اور بنگال کو تاخت و تاراج کر رہے تھے۔ دہلی میں ایرانی تورانی نزاع پورے عروج پر تھا۔ امرا آپس کے عناد اور دوسرے فریق کو شکست دینے کی خاطر مرہٹوں سے امداد لیتے تھے اور اس طرح مرہٹوں کا اقتدار دہلی کے اردگرد کے علاقہ میں بڑھ رہا تھا۔

ہندوستان کی تاریخ کا یہ نازک دور تھا۔ شاہانِ مغلیہ ان حالات میں بالکل بے بس تھے شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر ایک طرف نجیب الدولہ کو تیار کیا کہ وہ ہمت اور جرأت سے مقابلہ کرے۔ دوسری طرف احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ ہندوستان آ کر مرہٹوں کے تسلط سے خلاصی دلائے۔ طباطبائی نے لکھا ہے:

> "مردم از دستِ شاں (مرہٹہ) بجا آمدہ برائے ناموس آبروئے خود رفاہ عالمے شاہ ابدالی منت را بہ منت از ولایت طلب داشتہ" (سیر المتاخرین)

> نادر شاہ کے حملے کے بعد مسلمانوں کی بیچارگی اور درماندگی کی جو حسرتناک حالت ہوگئی تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے "جوہر" کر کے یعنی آگ میں جل کر خود کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ (ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ)۔

یہ تھے ہندوستان کے وہ ہوش ربا حالات جن میں شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان بلایا تھا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ شاہ صاحبؒ اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جنگ پانی پت نے ہندوستان کی تاریخ کا رُخ بدل دیا۔

مولانا ازہر شاہ قیصر اپنے مضمون "حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکاتیب" مطبوعہ ماہنامہ دینی مدارس شاہ ولی اللہ نمبر میں رقم طراز ہیں کہ ہم اس اعتراض (احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان میں بلانا) کے جواب میں کوئی طویل بحث نہیں چھیڑنا چاہتے بلکہ ہمارے محترم مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس موقعہ پر جو جواب دیا ہے یہاں نقل کر دیتے ہیں:

"حضرت شاہ صاحب محب وطن تھے، اور اتنے ہی جتنا کہ اس آریہ ورت کا کوئی چار

ہزار برس کا باشندہ ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر گھر میں آگ لگ رہی ہو اور خود گھر والے اس کو بجھانے اور اس پر قابو پانے پر قادر نہ ہوں تو کیا اس وقت باہر والوں کو امداد کے لئے نہ بلانا گھر سے غداری اور خودکشی نہیں ہے؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کی طاقت کو زیر وزبر کیا اور اب پورے ہندوستان میں کوئی طاقت اس کی حریف نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ نجیب الدولہ کو امیر الامراء بنا کر چلا گیا، اور خود اُس نے اپنی حکومت قائم نہیں۔ کی ایک مورخ یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ حضرت شاہ صاحب کے اشارہ اور ایما پر ہی ہوا ہوگا، جنہوں نے اپنے گھر کو درست کرنے کے لئے بیرونی امداد تو لی لیکن اپنے ملک پر بیرونی طاقت کا قبضہ گوارا نہیں کیا۔ رہا امداد کے لئے بلانا؟ تو واقعہ یہ ہے کہ مرہٹوں نے اس ملک میں اس قدر مضبوط اقتدار قائم کرلیا تھا اور ان کی وجہ سے پورے ملک میں عام تباہی و بربادی اس درجہ میں پھیل رہی تھی کہ بیرونی امداد کو طلب کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ چنانچہ اس معاملے میں حضرت شاہ صاحب خود اکیلے نہیں۔ خود نجیب الدولہ اور سب سے بڑھ کر ہندو راجہ، مہاراجہ، احمد شاہ ابدالی سے امداد کے خواہاں تھے۔ سیر المتاخرین کے الفاظ یہ ہیں:

"نجیب الدولہ وراجہائے ہند از دست مرہٹہ و عماد الملک بجاں آوردہ زوالِ دولت وملکِ خود از دست وبرد مرہٹہ برای العین مشاہدہ نمودہ عرائض استدعا بخدمت احمد شاہ ابدالی نگاشتہ خواہاں ورود شدند۔

ترجمہ:— نجیب الدولہ اور ہندوستان کے راجہ مہاراجوں نے مرہٹوں اور عماد الملک کے ہاتھوں اپنے ملک و دولت کا زوال بچشم خود دیکھ کر احمد شاہ ابدالی کو درخواستیں بھیجیں اور ہندوستان میں اس کے ورود کے خواہاں ہوئے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ مرہٹوں کی تاریخ سے ظاہر ہے اور خود ہندو اربابِ قلم نے اس کی تصریح کی ہے کہ یہ لوگ انسانیت اور شرافت کے دشمن تھے اور کوئی ظلم وستم ایسا نہیں تھا، جو انہوں نے ہندو مسلمانوں اور عیسائیوں وغیرہ پر روا نہ رکھا ہو۔ پس یہ ظاہر ہے کہ شاہ صاحب ابدالی کو بلانا وطن کی محبت اور اہل ملک کی خیر خواہی کے جذبہ ہی سے تھا، اور اس میں وہ بالکل حق بجانب تھے۔ اگر شاہ صاحب کے پیش نظر صرف مسلمانوں کی خیریت اور بھلائی ہوتی تو وہ نجیب الدولہ کو دہلی بلاتے [illegible] یعنی غیر مسلموں کی بھی صراحت نہ

کرتے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے لئے بھی امن وامان کی درخواست نہ کرتے۔

(ماہنامہ برہان، دہلی، مارچ ۱۹۵۱ء)

ہندوستان کے اٹھارویں صدی کے حالات سے قطع نظر موجودہ دنیا کو دیکھیے آج دنیا انفارمیشن ٹیکنالوجی کے باعث سمٹ کر رہ گئی ہے کسی بھی جگہ چھوٹا یا بڑا کوئی واقعہ یا حادثہ رونما ہو، چند منٹوں میں دنیا بھر میں اطلاع ہو جاتی ہے۔

امریکہ اس وقت دنیا بھر کی سب سے بڑی طاقت ہے لیکن گزشتہ دنوں عراق اور افغانستان میں جنگ کے لئے اس نے حلیفوں کی مدد حاصل کی۔ اس سے پہلے عراق کی کویت کے ساتھ جنگ ہوئی تو سعودی عرب اور کویت دونوں نے امریکہ سے مدد لی اور کسی بڑے خطرے کے پیش نظر حفاظت کے لئے امریکی فوج کو اپنے علاقوں میں مقرر کیا۔ سعودی عرب میں آج بھی امریکی فوج کا ڈیرا ہے، دنیا بھر میں دہشت گردی ختم کرنے کے لئے ممالک ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں۔ اس سے اٹھارویں صدی میں ہندوستان کی جو حالت تھی اس وقت شاہ صاحب کا احمد شاہ ابدالی کو خط لکھنا، ہندوستان بلانا ہندوستان کے حق میں ہی تھا کیونکہ مغل حکومت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ حکومت کے باغیوں کی سرکوبی بھی نہیں کر سکتی تھی چہ جائے کہ اپنے خلاف محاذ آرا قوتوں کا مقابلہ کرتی۔ اگر سلطنت مغلیہ اس قدر ناتواں نہ ہوتی تو شاہ صاحب، احمد شاہ ابدالی کو کبھی مدعو نہ کرتے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ ''اگر سلطنت مغلیہ میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندوستان میں پھر کچھ صدیوں کے لئے قائم کر سکتی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اس وقت ایک بے روح جسم کی مانند تھی۔ جنگ پانی پت کا اصلی فائدہ فاتحین جنگ پلاسی نے اٹھایا۔

یہ سمجھ لینا غلط ہوگا کہ شاہ ولی اللہؒ یا احمد شاہ ابدالی انگریزوں کے خطرے سے بے خبر تھے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں مغلیہ بادشاہ کے تساہل سے انگریزوں کو اپنا اقتدار قائم کرنے کا موقعہ نہ مل جائے۔ جس وقت احمد شاہ ابدالی نے حملہ کیا تھا، شاہ عالم ثانی بہار میں تھا۔ جنگ پانی پت کے بعد احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کو دہلی بلانے کی بے حد کوشش کی اور اپنا آدمی بھیجا۔ جب نہ آیا تو احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کی والدہ نواب زینت محل سے خط لکھوایا......شاہ

عالم کو وہاں سے بلانے کی کوشش اس لئے تھی کہ وہ انگریزوں کے اثر سے نکل آئے اور دہلی آکر احمد شاہ کی موجودگی میں اپنی طاقت کا استحکام کر لے۔

شاہ صاحبؒ کے ان سیاسی خطوط کی روشنی میں کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ خیال آسکتا ہے کہ شاہ صاحب نے اس وقت محض مسلمانوں کو مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں سے بچانے کے لئے یہ قدم اٹھایا۔ اس طرح کی غلط فہمیوں کے پیش نظر مولانا عبید اللہ سندھی کا یہ بیان قابل توجہ ہے:

''شاہ صاحب نے خوب سمجھ لیا تھا کہ شہنشاہیت کا دور ختم ہو چکا اب اگر کوئی حکومت بنے گی تو اس کا اساس کوئی اور ہوگا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے جس تحریک کی داغ بیل ڈالی وہ ہمہ گیر تحریک تھی۔ ان کے پیش نظر پورا ہندوستان تھا۔ چونکہ مرکزی ہندوستان کی قیادت اس وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اس لئے لامحالہ شاہ صاحبؒ نے عام مسلمانوں سے خطاب کیا لیکن شاہ صاحبؒ کی دعوت کے اصول عام انسانیت کے اصول تھے۔ ان کا زور مذہب کی رسوم پر نہیں بلکہ مذہب کی روح پر تھا۔ قانون کی ظاہری شکل پر نہیں بلکہ قانون کی جان یعنی عدل وانصاف پر تھا...... مرہٹوں جاٹوں، سکھوں اور اس عہد کی دوسری چھوٹی تحریکیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہوں گی لیکن ان میں کسی تحریک میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی مرکزیت اور وحدت کو بحال رکھ سکنے کی تدبیر سوچتیں۔ شاہ صاحب اپنے مجوزہ نظام میں اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانہ کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدار اعلیٰ کو بحال دیکھنا چاہتے تھے، لیکن اس طرح سے کہ مطلق العنان بادشاہوں کے بجائے انصاف کی حکومت ہو...... (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک: مولانا عبید اللہ سندھی ترتیب وتدوین محمد سرور، صفحہ: ۲۷، ۲۸)۔

شاہ صاحب کے ان سیاسی مکتوبات کا بغور مطالعہ کیجئے تو ہمیں پروفیسر محمد حبیب کے ان خیالات سے ضرور اتفاق ہوگا کہ:

''درحقیقت شاہ صاحب'' سماجی تحفظ'' کے حامی تھے اور یہ چاہتے تھے کہ ہند کے شاندار ماضی کی روشنی میں ملک کے سیاسی اداروں کو از سر نو زندہ کیا جائے۔

# شاہ ولی اللہ کا تصور عالم مثال

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز☆

کسی عالم مثال کے وجود کا نظریہ مشہور یونانی فلسفی افلاطون (Plato) کی طرف منسوب ہے، اور پھر یہی نظریہ (Plotinus) کے ذریعہ عیسائی لاہوت میں اشراقیت کی بنیاد بنا جسے متعدد صوفیاء نے مزید آب و رنگ دے کر اسلامی افکار کا جز بنایا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی (مقتول) اسلامی فلسفۂ اشراق کا اہم نام ہے۔ اسی طرح شیخ محی الدین ابن عربی فلسفۂ وحدت الوجود اور فلسفہ تنزلات ستہ کے عظیم داعی و مبلغ ہیں۔ تنزلات دراصل اشراق ہی کی ایک تفسیر ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ رب العزت کی تجلیات ہی وجود عالم کی بنیاد ہیں۔ وہ تجلیات اپنے درجات تنزل کے اعتبار سے مختلف مراحل وجود کا باعث ہوتی ہیں۔ افلاطون کا کہنا ہے کہ جمادات و نباتات و حیوانات وغیرہ کے جو افراد اس عالم میں پائے جاتے ہیں ان کے حقائق واعیان ثابتہ بطور مثال اور نمونہ کے ایک عالم مثال میں موجود رہتے ہیں۔ گویا ان کی صورت نوعیہ بھی عالم مثال میں اپنا وجود رکھتی ہے مثلاً گھوڑا اور زید، عمر، بکر وغیرہ کے جو افراد اس دنیا میں پائے جاتے ہیں ان کی نوعی صورت اگر چہ ان کا جز ہوتی ہے مگر علاحدہ نہیں پائی جاتی۔ لیکن عالم مثال میں گھوڑے اور انسان وغیرہ کی مثالی اور نوعی صورت ایک مجرد انداز میں موجود ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا عالم مثال افلاطونی عالم سے مختلف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ متعدد قرآنی آیات اور احادیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم ظاہری سے الگ کوئی دوسرا عالم بھی ہے جہاں انسانی اعمال کے حقائق ظاہر ہو جاتے ہیں۔ شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں ذکر عالم مثال کے عنوان

☆ دوحہ قطر۔

سے فرماتے ہیں کہ بہت سی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک غیر مادی یعنی صرف روحانی عالم کا وجود ہے جس میں معانی وحقائق اپنے مناسب حال اجسام کے ساتھ متشکل ومتجسد نظر آتے ہیں، اور زمین پر پائے جانے سے پہلے کسی درجہ میں ان کا تحقق وظہور ہو جاتا ہے اور بہت سی بظاہر روحانی اشیاء ادھر سے اُدھر منتقل ہوتی رہتی ہیں مگر عام نگاہیں انہیں دیکھ نہیں سکتیں، مثلاً اللہ تعالیٰ نے جب رحم کو پیدا کیا تو وہ کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ اے مولا! یہ تیرے ذریعہ قطع رحمی سے پناہ مانگنے والے کا مقام ہے۔ اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اعمال سامنے لائے جائیں گے۔ نماز، روزہ اور صدقات رونما ہوں گے اور فرمایا قیامت کے دن دنیا ایک کھچڑی بالوں والی عورت کی شکل میں پیش کی جائے گی جس کے ناخن نیلے ہوں گے اور چہرہ بگڑا ہوگا، اور شب معراج کے بیان میں فرمایا کہ میں نے چار دریا دیکھے جن میں دو ظاہری تھے اور دو باطنی، میں نے جب ان کے بارے میں جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا تو انہوں نے کہا باطنی دریا تو جنت کے دریا ہیں اور ظاہری دریا نیل اور فرات ہیں۔ یہ اور اس طرح کی بہ کثرت احادیث وآیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ اس عالم ظاہری کے ساتھ باطنی عالم یا عوالم بھی موجود ہیں جن کا ادراک کرنے سے ظاہر بیں نگاہیں قاصر رہتی ہیں۔ اور جنہیں انبیاء اور دیگر مقربین پر ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ عذاب قبر کے سلسلہ میں جو احادیث آئی ہیں وہ بھی اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ میت کو دوزخ یا جنت کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔ مومن کی قبر کو ستر ہاتھ یا اس سے زیادہ وسعت مل جاتی ہے جبکہ غیر مومن کی پسلیاں ایک دوسرے میں ضم کر دی جاتی ہیں۔ میت سے سوال وجواب کے لئے منکر ونکیر فرشتے آتے ہیں۔ جواب صحیح نہ ملنے پر وہ صاحب قبر کو لوہے کے ہتھوڑے سے مارتے ہیں یہاں تک کہ اس کی چیخ مشرق سے مغرب تک سنی جاتی ہے۔ شاہ صاحب نے حضرت امام غزالیؒ کی ایک عبارت نقل کی جس میں کہا گیا ہے کہ قبر کے عذاب سے متعلق علم ومعرفت کے تین درجے ہیں چونکہ ان روایات کا ظاہر صحیح ہے مگر باطن میں اسرار پوشیدہ ہیں جنہیں اہل بصیرت سمجھتے ہیں۔ اس لئے جو شخص نہ سمجھے اسے کم از کم ان روایات کے ظاہر پر اعتقاد رکھنا چاہئے۔ کیونکہ تسلیم وتصدیق ایمان کا سب سے چھوٹا درجہ ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم قبروں کا عرصہ دراز سے مشاہدہ کرتے ہیں مگر ان سے کوئی ایسی چیز ظاہر نہیں ہوتی جن کا روایات میں ذکر کیا گیا ہے تو امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ ہم جواب میں کہیں گے کہ ان جیسے معاملات میں تصدیق کے

تین درجے ہیں پہلا یہ ہے کہ مثلاً اس بات کی تصدیق کی جائے کہ سانپ گنہگار میت کو ڈستا ہے۔
اگر چہ باہر والوں کو اس کا ادراک نہیں ہوتا کیونکہ عام نگاہیں ملکوتی اور روحانی امور کا مشاہدہ کرنے
سے قاصر ہوتی ہیں۔ جس طرح صحابہ کرامؓ حضرت جبرئیلؑ کو نہ دیکھتے ہوئے اس بات کا یقین
رکھتے تھے اور تصدیق کرتے تھے کہ وہ رسول اکرم ﷺ سے مل کر انہیں خدا کا پیغام پہنچاتے
ہیں اسی طرح ہمیں چاہیئے کہ قبر کے سانپ اور بچھوؤں کو نہ دیکھتے ہوئے بھی ہم ان کے وجود کی
تصدیق کریں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس معاملہ کو کم از کم سوتے ہوئے آدمی کی کیفیت پر قیاس کیا
جائے کہ اگر اسے خواب میں کوئی سانپ ڈسے تو وہ تکلیف محسوس کرتا ہے، کراہتا ہے اور کبھی اس
کی پیشانی سے پسینہ بھی چھوٹتا ہے، اس کے آس پاس کے لوگ اس کو ہونے والی تکلیف کا تو کچھ
اندازہ کر لیتے ہیں مگر کاٹنے والا سانپ انہیں نظر نہیں آتا جبکہ سونے والا اسے دیکھتا بھی ہے اور
اس کا اثر بھی قبول کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ عالم خیال میں ڈسے جانے سے بھی اتنی
ہی تکلیف ہوتی ہے جتنی حقیقت میں ڈسے جانے سے اگر چہ خواب سے بیداری کے بعد اس کا اثر
نہیں رہتا۔ اس کیفیت کی معرفت و آگہی کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ آپ واقف ہیں سانپ از خود
اذیت کا سبب نہیں ہے بلکہ اس کے زہر سے جو درد ہوتا ہے وہ تکلیف کا اصل سبب ہے یعنی زہر بھی
تکلیف نہیں ہے بلکہ اس کی جو تاثیر جسم تک پہنچتی ہے وہ باعث تکلیف واذیت ہے اس لئے اگر کسی
بھی طرح سانپ کے زہر کی تاثیر میت تک پہنچ جائے تو اسے سانپ کے ڈسنے سے ہی تعبیر کیا
جائے گا۔ جس طرح جنسی لذت اگر بغیر مباشرت کے حاصل ہو جائے تو اسے مباشرت ہی کی
لذت کہا جائے گا اس لئے اگر اللہ تعالیٰ میت کو کوئی عذاب بغیر ظاہری اسباب کے پہنچا دے تو
اسے اسی عذاب کے لفظوں سے بیان کیا جائے گا جو عرف عام میں مشہور ہیں۔ شاہ صاحب کا
نظریہ یہ بھی ہے کہ عالم مثال شخص اکبر یعنی کل عالم کے لئے ایسا ہے جیسے شخص اصغر یعنی انسان کے
لئے اس کا دماغ۔ جس طرح خیال، ارادہ، خواہش، خواب، رسوچ بچار وغیرہ کا وجود اعمال سے
پہلے دماغ میں آتا ہے اس طرح عالم مثال عالم واقع سے پہلے اشیاء کا تحقق وتصور کر لیتا ہے۔
بہر حال افلاطونی عالم مثال کی شاہ صاحبؒ نے اس عالم امکان اور عالم ملکوت سے تشریح کی جس
کے وجود کی نشاندہی بہت سی آیات وروایات سے ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم بہ دقت نظر مطالعہ کریں تو
افلاطون اور شاہ صاحب کے عالم مثال میں واضح فرق ہے۔ افلاطونی عالم مثال وہ ہے کہ ہر مخلوق

شے کا ایک کامل اور مثالی نمونہ وہاں پایا جاتا ہے جب کہ شاہ صاحب کا عالم مثال اس ظاہری وخارجی عالم کے متوازی دیگر مخفی امکانات وملکات پر مشتمل ایک عالم ہے جسے ظاہر بیں نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں لیکن اس کے اسرار خواص یا اخص الخواص حضرات پر حسب صلاحیت واستطاعت منکشف ہوجاتے ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا زوایات سے ثابت ہوتا ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ بعض دینی حلقے شاہ صاحب کے صوفیانہ رجحان کی تنقید وتنقیص کرتے ہیں جس طرح اسی بنیاد پر امام غزالی کی تنقیص کی جاتی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ انبیائے کرام کے سوا کوئی معصوم نہیں مگر ان دونوں حضرات نے شرعی امور اور اسلامی عقائد واحکام کی جتنی عقلی، روحانی اور نفسیاتی تشریح وتوضیح کی ہے اس کی مثال کسی دوسرے عالم کے یہاں نہیں ملتی۔ میں اپنی معلومات کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ قرون اولی کے بعد دینی اسرار کے سب سے بڑے شارح یہی دو حضرات ہیں۔ امام رازی عقلیات کے امام ہیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے بھی اپنے طور پر کافی اسرار بیان کئے ہیں مگر ان کی تشریحات ایک خاص نقطۂ نظر کی حامل ہیں جن کی صحت اکثر علماء حق کے نزدیک محل نظر ہے۔ امام غزالی کو امت نے عمومی طور پر حجۃ الاسلام کا لقب دیا اور وہ یقیناً اس کے جائز مستحق ہیں یعنی: ایں قبا بود کہ بر قامت او دوختہ بود۔

لیکن یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ امام غزالیؒ کا علم حدیث میں وہ درجہ نہیں ہے جو شاہ صاحب کا ہے بلکہ ان کی بیشتر روایات صوفیا میں رائج ضعیف روایات ہیں جبکہ شاہ صاحب علم حدیث میں سند اور امامت کا درجہ رکھتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کہیں لکھا ہے کہ امام غزالی کی احیاء العلوم شاہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ کو مستثنیٰ کر کے علم تصوف کی سب سے اہم کتاب ہے۔ یعنی حجۃ اللہ البالغہ علم تصوف کی سب سے جامع اور مستند ترین کتاب ہے۔ مولانا مودودیؒ نے امام غزالی کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی ذات عالم اسلام کی ایک عظیم شخصیت ہے مگر ان کی کتابوں کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں ان کمزوریوں سے آگاہ رہنا چاہئے جو ان میں ضعف حدیث سے پیدا ہوئیں، جو تصوف کی راہ سے آئیں۔ اور جو فلسفہ ومنطق کے کثرت استعمال سے وجود میں آئیں۔ امام غزالی کے بارے میں دینی حلقوں میں یہ لطیفہ مشہور ہے کہ انہیں ابن سینا کی تصنیف شفاء نے بیمار کر دیا (أمرضه الشفاء) مقصد یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا علم وبصیرت خصوصاً اسرار شریعت کے باب میں ماضی کے بکثرت عالموں اور دانشوروں سے زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ صحت مند ہے۔

حضرت امام غزالی اور شاہ صاحب میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ دونوں بہ کثرت علوم وفنون کے ماہر ہیں۔ امام غزالیؒ کے علمی تبحر کو پیش نظر رکھ کر تعریفی انداز میں علامہ ابن رشد نے تہافۃ التہافۃ میں لکھا ہے کہ: هو مع الصوفية صوفي ومع الفلاسفة فيلسوف ومع الاشاعرة اشعری ومع الاصولیین اصولی یعنی امام غزالی صوفیاء کے ساتھ صوفی ہیں اور فلسفیوں میں فلسفی ہیں۔ اور متکلمین کے ساتھ اشعری متکلم ہیں اور جب فقہ واصول فقہ کی بات ہو تو وہ ایک ماہر اصولی فقیہ ہیں۔ شاہ صاحبؒ اپنی تصانیف میں بالعموم منطق، فلسفہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر، اصول تفسیر، فقہ، اصول فقہ، کلام، تصوف، طب، عروض، ہیئت اور نجوم وغیرہ علوم کے مسائل اور اصطلاحوں کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تصانیف کا سمجھنا ہر خاص وعام کے بس کی بات نہیں ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تصانیف کتب خانوں میں دستیاب نہیں ہیں یعنی علماء بھی ان سے اعتناء کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ راقم سطور کا خیال ہے کہ امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم کے حامل علماء کا وجود امت کی فلاح کے لئے ضروری ہے کہ اس میں بھی "خذما صفا ودع ما كدر" کا اصول پیش نظر رہے۔ یقیناً جو روشنی اور بصیرت ان حضرات کے پاس ہے امت کا دانشور طبقہ ابھی اس سے محروم وپس ماندہ ہے۔

حضرات! زیر نظر مبحث میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عالم روح وملکوت کی جتنی واضح تصویر امام غزالی اور شاہ صاحب نے پیش کی ہے اس سے ان پیچیدہ مسائل کا سمجھنا کتنا آسان ہو جاتا ہے شیخ ابن عربی کے فلسفۂ تنزلات اور شیخ شہاب سہروردی کے فلسفہ اشراق کی جھلکیاں شاہ صاحب کے افکار میں دکھائی دیتی ہیں مگر محتاط اور مشروع انداز میں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ تصوف، کلام، فلسفہ اور شرعی علوم کے لطیف اور محتاط امتزاج سے شاہ صاحب کی بزم علم روشن ہے جس کی سب سے مکمل تصویر حجۃ اللہ البالغۃ اور التفہیمات الالٰہیۃ وغیرہ تصانیف میں نظر آتی ہے اور اس کی ایک واضح مثال شاہ صاحب کا نظریۂ عالم مثال ہے جو افلاطون کے نظریہ سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ جیسا کہ اس کی وضاحت گزشتہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہے۔

# شاہ ولی اللہ اور ان کا عہد

## شمالی ہند میں اٹھارہویں صدی کا سیاسی و سماجی بحران، ایک تجزیاتی مطالعہ

پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین☆

بقول شاعر ؎

یارب کرا گذر رشد در شہر ما کہ باشد　　ہر خانہ بزم ماتم، ہر کوچہ کربلائی

اسلام نے سیاسی نظام کی بنیاد شوریٰ اور اجماع پر رکھی اور ایک بنیادی اصول سماجی برابری تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے شوریٰ، اجماع اور سماجی برابری پر اپنی تعلیمات پر زور دیا۔ خلفاء (۶۳۲ تا ۶۶۱ء) نے بھی اسلام کے انہی اصولوں اور سنت رسول اللہ پر عمل کیا، لیکن ۶۶۱ء میں اس شورائی نظام کو ختم کر کے موروثی ملوکیت کی بنیاد ڈال دی گئی۔ اس وقت مسلمانوں کی کثیر اکثریت نے یہ محسوس کیا کہ یہ معمولی تبدیلی ہے اور اس کے اثرات اسلام کے دوسرے نظام زندگی کو متاثر نہ کر سکیں گے، لیکن ایسا ممکن نہ تھا اس لئے کہ سیاست سماج کا ایک کلیدی ادارہ ہے جو دوسرے اداروں کو یقینی طور پر متاثر کرتا ہے۔ نتیجتاً دوسرے ادارے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ شورائی نظام ختم ہوا، آزادی رائے ختم ہوئی، عدلیہ کی آزادی ختم ہوئی اور سماجی برابری ختم ہو گئی اب باقی کیا رہا۔ تقویٰ اور صلاحیت کی جگہ موروثی حقوق نے لے لی۔ نہ صرف سیاسی ادارے موروثی ہوئے بلکہ عہدۂ قضاء، افتا اور مساجد کے امام وغیرہ بھی موروثی ہو گئے۔ اور آہستہ آہستہ مسلم سیاست اور معاشرہ جاگیردارانہ نظام کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ موروثی جاگیردارانہ نظام قطعی طور پر غیر اسلامی اور بدعت تھا۔ لیکن نہ صرف یہ کہ مسلم اکثریت نے اسے قبول کیا بلکہ علماء کی بھی کثیر تعداد نے اس

---

☆ صدر شعبہ تاریخ و ثقافت جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

جاگیردارانہ نظام کی وکالت کی اور اس کے حصہ دار ہو گئے۔ اب مسلمان مذہبی معاملات میں نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کی تو پابندی کرتے رہے اور کر رہے ہیں لیکن اسلام کے سیاسی اور سماجی اصولوں سے بہت دور چلے گئے۔ اس لئے کہ علماء کی اکثریت نے اس بدلے ہوئے نظام کی تفسیر بھی اسی طرح کی تو عام مسلمان کیا سوچتا؟ اس نے وہی کیا جو علماء نے کہا اس کے لئے تقلید ضروری قرار دیدی گئی اور اجتہاد کے دروازوں کو بند کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو عرب، غیر عرب، موالی ایرانی، تورانی، سید، مغل، افغان اور شیخوں میں بانٹ دیا گیا۔ حد یہ ہوئی کہ مسلمان اس قدر بٹ گئے کہ آپس میں شادی بیاہ بھی ترک کر دیئے گئے۔ معاف کیجئے گا کہ ساتویں صدی عیسوی میں ہماری سیاست وسماج کے بگاڑ میں امریکہ، روس، انگلینڈ اور فرانس وغیرہ کا کوئی دخل نہ تھا اس کے لئے صرف ہم ہی ذمہ دار ہیں۔

جب بنی عباس کی حکومت کمزور ہونے لگی تو علما نے یہ حل تلاش کیا کہ جو مسلم حکومتیں بغداد سے آزاد ہونا چاہیں ان کو اس کی اجازت ہو گی لیکن وہ خطبہ اور سکہ میں بغداد کے نام نہاد خلیفہ کا نام شامل کر لیں جس کے نتیجے میں غزنی اور غور کی حکومتیں وجود میں آئیں لیکن ان کی اساس بھی جاگیردارانہ نظام تھی۔ محمد غوری نے ہندوستان کے کچھ حصے کو فتح کیا اور اس کے جانشین قطب الدین ایبک نے ۱۲۰۶ میں دہلی میں سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ یہ مسلمان وہی دوہرا نظام اپنے ساتھ لے کر آئے یعنی نماز، روزہ اور زکوۃ کے پابند لیکن جاگیردارانہ نظام کے پیرو۔ اس طرح ہندوستان میں مسلمان یہ دو متضاد پہلو ساتھ لئے ہوئے داخل ہوئے، جن کی بنیاد دمشق میں پڑ چکی تھی اور بغداد میں ان روایات کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ یہی دو متضاد شکلیں ہمیں عہد وسطی کے ہندوستان میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ صوفیا بھی ہندوستان آئے لیکن انہوں نے مسلم سیاست سے کنارہ کشی، ملوکیت کے قیام اور جاگیردارانہ نظام سے اس سرزمین پر ہی کر لی تھی جہاں رسول اللہ ﷺ ان کے اہل بیت اور صحابہ نے اصل اسلام کی تبلیغ کی تھی اور ان پر عمل کیا تھا۔ عہد وسطی کے مورخ ضیاء الدین برنی صاحب تاریخ فیروز شاہی اور فتاویٰ جہانداری کا کہنا ہے کہ اسلام کے اصولوں کی بنیاد پر حکومت کا قائم کرنا ممکن نہیں حکومت تو شاہی اصولوں پر ہی چل سکتی ہے۔ ۱۵۲۶ء میں ہندوستان میں مغل حکومت کا قیام وجود میں آیا۔ مغل حکومت بھی پوری طرح

جاگیردارانہ نظام پر مبنی تھی، مغل بادشاہوں کا نظریہ بادشاہت پورے طور سے اسی نظام کی عکاسی کرتا ہے اس لئے کہ ان کے نظریہ بادشاہت کا ایک اہم جزو توریٔ چنگیزی تھا۔ حد یہ ہے کہ مسلم معاشرے میں اورنگ زیب کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے اپنے دور حکومت میں اسلام کے احیاء کی کوشش کی اور اسی لئے اورنگ زیب کے نام کے ساتھ کچھ مسلمان رحمۃ اللہ علیہ کا بھی اضافہ کرتے ہیں، لیکن کیونکہ تاریخ کے بارے میں ہماری اپنی ہی سمجھ صحیح نہیں لہذا ہماری سمجھ عہد اورنگ زیب کے بارے میں بھی تاریخی حقائق کے مطابق نہیں۔ شبلی نعمانی کی کتاب ''اورنگ زیب پر ایک نظر'' اسی متضاد فکر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اورنگ زیب نے بھی جس نظریہ بادشاہت کی اتباع کی وہ وہی تھا جو اس کے مورث بابر ہمایوں اور اکبر نے قائم کیا تھا۔ اور شکل بھی وہی پرانی نماز، روزہ اور زکوۃ کی پابندی، حج شامل نہ تھا۔ اس لئے سلاطین دہلی یا مغل بادشاہوں میں سے کسی نے بھی حج نہیں کیا۔ سیاست یا سیاسی اداروں کا کوئی تعلق اسلام سے نہ تھا۔ بادشاہت موروثی، زمینداری موروثی، جو مساجد مغل بادشاہوں نے تعمیر کیں وہاں مغل بادشاہوں نے امامت بھی موروثی کر دی۔ جو وقف نامے مسلم زمینداروں نے کئے اس میں جائداد کے تحفظ کے لئے متولی، پسر اکبر کو بنا دیا گیا اور باقی اولاد کو محروم کر دیا جو شریعت کے کھلم کھلا خلاف تھا، شریعت نے شوہر کی جائداد میں زوجہ کا حق قائم کیا ہے لیکن اگر کوئی کشمیری مسلمان، غیر کشمیری مسلم عورت سے شادی کرتا ہے تو اس کی زوجہ کو اس کے شوہر کی کشمیر میں واقع جائداد سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ لہذا زیادہ تر مسلمانوں نے سیاسی اور زمین سے جڑے مفادات کو شریعت کے مقابلے میں فوقیت دی۔

جاگیردارانہ نظام کی بنیاد تفریق پر تھی اسلام تفریق میں یقین نہیں رکھتا۔ جاگیردارانہ نظام کا زیادہ تر انحصار زمینی پیداوار پر تھا اور اس کا اصول یہ تھا کہ کسان سے زیادہ سے زیادہ لگان وصول کیا جائے۔ اسلام نے لگان کے اصول وضوابط بنائے جن کی مسلم حکمرانوں نے اپنے مال گزاری کے نظام کے سامنے کوئی پروانہ کی۔ جاگیردارانہ نظام کی بنیاد ہی کسانوں کے استحصال پر تھی۔ جاگیردارانہ نظام کا دوسرا اہم ادارہ زمینداری تھا۔ زمیندار کا انحصار بھی کسان پر تھا اور یہ کہ جتنا زیادہ سے زیادہ ان سے وصول کیا جا سکے۔ جو کسان دن رات محنت کرتا اس کو سب سے کم حصہ پیداوار میں سے ملتا ہے کسانوں کا اس طرح استحصال مغل حکومت کے زوال کا کافی حد تک ذمہ دار

تھا۔ لیکن ہندوستان میں علماء و مشائخ اس دور میں بھی اور آج بھی مغل حکومت کے زوال کی ذمہ داری افراد میں تلاش کرتے ہیں اور طرح طرح کی تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ کچھ کا تو کہنا ہے کہ اورنگ زیب ہی مغل حکومت کے زوال کا ذمہ دار تھا۔ اس جاگیردارانہ نظام میں کمزوری جہانگیر کے عہد سے ہی نمودار ہوگئی تھی اور اورنگ زیب کے عہد میں بہت واضح صورت میں سامنے آگئی تھی حکمرانوں کی کوتاہیاں تو تھیں ہی لیکن اس سے زیادہ جاگیردارانہ نظام خود ہی شکستگی کی طرف مائل بہ زوال تھا۔ ہاں تیرتھ یاترا ٹیکس لگانا اور جزیہ کا لگانا جیسے اقدامات اورنگ زیب کے صحیح نہ تھے۔ ہمارے مورخین اور علماء نے اورنگ زیب کے ان اقدامات کو مذہبی اقدامات مانا۔ جیسا کہ یہی رائے مولانا شبلی نعمانی کی بھی ہے لیکن تیرتھ یاترا نام کے ٹیکس کا کوئی ذکر اسلامی فقہ میں ہے ہی نہیں تو پھر یہ کیسے اسلامی ہوگیا۔ مدرسہ رحیمیہ کے فارغ سر سید احمد خاں نے اورنگ زیب کے نفاذ جزیہ پر سخت تنقید کی ہے اور اسی پالیسی نے ہندو مسلم نفرت کو بڑھاوا دیا۔

دوسرا مسئلہ اہم یہ تھا کہ اس دور کے علماء و مشائخ انگلینڈ اور یوروپ میں آرہی انقلابی تبدیلیوں سے قطعی طور پر واقف نہ تھے۔ ان تبدیلیوں نے جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ کردیا۔ نادرشاہ یا احمد شاہ ابدالی کا ہندوستان پر حملہ حالات کا کوئی حل نہیں ہوسکتا تھا اس لئے کہ جن علاقوں سے یہ حملہ آور آئے وہاں کی حکومتیں بھی مغل حکومت کے ساتھ ساتھ ختم ہوگئیں۔ جاگیردارانہ نظام میں اٹھارہویں صدی میں کوئی روح نہیں پھونکی جاسکتی تھی اس کو تو ختم ہونا ہی تھا اور جو کوئی بھی نظام جب زوال پذیر ہوتا ہے تو اس کی شکستگی کا اثر اس سماج پر بھی پڑتا ہے۔ انگلینڈ اور یوروپ میں اہم تبدیلیاں آرہی تھیں اور ہندوستان میں بقول شاعر۔

صبح تو جام سے گذرتی ہے ۔ شب دل آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے ۔ اب تو آرام سے گذرتی ہے

یا بقول میر حسن دہلوی۔

جابجا سبزہ، تماشا باغ اور معشوق ڈے
خضر نے بھی عمر بھر دیکھا نہیں دلی شہر

یہ سب عکاسی کررہا ہے جاگیردارانہ زوال پذیر نظام کی۔ اور ان لوگوں کی فکر کی عکاسی کررہا ہے کہ جو ایسی تاریک دنیا میں کھوئے ہوئے تھے جس کا ترقی سے کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔ شاہ ولی اللہ

نے اپنے مکتوبات میں اس دور کے خراب حالات پر تبصرہ کیا ہے۔اور شاہ ولی اللہ، مرزا مظہر جان جاناں شاہ کلیم اللہ، شاہ فخر الدین اور خواجہ میر درد نے مسلمانوں میں اصلاح کی کوشش کی۔لیکن ان بزرگان دین نے سماج کی اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن یہ اصلاح سیاسی اصلاحات کے بغیر ناممکنات سے تھی اس لئے کہ جب سیاسی نظام جاگیردارانہ ہو تو اس میں آپ سماج کی اصلاح نہیں کر سکتے۔دراصل خلافت کے زوال کے بعد علماء کی ایک بڑی تعداد نے اپنے آپ کو مسلم سلاطین و بادشاہوں کے ساتھ کر لیا اور کم تعداد نے اس سلطنت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔لیکن نقصان دونوں رویوں سے پہونچا۔اس لئے کہ علماء کی ذہن و فکر جاگیردارانہ نظام سے ہٹ کر معاملات پر غور نہ کر سکی اور نہ ہی کر رہی ہے اس لئے کہ آج جن مسائل سے مسلمان دوچار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم ممالک میں اسلامی جمہوری نظام کے بجائے موروثی ملوکیت ہی ہے۔حالانکہ پاکستان میں بظاہر جمہوری نظام کا ڈھانچہ نظر آتا ہے لیکن فکر وہی جاگیردارانہ ہے۔اور کیونکہ فکر جاگیردارانہ ہے لہذا جمہوری قدریں پنپ ہی نہیں سکتیں۔لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم عوام اور مسلم ممالک جاگیردارانہ فکر کو ترک کر کے جمہوری فکر کو اپنانے کی کوشش کریں تب ہی اچھا سماج بن سکے گا اور ترقی حاصل ہو سکے گی۔

# حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کا عہد

مولانا محفوظ الرحمن شاہین جمالی ☆

عہد، انسان کے اردگرد نزدیک و دور تک پھیلے ہوئے ان زمانی حالات و واقعات کا نام ہے جو اس کی سیرت و کردار، اخلاق و عادات، اعمال و افکار اور شخصیت کی تعمیر و تخریب میں انتہائی موثر رول ادا کرتے ہیں۔ اس کا دائرہ، معاشرت، سیاست، مذہب، زبان و ادب تہذیب و تمدن، ثقافت و ثقاہت تک وسیع ہوتا ہے۔

تاریخ میں جن شخصیتوں کی عظمت و اہمیت ایک تسلیم شدہ حقیقت تصور کی جاتی ہے وہ زیادہ تر اپنے عہد کی پیداوار تھیں، عہد جاہلیت کے شعراء میں امرأ القیس، متنبی اور ابونواس کی ادب و شاعری اور فکر و خیال کی آوارگی اپنے عہد کی عکاس ہے۔ اور دور اسلام میں علی بن ابی طالب، حسان بن ثابت، عبداللہ بن رواحہ کے پاکیزہ ادبی افکار اپنے عہد کی حسین پرچھائیاں ہیں۔

پردۂ گیتی پر نمودار ہونے والی بیشتر شخصیتیں انفعال شخصیتیں ہوتی ہیں جو اپنے عہد کے اچھے یا بُرے اثرات لے کر نمایاں ہوتی ہیں۔ ان شخصیات کی تعمیر و تشکیل اور تحسین و تقبیح اپنے عہد کی منہ بولتی تصویر ہوتی ہیں۔ اگر ان میں خیر و خوبی کی نیرنگیاں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اپنے عہد ہی کی جلوہ سامانیوں کا نتیجہ ہیں اور اگر شر و فساد کا مرقع ہیں تو وہ بھی خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ کے رنگ بدلنے کی ایک مثال ہے ایسے لوگ تاریخ بنانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئے بلکہ خود تاریخ نے ان کو کسی قدر لائق یا نالائق بنا دیا۔ انفعالی شخصیتیں دراصل "دام ہر رنگ زمیں بود گرفتار شدیم" کا نمونہ ہوتی ہیں۔

---

☆ شیخ الحدیث مدرسہ امداد الاسلام [illegible]

دوسری طرف اسی تاریخ انسانی میں کچھ وہ لوگ بھی پیدا ہوئے ہیں جو عہد ساز شخصیت کے مالک رہے ہیں۔ ان کے عہد نے ان کی شخصیت کی آرائش و پرداخت میں کوئی موثر رول ادا نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے اپنی بیدار مغزی، فکری بلند پردازی اور خداداد صلاحیت اور فعال شخصیت ہونے کی بدولت اپنے عہد کے دھاروں کا رُخ موڑ دیا۔

اپنا مقام خود ہی بناتے ہیں اہل عشق
وہ اور ہوں گے جن کو زمانہ بنا گیا

انہی عہد ساز شخصیتوں میں ایک عظیم شخصیت امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ہے جن کے انقلابی افکار و نظریات اور اعمال و کردار نے زندگی کے تمام خاکوں میں رنگ و نور بھر دیا۔ اور سیاست و حکومت، تہذیب و تمدن، زبان و ادب، اخلاق و کردار، علوم و فنون، معاشرت و مصاحبت کے تمام فرسودہ نظاموں کو تارِ عنکبوت کی طرح شکست و ریخت سے دوچار کر کے تاریخ میں اپنی عبقریت کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کر دیا۔ ذیل میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے عہد کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے جس نے ان کے دل و دماغ میں اضطرابی کیفیت پیدا کر دی اور وہ اپنے عہد کے طوفانوں سے ٹکراتے ہوئے ساحل مراد تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

## شاہ صاحب کا مذہبی عہد:

شاہ صاحب نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں اس میں چاروں طرف خلاف شرع رسوم و رواج اور بدعات و خرافات کے گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ مشرکانہ عقائد و اعمال میں لوگ ڈوبے ہوئے تھے۔ دارالسلطنت دہلی کے ارد گرد عوامی جہالتوں کا دور دورہ تھا، جسے دیکھ کر ان کی روح تڑپ جاتی تھی۔ اپنی مشہور تصنیف ''الفوز الکبیر'' میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

وان کنت متوقفاً فی تصویر حال المشرکین وعقائدھم واعمالھم۔ فانظر الی حال العوام والجھلۃ من اھل الزمان خصوصاً من سکن منھم باطراف دارالاسلام کیف یظنون الولایۃ وماذا یخیل الیھم منھا۔ ومع انھم یعترفون لولایۃ الاولیاء المتقدمین یعدون وجود الاولیاء فی ھذا الزمان من قبیل المحال و یذھبون الی القبور والآثار

ويرتكبون انواعاً من الشرك، وكيف تطرق اليهم التشبيه والتحريف ففي الحديث الصحيح لتتبعن من كان قبلكم حذوا النعل بالنعل ومامن آفة من هذه الآفات الاقوم من اهل هذا الزمان واقعون في ارتكابها معتقدون مثلها عافانا الله سبحانه من ذلك (الفوز الكبير في اصول التفسير: ص: ۵)۔

اگر مشرکین کی صورت حال اور ان کے عقائد و اعمال کے بارے میں تمہیں کچھ تردد ہو تو اس زمانے کے عوام اور جاہلوں کے حالات پر ایک نظر ڈال لو۔ خاص طور پر ان میں سے جو لوگ دارالاسلام دہلی اور اس کے اطراف میں رہتے ہیں ان کو دیکھو کہ وہ ولایت کے سلسلے میں کیا کیا خیال و گمان رکھتے ہیں۔ باوجودیکہ یہ لوگ قدیم اولیاء کرام کی ولایت کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن موجودہ زمانے میں اولیاء کے وجود کو ناممکن تصور کرتے ہیں، اور قبروں اور بزرگوں کی نشانیوں کے پاس جاتے ہیں اور طرح طرح کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور یہ بھی دیکھو کہ ان لوگوں میں تشبیہ و تحریف نے کیسے راستہ بنالیا ہے (جو پچھلی گمراہ قوموں کا طریقہ رہا ہے، وہی ان میں ہو بہو پایا جاتا ہے) جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے کہ تم لوگ پچھلے لوگوں کے نقش قدم پر جوتے کے ساتھ کی طرح ہو بہو چل کر رہو گے، خلاصہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے عقائد باطلہ کی کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانے کے لوگوں میں نہ پائی جاتی ہو اور یہ لوگ بھی پچھلی گمراہ قوموں کی طرح فاسد اعتقاد نہ رکھتے ہوں، اللہ تعالیٰ ان سے ہم سب کو عافیت عطا فرمائے۔

## شاہ صاحب کا علمی عہد:

حضرت شاہ صاحب کا علمی عہد بھی بڑا عجیب وغریب تھا، فقہی اور مسلکی تعصب زوروں پر تھا۔ اہل علم کی دلچسپیاں فقہی موشگافیوں اور غیر مفید بحث و تکرار میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ کچھ دوسرے علماء وہ بھی تھے جو قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے شغف رکھنے کے بجائے منطق و فلسفہ اور یونانی علوم کے گھروندوں میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ اس صورت حال نے علوم شریعت پر جاں کنی کی کیفیت طاری کردی تھی۔ شاہ صاحب اپنی فاضلانہ تالیف ''تفہیمات الہیہ'' میں اہل علم کو جھنجھوڑتے ہوئے لکھتے ہیں:

بے وقوفو! تم یونانی علوم اور صرف ونحو و معانی میں پھنس کر رہ گئے ہو اور سمجھتے ہو کہ علم اسی کا نام ہے حالانکہ علم تو کتاب اللہ کی آیات محکمات ہیں یا پھر وہ سنت ہے جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ تم پچھلے فقہاء کی استحسانات اور تفریعات میں ڈوب گئے ہو تم کو خبر نہیں کہ حکم صرف وہ ہے، جو اللہ اور اس کے رسول نے فرمایا ہے۔ تم میں اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کسی کو نبی ﷺ کی کوئی حدیث پہنچتی ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میرا یہ عمل تو فلاں مذہب پر ہے نہ کہ حدیث پر اور پھر وہ حیلہ پیش کرتا ہے کہ حدیث کا فہم اور اس کے مطابق فیصلہ تو کاملین اور ماہرین کا کام ہے۔ اور یہ حدیث ائمہ سلف سے چھپی ہوئی تو نہ رہی ہوگی کہ انہوں نے اسے ترک کر دیا۔

جان رکھو یہ ہرگز دین کا طریقہ نہیں ہے۔ اگر تم اپنے نبی پر ایمان لائے ہو تو اس کا اتباع کرو خواہ کسی مذہب کے موافق ہو یا مخالف۔ (تفہیمات الٰہیہ: ص: ۲۱۰، ج ۱)

## شاہ صاحب کا سیاسی عہد:

شاہ صاحب کا سیاسی عہد انتہائی پیچیدہ اور گونا گوں مسائل سے بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف طوائف الملوکی، انارکی، لاقانونیت، لوٹ مار، قتل و غارت گری، فتنہ و فساد، انتشار و خلفشار، اختلاف و عناد کی گرم بازاری تھی۔ مغلیہ حکومت کی سطوتِ شاہی کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت و سیاست کا عہد جاہ و جلال ان کے انتقال کے بعد ہی رو بزوال ہو چکا تھا۔ بعد کے فرماں رواں اپنے اسلاف کے ناخلف اخلاف بن چکے تھے۔ ان کی دلچسپیاں محفل رقص و سرود، اور چنگ و رباب کی دھنوں اور بازار حسن میں دادِ عیش دینے تک محدود ہو چکی تھیں۔ ملکی انتظامات کس مپرسی کی حالت میں تھے۔ شراب و کباب ان کا مشغلہ بن چکا تھا۔ عوام کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہو چکی تھی۔ رعایا غربت و افلاس کے ہاتھوں برباد اور ستمگروں کے مظالم سے پامال ہو رہی تھی۔ انہی حالات میں شاہ صاحب نے نجیب الدولہ کے ذریعہ احمد شاہ ابدالی سے ہندوستان کے کئی ہندو راجاؤں کے ساتھ مل کر فوجی امداد کی درخواست کی تھی اور اس میں اس درجہ احتیاط ملحوظ رکھی گئی کہ یہ غیر ملکی تسلط اور شاہی ستم رانی کا سبب نہ بن جائے۔ شاہ صاحب نے لکھا۔

جب افواج شاہی کا گزر دہلی میں ہو تو اس وقت اس بات کا پورا انتظام و اہتمام ہونا

چاہیے کہ شہر سابق کی طرح ظلم سے پامال نہ ہو جائے۔ دہلی والے کئی بار لوٹ مار، ہتک عزت اور بے آبروئی کا تماشا دیکھ چکے ہیں، اسی واسطے مطلب برآری اور مقاصد میں تاخیر ہو رہی ہے۔ اخیر میں مظلوموں کی آہ بھی اثر رکھتی ہے اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ وہ کام جو تشنۂ تکمیل تھے مکمل ہو جائیں تو اس بات کی پوری تاکید و پابندی ہونی چاہیے کہ کوئی فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے جو ذمی کی حیثیت رکھتے ہیں تعرض نہ کرے۔ (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: ص: ۲۸)

## شاہ صاحب کا سماجی عہد:

شاہ صاحب کے عہد کا سماجی اور معاشرتی نقشہ اتنا گندہ ہو چکا تھا کہ اس میں پاکیزہ اخلاق کی جلوہ فرمائی کا تصور بھی مشکل تھا۔ اس کا اندازہ ان خطابات سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے حاکمانِ وقت اور اہل صنعت و حرفت سے فرمائے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اے امیرو! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذتوں میں ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے۔ کیا تم اعلانیہ شرابیں نہیں پیتے؟ اور پھر تم اپنے فعل کو برا بھی نہیں سمجھتے۔ تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لئے کھڑے کیے ہیں کہ ان میں زنا کاری کی جائے اور شرابیں ڈھالی جائیں۔ جوا کھیلا جائے۔ لیکن تم اس میں دخل نہیں دیتے اور اس حال کو نہیں بدلتے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

ارباب پیشہ، دیکھو امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے۔ تم اپنے رب کی عبادت سے خالی الذہن ہو چکے ہو اور تم اپنے فرضی معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو، تم مدار اور سالار کا حج کرتے ہو تم میں بعض لوگوں نے فال بازی اور ٹونا اور گنڈے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہی ان کی دولت ہے اور یہی ان کا ہنر ہے۔ یہ لوگ خاص قسم کا لباس اور جامہ اختیار کرتے ہیں خاص طرح سے کھانے کھاتے ہیں ان میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے۔ وہ اپنی عورتوں اور بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے تم میں بعض شراب خوری کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں اور تم ہی میں کچھ لوگ عورتوں کو کرایہ پر

چلا کر پیٹ پالتے ہیں یہ کیسا بد بخت آدمی ہے جو اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو برباد کر رہا ہے۔ (تفہیمات:ص:۲۱۷)

مسلمانوں کے عمومی حالات کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

"تمہارے اخلاق سو چکے ہیں، تم پر بیجا حرص و آز کا بھوت سوار ہو گیا ہے تم پر شیطان نے قابو پالیا ہے۔ عورتیں مردوں کے سر چڑھ گئی ہیں اور مرد عورتوں کے حقوق برباد کر رہے ہیں۔ حرام کو تم نے اپنے لئے خوشگوار بنالیا ہے اور حلال تمہارے لئے بدمزہ ہو چکا ہے۔ تم نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کر لئے ہیں جن سے دین کی اصل صورت مسخ ہو گئی ہے تم عاشوراء کے دن جھوٹی باتوں پر اکٹھے ہوتے ہو۔ اسی طرح شب برأت میں کھیل کود کرتے ہو۔ تقریبات کی دعوتوں میں تم نے حد سے زیادہ تکلف برتنا شروع کر دیا ہے۔ بیوہ عورتوں کو نکاح سے روکے رکھتے ہو"۔

(اقتباسات از الواح الصنادید: مصنفہ مولانا مفتی عطاء الرحمٰن صاحب قاسمی)

## عہد شاہی کا تجزیہ:

حضرت شاہ صاحب کے عہد کے یہی وہ حالات تھے جن میں انہوں نے بچپن جوانی اور زندگی کے باقی ایام گزارے اور بہت قریب سے سب کچھ دیکھا۔ جزئیات وکلیات کا احاطہ کیا اور دل ودماغ پر ان کی چوٹیں سہتے رہے اور ایک مرد آہن کی طرح حالات کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے اور اپنی عہد آفریں شخصیت کے بل پر وقت کے طوفانوں سے ٹکراتے رہے اور بالآخر ایک ایسی مستحکم چٹان بن کر ابھرے جس نے ہر سیلاب بلاخیز کا رُخ موڑ دیا۔

حضرت شاہ صاحب انفعالی شخصیت کے مالک نہیں تھے جو اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہو کر وجود میں آئی ہو بلکہ علامہ اقبال کے لفظوں میں ایک مردِ خود آگاہ تھے جو اپنے عہد وزمانہ کو دگر گوں کرنے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عہد کا علمی مزاج بدلنے کے لئے اپنے صاحبزادگان، تلامذہ، اور مصاحبین اور پچاس سے متجاوز علمی تصنیفات کا سلسلۃ الذہب قائم کر دیا جس نے وقت کے ہر غلط علمی فقہی، مذہبی ومسلکی رجحانات اور جہالت زدہ متصوفانہ تصورات کا خاتمہ کر دیا۔

سیاسی عہد کی بدمزاجیوں کو اپنے مجاہدانہ منصوبوں اور اس کے اصول وضوابط قائم کر کے بدلنے کی بھرپور سعی کی جس کے نتیجہ میں سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور ان کے بعد حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی، امام انقلاب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور محدث گنگوہی کی انگریز مخالف تحریک اور جہاد شاملی وتھانہ بھون کا واقعہ رونما ہوا۔ اور اس کے نتیجہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی تحریک ریشمی رومال اور اس کے بطن سے تحریک خلافت پیدا ہوئی جس نے آخری دور میں گاندھی جی کے ساتھ مل کر جہاد حریت کی شکل اختیار کی اور انگریزوں کی غلامی سے ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی۔

اپنے سماجی عہد کے حالات کو بدلنے کے لئے حضرت شاہ صاحب نے بالغ نظر علماء اور ماہرین شریعت کی ایسی کھیپ تیار کی جن کی کوششوں سے غلط رسوم ورواج بدعات وخرافات کا قلع قمع ہوگیا اقتصادی عہد کی بدحالیوں کا علاج معاشی اصول وقواعد مقرر فرما کر اس طرح کیا کہ پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہوگیا۔ فضول خرچیوں کا سد باب ہوگیا۔ اور اسباب معیشت کی تلاش کا لوگوں میں صالح جذبہ پیدا ہوگیا۔ اور قناعت پسندی اور سادہ زندگی گزارنے کا عمومی ذہن بن گیا۔ دولت کی منصفانہ تقسیم کے نظام کو بروئے کار لا کر چند مٹھیوں میں دولت کے ناجائز ارتکاز کا یکسر خاتمہ کردیا۔ فکر ولی اللہی کے شارح مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

> ”میں نے شاہ صاحب کے فکر کی روشنی میں اسلام کا معاشی فکر اسٹالن کے سامنے پیش کیا تو وہ بہت متاثر ہوا۔ (شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک: ص:۱۵)

خلاصہ یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اپنے عہد سے کچھ نہیں لیا بلکہ اپنے عہد بد کو صالح عہد بنا کر اس پر وہ احسان عظیم فرمایا جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

یہاں اپنی بات ختم کرتے ہوئے اس واقعہ کا اظہار مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی اصلاحی اور انقلابی کوششوں اور ان کے نتائج اور بنیادی اصول وضوابط کی تفصیلات راقم السطور کی کتاب ”دارالعلوم دیوبند کی تاریخ سیاست“ میں دیکھ لی جائیں یہاں اس کے نقل کی نہ وقت اجازت دیتا ہے نہ زیر نظر موضوع کیونکہ۔

دامان نگہ تنگ گل حسن تو بسیار
گلچیں بہار توز داماں گلہ دارد

# فقہی اختلافات میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کا معتدل موقف

مولانا محمد فہیم اختر ندوی☆

## فقہی اختلاف کی حقیقت اور اس کا پس منظر:

۱- قرآن وسنت کی شکل میں احکام شریعت کا جو مجموعہ امت کو عطا کیا گیا اس کے دو حصے ہیں، ایک حصہ ایسے منصوص احکام کا ہے جنہیں قرآن یا حدیث میں ان کی جزئیات کی تفصیل کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے، جیسے میراث کے احکام (۱) محرمات خواتین جن سے نکاح حرام ہے (۲) ۔ قصاص کے بعض احکام (۳) وغیرہ۔ دوسرا حصہ ایسے احکام کا ہے جن میں صرف اصولی ہدایات دی گئی ہیں، یہ حصہ بہت بڑا اور وسیع ہے اور یہی فکر وفہم کے اختلافات کی جولانگاہ ہے۔

۲- یہ ممکن تھا کہ قرآن وحدیث میں احکام شریعت کو مکمل جزوی تفصیل کے ساتھ قطعی صورت میں محفوظ کردیا جاتا، تاکہ کسی مسئلہ میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ رہتی، لیکن جس طرح اللہ کی مشیت یہ نہیں ہوئی کہ تمام اولاد آدم ایمان کے دائرہ میں آجائیں، چنانچہ قرآن میں بتایا گیا:

ولوشاء ربك لآمن من في الأرض كلهم جميعاً (۴) ۔ (اور تمہارے رب کی مشیت ہوتی تو زمین کے تمام لوگ ایمان لے آتے)

اسی طرح اللہ کی مشیت یہی رہی کہ احکام شریعت کے اس دوسرے حصہ میں فکر انسانی کا اختلاف برقرار رہے۔ مالکی مفسر وفقیہ امام ابوبکر ابن العربی نے آیت کریمہ "واعتصموا

---

(۱) نساء:۱۱-۱۲۔ (۲) نساء:۲۳۔ (۳) مائدہ:۴۵۔ (۴) یونس:۹۹۔

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی، دہلی۔

بحبل الله جميعاً ولاتفرقوا"[1] کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے: "أما الاختلاف في الفروع فهو من محاسن الشريعة لقوله عليه السلام: اذا اجتهد الحاكم فأصاب فله اجران واذا اجتهد فأخطأ فله أجر واحد"[2] (فروعی مسائل میں اختلاف شریعت کے محاسن میں سے ہے اس لئے کہ فرمان نبوی ہے: جب حاکم اجتہاد کرے اور صحیح حکم تک پہنچے تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے، اور اجتہاد کرے اور غلطی کر جائے تو اس کے لئے ایک اجر ہے)

۳- عہد رسالت میں صحابہ کرام کے درمیان احکام نبوی کے فہم میں اختلاف ہوا، یہ اختلاف حضور رسالت مآب ﷺ میں پیش کیا گیا اور آپ ﷺ نے اختلاف پر نکیر نہیں فرمائی، بلکہ معاملہ کے ہر دو فریق میں سے کسی کو برسر غلط نہیں ٹھہرایا، چنانچہ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خندق کے سال صحابہ کرام سے فرمایا:

"لايصلين احد العصر إلا في بني قريظة فادركتهم صلاة العصر في الطريق فقال بعضهم لانصلي إلا في بني قريظة وقال بعضهم لم يرد منا هذا فصلوا في الطريق فلم يعب واحدة من الطائفتين"[3] (ہر شخص عصر کی نماز بنی قریظہ میں پڑھے، راستہ میں ہی عصر کا وقت آ گیا، تو کچھ صحابہ نے کہا: ہم تو بنی قریظہ میں ہی نماز پڑھیں گے، کچھ دوسرے صحابہ نے کہا: حضور ﷺ کی مراد ہم سے یہ نہیں تھی چنانچہ ان لوگوں نے راستہ میں نماز پڑھی، آپ ﷺ نے دونوں میں سے کسی جماعت کو غلط نہیں کہا)۔

۴- امت کا پہلا عادل طبقہ صحابہ کرام کا ہے، حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد صحابہ کرام مملکت اسلامیہ کے مختلف شہروں میں حکم نبوی کی تعمیل کے لئے پھیل گئے کہ "ألا فليبلغ الشاهد الغائب"[4] (سن لو! ہر موجود شخص غائب شخص تک پہنچا دے) صحابہ کرام نے منصوص مسائل میں قرآن وسنت سے حکم بتایا، لیکن زندگی کے روز بروز پیدا ہونے والے نئے نئے مسائل میں ان کے پیش نظر چند اصولی ہدایات تھیں:

---

(۱) آل عمران: ۱۰۳۔

(۲) الاحکام الصغری بحوالہ المدخل الفقہی العام، مصطفی الزرقاء ۱/ ۲۷۰۔

(۳) رفع الملام عن الائمۃ الاعلام مطبوع بر کتاب الانصاف للمرداوی ۲۳۶/۱۔

(۴) ترمذی، ابوداود،

اول: اجتہاد اور غور وفکر: چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ کرتے وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"كيف تقضي اذا عرض لك قضاء قال: أقضي بكتاب الله، قال: فان لم تجد في كتاب الله؟ قال: فبسنة رسول الله، قال: فان لم تجد في سنة رسول الله؟ قال: أجتهد رأيي ولا آلو"[1] (اگر تمہارے سامنے کوئی مسئلہ آئے تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا: میں اللہ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا، پوچھا: اگر کتاب اللہ میں تمہیں حکم نہ ملے؟ فرمایا: پھر رسول اللہ کی سنت سے کروں گا، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تمہیں رسول اللہ کی سنت میں حکم نہ ملے؟ تو انہوں نے کہا: میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہیں کروں گا)۔

دوم: اجتماعی مشورہ: چنانچہ اس طرح کی صورت حال کے بارے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے انہیں اجتماعی مشورہ کرنے کا حکم دیا، حدیث میں ہے:

"قلت يا رسول الله! الأمر ينزل بنا، لم ينزل فيه القرآن ولم تمض فيه منك سنة فقال: أجمعوا العالمين من المومنين فاجعلوه شورى بينكم ولاتقضوا فيه برای واحد"[2] (میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمارے سامنے مسائل آتے ہیں جن کے بارے میں نہ قرآن میں کچھ نازل ہوا ہے نہ اس بارے میں آپ کی سنت پائی گئی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: مومنوں میں سے اہل علم کو جمع کرو اور باہمی مشورہ سے فیصلہ کرو، اس میں انفرادی رائے سے فیصلہ مت کرو)۔

سوم: قیاس: حضرت عمرؓ نے نئے مسائل کے بارے میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کو خط لکھ کر قیاس کا حکم دیا، فرمایا:

"الفهم الفهم فيما تلجلج في صدرك مما ليس في كتاب الله ولاسنة النبي ﷺ، ثم اعرف الأشباه والأمثال فقس الأمور عند ذلك بنظائرها واعمد إلى احبها إلى الله واشبهها بالحق فيما ترى فاتبعه"۔ (تمہارے دل میں جوایسے مسائل کھٹکیں ان میں خوب غور کرو جن کے بارے میں نہ قرآن میں کچھ ہے اور نہ نبی ﷺ کی سنت میں

(۱) طبرانی فی الاوسط بحوالہ المدخل ار۲۰۷۔

(۲) اعلام الموقعین ۱؍۶۵

حکم ہے، پھر مشابہ اور ہم مثل احکام کو پہچانو، پھر مسائل کو ان کے نظائر پر قیاس کرو، پھر جو حکم اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ اور تمہاری نظر میں حق کے زیادہ مشابہ ہو، اسے اختیار کرو)۔

ان اصولی اور رہنما ہدایات کے مطابق جب صحابہ کرام نے نئے مسائل پر احکام شرع کی تطبیق کی تو مختلف اسباب کے تحت ان کی آراء میں اختلاف ہوا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ثم إنهم تفرقوا في البلاد وصار كل واحد مقتدى ناحية من النواحي فكثرت الوقائع ودارت المسائل فاستفتوا فيها فأجاب كل واحد حسبما حفظه أو استنبط وإن لم يجد فيما حفظه أو استنبط مايصلح للجواب اجتهد برأيه وعرف العلة التي أدار رسول الله ﷺ عليها الحكم في منصوصاته فطرد الحكم حيثما وجدها لايألو جهداً في موافقة غرضه عليه الصلوة والسلام فعند ذلك وقع الاختلاف بينهم على ضروب" (۱) (پھر وہ ملکوں میں پھیل گئے، اور ہر ایک اپنے علاقہ کا مقتدا ہوا، تو کثرت سے مسائل پیش آئے اور سوالات ہوئے تو ان سے استفتاء کیا گیا، ہر ایک نے اپنی یادداشت یا استنباط کے مطابق جواب دیا، اگر اپنی یادداشت کے ذخیرہ یا استنباط میں جواب کے لائق نہیں ملا تو اپنی رائے سے اجتہاد کیا اور اس علت کو پہنچانا جس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنی منصوصات میں حکم کی بنا رکھی تھی، تو جہاں بھی وہ علت ملی وہی حکم وہاں جاری کیا اور اس میں غرض نبوی ﷺ تک پہنچنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، تو اس موقع پر ان میں چند شکلوں پر اختلاف ہوا)۔

۵۔ صحابہ کرام سے تابعین نے دین کا علم حاصل کیا اور پھر اسے بعد والوں تک منتقل کیا، ساتھ ہی مزید پیدا ہونے والے نئے مسائل میں اجتہاد و استنباط سے کام لیا، اور اس کے لئے مناہج اور اصول و ضوابط مقرر کئے، یہ مناہج اور اصول و ضوابط باہم مختلف تھے، چنانچہ تابعین کے درمیان فروعی مسائل میں اختلاف زیادہ بڑے پیمانہ پر ہوا، شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

"وبالجملة فاختلفت مذاهب أصحاب النبي ﷺ وأخذ عنهم التابعون......

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ۱؍۱۴۱۔

فعند ذلك صار لكل عالم من علماء التابعين مذهب على حياله"[1] (خلاصہ یہ ہے کہ اصحاب نبی ﷺ کے مذاہب مختلف ہوئے، ان سے تابعین نے اخذ کیا...... تو اس وقت علماء تابعین میں سے ہر عالم کا اپنے گرد ایک مکتب فکر ہوگیا)۔

۶- فروعی مسائل میں یہ اختلاف خیر القرون میں نہ صرف ناپسندیدہ نہیں سمجھا گیا بلکہ اختلاف کو ختم کرنے کی سیاسی کوشش کو سلف صالحین نے بالکلیہ مسترد کردیا، چنانچہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالک سے خواہش ظاہر کی کہ موطا کو کعبہ میں لٹکا دیا جائے اور پوری اسلامی قلمرو میں اسی کے مطابق عمل کو لازمی کردیا جائے تو امام مالک نے جواب دیا:

"یا أمیر المؤمنین! إن أصحاب رسول الله ﷺ اختلفوا فی الفروع فافترقوا فی البلدان و کل عند نفسه مصیب"[2] (اے امیر المؤمنین! رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کا فروعات میں اختلاف ہوا، وہ شہروں میں پھیل گئے، اور ہر ایک اپنے نزدیک درست ہے)۔

"یا امیر المؤمنین! إن اختلاف العلماء رحمة من الله علی هذه الأمة کل یتبع ما صح عنده و کل علی هدی و کل یرید الله"[3] (اے امیر المؤمنین! علماء کا اختلاف اس امت پر اللہ کی رحمت ہے۔ ہر ایک اپنے نزدیک صحیح روایت کی اتباع کرتا ہے۔ سب کے سب ہدایت پر ہیں اور سب اللہ کی مرضی چاہتے ہیں)۔

پانچویں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا:

"ما احب ان أصحاب محمد لایختلفون لأنه لو کان قولا واحد الکان الناس فی ضیق وإنهم أئمة یقتدی بهم، فلو أخذ رجل بقول أحدهم لکان فی سعة"[4] (میں یہ پسند نہیں کرتا ہوں کہ محمد ﷺ کے اصحاب میں اختلاف نہ ہوتا، اس لئے کہ اگر ایک ہی قول ہوتا تو لوگ تنگی میں پڑ جاتے، یہ سب ایسے ائمہ ہیں جو قابل اقتدا ہیں، اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کا قول اختیار کرلے تو اس کے لئے گنجائش ہوگی)۔

امام سفیان ثوری کہا کرتے تھے:

"لاتقولوا اختلف العلماء فی کذا وقولوا قد وسع العلماء علی الأمة بکذا"[5]

(۱) ایضاً ۱/۱۴۳۔ (۲) مالک لابی زہرۃ بحوالہ المدخل ۱/۲۷۰۔ (۳) ایضاً ۱/۲۷۰۔ (۴) ایضاً ۱/۲۷۰۔
(۵) المیزان الکبریٰ ۱/۲۸۔

(یہ مت کہو کہ علماء نے فلاں مسئلہ میں اختلاف کیا، بلکہ کہو کہ انہوں نے امت کو اس مسئلہ میں وسعت دی ہے)۔

ان امور بالا کا خلاصہ درج ذیل ہے:

الف۔ فروعی مسائل میں وحدت اور یکسانیت مشیت الٰہی نہیں رہی۔

ب۔ نبی اکرم ﷺ کی موجودگی میں جزوی مسائل میں اختلافات ہوئے اور آپ ﷺ نے اختلاف پر نکیر نہیں فرمائی۔

ج۔ صحابہ کرام اور ان کے بعد تابعین عظام کے ادوار میں جزوی مسائل میں اختلاف کا دائرہ وسیع ہوا، جو زمانہ کی رفتار کے ساتھ مختلف اسباب و عوامل کے تحت بڑھتا گیا۔

د۔ جزوی اور فروعی مسائل کے اس اختلاف کو سلف صالحین نے امت کے حق میں رحمت تصور کیا اور اس بات کو پسند نہیں فرمایا کہ پوری امت کو جزوی مسائل میں بھی کسی ایک رائے کا پابند کر دیا جائے، بلکہ اسے امت کے لئے باعث حرج و تنگی سمجھا۔

۷۔ اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ جزوی مسائل میں اختلاف رائے کی بنیاد شریعت میں موجود ہے اور یہ اختلاف مذموم نہیں بلکہ محمود ہے، یہی وجہ ہے کہ جب تابعین، تبع تابعین اور ان کے تلامذہ کے ادوار میں ائمہ مجتہدین نے عملی زندگی کے تمام ابواب کے لئے وسیع پیمانہ پر احکام شریعت اور فقہی احکام کا ذخیرہ مستنبط اور مرتب فرمایا تو نصوص شریعت سے واقفیت، علم و فہم کے درجات اور قوت ادراک کے فرق کی بنیاد پر ان مستنبط شدہ احکام میں وسیع تر دائرہ میں اختلاف ہوا۔

اجتہاد و استنباط کا یہ عظیم کام اسلامی مملکت کے مختلف شہروں میں مجتہدین فقہاء کے ذریعہ انجام پاتا رہا، جن میں نمایاں درج ذیل تھے:

مدینہ میں فقہاء سبعہ مشہور تھے، یعنی سعید بن المسیب، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، قاسم بن محمد بن ابوبکر، عروہ بن زبیر، سلیمان بن یسار، خارجہ بن زید بن ثابت اور عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، پھر ربیعۃ الرائے اور امام مالک۔

مکہ کے فقہاء تابعین میں عطاء، طاؤس بن کیسان، عمرو بن دینار اور عکرمہ تھے، ان کے بعد امام شافعی وغیرہ رہے۔

بصرہ میں حسن بصری، جابر بن زید، ابن سیرین اور زرارہ بن اوفی وغیرہ تھے۔

کوفہ میں علقمہ بن قیس، اسود بن یزید، عبداللہ بن عبداللہ بن مسعود، مسروق بن اجدع، قاضی شریح، ابراہیم نخعی، عامر شعبی، سعید بن جبیر، عامر بن شراحیل، حماد بن ابی سلیمان، ابوحنیفہ، ابن ابی لیلی، سفیان ثوری اور قاضی شریک وغیرہ تھے، ادھر بغداد میں امام احمد بن حنبل تھے، شام میں عبدالرحمن بن غنم، ابوادریس خولانی، عبدالرحمن بن جبیر، مکحول، عمر بن عبدالعزیز، عبدالملک بن مروان اور اوزاعی تھے۔

مصر میں صحابی رسول حضرت عمرو بن العاص کے بعد ان کے صاحبزادہ عبداللہ بن عمرو پھر مرثد مزنی، یزید بن ابی حبیب اور لیث بن سعد تھے۔

۸- یہ اور ان کے علاوہ بے شمار ائمہ اسلاف نے استنباط مسائل اور احکام شریعت کی توضیح کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، جو ان کے تلامذہ کے ذریعہ منتقل ہوتا رہا، لیکن ائمہ مجتہدین میں سے چار ائمہ عظام کو اللہ تعالیٰ نے ایسے باکمال شاگردوں سے نوازا اور سلسلہ بہ سلسلہ ان میں ایسے فقہاء وعلماء کبار پیدا ہوتے رہے جنہوں نے ان ائمہ کی آراء اور استنباطات کے ذخیرہ کو نہ صرف محفوظ ومدون کیا بلکہ ان میں کافی اضافہ بھی کیا، یہ ائمہ تھے: ابوحنیفہؒ (۱۵۰ھ) مالکؒ (۱۷۹ھ) شافعیؒ (۲۰۴ھ) اور احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ) ان چاروں فقہی مسالک میں بڑے بڑے محدثین اور فقہاء وعلماء پیدا ہوتے رہے جنہوں نے مختلف پہلوؤں سے اس ذخیرۂ احکام کی تنقیح وتدقیق اور خدمت انجام دی۔ چنانچہ اقوال ومسائل کی صحیح سند کے ساتھ روایت، مشہور کتابوں میں ان کی تدوین، محتملات میں راجح تعیین، عموم کی تخصیص، مطلق کی تقیید، مختلف فیہ مسائل میں جمع وتطبیق اور احکام کی علتوں کی توضیح کی عظیم خدمت آج ان مذاہب اربعہ کے علاوہ کسی اور مذہب میں نہیں ملتی ہے[(۱)]۔ اسی لئے ان چار مسالک کو امت میں قبول عام حاصل ہوا۔

ان مسالک اربعہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ رہی کہ ان میں بے شمار علماء فقہاء، مفسرین ومحدثین اور مجتہدین عہد بہ عہد ایسی عظیم خدمات انجام دیتے رہے کہ آج ان مسالک کے مسائل دلائل شرعیہ کی روشنی میں بہت ہی منقح ہوکر موجود ہیں، محققین علماء نے بے شمار مسائل میں مسلک کی منقول آراء سے اختلاف بھی کیا، اور مختلف آراء میں دلائل قویہ کی بنیاد پر ترجیح کا فریضہ انجام دیا

(۱) عقد الجید [illegible] ۱۲/۱

اور حالات زمانہ کی رعایت کے ساتھ اجتہادی احکام و مسائل میں تبدیلی بھی کی، اور علمی تحقیق وتنقید کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

## فقہی اختلاف میں شاہ ولی اللہؒ کا موقف:

ا۔ اسلام کا مزاج اعتدال اور میانہ روی کا ہے، رسول کریم علیہ السلام نے ہر ہر امر میں اعتدال وتوسط اپنانے کی تلقین فرمائی ہے، ارشاد گرامی ہے:

"إن الدين يسر ولن يشاد الدين إلا غلبه فسددوا وقاربوا وابشروا واستعينوا بالغدوة والروحة وشيء من الدلجة"(۱) وفي رواية القصد القصد تبلغوا۔ (دین آسان ہے، اور جو دین میں سختی کرے گا دین اس پر غالب آجائے گا، تو ٹھیک ٹھیک چلو، قریب قریب رہو، خوش خبری لو، صبح اور شام سے مدد لو اور کچھ رات کے آخری پہر سے، ایک روایت میں ہے، درمیانی راہ اختیار کرو پہنچ جاؤ گے)۔

اسلام کے اس مطلوب مزاج سے اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحب کو حظ وافر عطا فرمایا تھا، چنانچہ آپ کے مزاج وفکر میں طبعی اعتدال موجود تھا، دوسری جانب اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے مواقع عطا فرمائے کہ آپ نے چاروں فقہی مسالک کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا اور ان مسالک کے اساتذہ سے براہ راست کسب فیض کیا، اس راست اور عمیق مطالعہ کے نتیجہ میں آپ کی فکر ونظر میں اعتدال اور جامعیت پیدا ہوگئی تھی، یہ اعتدال اور جامعیت درج ذیل امور کی صورت میں بہت واضح طریقہ پر دیکھی جاسکتی ہیں:

الف۔ فقہی اختلاف کی حیثیت وحقیقت۔

ب۔ فقہی اختلاف میں طرز عمل۔

ج۔ فقہی مسالک میں جمع وتطبیق اور

د۔ اجتہاد وتقلید کے بارے میں نقطۂ نظر۔

ذیل کی سطور میں ان امور پر حضرت شاہ صاحب کی فکر اور موقف کی تفصیل پیش کی جارہی ہے۔

(۱) بخاری شریف۔

## الف۔ فقہی اختلاف کی حیثیت:

۲- فقہی اختلاف کی حیثیت متعین کرتے ہوئے شاہ صاحب نے تین باتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اول یہ کہ صاحب شریعت علیہ الصلوۃ والسلام سے اخذ شریعت دو طریقوں سے ہوا، ایک طریقہ ظاہری نقل روایت کا تھا جو آگے چل کر روایت احادیث اور اس کی اقسام کی شکل اختیار کرتا گیا۔ دوسرا طریقہ دلالتاً استنباط کا یعنی حضور ﷺ کے عمل کو دیکھ کر حکم مستنبط کرنے کا تھا جو آگے چل کر صحابہ کرام کے قیاسات اور قرآن وسنت سے ان کے استنباط کی شکل میں سامنے آیا (۱)۔

عہد نبوت کے بعد صحابہ کرام اسلامی شہروں میں پھیل گئے، ان میں ہر ایک اپنے علاقہ میں امت کا پیشوا تھا، ان کے سامنے مسائل آتے وہ قرآن وسنت سے حکم بتاتے اور اگر ان دونوں میں حکم نہ ہوتا تو استنباط و اجتہاد کرتے اور غرض نبوی علیہ السلام تک پہنچنے کی کوشش کرتے (۲)۔

تابعین نے صحابہ کرام سے قرآن وسنت اور صحابہ کے اقوال کو اخذ کیا، مختلف اقوال میں تطبیق اور ترجیح کا طریقہ اپنایا اور اس روشنی میں علاحدہ مکاتب فکر قرار پاتے گئے، یہی صورت ان سے اخذ کرنے والے تبع تابعین اور پھر ان کے تلامذہ کے یہاں پائی جاتی رہی (۳)۔

چوتھی صدی ہجری سے قبل تک [۱] کسی ایک معین مسلک کی پابندی رائج نہ تھی، عوام کا طرز عمل یہ تھا کہ اجتماعی اور متفق علیہ مسائل میں اپنے افراد خاندان اور اساتذہ وعلماء کو دیکھ کر عمل کرتے تھے اور نئے مسائل میں کسی پابندی کے بغیر جس عالم سے میسر آتا معلوم کر لیتے تھے، خواص میں کچھ اصحاب حدیث بھی تھے جن کے پاس احادیث رسول اور آثار صحابہ کا اتنا بڑا ذخیرہ ہوتا کہ ان کے عمل کے لئے کافی ہوتا، اگر کسی مسئلہ میں روایت مختلف ہوتی اور اقوال بھی متضاد ہوتے تو جس روایت پر فقہاء کا عمل ہوتا اسے اپنا لیتے، اگر یہ بھی مختلف ہوتا تو ترجیح سے کام لیتے (۴)۔ چوتھی صدی ہجری کے بعد مسلک معین کی تقلید خالص کا بعض مخصوص علمی حالات کی بنا پر رواج ہوا۔ یہ فقہی اختلاف کا تاریخی تسلسل تھا۔

۳- دوسرے یہ کہ اخذ شریعت کے مذکورہ دونوں طریقے اپنی اپنی جگہ درست ہیں اور دونوں

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ۱/۱۳۲۔ (۲) ایضاً ۱/۱۴۱۔ (۳) ایضاً ۱۴۳، ۱/۱۴۴۔ (۴) ایضاً: ۱/۱۵۲۔

کی اصل دین میں موجود ہے، وہ لکھتے ہیں:

"إن التخريج على كلام الفقهاء وتتبع لفظ الحديث لكل منهما أصل أصيل في الدين ولم يزل المحققون من العلماء في كل عصر يأخذون بهما"(۱) (فقہاء کے کلام پر تخریج اور لفظ حدیث کا تتبع دونوں کی پختہ اصل دین میں موجود ہے، اور ہر زمانہ میں محقق علماء ان دونوں کو اختیار کرتے رہے ہیں)۔

البتہ ان دونوں میں سے ہر طریقہ میں کچھ کمی اور خلل ہے جس کی تلافی دوسرے طریقہ سے ہوتی ہے، اور اس طرح کوئی ایک طریقہ دوسرے سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، لکھتے ہیں:

"وفي كل من الطريقين خلل إنما ينجبر بالأخرى، ولا غنى لاحداهما عن صاحبتها"(۲) (دونوں میں سے ہر طریقہ میں خلل ہے جس کی تلافی دوسرے طریقہ سے ہوتی ہے، ایک کو دوسرے سے استغناء نہیں ہے)۔

آپ نے ہر طریقہ کے خلل کی نشاندہی فرمائی اور دونوں طریقوں کو اختیار کرنا ضروری قرار دیتے ہوئے کہا:

"ولما كان الأمر كذلك وجب على الخائض في الفقه أن يكون متضلعا من كلا المشربين ومتبحرا في كلا المذهبين"(۳) (جب معاملہ ایسا ہے تو فقہ میں اترنے والے پر واجب ہے کہ وہ دونوں میدان کا ماہر اور دونوں طریقوں میں متبحر ہو)۔

۴-تیسرے یہ کہ طریقہ ومنہج کے فرق کی بنیاد پر فقہاء کرام میں جو فقہی اختلافات ہوئے ان میں سے بیشتر اختلافات میں اور بالخصوص جن امور میں صحابہ کرام کے اقوال دونوں جانب ملتے ہیں، ان میں اختلاف کی حیثیت محض کسی ایک قول کی ترجیح کی ہے، دونوں فریق کے نزدیک دونوں نقطۂ نظر ثابت ہیں، صرف راجح اور اولی کی تعیین میں اختلاف ہے(۴)۔

## ب۔ فقہی اختلاف میں طرز عمل:

۵-شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے نزدیک فقہی اختلاف میں دلائل دونوں جانب ہیں، اور

---

(۱) ایضا: ۱/۱۵۶۔ (۲) ایضا: ۱/۱۳۲۔ (۳) ایضا: ۱/۱۳۲۔ (۴) ایضا: ۱/۱۵۹۔

ایسے بیشتر مسائل میں اختلاف کی حیثیت محض اولیٰ اور غیر اولیٰ کی ہے، اس لئے آپ نے فقہی اختلاف میں معتدل راہ اور طرزِ عمل اپنایا ہے، اور سلف صالحین کی زندگیوں کے وہ روشن صفحات ہمیں دکھائے ہیں جن میں فقہی اختلاف کے ساتھ معتدل طرزِ عمل اور عملی رواداری کے تابناک نقوش ثبت ہیں اور اہلِ علم نے اختلافی مسائل میں شدت نہیں برتی بلکہ اپنی رائے کی مخالف صورت پر عمل کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھا، یہ طرزِ عمل صحابہ کرام کے یہاں بھی ملتا ہے اور ان کے بعد تابعین اور ائمہ مجتہدین بھی اسی روش پر گامزن رہے۔ چنانچہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے درمیان نماز میں بسم اللہ پڑھنے اور نہ پڑھنے، آمین اور تسمیہ کو بلند آواز یا آہستہ آواز میں پڑھنے، فجر میں دعائے قنوت پڑھنے اور نہ پڑھنے، پچھنہ، نکسیر اور قے کی وجہ سے وضوء کرنے اور نہ کرنے، اسی طرح شرمگاہ چھونے، عورت کو شہوت کے ساتھ چھونے، آگ پر پکی چیز کے کھانے اور اونٹ کا گوشت کھانے کی وجہ سے بھی وضو واجب ہونے اور نہ ہونے کے مسائل میں اختلاف رہا، اور دونوں رایوں پر عمل کیا جاتا رہا، لیکن اس اختلاف کے باوجود ایک رائے کے حاملین دوسری رائے کے ماننے والوں کے پیچھے بلاتکلف نماز پڑھتے تھے۔ امام ابوحنیفہ ان کے اصحاب، امام شافعی اور ان کے اصحاب مدینہ میں مالکی امام کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، حالانکہ وہ سرے سے بسم اللہ پڑھتے ہی نہ تھے، نہ آہستہ نہ بلند، خلیفہ ہارون الرشید نے پچھنہ لگوایا اور نماز پڑھائی، اس لئے کہ امام مالک نے وضو نہ ٹوٹنے کا فتوی دیا تھا، ان کے پیچھے امام ابویوسف نے نماز پڑھی، جبکہ امام ابویوسف کے نزدیک اس سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے، اور پھر نماز دوہرائی بھی نہیں۔ امام احمد بن حنبل کی رائے ہے کہ نکسیر اور پچھنہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، ان سے پوچھا گیا کہ اگر امام کو خون نکل آئے اور وضو نہ کرے تو آپ ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے؟ انہوں نے جواب دیا: بھلا میں کیسے امام مالک اور سعید بن المسیب کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتا ہوں۔ امام ابویوسف اور امام محمد عیدین کی نمازوں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تکبیر کہا کرتے تھے کیونکہ ہارون الرشید کو اپنے دادا کی تکبیر پسند تھی۔ امام شافعیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کی قبر کے قریب نماز پڑھی تو ان کے ادب میں قنوت چھوڑ دی اور فرمایا: ہم کبھی اہل عراق کے مذہب کی طرف بھی اتر آتے ہیں۔ ایک جمعہ کو امام ابویوسف نے نماز پڑھائی، جب نماز سے فارغ ہو کر لوگ چلے گئے تو انہیں بتایا گیا کہ جس حمام سے انہوں نے غسل کیا تھا اس میں ایک چوہیا مری ہوئی تھی، تو انہوں

نے فرمایا: تب ہم اہل مدینہ کے قول کو اختیار کر لیتے ہیں[1]

سلف صالحین کے اس معتدل اور روادارانہ طرزِ عمل کی وجہ سے ہی علماء کرام ہمیشہ اجتہادی مسائل میں مفتیوں کے فتاوی کو درست اور قاضیوں کے فیصلوں کو صحیح تسلیم کرتے تھے اور بسا اوقات وہ اپنے مسلک کے خلاف بھی عمل کرتے تھے۔

"ولذلک لم یزل العلماء یجوزون فتاوی المفتین فی المسائل الاجتهادیة ویسلمون قضاء القضاة ویعملون فی بعض الأحیان بخلاف مذهبهم"[2] (اسی لئے علماء ہمیشہ اجتہادی مسائل میں مفتیوں کے فتاوی اور قاضیوں کے فیصلوں کو درست مانتے رہے ہیں، اور بعض اوقات اپنے مذہب کے خلاف عمل کرتے رہے ہیں)۔

## ج۔ فقہی مسائل میں جمع و تطبیق:

۶۔ فقہی اختلاف کی حیثیت اور اختلافی مسائل میں سلف صالحین کے طرزِ عمل کے پیش نظر حضرت شاہ ولی اللہ محدث رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عمیق و وسیع مطالعہ، معتدل رجحان و فکر اور گہری بصیرت کے ساتھ فقہی مسالک میں باہمی رواداری کو فروغ دینے، فروعی مسائل میں بے جا تشدد اور تعصب کو ختم کرنے اور حدیث کی روشنی میں فقہی مسالک کے درمیان جمع و تطبیق کی شکل نکالنے کا عزم فرمایا، اس کے لئے آپ نے درج ذیل تین محاذوں پر کام کیا:

۷۔ اول: آپ نے مسالک اربعہ کی کتابوں اور ان کے مستدلات کے مطالعہ کی روشنی میں نیز نورِ غیبی کی مدد سے اپنے لئے ایک معتدل روش منتخب فرمائی۔ اس روش کا نام آپ نے "روشِ فقہائے محدثین" بتائی، لکھتے ہیں:

"وبعد ملاحظه کتب مذاهب اربعه واصول فقه ایشان احادیث که متمسک ایشان است قرار داد خاطر بمدد نور غیبی روش فقهائے محدثین افتاد"[3] (مذاہب اربعہ کی کتابوں، ان کے اصول فقہ اور جو احادیث ان کا مستدل ہیں ان

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ۱/۱۵۹۔

(۲) ایضاً: ۱/۱۵۹۔

(۳) الجزء اللطیف ۲۰۴، بحوالہ اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ ۲۵۔

کے مطالعہ کے بعد نور غیبی کی مدد سے فقہاء محدثین کی روش اختیار کرنے کی آمادگی دل میں ہوئی)۔

روش فقہاء محدثین کا مطلب یہ ہے کہ مجتہدین کے اقوال کو حدیث کے سامنے پیش کیا جائے، اور جو قول ظاہر و معروف حدیث کے موافق ہو اسے قبول کیا جائے، نہ تو مجتہدین کے اقوال سے استغناء ہو اور نہ ان اقوال پر حدیث سے صرف نظر کر کے اصرار کیا جائے، علم حدیث اور اقوال مجتہدین کے درمیان یہ جامعیت شاہ صاحب کی نظر میں مجتہد مطلق منتسب کا وصف و عمل ہوتا ہے، لکھتے ہیں:

"انه الجامع بين علم الحديث والفقه المروى عن اصحابه"[1] (یہ علم حدیث اور اپنے اصحاب سے مروی فقہ کا جامع ہوتا ہے)۔

مجتہد مطلق منتسب کی اس تعریف کے بعد کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں:

"فهذه طريقة المحققين من فقهاء المحدثين وقليل ماهم، وهم غير الظاهرية من اهل الحديث الذين لايقولون بالقياس ولا الاجماع وغير المتقدمين من اصحاب الحديث ممن لم يلتفتوا إلى أقوال المجتهدين أصلاً، ولكنهم أشبه الناس بأصحاب الحديث لأنهم صنعوا فى أقوال المجتهدين ماصنع أولئک فى مسائل الصحابة والتابعين"[2] (یہی فقہاء و محدثین میں سے محققین کا طریقہ ہے، اور ایسے لوگ بہت کم ہیں، یہ وہ اصحاب حدیث میں سے ظاہریہ نہیں ہیں جو قیاس اور اجماع کے قائل نہیں ہیں، اور نہ متقدمین میں سے وہ اصحاب حدیث ہیں جو مجتہدین کے اقوال کو سرے سے دیکھتے ہی نہیں ہیں، البتہ یہ لوگ اصحاب حدیث سے زیادہ مشابہ ہیں، اس لئے کہ یہ مجتہدین کے اقوال میں وہی عمل کرتے ہیں جو انہوں نے صحابہ و تابعین کے مسائل میں کیا)۔

٨-دوم: آپ نے چاروں فقہی مسالک کو یکساں درجہ میں اہمیت دی، اس کے لئے ایک طرف آپ نے ہر فقہی مسلک اور اس کے ابتدائی حاملین کی خصوصیات پر روشنی ڈالی اور اس کی اہمیت کا برملا اظہار فرمایا، امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں لکھا:

"كان عظيم الشان فى التخريج على مذهبه دقيق النظر فى وجوه التخريجات مقبلا على الفروع أتم إقبال"[3] (وہ نخعی کے مذہب پر تخریج میں عظیم

(١) عقد الجید ٤١ بحوالہ اصول فقہ ٢٥۔ (٢) ایضاً۔ (٣) حجۃ اللہ البالغہ ١٤٦

مرتبہ پر فائز تھے، وجوہ تخریجات میں بڑے باریک بیں اور فروعات کے استنباط میں ماہر تھے)۔

فیوض الحرمین میں مذاہب کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا کہ مذاہب دو معانی کے اعتبار سے حق ہوتے ہیں، ان میں سے ایک معنی جلی ہیں اور دوسرے معنی دقیق۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "میں بڑے غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ آج مذہب حنفی کو اس معنی دقیق کے اعتبار سے تمام مذاہب پر ترجیح حاصل ہے"۔[۱]

امام مالک کی کتاب "موطا" کے بارے میں لکھا کہ:

"الطبقة الأولى منحصرة في ثلاثة كتب: الموطا وصحيح البخاري وصحيح مسلم، قال الشافعي: أصح الكتب بعد كتاب الله مؤطا مالك"[۲] (طبقہ اولی میں صرف تین کتابیں ہیں: موطا، صحیح بخاری اور صحیح مسلم، امام شافعی نے کہا: قرآن کے بعد سب سے صحیح کتاب موطا امام مالک ہے)۔

آپ نے موطا کو حدیث کی کتابوں میں اول نمبر پر رکھا، اور خود اس کی شرح دو زبانوں میں لکھی، پہلی شرح عربی میں "المسوی" کے نام سے لکھی اور دوسری فارسی شرح المصفی لکھی۔

تیسرے فقہی مسلک مذہب شافعی کے بارے میں لکھا:

"وأما هذه المذاهب الأربعة فأقربها إلى السنة مذهب الشافعي المنقح المصفى"[۳] (ان مذاہب اربعہ میں سنت سے سب سے زیادہ قریب امام شافعی کا مذہب ہے جو منقح اور صاف ہے)۔

اسی طرح امام احمد بن حنبل کے بارے میں لکھا:

"وكان أعظمهم شاناً واوسعهم رواية واعرفهم للحديث مرتبة وأعمقهم فقها احمد بن محمد بن حنبل"[۴] (ان میں سب سے عظیم الشان، سب سے زیادہ وسیع الروایہ، حدیث کے مرتبہ سے سب سے زیادہ واقف اور سب سے عمیق تفقہ کے حامل امام احمد بن محمد بن حنبل ہیں)۔

۹- دوسری طرف آپ نے رسول اللہ ﷺ سے روحانی طور پر استفادہ کر کے بتایا کہ چاروں

(۱) فیوض الحرمین ص۱۰۲، بحوالہ اصول فقہ ۲۷۔ (۲) حجۃ اللہ البالغہ ۱/۱۳۳۔
(۳) الخیر الکثیر ۱۸۱، بحوالہ اصول فقہ۔ (۴) حجۃ اللہ البالغہ ۱/۱۵۰۔

فقہی مسالک برابر ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں ہے، لکھتے ہیں:

"سألته ﷺ عن هذه المذاهب الأربعة وبهذه الطرق أيها أولى عنده بالأخذ وأحب، ففاض على قلبي أن المذاهب والطرق كلها سواء ولافضل لواحد على الآخر"(۲) (میں نے رسول اللہ ﷺ سے ان مذاہب اربعہ اور ان طریقوں کے بارے میں دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک زیادہ بہتر اور پسندیدہ کون ہے، تو میرے قلب پر فیضان ہوا کہ یہ سارے مذاہب اور طرق برابر ہیں، کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں ہے)۔

۱۰۔سوم: آپ نے رسول اللہ ﷺ کا روحانی حکم پا کر ان چاروں فقہی مسالک کے درمیان باضابطہ تطبیق اور جمع کی کوشش فرمائی، قیام حرمین شریفین کے درمیان ملے اس حکم نبوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ثانيها الوصاة بالتقيد بهذه المذاهب الأربعة لا أخرج منها والتوفيق مااستطعت"(۲) (دوسری وصیت یہ ہے کہ ان مذاہب اربعہ سے پابند رہوں، ان سے نہ نکلوں اور حسب استطاعت ان میں توفیق انجام دوں)۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "نفحہ ثانیہ میں مجھ پر ظاہر ہوا کہ تیرے متعلق اللہ تعالیٰ کی مراد یہ ہے کہ امت مرحومہ کے مختلف ٹکڑوں کو تیرے ذریعہ جمع کر دے"۔(۳)

جمع و تطبیق کے اس نازک عمل کے لئے شاہ صاحب کے ذہن میں حق تک رسائی کی صلاحیت بھی القا کی گئی، وہ لکھتے ہیں:

"إن الله تعالىٰ جعل في قلبي وقتا من الأوقات ميزانًا اعرف به سبب كل اختلاف وقع في الملة المحمدية على صاحبها الصلوة والسلام وماهو الحق بالدلائل العقلية والنقلية بحيث لايبقى فيه شبهة ولاإشكال"(۴) (اللہ نے میرے دل میں کسی خاص وقت میں ایسا میزان رکھ دیا جس سے میں اس ملت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں ہونے والے ہر اختلاف کا سبب پہچان لیتا ہوں اور یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک حق کیا ہے؟ اور مجھے قدرت دی کہ میں اس کو عقلی اور نقلی دلائل سے اس طرح ثابت

---

(۱) تفہیمات ۲/ ۲۵۰، بحوالہ اصول فقہ ۲۸

(۲) فیوض الحرمین ۶۴، بحوالہ اصول فقہ ۲۸۔

(۳) ایضاً: ۳۹

(۴) حجۃ اللہ البالغۃ ۱/ ۱۶۹

کردوں کہ اس میں کوئی شبہ اور اشکال نہ رہ جائے)۔

حرمین شریفین سے واپسی کے بعد آپ نے چاروں فقہی مسالک کے درمیان تطبیق کی کوشش کا آغاز کیا لیکن ابتدائی مرحلہ میں اپنے ملک کے ماحول کے پیش نظر صرف فقہ حنفی اور فقہ شافعی کے درمیان تطبیق کی عملی کوشش فرمائی، کیونکہ یہاں کے ماحول میں انہی دونوں فقہی مسالک کے درمیان پائے جانے والے بعد کو ختم کرنے کی ضرورت تھی۔

"ان دونوں مسالک میں تطبیق کی صورت شاہ صاحب نے یہ اختیار فرمائی کہ ان دونوں کے فقہی مسائل کو فریقین کی تدوین کردہ کتب حدیث پر پیش کیا جائے، جو ان کے موافق ہوا سے باقی رکھا جائے، جو مخالف ہوا سے ساقط کر دیا جائے، متفقہ مسائل پر سختی سے عمل کیا جائے اور مختلف فیہ مسائل میں رواداری برتی جائے، ہر دو قول کو اختلاف قرأت کی طرح شمار کیا جائے اور دونوں پر عمل کو درست تصور کیا جائے، یا ایک کو رخصت اور دوسرے کو عزیمت پر محمول کیا جائے، یا یہ سمجھا جائے کہ کفارہ کے بیان کردہ طریقوں کی طرح عمل کے دو طریقے ہیں اور دونوں کو مباح سمجھا جائے"۔(۱)

پھر شاہ صاحب نے چاروں فقہی مسالک میں تطبیق کی عملی کوشش شروع فرمائی اور موطا کی فارسی شرح "المصفی" میں اسی نہج پر کام کیا، ڈاکٹر مظہر بقاء اپنی کتاب میں بتاتے ہیں:

"چنانچہ المصفی میں جو المسوی کے بعد کی تصنیف ہے، انہوں نے مذاہب اربعہ کے درمیان توفیق کی کوشش کی ہے"۔(۲)

شاہ صاحب نے اس شرح میں مذاہب اربعہ کے علاوہ دوسرے فقہاء و مجتہدین کے مذاہب نقل کرنے کا بھی اہتمام کیا ہے، اور مجتہد فیہ مسائل میں از روئے حدیث کسی ایک مذہب کو ترجیح دی ہے۔

بسا اوقات مذاہب اربعہ کے علاوہ متقدمین تابعین اور مجتہدین کے اقوال کو بھی اختیار کیا ہے، چنانچہ وضوء کے بعض مسائل میں حسن بصری کے مذہب اور روزہ کی قضاء کے بعض مسائل میں اسحاق بن راہویہ کا مذہب اختیار فرمایا ہے۔(۳)

(۱) تفہیمات ا/۱۱۱۔۲۱۰ بحوالہ اصول فقہ ۳۰۔ (۲) اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ صفحہ ۳۰۔

(۳) اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ ۳۱

اس طرز اور نقطۂ نظر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"ونحن نأخذ من الفروع مااتفق عليه العلماء ولاسيما هاتان الفرقتان العظيمتان الحنفية والشافعية وخصوصاً في الطهارة والصلوة، فان لم يتيسر الاتفاق واختلفوا فناخذ بما يشهد له ظاهر الحديث ومعروفه، ونحن لانزدري أحداً من العلماء فالكل طالبوا الحق ولانعتقد العصمة في أحد غير النبي ﷺ"[1] (ہم فروعات میں اسے اختیار کرتے ہیں جس پر علماء بالخصوص دو بڑے فرقے حنفیہ اور شافعیہ کا اتفاق ہو، خصوصاً طہارت ونماز میں، اگر اتفاق میسر نہ آئے تو ہم اسے اختیار کرتے ہیں جس کے حق میں ظاہر ومعروف حدیث ہو، ہم کسی بھی عالم کی تحقیر نہیں کرتے، سب کے سب حق کے طالب ہیں، اور ہم نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی کے معصوم ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتے)۔

اسی طریقہ کی وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بقدر امکان جمع میکنم درمذاهب مشهورة مثلا صوم وصلوة ووضوء وغسل وحج بوضع واقع می شود که همه اهل مذاهب صحیح دانند وعند تعذر الجمع بأقوی مذاهب از روئے دلیل وموافقت صریح حدیث می نمایم"[2] (روزہ، نماز، وضو، غسل اور حج جیسے مسائل میں بقدر امکان مذاہب مشہورہ کے درمیان جمع کرتا ہوں، کیونکہ تمام اہل مذاہب صحیح ہیں، اور جب تطبیق دشوار ہوتی ہے تو از روئے دلیل اور صریح حدیث کے موافق جو قوی مذہب ہو اسے اختیار کرتا ہوں)۔

۱۱۔ حدیث کی روشنی میں مسالک اربعہ کے درمیان توفیق وتطبیق کی حتی الوسع کوشش کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے حنفی مذہب کو بھی سنت سے مطابق کرنے کی جدوجہد جاری رکھی، اسی جدوجہد کا عملی طریقہ آپ نے درج ذیل بتایا:

"فقہ حنفی کے ساتھ سنت کی تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ کے اقوال میں سے کسی ایک کا قول لیا جائے، ان کے عام حکموں کی تخصیص کی جائے، ان کے مقاصد سے واقفیت بہم پہنچائی جائے اور لفظ سنت سے جو کچھ سمجھ میں آئے اس پر اس طرح اکتفاء کیا جائے کہ نہ اس میں تاویل

(۱) تفہیمات ۲/۲۰۲، بحوالہ اصول فقہ ۲۱۳۔ (۲) مکتوبات (کلمات طیبات) ۱۶۱ بحوالہ اصول فقہ ۲۱۳۔

بعید ہو نہ بعض احادیث کو بعض سے ٹکرانے کی نوبت آئے اور نہ امت کے کسی فرد کے قول کے مقابلہ میں کسی حدیث کو چھوڑنا پڑے، اس طریقہ کو اللہ تعالیٰ پورا فرمادے تو یہ کبریت احمر اور اکسیر اعظم ہے۔"[1]

## د۔ اجتہاد و تقلید کے بارے میں نقطۂ نظر:

۱۲۔ اجتہاد اور تقلید کا موضوع بڑا نازک اور اہم رہا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے ان دونوں کے درمیان معتدل راہ اپنائی ہے، اور امت کے مختلف افراد کو سامنے رکھ کر ان کے حسب حال اجتہاد یا تقلید کا حکم دیا ہے۔

اجتہاد کے بارے میں شاہ صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ اجتہاد ہر زمانہ میں فرض کفایہ ہے[2] اور ہر زمانہ میں کم از کم کسی مجتہد منتسب کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح تجزی اجتہاد کو بھی آپ درست قرار دیتے ہیں، لکھتے ہیں:

"ويجوز أن يكون مجتهداً في باب دون باب"[3] (یہ درست ہے کہ ایک باب میں مجتہد ہو دوسرے میں نہیں، شاہ صاحب نے چار قسم کے لوگوں کے لئے تقلید کو حرام قرار دیا ہے:

۱۔ وہ شخص جسے خود ایک گونہ اجتہاد کی صلاحیت حاصل ہو خواہ ایک ہی مسئلہ میں ہو۔

۲۔ جس کے سامنے رسول اکرم ﷺ کا کوئی حکم یا ممانعت صاف ظاہر ہو جائے اور اسے معلوم ہو جائے کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہے، پھر بھی اس حدیث کے خلاف کرے۔

۳۔ وہ عامی شخص جو کسی معین فقیہ کی تقلید اس اعتقاد کے ساتھ کرتا ہے کہ اس سے خطا ممکن نہیں اور دلیل اس کے خلاف ظاہر ہو جائے تب بھی اس کا قول ترک نہیں کرے گا۔

۴۔ جو شخص یہ جائز نہ سمجھتا ہو کہ مثلاً کوئی حنفی کسی شافعی سے مسئلہ پوچھ لے یا اس کی تقلید کر لے، اسی طرح اس کے برعکس۔[4]

جہاں تک تقلید کا تعلق ہے شاہ صاحب کے خیال میں نفس تقلید نہ صرف جائز ہے بلکہ تقلید کے جواز پر انہوں نے اجماع نقل کیا ہے، اس میں بھی انہوں نے مذاہب اربعہ کی تقلید میں بڑی

(۱) فیوض الحرمین ۶۲، بحوالہ اصول فقہ ۲۹۔ (۲) مقدمہ المصفی بحوالہ دعوت وعزیمت ۲۱۳/۵۔

(۳) عقد الجید ۸۶، بحوالہ اصول فقہ ۴۵۔ (۴) حجۃ اللہ البالغہ ۱/۱۵۵۔

مصلحت اوران سے اعراض میں بڑا مفسدہ قرار دیا ہے، لکھتے ہیں:

"إن هذه المذاهب الأربعة المدونة المحررة قد اجتمعت الأمة او من يعتد به منها على جواز تقليدها إلى يومنا هذا وفى ذلك من المصالح مالايخفى"[1] (یہ چاروں مذاہب جو مدون اور محفوظ ہیں، پوری امت یا امت کے قابل ذکر لوگوں کا اجماع ہے کہ ان کی تقلید آج تک جائز ہے، اور اس میں جو مصالح ہیں وہ مخفی نہیں ہیں)۔

لیکن تقلید کا یہ وجوب مذکورہ بالا چار قسم کے لوگوں کے علاوہ عامیوں کے لئے ہے، اور ان کے حق میں مذاہب اربعہ کی تقلید ضروری ہونے کی وجوہات اور اسباب بہت تفصیل کے ساتھ آپ نے بیان فرمائے ہیں[2] اس کے ساتھ ہی آپ نے تقلید میں ہمیشہ اعتدال پسندی ملحوظ رکھنے پر زور دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں کوئی صحیح حدیث یا قوی دلیل اس مذہب کے خلاف ملے تو اس مسئلہ میں تقلید کو ترک کر دینا چاہیے۔

عامیوں کے لئے اور اس اعتدال کے ساتھ تقلید کے بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"فهذا كيف ينكره أحد مع أن الاستفتاء والافتاء لم يزل بين المسلمين من عهد النبى ﷺ"[3] (کوئی شخص اس کا انکار کیسے کر سکتا ہے، جبکہ نبی کریم ﷺ کے عہد سے مسلمانوں کے درمیان استفتاء اور افتاء کا سلسلہ چلا آرہا ہے)۔

یوں تو عامی کے لئے شاہ صاحب مذاہب اربعہ کی تقلید تک محدود رہنا ضروری سمجھتے ہیں، لیکن جہاں تک مذہب معین کی پابندی کی بات ہے، شاہ صاحب کا خیال ہے کہ اگر خواہش پرستی اور اتباع ہوی نہ ہو تو مذہب معین کی پابندی ضروری نہیں ہے۔

## ۱۳۔ خلاصۂ بحث:

فقہی اختلاف میں شاہ صاحبؒ کے موقف کی یہ تفصیل تھی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ فقہی اختلاف عہد رسالت سے موجود ہے، اور مختلف اسباب کے تحت اس کا دائرہ بڑھتا رہا۔

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ۱/۱۵۴۔ (۲) عقد الجید ۳۱، ۳۲، ۳۳، بحوالہ دعوت وعزیمت ۵/۲۱۷۔

(۳) حجۃ اللہ البالغہ ۱/۱۵۶

اخذ شریعت کے دو طریقے جاری ہوئے اور دونوں کی اصل دین میں موجود ہے، البتہ
۲۔ ہر ایک طریقہ میں کچھ خلل ہے جس کی تلافی دوسرے طریقہ سے ہوتی ہے۔

۳۔ فقہی اختلافات دلائل پر مبنی ہیں اور بیشتر اختلافات محض اولی اور راجح کی تعیین کے ہیں۔

۴۔ سلف نے اختلافی مسائل میں شدت نہیں برتی بلکہ مخالف رائے پر عمل میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔

۵۔ فقہائے محدثین کی روش بہتر ہے جو اقوال مجتہدین کو اختیار کرتے ہیں اور حدیث پر انہیں پیش کرتے ہیں۔

۶۔ چاروں فقہی مسالک برابر ہیں، اور ہر ایک کی اپنی خصوصیت و اہمیت ہے۔

۷۔ حدیث کی روشنی میں مسالک اربعہ کے درمیان تطبیق و توفیق کی حتی الوسع کوشش ہونی چاہیے۔

۸۔ اجتہاد ہر زمانہ میں فرض کفایہ ہے اور جزوی اجتہاد بھی درست ہے۔

۹۔ ان چار قسم کے افراد ایسے ہیں جن پر تقلید حرام ہے۔

۱۰۔ تقلید جائز ہے اور عامیوں کے لئے مذاہب اربعہ کی تقلید میں ہی مصلحت ہے۔

۱۱۔ تقلید میں اعتدال پسندی ملحوظ رکھنی ضروری ہے۔

۱۲۔ اتباع ہوی نہ ہو تو مذہب معین کی پابندی ضروری نہیں ہے۔

یہ ہے فقہی اختلافات اور اجتہاد و تقلید کے درمیان شاہ صاحب کا انتہائی معتدل اور مدلل موقف جو اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ ان کی عظیم الشان تصنیفات میں موجود ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا موقف شریعت کے مصادر اصلیہ، صحابہ و تابعین کے عمل اور ائمہ مجتہدین کی روش سے ہم آہنگ ہے اور آج امت کے ٹوٹتے بکھرتے تانے بانے کو اس معتدل و روادارانہ موقف کی شدید ضرورت ہے، یہ پوری طرح واضح ہے۔

محدث دہلویؒ کا موقف ہمیں دعوت فکر و عمل دے رہا ہے۔

# حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فقہی امتیاز

مولانا اختر امام عادل☆

حضرت الامام شاہ ولی اللہ الدہلویؒ بارہویں صدی کی ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں ہیں، جنہوں نے زوال پذیر ہندوستان کی اسلامی علمی تاریخ کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ آپ نے ایک نئے عہد اور نئے دور کی بنیاد ڈالی، اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ کو نئی علمی اور عقلی بنیادوں پر تعمیر کیا۔ اسلامی ہند کے زوال سے لے کر سقوط تک بلکہ آج کی تاریخ تک یہاں جو کچھ علمی و دینی سرگرمیاں نظر آرہی ہیں وہ اسی خانوادۂ ولی اللہی کا فیض ہیں، فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

شاہ صاحب کی تجدیدی مساعی کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس شخص نے تنہا اتنے کام کئے ہیں کہ ان کو سمیٹنے اور مرتب کرنے کے لئے بھی مستقل ایک اکیڈمی کی ضرورت ہے۔ یوں تو شاہ صاحب کا ہر کارنامہ اپنی جگہ بہت اہم ہے، لیکن ان کارناموں میں بہت ہی اہم اور مشکل ترین کارنامہ فقہ و اجتہاد کے میدان میں ان کی تجدیدی مساعی کا ہے۔ شاہ صاحب جس دور میں پیدا ہوئے وہ تقلیدی اور فقہی تاریخ کے انتہائی انتشار اور زوال کا دور تھا، حالانکہ کچھ ہی دنوں قبل حضرت عالمگیر اورنگ زیب نے ایک مجلس فقہی قائم کرکے ''فتاوی ہندیہ'' (بالفاظ دیگر اسلامی ہند کا تحریری اسلامی دستور) کی تدوین کرائی تھی، جس میں حضرت شاہ صاحب کے والد ماجد اور شیخ و مربی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ بھی شریک رہ چکے تھے۔ (حیات ولی ۲۷۷ مرتبہ ابو محمد رحیم بخش)

---

☆ استاد دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد۔

# حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فقہی امتیاز

مولانا اختر امام عادل☆

حضرت الامام شاہ ولی اللہ الدہلویؒ بارہویں صدی کی ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں ہیں، جنہوں نے زوال پذیر ہندوستان کی اسلامی علمی تاریخ کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ آپ نے ایک نئے عہد اور نئے دور کی بنیاد ڈالی، اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ کو نئی علمی اور عقلی بنیادوں پر تعمیر کیا۔ اسلامی ہند کے زوال سے لے کر سقوط تک بلکہ آج کی تاریخ تک یہاں جو کچھ علمی و دینی سرگرمیاں نظر آرہی ہیں وہ اسی خانوادۂ ولی اللہی کا فیض ہیں، فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

شاہ صاحب کی تجدیدی مساعی کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس شخص نے تنہا اتنے کام کئے ہیں کہ ان کو سمیٹنے اور مرتب کرنے کے لئے بھی مستقل ایک اکیڈمی کی ضرورت ہے۔ یوں تو شاہ صاحب کا ہر کارنامہ اپنی جگہ بہت اہم ہے، لیکن ان کارناموں میں بہت ہی اہم اور مشکل ترین کارنامہ فقہ واجتہاد کے میدان میں ان کی تجدیدی مساعی کا ہے۔ شاہ صاحب جس دور میں پیدا ہوئے وہ تقلیدی اور فقہی تاریخ کے انتہائی انتشار اور زوال کا دور تھا، حالانکہ کچھ ہی دنوں قبل حضرت عالمگیر اورنگ زیب نے ایک مجلس فقہی قائم کرکے ''فتاوی ہندیہ'' (بالفاظ دیگر اسلامی ہند کا تحریری اسلامی دستور) کی تدوین کرائی تھی، جس میں حضرت شاہ صاحب کے والد ماجد اور شیخ و مربی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ بھی شریک رہ چکے تھے۔ (حیات ولی ۲۷۷ مرتبہ ابو محمد رحیم بخش)

☆ استاد دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد۔

## شاہ صاحب کے عہد کے بعض حالات:

لیکن صدیوں کا علمی وفکری جمود ایک عالمگیر کی چند روزہ کوششوں سے نہیں ٹوٹ سکتا تھا، اس کو توڑنے کے لئے کسی عظیم مجدد کے تیشۂ تجدید کی ضرورت تھی۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی کتاب ''تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ'' میں اس دور کے بعض حالات کا تذکرہ کیا ہے، ان کو پڑھ کر آج بھی احساسات میں جھرجھری پیدا ہو جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدیوں میں بعض خاص حالات خصوصاً اسلام کے اصلی سرچشموں یعنی قرآن وحدیث کی تعلیم سے اسلامی مدارس جس حد تک بیگانے ہوتے چلے گئے، بتدریج یہ اختلاف بہت غلط صورت اختیار کرتا چلا جاتا تھا۔ خصوصا ماوراء النہر (ترکستان اور خراسان) کے حنفی فقہاء کا غلو اس باب میں آہستہ آہستہ بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ اور ہندوستان میں وطن بنانے کے لئے اسلام جس راستہ سے آیا چونکہ وہ انہی ممالک کا راستہ تھا، اس لئے قدرتاً ہندوستانی مسلمان کی ذہنیت ان ہی ممالک کے علماء کی ذہنیت سے متاثر تھی۔ پھر نادری اور ابدالی حملوں نے جب اس ملک میں روہیلوں کے جدید عنصر کا اضافہ کر دیا تو تشدد وتصلب کی یہ شرارت دو آتشہ ہو چکی تھی۔ (ص ۲۲۱)

علامہ محسن بہاری الترہتی صاحب ''الیانع الجنی'' نے ان کا یہ نقشہ کھینچا ہے:

''وکانوا اشد قوم عصبية لما ينتحلونه من آراء فقهائهم رحمهم الله واشد الناسِ جموداً عليها'' (یعنی جن فقہاء کی پیروی کو ان لوگوں نے اپنا مشرب اور مسلک قرار دیا تھا، ان کے معاملے میں اپنے اندر سخت تعصب رکھتے تھے اور اس پر شدت سے جمے رہتے تھے)۔

کیدانی جیسی معمولی کتاب کی ایک فقہی روایت (یعنی ''چاہیے کہ تشہد میں اہل حدیث کے مانند شہادت کی انگلی نمازی نہ اٹھائے'') کو صدیوں یہ اہمیت حاصل رہی کہ اگر اتفاقاً نماز میں کسی کی انگلی اٹھ گئی تو اسی وقت اس کی انگلی تراش دی جاتی تھی، علامہ رشید رضا مصری نے ''مغنی'' کے مقدمے میں اپنا یہ بیان درج کیا ہے کہ:

''میں نے اپنے کان سے بعض افغانی طلبہ سے لاہور کی جامع مسجد میں جو ہندوستان

میں واقع ہے، یہ سنا ہے، میں نے دراصل ان سے یہ دریافت کیا تھا کہ (انگلی تراشنے کا قصہ) کیا صحیح ہے؟ اس کے جواب میں انہوں نے کہا ہاں! اور اس کی توجیہہ یہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور ترک سنت کی یہی سزا دی جاتی ہے ...... تمباکو جیسی غیر منصوص چیز کی حرمت وحلت پر جو جھگڑا سنا جاتا ہے پچھلے چند سالوں تک قصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ بیچارے کوٹہ ملا نے تمباکو کی حلت کا فتوی دیدیا تھا پھر مختلف جگہوں کے مجاہد دینی حمیت وغیرت کے نشہ میں چور اپنے علاقوں کے زیر کمان باضابطہ مسلح ہو ہو کر کوٹہ ملا پر چڑھ دوڑے، راستہ میں اس دینی جہاد کی مہم پر جو رجز پڑھا جاتا تھا، میرے ایک دوست نے ہم سے یہ بیان کیا تھا کہ وہ یہ تھا: ''کوٹہ ملا کا پردی جو ساک شدہ ہم کا پرڈے'' یعنی کوٹہ ملا کافر ہے اور جو اس کے ساتھ ہے وہ بھی کافر ہے'' میرے ایک اور سرحدی ہم سبق کہتے ہیں کہ تمباکو کی حرمت کے جو لوگ قائل تھے ان کا تشدد اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ جس کھیت میں تمباکو بویا جائے اس کھیت کے اطراف سے بیلوں پر غلہ لاد کر جو کوئی گزرے گا اس کا غلہ بھی حرام ہو جائے گا''۔

(تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ ۱۸۹)

الیانع الجنی کے مؤلف نے حضرت شاہ صاحب کے زمانہ کے حنفی روہیلوں کی ''حنفیت صلبہ'' یا ''سنگین ملایانہ حنفیت'' کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ:

''ان کا حال یہ تھا کہ جب ان کے کان میں کوئی ایسی بات پہنچتی جو ان کے اس تقلیدی امر کے خلاف ہوتی جسے کل وہ اچھا سمجھتے تھے تو خواہ کوئی ہوتا اس پر یہ چڑھ بیٹھتے، جس کے منہ سے ایسی مخالف بات نکلی ہوتی، غصہ اس کے مقابلے میں بھر جاتا، ان کی گردن کی رگیں پھول جاتیں، ان کے رخسار سرخ ہو جاتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ جھاؤ کی لکڑی کے انگارے ہیں۔ (ص ۸۳)

ہندوستان میں رہ پڑنے کے بعد اگرچہ ان کی پچھلی نسلوں میں وہ کرختگی اور تصلب تو باقی نہیں رہا، لیکن جواب تک ان ہی پتھریلے کوہستانوں میں رہتے ہیں ان کی دینی سختی جیسا کہ سید رشید رضا مصری نے لکھا ہے وہی ہے۔ لکھتے ہیں:

''ان کی سختیوں کی داستانوں میں ایک قصہ یہ ہے جو بعض افغانی حنفیوں کے متعلق سنا

جاتا ہے کہ اس نے جماعت میں اپنے برابر والے کو دیکھا کہ وہ سورہ فاتحہ (امام کے پیچھے) پڑھ رہا ہے، تو اس افغانی نے اس بیچارے فاتحہ پڑھنے والے کے سینے پر اس زور سے دوہتڑ مارا کہ وہ بیچارہ زمین کے بل گر پڑا۔ اور قریب تھا کہ مرجائے اور مجھے یہ خبر ملی کہ ایسے ہی ایک شخص نے تشہد کی انگلی نماز میں اٹھائی تو بعض افغانیوں نے اس کی انگلی توڑ دی۔" (مقدمہ مغنی ۱۶)

خود حضرت شاہ ولی اللہ بھی (جنہوں نے رد شیعیت پر ازالۃ الخفا اور قرۃ العینین جیسی کتابیں تحریر فرمائیں) ان کے ناوک تعصب سے محفوظ نہ رہ سکے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بیان فرماتے ہیں:

"شخصے از والد ماجد مسئلہ تکفیر شیعی پرسید، آنحضرت اختلاف حنفیہ کہ دریں باب است، بیان کردند چوں مکرر پرسید ہماں شنید، شنیدم می گفت ایں شیعی است"۔

یعنی ایک شخص نے والد ماجد سے شیعوں کی تکفیر کے متعلق سوال کیا، فقہاء حنفیہ کا اس باب میں جو اختلاف ہے والد ماجد نے اس کو بیان فرمایا، غریب روہیلہ "پہلی مرتبہ تو یہ سن کر خاموش رہا اور پھر دہرا کر ذرا اصرار سے اپنے منشاء کو ظاہر کرتے ہوئے جو اس نے دوبارہ وہی بات پوچھی تو جواب میں پھر وہی سنا، دوسری دفعہ اس کا یہ سننا تھا کہ آگ بگولہ ہو گیا، جن کو قطعی کافر سمجھتا تھا ان کے کفر کے متعلق پوچھتے پوچھتے الٹ کر وہ خود مفتی بن بیٹھا، شاہ صاحب فرماتے ہیں، میں نے سنا وہ کہتا تھا کہ یہ (یعنی شاہ ولی اللہ) شیعی ہے۔ (تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ ۱۹۲)

حضرت شاہ صاحب نے "الانصاف" اور "حجۃ اللہ" میں اپنے دور کے فقہاء کی جو تصویر کشی کی ہے اس سے بھی اس دور کے فقہی جمود اور غلو آمیز تعصب کا اندازہ ہوتا ہے۔ عربی عبارتوں سے مضمون کو گرانبار اور طویل کرنے کے بجائے ترجمہ و مفہوم پر اکتفاء کیا جاتا ہے:

"الانصاف" میں رقمطراز ہیں:

"اس زمانے میں فقیہ اس شخص کا نام ہے، جو باتونی ہو، زور زور سے ایک جبڑے کو دوسرے جبڑے پر پٹکتا ہو، جو فقہاء کے اقوال قوی ہوں یا ضعیف سب کو یاد کر کے بغیر اس امتیاز کے کہ ان میں سے کس میں قوت ہے اور کس میں نہیں، اپنے جبڑوں کے زور سے بیان کرتا رہے۔" (۹۳)

اوراسی گروہ کے متعلق دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

"ان کی بے تمیزیوں اور جہالت کا حال یہ ہے کہ طویل وضخیم کتب فتاویٰ میں جتنے اقوال ومسائل ہیں سب کو امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین کا قول سمجھتے ہیں، اوران اقوال میں یہ تمیز نہیں کرتے کہ فلاں قول ان ائمہ کا واقعی قول ہے اور فلاں قول ان کی رایوں اور فتوؤں کو سامنے رکھ کر بعد میں مستنبط کیا گیا ہے اور یہ جو ان کتابوں میں علی تخریج الکرخی کذا اور علی تخریج الطحاوی کذا کے الفاظ آیا کرتے ہیں، ان کو وہ گویا بے معنی سمجھتے ہیں، اسی طرح قال ابوحنفیہ کذا...... اور جواب المسئلة علی مذهب ابی حنیفة کذا...... کے درمیان وہ کوئی فرق وامتیاز نہیں کرتے، اور ابن الہمام وغیرہ محققین حنفیہ کا مسئلہ دہ دردہ اور مسئلہ شرط تیمم اور ایسے دوسرے مسائل کے بارے میں یہ فرمانا کہ دراصل یہ امام ابوحنیفہ کا قول نہیں ہے بلکہ بعد والوں کی تخریجات ہیں ان کے نزدیک بالکل ناقابل اعتناء ہے(۸۶)

بلکہ بہت سے لوگوں نے تو عزت ودولت، یا عہدہ ومنصب کے حصول کے لئے فقہ اور فتاویٰ کا شغل اختیار کر رکھا تھا...... فاصبح الفقهاء بعد ما كانوا مطلوبين طالبين وبعد ان كانوا اعزة بالاعراض عن السلاطين اذلة بالاقبال عليهم" (۸۱) "یعنی پھر یہ ہوا کہ یہ فقہاء پہلے مطلوب تھے اور اب طالب بن گئے، اور سلاطین سے دور رہنے کے باعث جو عزت ان کو حاصل تھی ان سے تعلق کی بنا پر وہ جاتی رہی"۔

یہ حالات تھے جن میں شاہ صاحب نے اپنی فقہی اور اجتہادی خدمات کا آغاز کیا، اجتہاد کا مفہوم واضح کیا، اس کے لئے ضروری شرائط اور دائرہ کی تحدید فرمائی، قرآن وحدیث سے مسائل کے اخذ واستنباط پر روشنی ڈالی، تقلید کی حقیقت سے بحث کی اور اس کے بارے میں نقطۂ عدل پیش فرمایا۔ فقہاء کے اختلاف کے اسباب اور ان کی شرعی حیثیت کو منقح کیا، اور مختلف ابواب فقہیہ میں پیدا شدہ شدتوں کو کم کرنے کی سعی بلیغ فرمائی وغیرہ۔

ایسا نہیں تھا کہ شاہ صاحب نے اسلاف سے ہٹ کر کوئی نئی بات پیش فرمادی تھی، باتیں وہی مگر تجزیہ وترتیب نئی تھی، حقائق وہی تھے، جو سابقہ فقہاء اور علماء نے بیان کئے تھے بس انہوں نے ان پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹا دیا تھا۔ اسی لئے شاہ صاحب نے اس تعلق سے کوئی بات محض

اپنے طور پر پیش نہیں کی، بلکہ اس کو قرآن وحدیث اور تحقیقات سلف سے مبرہن کیا، اور اسے معقول، جدید ترین سائنٹفک انداز میں پیش کیا کہ بڑے سے بڑے مدعیان علم وتحقیق کے لئے ان کا انکار کرنا مشکل ہے۔

## شاہ صاحب کا فقہی مسلک اور مقام:

حضرت شاہ صاحب کی شخصیت اس قدر ہمہ جہت اور آپ کی تحریرات اتنی متنوع ہیں کہ ان کے مسلک کا تعین حد درجہ پیچیدہ ہوگیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف اصحاب مسالک ان کو اپنا ہم نوا اور ہم مسلک ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر ایک کی تائید میں کچھ نہ کچھ عبارات مل ہی جاتی ہیں۔ نواب صدیق حسن خان نے ''اتحاف النبلاء'' میں لکھا ہے:

''اگر وجود او صدر اول در زمانہ ماضی می بود امام الائمہ وتاج المجتہدین شمردہ می شد
(ظفر المحصلین ۵۸)

(اگر شاہ صاحب کا وجود گزشتہ زمانہ میں صدر اول میں ہوتا تو مجتہدوں کے پیشوا اور سرتاج مانے جاتے اور امام الائمہ کا گرانقدر خطاب پاتے)۔

مشہور مورخ حکیم مولانا سید عبدالحی صاحب نے بھی اپنی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' میں شاہ صاحب کو امام الائمہ اور ''آخر المجتہدین'' قرار دیا ہے۔ (الاعلام بمن فی تاریخ الہند من الأعلام ۴۱۰۔ ج ۶) اور بڑے بڑے معاصر اور اکابر کے خیالات شاہ صاحب کے مناقب میں پیش کیے ہیں۔

## شاہ صاحب کے بارے میں مجتہد منتسب کی رائے:

ان کے علاوہ اور بھی کئی حضرات نے شاہ صاحب کو مجتہد اور امام وغیرہ کے القاب سے یاد کیا ہے، اگرچہ اس تعبیر کا ہمارے عرف میں خاص اصطلاحی مجتہد کے ہم معنی ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ ہر ایسے شخص کے لئے اس کا اطلاق کیا جاتا۔ جو عہد ساز اور انقلابی کارنامہ انجام دے، اور جو علمی وفکری طور پر امت کے لئے ایک بڑے طبقے پر اثر انداز ہو، مگر شاہ صاحب کو بعض حضرات

نے فقہی اصطلاح میں بھی مجتہد تسلیم کیا ہے اور ان کی خدمات علمیہ کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے۔ شاہ صاحب کی شاہکار تصنیف ''المسوّیٰ شرح المؤطا'' دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان سے چھپی ہے، اس پر علماء کی ایک جماعت نے کام کیا ہے، ابتدائے کتاب میں شاہ صاحب کی شخصیت اور کتاب کے تعارف پر مختصر تمہید تحریر ہے، اس میں شاہ صاحب کو مجتہد مطلق منتسب قرار دیا گیا ہے، البتہ اس انتساب کو کسی ایک مذہب سے جوڑنے کے بجائے مذہب حنفی اور شافعی دونوں سے جوڑا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کے دائرہ تدریس میں دونوں مذاہب شامل تھے۔ علاوہ ازیں متعدد امور میں شاہ صاحب نے ائمہ مجتہدین کی فقہی آراء کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے:

''کان آیة من آیات اللّٰه تعالیٰ اماما فی علوم الدین بلغ رتبة المجتهد المطلق المنتسب فی المذهب الحنفی والشافعی فکان یدرس المذهبین و کان یضاهی الائمة المستقلین بالاجتهاد فی بعض شؤونهم'' (ص ۸)

اس تصور کی اصل بنیاد شاہ صاحب کی وہ عبارات ہیں جن میں انہوں نے اپنے طرز فکر کو ان فقہاء محدثین کے طرز فکر اور طریقہ اجتہاد سے وابستہ کیا ہے اور اس کو اپنے لئے پسندیدہ راہ عمل قرار دیا ہے، جنہوں نے ذخیرہ احادیث اور اقوال فقہاء دونوں کو اپنے پیش نظر رکھا اور قرآن وحدیث کو اساس قرار دے کر اقوال فقہیہ کو ان پر پیش کیا مثلاً حجۃ اللہ البالغہ میں اہل الحدیث اور اہل الرائے دونوں طبقات کے نقطہائے نظر اور طریقۂ کار پر مبسوط علمی تبصرہ کرنے کے بعد فیصلہ کن طور پر تحریر فرماتے ہیں کہ معتدل اور محقق فقیہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ دونوں نقطۂ نظر کے درمیان تطبیق کا راستہ اختیار کرے اور دونوں طرز فکر اور منہج استنباط سے استفادہ کرے۔

ولما کان الامر کذلک وجب علی الخائض فی الفقه ان یکون متضلعًا من کلا المشربین ومتبحرًا فی کلا المذهبین و کان احسن شعائر الملة ما اجمع علیه جمهور الرواة و حملة العلم وتطابق فیه الطریقان جمیعاً و اللّٰه اعلم.

(حجة اللّٰه البالغه ص ۱۴۷ مطبوعه دیوبند)

''الجزء اللطیف فی ترجمة العبد الضعیف'' میں تحریر فرماتے ہیں:

بعد ملاحظہ کتب مذاہب اربعہ واصول فقہ ایشاں واحادیثے کہ متمسک ایشاں است قرارداد

خاطر بمدد نور غیبی روش فقہاء محدثین افتاد بعد ازاں شوقِ زیارت حرمین محترمین در سر افتاد۔
یعنی مذاہب اربعہ اور ان کے اصول فقہ کی کتابوں کے مطالعہ اور جن احادیث سے وہ استدلال کرتے ہیں ان پر غور وفکر کرنے کے بعد طبیعت کو فقہاء محدثین کی روش پسندیدہ معلوم ہوئی، اس میں نور غیبی کی مدد بھی شامل تھی۔ اس کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق دامنگیر ہوا۔ (الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف مشمولہ انفاس العارفین مطبع مجتبائی ص ۲۰۳۔۲۰۴)

اپنے فارسی وصیت نامے میں تحریر فرماتے ہیں:

درفروع پیروئ علماء محدثین جامع باشند میان فقہ وحدیث کردن ودائما تفریعات فقہیہ را بر کتاب وسنت عرض نمودن۔

فروعی مسائل میں ایسے علماء محدثین کی پیروی کرنی چاہیے، جو فقہ وحدیث دونوں کے عالم ہوں۔ اور مسائل فقہیہ کو ہمیشہ کلام اللہ اور حدیث رسول ﷺ پر پیش کرنا چاہیے'' (ص ۲ بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت ص ۲۰۲ ج ۵)

آگے تحریر فرماتے ہیں: ''امت راہیچ وقت عرض مجتہدات بر کتاب استغناء حاصل نیست امت کے لئے قیاسی مسائل کا کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ ﷺ سے تقابل کرتے رہنا ضروری ہے، اس سے کبھی بے نیازی نہیں ہوسکتی۔'' (ص ۳)

دوسری طرف شاہ صاحب نے ''عقد الجید فی احکام الاجتهاد والتقلید'' میں مجتہد مطلق منتسب کی تعریف، شرائط اور اس کے کاموں پر جو گفتگو کی ہے، اس کا حاصل گفتگو خود انہی کی زبان میں یہ ہے:

''و حاصل كل ذلك انه جامع بين علم الحديث والفقه المروى عن اصحابه واصول الفقه كحال كبار العلماء من الشافعية...... وحاصل صنيعهم على ما استقرينا من كلامهم ان تعرض المسائل المنقولة عن مالك والشافعى وابى حنيفة و الثورى وغيرهم رضى الله عنهم من المجتهدين المقبولة مذاهبم وفتاواهم على موطاء مالك والصحيحين ثم على آحاديث الترمذى وابى داؤد فاىّ مسئلة وافقتها السنة نصًا او اشارة اخذوبها وردوا عليها واى مسئلة خالفتها السنة مخالفة صريحة ردوها وتركوا العمل بها واى مسئلة اختلفت

فیها الاحادیث والآثار اجتهدوا فی تطبیق بعضها ببعض۔ (ص: ۴۰ مطبوعہ ترکی)

(ان سب کا حاصل یہ ہے کہ مجتہد مطلق منتسب علم حدیث، علم فقہ (جو کہ اصحاب فقہ سے منقول ہو) اور علم اصول فقہ کا جامع ہو، جیسا کہ اکابر علماء شافعیہ کا حال ہے ان کے طرز عمل کا حاصل (ہمارے استقراء کے مطابق) یہ ہے کہ فقہاء (امام مالک، شافعی، ابوحنیفہ، ثوری وغیرہ مجتہدین جن کے مذاہب نے امت میں قبول عام حاصل کیا) سے منقول مسائل اور فتاویٰ کو مؤطا امام مالک، بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد وغیرہ کی احادیث پر پیش کرے، جو مسئلہ حدیث کے موافق ہو صراحتاً یا اشارۃً، اس کو قبول کرے اور جو صراحتاً مخالف ہو اس کو رد کر دے اور اس پر عمل نہ کرے، اور جس مسئلے میں احادیث وآثار کا اختلاف ہو ان میں اجتہاد سے تطبیق دینے کی کوشش کرے)۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ سنن بیہقی، معالم السنن اور شرح السنۃ للبغوی اس طرز تحقیق واجتہاد کی بہترین مثالیں ہیں، پھر فرماتے ہیں:

فهذه طريقة المحققين من فقهاء المحدثين وقليل ماهم وهم غير الظاهرية من اهل الحديث الذين لا يقولون بالقياس ولا الاجماع وغير المتقدمين من اصحاب الحديث ممن لم يلتفتوا الى اقوال المجتهدين اصلا ولكنهم اشبه الناس باصحاب الحديث لانهم صنعوا فى اقوال المجتهدين ماصنع اولئك فى مسائل الصحابة والتابعين. (ص: ۴۰)

یعنی "یہ محققین فقہاء محدثین کا طریقہ ہے، مگر ان کی تعداد کم ہے، یہ اہل حدیث کے اصحاب ظواہر نہیں ہیں، جو قیاس اور اجماع کے قائل نہیں اور نہ متقدمین میں سے محدثین کا طرز ان سے میل کھاتا ہے، جو مجتہدین کے اقوال کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھتے، البتہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ان کا رویہ محدثین سے قریب تر ہے، اس لئے کہ ان حضرات نے اقوال مجتہدین کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو ان حضرات محدثین نے صحابہ اور تابعین کے مسائل کے ساتھ کیا"۔

غالباً انہی تحریرات کے آئینے میں شاہ صاحب کے بارے میں مذکورہ تصور قائم کیا گیا، چنانچہ مذکورہ تصور کے بعض حاملین نے شاہ صاحب کے مذکورہ طرز تحقیق کا حوالہ بھی دیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نظریے کے پیچھے شاہ صاحب کی یہی تحریرات کارفرما ہیں،

مولانا حکیم سید عبدالحی رقمطراز ہیں: "وخاض فی بحار المذاهب الاربعة واصول فقههم خوضا بليغا ونظر فی الاحاديث التی هی متمسكاتهم فی الاحكام وارتضى من بينهما بامداد النور الغيبی طريق الفقهاء المحدثين.

(الاعلام بمن فی تاریخ الہند من الاعلام ص ۴۱۱ ج ۴ مطبوعہ رائے بریلی)

یعنی "شاہ صاحب نے مذاہب اربعہ اور ان کے اصول فقہ کا گہرا مطالعہ کیا اور احکام سے متعلق ان کی مستدل احادیث کا جائزہ لیا اور نور غیبی کی مدد سے فقہاء محدثین کا طریق اختیار کیا"۔

چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

والهمهٔ الجمع بين الفقه والحديث "اللہ تعالیٰ نے فقہ وحدیث کو جمع کرنے والی بات ان کے دل میں ڈالی"۔

(ص: ۴۱۵ ج ۶)

المسوی شرح الموطا پر کام کرنے والی جماعت نے شاہ صاحب کے مسلک پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے، مسلكه هو التوسط والاعتدال والجمع بين صحيح المنقول والمعقول وبين طريقة الفقهاء والمحدثين (کتاب المسوّی شرح الموطا ص ۸) یعنی شاہ صاحب کا مسلک توسط اور اعتدال، منقول اور معقول، اور طریق فقہاء اور طریق محدثین کی جامعیت تھی"۔

حیات ولی کے مصنف نے حضرت شاہ صاحب کے مسلک سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے، لیکن ایک مقام پر ایک خاص مناسبت سے شاہ صاحب کے مسلک کا ذکر آ گیا ہے تو "الجزء اللطیف" کی عبارت کے حوالے سے شاہ صاحب کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ: انجام کار نور غیبی کی تائید سے مجھے فقہاء محدثین کی روش بھلی معلوم ہوئی اور انہی کے مسلک کو میں نے اختیار کر لیا۔

(حیات ولی ص: ۴۲۲)

لیکن اس رائے کو تسلیم کرنے میں کئی مشکلات ہیں۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ اس طبقہ کے افراد تاریخ اسلامی میں بہت نادر الوجود ہیں۔ اس منصب کے اطلاق کے لئے فقہ واصول فقہ اور فتاوی کے میدان میں بے مثال اور وسیع خدمات کی ضرورت ہے، شاہ صاحب کی خدمات علمیہ کا دائرہ متنوع اور بے مثال سہی، اسی طرح ان کے یہاں جوشان تجدید اور عبقریت پائی

جاتی ہے اس کی انفرادیت اور امتیاز بھی مسلم ہے، لیکن اس کے باوجود خاص فقہ واصول فقہ اور فتاوی کے میدان میں شاہ صاحب کا کام انتہائی مختصر اور اصولی حیثیت کا ہے، وہ اتنا مفصل، وسیع اور عمیق نہیں ہے کہ اس عظیم الشان منصب کا اطلاق اس پر ہو سکے۔ شاہ صاحب کو اس عہدہ کی عظمت اور نزاکت کا پورا احساس ہے اور آپ اس حقیقت سے بھی پوری طرح آشنا ہیں کہ اس مقام کا اطلاق بہت کم لوگوں پر ہو سکا ہے۔ شاہ صاحب نے مثال میں کبار علماء شافعیہ کا ذکر کیا ہے اور پھر تحریر فرماتے ہیں:

**وهم وان كانوا كثيرين في انفسهم لكنهم اقلون بالنظر الى المنازل الاخرىٰ** (عقد الجید ص: ۴۰) "اس طبقہ کے افراد اگر چہ بطور خود بہت ہوں، لیکن دیگر امور پر نظر کی جائے تو ان کی تعداد بہت کم ہے" ایک اور مقام پر اس بحث کے آخر میں بیہقی اور بغوی جیسے فقہاء محدثین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، **وقليل ماهم** (۴۰) یعنی اس طرز فکر کے حامل اس سطح کے محققین فقہاء محدثین بہت کم یاب ہیں۔

شاہ صاحب کا بار بار یہ احساس دلانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ اس عہدہ کو بہت محتاط اور نازک محسوس کرتے ہیں اور اپنے بارے میں اس تعلق سے کسی استحقاق کا احساس نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں خواہ مخواہ کا تکلف یا تواضع نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے بڑی صفائی کے ساتھ اپنے بارے میں اظہار خیال کیا ہے، اور اپنے کاموں کی حیثیت بھی واضح کی ہے، (جس کو بلاشبہ تحدیث نعمت ہی کہا جا سکتا ہے) چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ تفہیمات میں تحریر فرماتے ہیں:

☆ مجھے خدا نے یہ شرف بخشا ہے کہ میں اس زمانہ کا مجدد، ولی اور قطب ہوں، اگر خدا نے چاہا تو میری کوششوں سے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہو جائے گی۔

(بحوالہ ظفر المحصلین ص: ۵۷)

☆ "مجدد" کے منصب کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ شریعت کے قوانین کی توجیہ و تفسیر کتاب وسنت کے مطابق کرے، اور اس میں قیاس کو ہرگز دخل نہ دے۔ تعلیمات و نظریات کو پیش کرتے وقت صحابہ و تابعین کے اعمال و افعال کو سامنے رکھے۔

☆ وصی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دین کے ان قوانین کو جو بتاتے ہیں کہ حرام کیا ہے اور

حلال کیا ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور ان کے ارشادات کی روشنی میں ترتیب دے۔ قطب وہ ہے جو خدا کی مرضی کو موجودہ حالات وضروریات میں بنی نوع انسان پر ظاہر کردے، چند اور اقتباسات ملاحظہ ہوں:

☆ مجھ پر اللہ تعالیٰ کے خاص احسانات میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے مجھے اس آخری دور کا ناطق، حکیم، قائد اور زعیم بنایا (تفہیمات)۔

☆ میرے ذہن میں ڈالا گیا کہ میں لوگوں تک یہ حقیقت پہونچادوں کہ یہ زمانہ تیرا زمانہ ہے اور یہ وقت تیرا وقت ہے۔ افسوس اس پر جو تیرے جھنڈے کے نیچے نہ ہو (ایضاً)۔

☆ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں قائم الزمان ہوں، یعنی اللہ تعالیٰ جب خیر کے کسی نظام کا ارادہ فرماتے ہیں تو اپنے اس ارادہ کی تکمیل کے لئے مجھے آلہ کار بناتے ہیں (فیوض الحرمین)

☆ حق تعالیٰ کا عظیم ترین انعام اس بندہ ضعیف پر یہ ہے کہ اس کو خلعت فاتحیہ بخشا گیا ہے، اور اس آخری دور کا افتتاح ان سے کرایا گیا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

☆ خداوند تعالیٰ نے ایک وقت میں میرے قلب میں میزان پیدا کردی، جس کی وجہ سے میں ہر اس اختلاف کا سبب جان لیتا ہوں، جو امت محمدیہ میں واقع ہوا، اور اس کو بھی پہچان لیتا ہوں، جو خدا اور اس کے رسول کے نزدیک حق ہے، اور خدا نے مجھے یہ بھی قدرت دی ہے کہ امر حق کو دلائل عقلیہ ونقلیہ سے اس طرح ثابت کردوں کہ اس میں کسی قسم کا شبہ اور اشکال باقی نہ رہے۔ (ایضا، بحوالہ المصلین ص:۵۹)

ظاہر ہے کہ اتنی صاف گوئی اور حقیقت پسندی کے باوجود شاہ صاحب کا اپنے بارے میں اس فقیہانہ منصب کی طرف کوئی اشارہ نہ کرنا بلاوجہ نہیں ہے، اور واقعہ بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ شاہ صاحب بہت کچھ تھے، اور سب کچھ جس کا انہوں نے اپنی تحریرات میں ذکر کیا ہے، مگر اپنی خدمات اور ان کے نتائج کی روشنی میں مجتہد منتسب نہیں تھے، یہ حقیقت ہے کہ شاہ صاحب سے ایک نئے علمی دور کا آغاز ہوا، نئی اساسیات وجود میں آئیں، نئی زبان نئی فکر تشکیل پائی۔ انہوں نے نئے عقلی دور کے مطابق کلام کیا، اور پوری ایک تاریخ اور ایک عہد کو جنم دیا، سب ہی کو اس کا

اعتراف ہے، مگر وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاہ صاحب نے کسی خاص مکتب فقہی کی بنیاد نہیں رکھی، نہ کسی امام کے اصول فقہیہ کو اپنا رنگ و آہنگ دیا، اور نہ ہی فقہی جزئیات و مسائل سے زیادہ تفصیلی طور پر بحث کی، انہوں نے تمام علوم و مراحل زندگی کی طرح اس باب کے بھی صرف ان حصوں پر انگلی رکھی جہاں کمزوری کا احساس ہوا، اور اپنی قوت تجدید سے اس کی اصلاح کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فقہی آراء کو وہ قبول عام حاصل نہیں ہوا، جو ان کی انقلابی اور تجدیدی فکر کو ہوا، بلکہ فقہی طور پر ان کی شخصیت یک گونہ غیر واضح سی ہو کر رہ گئی، اگر وہ کسی مذہب کے مجتہد منتسب ہوتے تو ان کا فقہی رجحان بھی بہت واضح ہوتا، اور ان کی تحریرات و تصنیفات کا کوئی ایک رخ متعین ہوتا۔

## حنفیت و شافعیت کی تخصیص کا جائزہ:

علاوہ ازیں اگر ان کی مذکورہ شانِ اجتہاد کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا انتساب کس مذہب کی طرف کیا جائے یہ طے کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ المسوّیٰ پر کام کرنے والی جماعت علماء کا خیال ہے کہ یہ انتساب ایک مذہب کی طرف کرنے کے بجائے مذہب حنفی اور مذہب شافعی دونوں کی طرف کیا جائے۔ (المسوّیٰ ص:۸)

ان دونوں مذاہب کی تخصیص کی بنیاد غالباً بخاری شریف کا وہ قلمی نسخہ ہے جو خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ شاہ صاحب کے درس میں رہا ہے، اس میں آپ کے تلمیذ محمد بن پیر محمد بن شیخ ابوالفتح نے پڑھا ہے۔ تلمیذ موصوف نے درس بخاری کے ختم کی تاریخ ۶ رشوال ۱۱۵۹ھ لکھی ہے، اور جمنا کے قریب جامع فیروزی میں ختم ہونا لکھا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے دست مبارک سے اپنی سند امام بخاری تک تحریر فرما کر تلمیذ مذکور کے لئے سندِ اجازت لکھی ہے، اور آخر میں اپنے نام کے ساتھ یہ کلمات تحریر فرمائے: "العمری نسباً، الدهلوی وطناً الاشعری عقیدةً، الصوفی طریقةً، الحنفی عملاً الحنفی والشافعی تدریساً، خادم التفسیر والحدیث والفقه والعربیة والکلام، ۲۳ رشوال ۱۱۵۹ھ"

"اس تحریر کے نیچے شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ کی یہ عبارت لکھی ہے کہ بیشک یہ تحریر بالا

میرے والد محترم کے قلم کی لکھی ہوئی ہے، نیز شاہ عالم کی مہر بھی بطور تصدیق ثبت ہے''

(بحوالہ ظفر المحصلین ص: ۶۲)

بلاشبہ یہ ایک مضبوط بنیاد ہے، جس سے شاہ صاحب کا رجحان مذہب حنفی وشافعی کی طرف ثابت ہوتا ہے مگر اس کے علاوہ بعض کئی چیزیں ایسی بھی ہیں جن سے شاہ صاحب کا رجحان دوسرے مذاہب کی طرف محسوس ہوتا ہے۔

## امام احمد بن حنبل کی طرف میلان:

مثلاً شاہ صاحب جس خاص مشرب فقہی کے وکیل اور علمبردار نظر آتے ہیں وہ ہے ''جمع بین الحدیث والفقہ'' جو شاہ صاحب کے نزدیک محققین فقہاء محدثین کا طریقہ رہا ہے۔ متعدد تذکرہ نگاروں نے شاہ صاحب کے اس مشرب کا ذکر کیا ہے اگر یہ درست ہے اور بلاشبہ درست ہے تو اس لحاظ سے شاہ صاحب امام احمد بن حنبل کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔

''حجۃ اللہ البالغہ'' کا ''باب الفرق بین اہل الحدیث واصحاب الرائے'' شروع سے آخر تک پڑھ جایئے، شاہ صاحب کا صریح رجحان ''اہل الحدیث'' کی طرف محسوس ہوگا، مگر ''اہل الحدیث'' سے مراد نہ غیر مقلدین ہیں اور نہ نرے محدثین، بلکہ ''اہل الحدیث'' سے مراد شاہ صاحب کے نزدیک محدثین فقہاء ہیں، جو فقہ کی بنیاد ترجیحی طور پر احادیث وآثار پر رکھتے ہیں اور فقہی مجتہدات اور اصول فقہ کو ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ یہ قیاس یا اجماع کے منکر نہیں ہیں، لیکن احادیث وآثار پر زیادہ زور صرف کرتے ہیں، شاہ صاحب کے نزدیک اس طبقہ کے سرخیل اور پوری جماعت میں سب سے عظیم المرتبت امام احمد بن حنبل ہیں۔ لکھتے ہیں: وبالجملة فلما مهدوا الفقه على هذه القواعد فلم تكن مسئلة من المسائل التى تكلم فيها من قبلهم والتى وقعت فى زمانهم الا وجدوا فيها حديثا مرفوعاً متصلاً او مرسلاً او موقوفاً صحيحاً او حسناً او صالحًا للاعتبار او وجدوا اثراً من آثار الشيخين او سائر الخلفاء وقضاة الامصار وفقهاء البلدان او استنباط من عموم او ايماء او اقتضاء فيسر الله لهم العمل بالسنة على هذا الوجه وكان اعظمهم شاناً و اوسعهم رواية واعرفهم للحديث مرتبة واعمقهم-احمد بن محمد بن حنبل ثم اسحق

بن راھویہ۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد ا ص: ۱۵۰)

یعنی: ''خلاصہ یہ کہ جب ان حضرات نے فقہ کی بنیاد ان قواعد پر رکھی تو کوئی مسئلہ ایسا نہیں تھا جو ان کے دور میں پیش آیا ہو یا ان سے قبل زیر بحث رہا ہو مگر اس کے لئے کوئی مرفوع متصل یا مرسل، یا موقوف حدیث ضرور ان کے پیش نظر ہوتی، وہ صحیح ہو یا حسن، یا کم از کم لائق اعتبار ہو، حدیث نہ ملنے کی صورت میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت فاروق اعظم یا دیگر خلفاء یا قضاۃ یا فقہاء کا کوئی اثر تلاش کرتے یا کم از کم کوئی فقہی استنباط (عموم نص، یا اشارۃ النص، یا اقتضاء النص کی روشنی میں) ہی ڈھونڈھتے ہیں، اس طرح اللہ نے ان کے لئے عمل بالسنۃ کو آسان کر دیا، اس طبقہ کے سب سے عظیم المرتبت، وسیع العلم، عالم حدیث اور عمیق فقہی بصیرت رکھنے والے امام احمد بن حنبل ہیں، ان کے بعد امام اسحاق بن راھویہ کا درجہ ہے''۔

## امام مالک کی طرف میلان:

مصفی شرح موطا کا مقدمہ پڑھیئے تو شاہ صاحب امام مالک کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ اس مقدمہ کی روشنی میں شاہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کا دروازہ بغیر موطا کی کلید کے نہیں کھل سکتا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں اس میدان میں ایک طویل عرصہ تک حیران و پریشان رہا اور اعتدال کا متلاشی رہا۔ اس کے لئے میں نے بہتوں سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی، پھر میں نے اللہ سے فریاد کی کہ اے پروردگار! اگر آپ مجھے ہدایت نہ دیں گے تو میں گمراہ ہو جاؤں گا میں پوری یکسوئی کے ساتھ خالق کائنات کی طرف متوجہ ہوا، تو اللہ نے بذریعہ الہام میری رہنمائی امام ہمام حجۃ الاسلام امام مالک بن انس کی شاہکار کتاب ''موطا'' کی طرف فرمائی اور اس طرح میرے دل کو قرار حاصل ہوا...... موطا کے مطالعہ کے بعد مجھے شرح صدر اور یقین ہو گیا کہ موطا روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد سب سے صحیح ترین کتاب ہے۔ اسی طرح مجھے یہ ایقان بھی حاصل ہوا کہ آج کے دور میں فقہ و اجتہاد کا راستہ صرف اسی شخص کے لئے کھل سکتا ہے جو موطا کو اپنے پیش نظر رکھے، اور اس کے مراسیل اور صحابہ و تابعین کے اقوال کے مآخذ پر غور کرے، پھر الفاظ کے مفاہیم کی تعیین اور دلائل کی تطبیق وغیرہ میں فقہاء مجتہدین کا طریق اختیار کرے نیز امام شافعی کے تعاقبات کو بھی سمجھنے کی کوشش کرے۔ (ص: ۱۷تا۲۹)

خود امام شافعی کے بارے میں شاہ صاحب کا خیال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مذہب کی بناء مؤطا پر رکھی ہے۔ الانصاف میں تحریر فرماتے ہیں: فمن مادة مذهبه كتاب المؤطا وهو وان كان متقدماً على الشافعي فان الشافعي بنى عليه مذهبه "ان کے مذہب کے مادہ میں مؤطا شامل ہے، مؤطا اگرچہ امام شافعی سے پہلے لکھی گئی، مگر انہوں نے اپنے مذہب کی بنیاد اس پر رکھی"۔

## زیادہ معتدل نقطۂ نظر:

اس لئے شاہ صاحب کی کسی ایک تحریر کو بظاہر دیکھ کر ان کے مسلک کا فیصلہ کر دینا مناسب نہیں، شاہ صاحب کی پوری علمی زندگی، ان کے تجدیدی افکار و خیالات اور ان کی تصنیفات کی مختلف عبارتوں کو سامنے رکھتے ہوئے زیادہ معتدل رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاہ صاحب اصلاً مسلک حنفی کے مقلد تھے۔ البتہ دیگر بہت سے ابواب کی طرح اس باب میں بھی آپ نے تجدیدی خدمات انجام دی ہیں۔ شاہ صاحب کے عہد کے حالات پر نظر ڈالنے سے مذہب حنفی کے مقلدین کے یہاں جو علمی یا فکری بے اعتدالیاں محسوس ہوتی ہیں، ان کا تقاضا تھا کہ کوئی مجدد پیدا ہو، اور ان بے اعتدالیوں کو دور کرے۔ شاہ صاحب اپنے دور کے بلاشبہ ایک عظیم مجدد تھے۔ انہوں نے زندگی کے تقریباً تمام ہی ضروری ابواب پر نظر ڈالی اور اپنی قوت فکر اور عمل تجدید سے ان کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی۔ شاہ صاحب کے دور میں جو جمود، تعصب، تنگ نظری اور غالی تصورات پیدا ہو گئے تھے، ان کی بناء پر دیگر مذاہب کے مطالعہ و تحقیق بلکہ احترام کی روایت بھی اٹھتی جا رہی تھی۔ لوگ مذہب حنفی کے مقلد تھے مگر اندھے مقلد، ان کو تقلید بصیرت، یا بصیرت مندانہ تقلید حاصل نہ تھی۔ شاہ صاحب نے اپنی کئی تحریرات اور پیغامات میں اس تعلق سے اپنے کرب کا اظہار کیا ہے، اور مذہب حنفی کے پیروکاروں کو مؤثر انداز میں متوجہ کیا ہے۔ شاہ صاحب نے محسوس کیا کہ اس جمود اور تنگ نظری کا سبب مطالعہ و تحقیق اور وسعت نظری کی کمی ہے، اگر اہل علم تمام مذاہب فقہیہ کا منصفانہ مطالعہ کریں اور ان کے بنیادی مآخذ تک پہونچنے کی کوشش کریں تو مذاہب کے درمیان اس درجہ تفریق و امتیاز کا جو احساس پایا جاتا ہے اس میں کمی آجائے

گی اور اسلاف باہم فکری ونظری اختلافات کے باوجود جس رواداری اور اکرام واحترام کا مظاہرہ فرماتے ہیں وہ روایت دوبارہ قائم ہوگی۔ شاہ صاحب نے اسی بنیاد پر فقہ وحدیث کا تطبیقی اور دیگر مذاہب کا تقابلی مطالعہ شروع کیا، تاکہ ایک طرف فقہ حنفی کے بنیادی مآخذ تک لوگوں کی نگاہ پہونچے اور علماء فقہی روایات کو قرآن، حدیث اور آثار کی روشنی میں بصیرت مندانہ طور پر سمجھنے کی کوشش کریں، دوسری طرف دیگر مذاہب کے بارے میں جو ذہنی بُعد پایا جاتا ہے وہ دور ہو، کہ یہ تمام مذاہب جب حق ہیں تو ان کے درمیان بیجا حساسیت مناسب نہیں۔

مذاہب کے مطالعہ کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہے کہ فقہاء کے اختلافات کی اصلیت سمجھنے میں علماء کو مدد ملے، اور یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکے کہ یہ اختلاف ہمارے آپس کے اختلاف جیسا نہیں تھا۔ بلکہ ان کا اختلاف علم اور اخلاص پر مبنی تھا، اور تمام اکابر فروعی طور پر مختلف ہونے کے باوجود بنیادی طور پر باہم متفق تھے۔

نیز اس سے تاریخی حقیقت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ بعد کے ادوار میں مذاہب اربعہ کی تقلید کی خاص وجہ کیا ہوئی؟ اور ان کے سوا دیگر مذاہب کی تقلید کیوں جاری نہ رہ سکی؟ اس طرح شاہ صاحب نے ایک بصیرت مند محقق کی طرح مذاہب فقہیہ پر نظر ڈالی، یہ شاہ صاحب کا وہ عظیم کارنامہ ہے جس کی مثال کم از کم اس دور میں نہیں ملتی۔ شاہ صاحب کا یہ کارنامہ بڑے دوررس اثرات کا حامل تھا، اگر شاہ صاحب اتنے تعمق اور توسع سے کام نہ لیتے تو فقہی روایات واقوال کی شرعی حیثیت میں جس درجہ غلو برتا جارہا تھا قدرتی طور پر کسی ردعمل کے نتیجے میں پورا فقہی ذخیرہ بحیثیت مذہب اور قانون رد کردیا جاتا۔ اس لئے کہ جن روایات واقوال کی اصلیت معلوم نہ ہو، اور قرآن وحدیث کے سرچشموں سے جو پوری طرح مربوط نہ ہوں تو محض ائمہ اور اسلاف کے نام پر ان کی روایتی حیثیت بہت زیادہ دنوں تک باقی نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

شاہ صاحب نے بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ ائمہ دراصل شارحین دینِ اسلام ہیں، اور ان کی تقلید اسی حیثیت سے کرتے ہیں کہ یہ دین کی صحیح تشریح کرتے ہیں۔ ہم نہ ان کو صاحبِ شریعت یا صاحبِ وحی سمجھتے ہیں اور نہ ان کے بارے میں یہ تصور رکھتے ہیں کہ یہ معصوم ہیں اور ان سے غلطی کا امکان نہیں۔ یہ وہ بنیادی فکری اصلاحات ہیں جن پر شاہ صاحب نے پوری

قوت کے ساتھ توجہ دی، اس کو بعض متعصب مقلدین نے عدم تقلید قرار دیا۔ کسی نے مذہب سے بغاوت یا خروج کا نام دیا، حالانکہ شاہ صاحب کی ان اصلاحات سے مذہب حنفی کو بالخصوص اور دیگر مذاہب کے مقلدین کو بالعموم جو فائدہ پہونچا وہ بڑے بڑے نام نہاد مقلدین سے بھی نہیں پہونچا۔ شاہ صاحب نے مذہب حنفی کی خدمت بصیرت کے ساتھ کی۔ جس کے بڑے دور رس نتائج سامنے آئے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی یہ تحریر بڑی بصیرت افروز اور مبنی بر حقیقت ہے لکھتے ہیں: "حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے مجددانہ کارناموں میں ایک کارنامہ اور خدمتِ حدیث اور انتصار للسنۃ ہی کے سلسلۂ زریں کی ایک اہم کڑی ان کی فقہ وحدیث میں تطبیق کی اور پھر مذاہب اربعہ میں جمع وتالیف کی کوشش تھی، اس سے اس بشارت نبوی کی تصدیق ہوتی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ تم سے خدا اس امت کی شیرازہ بندی کے ایک خاص نوع کا کام لے گا"۔

جہاں تک ہندوستان کے تحتی براعظم کا تعلق ہے اس میں اس طرز فکر اور جمع وتطبیق کی اس کوشش کا سراغ نہیں ملتا، اور اس کے تاریخی وعلمی اسباب ہیں۔ یہ تحتی براعظم شروع سے آن فاتحین اور بانیان سلطنت کے زیرنگیں رہا، جو یا ترکی النسل تھے یا افغانی النسل۔ اور یہ دونوں قومیں تقریباً اپنے اسلام قبول کرنے کے زمانے سے ہی مذہب حنفی کی حلقہ بگوش بلکہ اس کی حمایت اور نشرواشاعت میں سرگرم اور پرجوش رہیں۔ یہاں اسلام کی تقریباً آٹھ سو سال کی تاریخ میں مذہب مالکی اور مذہب حنبلی کو قدم رکھنے کا بھی موقع نہ مل سکا۔ شافعی مسلک سواحل تک محدود رہا، یا جنوبی ہند، مدراس اور شمالی کنارے (موجودہ کرناٹک) کے بعض حصوں بھٹکل وغیرہ اور کیرالا میں محدود رہا۔ ان میں بھی مالابار (قدیم بلاد العنبر) کو مستثنیٰ کر کے جہاں زیادہ تر شافعی مسلک کے داعیانِ اسلام، تجار، مشائخ اور فقیہ وعالم آئے، شیخ مخدوم علی مہائمی (م ۸۳۵ھ) صاحب تفسیر تبصیر الرحمان اور تیسیر المنان، اور مالابار کے شیخ مخدوم اسماعیل فقیہ السکری الصدیقی (م ۹۴۹ھ) نیز مخدوم شیخ زین الدین بلیاوی (م ۹۲۸ھ) صاحب فتح المعین کے علاوہ ہمارے محدود علم میں اس پایہ کے شافعی فقیہ ومحدث نہیں پیدا ہوئے...... جو ہندوستان (بالخصوص شمالی ہند کے) علمی حلقوں پر گہرا اثر ڈالتے اور علماء حنفیہ کو فقہ شافعی پر عمیق نظر ڈالنے اور اس سے استفادہ پر

آمادہ کرتے۔ ہندوستان سے جو علماء اور طالبانِ علم حدیث وفقہ حجاز جاتے (جو ترک کی سلطنت کے زیر انتظام تھا اور ترک ہر دور میں سو فیصدی سنی اور حنفی رہے ہیں) وہ بھی زیادہ تر اپنے ہی مذہب کے علماء اور خصوصیت کے ساتھ اپنے ہم وطن اساتذۂ فقہ وحدیث سے رابطہ رکھتے، جو وہاں ہندوستان یا افغانستان سے ہجرت کر کے چلے گئے تھے اور ان کے شاگردوں کا بڑا حلقہ تھا (مثلاً علامہ شیخ علی تقی برہان پوری صاحب کنز العمال، علامہ قطب الدین نہروالی، ملا علی قاری ہروی مکی، شیخ عبدالوہاب متقی اور شیخ محمد حیات سندی وغیرہ)۔

ان تمام اسباب کی بنا پر شاہ صاحب کو فقہ شافعی کے اصول وقواعد، اس کی خصوصیات اور بعض مابہ الامتیاز چیزوں سے واقف ہونے کا پورا موقعہ ملا، اور اسی طرح فقہ مالکی اور فقہ حنبلی سے بھی باخبر ہونے کا وہ موقعہ ملا، جو علماء ہندوستان کو طویل عرصہ سے (تاریخی، جغرافیائی، سیاسی اور تمدنی اسباب کی بنا پر) میسر نہیں آیا تھا، اور اس طرح مذاہب اربعہ کا تقابلی مطالعہ (الفقہ المقارن) ان کے لئے ممکن اور آسان ہوا، جو ان علماء کے لئے دشوار تھا، جن کو یہ مواقع حاصل نہیں ہوئے تھے۔ (تاریخ دعوت وعزیمت ص ۱۹۸ تا ۲۰۰)

اس موضوع پر حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے تذکرۂ حضرت شاہ ولی اللہ میں بڑا بصیرت افروز کلام فرمایا ہے اور میرے خیال میں ان کے بعد کے اکثر انصاف پسند مصنفین نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ مولانا گیلانیؒ نے عنوان قائم کیا ہے ''حضرت مجدد اعظم کی زندگی اور ان کے فکر ونظر کی تشریح وتوضیح'' اس عنوان کے تحت ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدیوں میں بعض خاص حالات خصوصاً اسلام کے اصلی سرچشموں یعنی قرآن وحدیث کی تعلیم سے اسلامی مدارس جس حد تک بیگانے ہوتے چلے گئے بتدریج یہ اختلاف بہت غلط صورت اختیار کرتا چلا جاتا تھا، خصوصاً ماوراء النہر (ترکستان وخراسان) کے حنفی فقہاء کا غلو اس باب میں آہستہ آہستہ بہت آگے بڑھ گیا تھا اور ہندوستان میں وطن بنانے کے لئے اسلام جس راستہ سے آیا چونکہ وہ انہی ممالک کا راستہ تھا اس لئے قدرتاً ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت انہی ممالک کے علماء کی ذہنیت سے متاثر تھی۔

پھر جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا نادری اور ابدالی حملوں نے جب اس ملک میں روہیلوں

کے جدید عنصر کا اضافہ کر دیا تو تشدد و تصلب کی یہ شرارت دو آتشہ ہو چکی تھی.......

شاہ صاحب نے بڑی دانش مندی اور گہرے مطالعہ کے بعد فقہ اور اصول فقہ کی بنیادوں سے پردہ ہٹایا۔ ائمہ مجتہدین اور ان اجتہادات کا جو صحیح مقام تھا اسے واضح فرمایا۔ بعضوں کو تو شاہ صاحب سے شکایت ہے کہ ہندوستان میں غیر مقلدیت کی ابتداء آپ ہی سے ہوئی اور خود غیر مقلدوں کا طبقہ اس باب میں ایک گونہ آپ کو اپنا پیشوا مانتا ہے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اگر امت یا کم از کم ہندی مسلمانوں کے ہاتھ میں اس وقت وہ معلومات نہ ہوتیں، جنہیں شاہ ولی اللہ کی عرق ریزیوں نے وقف عام کیا، تو سرزمین نجد اور نجد سے آگے بڑھ کر حجاز میں جو تحریک وہابیت کے نام سے چل پڑی تھی اور یوروپ والوں نے اپنے خاص اغراض کے تحت اس تحریک اور اس تحریک کے چلانے والوں کو مختلف طریقوں سے اچھالنا شروع کیا تھا۔ اس کا بہت کچھ نقصان ہندی مسلمانوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا۔

واقعہ یہ ہے کہ غلامی کے ان دنوں میں جن میں ایسے کم ہیں جو اپنی زبان سے اپنی بات ادا کرتے ہوں اور اپنے دماغ سے اپنے خیالات سوچتے ہیں، مشکل ہی سے غلام ہندوستان میں اس وقت کوئی حنفی نظر آتا، اس میں شک نہیں کہ اندرونی طور پر مغربی دجل وکید نے جو دام بچھایا تھا، اور ذم کی صورتوں میں اس تحریک کی مدح کا جو گیت مختلف لہجوں میں گایا جاتا تھا، جس کا افسانہ طویل ہے اس میں کچھ بیچارے سادہ لوح ابتداء ہی میں پھنس گئے، لیکن اہل علم کو معلوم ہے کہ شاہ ولی اللہ کے تحقیقی طرز عمل نے اس تحریک کو ہندوستان میں زیادہ پھلنے پھولنے نہیں دیا۔

"ولی اللہی" مکتب فکر کے علماء کی کوششوں کا آج یہ نتیجہ ہے کہ "شیٔ من صدر قلیل" کے سوا اب عمل بالحدیث کے مدعیوں کی آبادیاں اپنے اندر اور کچھ نہیں رکھتیں۔

اس سلسلہ میں حضرت کی کتابیں "الانصاف"، "عقد الجید"، "حجۃ اللہ البالغۃ" کے بعض ابواب، "تفہیمات الٰہیہ" کے بعض تفہیمات، ازالۃ الخفاء کی بعض ضمنی چیزیں، اور سب سے زیادہ مؤطا کی شرحوں نے حدیث فہمی کا معیار پیش کیا ہے، اور فقہ وحدیث میں تطبیق کی جو راہیں اشاروں اشاروں میں شاہ صاحب نے اہل فہم کے سامنے کھولی ہیں، سچی بات یہ ہے کہ آج حنفیت "علی بصیرۃ من ربہ" انہی بنیادوں پر قائم ہے۔

ایک بڑی دانشمندی شاہ صاحب نے یہ بھی فرمائی کہ فقہ کے ساتھ ساتھ آپ نے درسی طور پر شافعی فقہ کے مطالعہ کو بھی ضروری قرار دیا۔ اپنے مسلک کی تشریح میں ایک موقعہ پر اپنے کو "الشافعی درسا" جو فرمایا ہے اس کا مطلب یہی ہے، لوگ جانتے ہیں کہ فقہ حنفی اور مالکی کی حیثیت اسلامی قوانین کے سلسلے میں تعمیری فقہ کی ہے۔ اور شافعی و حنبلی فقہ کی زیادہ تر نوعیت ایک تنقیدی فقہ کی ہے۔ حنفیوں کی فقہ کو مشرق میں اور مالکیوں کی فقہ کو مغرب میں چونکہ عموماً حکومتوں کے دستور العمل کی حیثیت سے تقریباً ہزار سال سے زیادہ مدت تک استعمال کیا گیا ہے، اس لئے قدرتاً ان دونوں مکاتب خیال کے علماء کی توجہ زیادہ تر جدید حوادث و جزئیات و تفریعات کی ادھیڑ بن میں مشغول رہی۔ بخلاف شوافع اور حنابلہ کے کہ بہ نسبت حکومت کے ان کا تعلق زیادہ تر تعلیم، درس و تدریس اور تالیف و تصنیف سے رہا، اس لئے عموماً تحقیق و تنقید کا وقت ان کو زیادہ ملتا رہا۔ بہر حال یہ افسانہ تو دراز ہے، مجھے کہنا یہ ہے کہ فقہ اور اسلامی قوانین کا تعلق ان کے سرچشموں یعنی کتاب و سنت سے ہے۔ جو چاہتے ہیں کہ یہ تعلق مسلسل زیادہ تر وتازہ حالت میں رہے۔ ان کے لئے شاہ صاحب کا یہ طریقۂ عمل کہ شوافع اور حنابلہ کی فقہ اور ان کی ادبیات کا بھی مطالعہ جاری رکھیں یہ بہت کچھ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ یا کم از کم حدیث کے درس میں خصوصیت کے ساتھ فقہاء امصار کے خلافیات اور ان کے وجوہ و دلائل کے بیان کرنے سے مسائل فقہ میں زندگی باقی رہتی ہے۔ ہر مذہب کا پیروان علل و اسباب سے واقف رہتا ہے جن کی روشنی میں اس کے امام نے اپنی رائے قائم فرمائی ہے۔ نیز چونکہ اس کے ساتھ دوسرے ائمہ مجتہدین کے دلائل و وجوہ بھی سامنے آتے ہیں۔ اسی لئے قدرتی طور پر جاہلی حمیت کا زہر ان میں پیدا ہونے نہیں پاتا۔ عقد الجید میں شاہ صاحب نے ائمہ مجتہدین کے قیاسی نتائج کے متعلق بجائے اس نظریہ کے کہ حق ان میں سے ایک ہی ہو سکتا ہے، اس خیال کو جو ترجیح دی کہ سب ہی حق پر ہیں۔ تو فروعی اختلافات کی اہمیت کے سارے قصہ ہی کو ختم فرما دیا؟ اس باب میں شاہ صاحب کے مباحث قابل دید ہیں......۔

تصوف کے متعلق بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے ہندوستان میں اس کے خلاف شاہ ولی اللہ ہی نے قلم اٹھایا، حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آج جب کہ یوروپ تحقیق و ریسرچ کے نام سے اسلامی چیزوں کو غیروں کی طرف شاطرانہ چابک دستیوں سے منسوب

کرنے میں منہمک ہے، اگر شاہ ولی اللہ کی کتابیں اس وقت ہمارے پاس نہ ہوتیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس دجالی ہنگامہ میں تصوف کا اسلام سے دور کا بھی رشتہ باقی رہ سکتا تھا؟

(تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ ص ۲۳۱ ج ۲۳۵)

## فقہی میدان میں تجدید خدمات:

غرض شاہ صاحب اپنے عہد کے مجدد اعظم تھے، اور انہوں نے علم و عمل کے بہت سے ابواب کی طرح فقہ اور اصحاب فقہ کو بھی اپنا ہدف تجدید بنایا، رہا یہ کہ فقہ پر غیر معمولی کام دائرہ تجدید میں داخل ہوگا یا دائرہ اجتہاد میں؟ تو ظاہر ہے کہ جب تک انسان میں اجتہادی صلاحیت نہ ہو فقہ پر غیر معمولی عمل تجدید کر ہی نہیں سکتا۔ شاہ صاحب جزوی طور پر بہت سے مسائل میں اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ اور اللہ نے ان کو اس صلاحیت سے نوازا تھا، اور جس عہد میں وہ پیدا ہوئے تھے اس عہد میں ان کے سوا کوئی نہیں تھا جو فقہ و حدیث پر اتنا عظیم الشان کام انجام دے سکے۔ بعض مرتبہ شاہ صاحب کی طبیعت (ان کی بے پناہ صلاحیت کی بنا پر) تقلید سے اباء بھی کرتی تھی لیکن اشارہ غیبی ان کو تقلید پر مجبور کرتا تھا اور اس عہد کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ مجتہد بن کر نہیں بلکہ مقلد بن کر کام کریں۔ اور جس شخص کو اجتہادی قوت رکھنے کے باوجود بحیثیت مجتہد کام نہ کرنے دیا جائے، بلکہ کسی مذہب کے دائرے میں رہ کر کام کرنے کی تاکید کی جائے، اس کی خدمات کو بلاشبہ تجدیدی خدمات ہی کہا جائے گا نہ کہ اجتہادی خدمات۔

فقہی میدان میں تجدید کا تصور خود شاہ صاحب کے یہاں بھی ملتا ہے، ''الانصاف'' میں مسلک حنبلی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلک حنبلی کی ابتدائی صدیوں میں مجتہدین بکثرت پیدا ہوئے۔ بلکہ امام احمد کے اکثر اصحاب مجتہد مطلق کے مقام پر فائز تھے، اور ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جو تمام تر مجتہدات میں امام احمد کا مقلد ہو، بعد کی صدیوں میں ابن سریج پیدا ہوئے اور انہوں نے مسلک حنبلی کے مطابق تقلید و تخریج کے قواعد و اصول مقرر کئے، پھر اکثر حنابلہ اسی راہ پر چل پڑے، ابن سریج کو ان کی غیر معمولی انقلابی خدمات کی بنا پر مجددین حنابلہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ''الانصاف'' میں مذکور ہے:

حتی نشأ ابن سریج فاسس قواعد التقلید والتخریج ثم جاء اصحابہ یمشون فی سبیلہ وینسجون علی منوالہ ولذلک یعد من المجددین علی راس المأتین واللہ اعلم (الانصاف ص ۲۴ مطبوعہ ترکی)۔

## شاہ صاحب فقہ حنفی کے مجدد:

اس طرح شاہ صاحب خود اپنی اصطلاح کے مطابق اپنے عہد میں فقہاء حنفیہ کے مجدد تھے، ان کی انقلابی خدمات نے حنفیہ کو جو فائدہ پہونچایا اور اس مذہب کے فقہاء وعلماء میں جو فقیہانہ بصیرت، دقت نظر اور وسعتِ مطالعہ پیدا ہوئی، اس کے پیش نظر شاہ صاحب بجا طور پر فقہ حنفی کے مجدد تھے۔ شاہ صاحب نے اپنی تحریرات میں کہیں تقلید سے خارج ہو کر کوئی بات نہیں کہی ہے ان کے یہاں توسع ضرور ہے مسلک حنفی کے بعض مسائل میں بصیرت مندانہ اختلاف پایا جاتا ہے مگر ایسا کہیں بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی کسی تحقیق میں دائرہ تقلید ہی سے نکل گئے ہوں، اور ائمہ اربعہ میں سے کسی کے قول کو قابل اعتناء نہ سمجھا ہو۔

## شاہ صاحب کو فقہ حنفی کی تقلید کا غیبی اشارہ:

شاہ صاحب جس عبقری شان اور اجتہادی صلاحیت کے مالک تھے، اس کے پیش نظر ممکن تھا کہ وہ تقلید سے آزاد ہو کر کام کرتے، لیکن اشارہ غیبی اور الہام ربانی نے ہمیشہ اس سے باز رکھا۔ فیوض الحرمین میں شاہ صاحب نے بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی اس اندرونی کشمکش کا اظہار کیا ہے اور پھر اشارہ غیبی کی روشنی میں وہ جس نتیجہ پر پہونچے ہیں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

استفدت منہ ﷺ ثلثۃ امور خلاف ما کان عندی و ما کانت طبعی تمیل الیہ اشد میل فصارت ھذہ الاستفادۃ من براھین الحق تعالیٰ علیّ احدھا الوصاۃ بترک الالتفات الی التسبب وثانیھا الوصاۃ بالتقلید بھذہ المذاھب الاربع لا اخرج منھا والتوفیق ما استطعت وجبلتی تابی التقلید وتانف رأساً و لکن شی طلب منّی التعبد بہ بخلاف

نفسی وھھنا نکتة طویت ذکرھا وقد تفطنت بسر ھذہ الحیلة وھذہ الوصاة (فیوض الحرمین)

یعنی میں نے اپنے عندیہ اور شدید میلان طبع کے خلاف رسول اللہ ﷺ سے تین امور میں استفادہ کیا تو یہ استفادہ میرے لئے برہان حق بن گیا، ان میں سے ایک تو اس بات کی وصیت تھی کہ میں اسباب کی طرف سے توجہ ہٹالوں، اور دوسری وصیت یہ تھی کہ میں ان میں مذاہب اربعہ کا اپنے آپ کو پابند کروں اور ان میں سے نہ نکلوں اور تابہ امکان تطبیق وتوفیق کروں، لیکن یہ ایسی چیز تھی جو میری طبیعت کے خلاف مجھ سے بطور تعبد طلب کی گئی تھی اور یہاں ایک نکتہ ہے جسے میں نے ذکر نہیں کیا ہے اور الحمدللہ مجھے اس حیلہ اور اس وصیت کا راز معلوم ہو گیا ہے۔

پھر جب مذاہب اربعہ کی تحقیق وتفتیش کے بعد ترجیح کا وقت آیا اور اس کی جستجو کے لئے آپ کی روح مضطرب ہوئی تو دربار رسالت سے اس طور پر رہنمائی کی گئی:

"عرفنی رسول اللہ ﷺ ان فی المذھب الحنفی طریقة انیقة ھی اوفق الطرق بالسنة المعروفة التی جُمعت ونُقحت فی زمان البخاری واصحابہ وذلک ان یؤخذ من اقوال الثلثة (ای الامام وصاحبیہ) قول اقربھم بھا فی المسئلة ثم بعد ذلک یتبع اختیارات الفقھاء الحنفیین الذین کانوا من علماء الحدیث فرب شئ سکت عنہ الثلاثة فی الاصول وماتعرضوا نفیہ ودلت الاحادیث علیہ فلیس بد من اثباتہ والکل مذھب حنفی.(فیوض الحرمین بحوالہ ظفر المحصلین ص:۶۰، ۶۱).

یعنی آنحضرت ﷺ نے مجھے بتایا کہ مذہب حنفی میں ایک ایسا عمدہ طریق ہے جو دوسرے طریقوں کی بہ نسبت اس سنت مشہور کے زیادہ موافق ہے جس کی تدوین اور تنقیح امام بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانے میں سنت معروفہ سے قریب تر ہو، لے لیا جائے۔ پھر اس کے بعد ان فقہاء حنفیہ کی پیروی کی جائے، جو فقیہ ہونے کے ساتھ حدیث کے بھی عالم تھے، کیونکہ بہت سے ایسے مسائل ہیں کہ ائمہ ثلاثہ نے اصول میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہا اور نفی بھی نہیں کی۔ لیکن احادیث انہیں بتلارہی ہیں تو لازمی طور پر اس کو تسلیم کیا جائے اور یہ سب مذہب حنفی ہے"۔

خلاصہ بحث یہ کہ شاہ صاحب مسلکاً حنفی اور ماضی قریب میں حنفیہ کے مجدد تھے، اس لئے آپ کے کاموں کو مجددانہ حیثیت ہی سے دیکھا جانا چاہیے، ان کی تنقیدات بغاوت یا خروج عن التقلید پر نہیں بلکہ اصلاح وتجدید پر مبنی ہیں، انہوں نے جو کچھ کیا پورے اخلاص اور درد کے ساتھ کیا، اس میں نہ کسی انتقامی ردعمل کا دخل تھا اور نہ مجتہدانہ ادعاء کا۔ وہ بلاشبہ ایک مخلص، محقق اور بصیرت مند حنفی تھے۔ اگر آپ حنفی نہ ہوتے تو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کے اثرات آپ کے صاحبزادوں پر پڑتے، مگر شاہ صاحب کے تمام قابل فخر اور یکتائے روزگار صاحبزادے نہ صرف حنفی تھے بلکہ ان حضرات کی ساری زندگی اس مسلک کی خدمت وتحقیق میں گزری بالخصوص حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے حدیث اور فقہ وفتاوی کے میدان میں جو نہج اختیار کیا، اور جو کارنامے انجام دیئے وہ اہل علم سے مخفی نہیں ہیں، فجزاهم الله عنا احسن الجزاء.

# حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور نصاب ولی اللّٰہی: ایک جائزہ

ڈاکٹر علیم اشرف خاں☆

مدارس کے باقاعدہ قیام کی تاریخ نہایت قدیم ہے البتہ عہد قدیم کا سب سے عظیم الشان مدرسہ بغداد کا نظامیہ تھا اور اس کے بعد اندلس میں قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ کے مدارس خاص اہمیت کے حامل تھے۔ دہلی بھی عہد مملوک سے علم وادب کا مینارہ اور اہم علمی، ادبی اور ثقافتی اہمیت میں مرکزی درجہ رکھتی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنے عہد میں حدیث کا درس عام کیا تھا مگر اس کے بعد کافی وقت تک دہلی میں درسِ حدیث کا رواج کم ہوگیا اور دوبارہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے عہد اکبری، عہد جہانگیری اور عہد شاہجہانی میں دہلی میں درس حدیث کی ترویج کے لئے باقاعدہ عملی کوشش کی تھی۔ عہد مغلیہ کے انحطاطی دور میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے صاحبزادے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے علم حدیث کو دہلی میں جلا بخشی۔

علمائے متقدمین کے زہد وتقویٰ اور ان کی حق گوئی اور بے باکی نے بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی اطاعتِ شریعت اور اتباع سنت رسول کی راہ پر گامزن کر دیا تھا۔ گیارہویں صدی ہجری میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحبزادے مولانا نورالحق کے ایک شاگرد سید محمد مبارک نے جو اپنے عہد کے جید علما میں شمار کیے جاتے تھے، حمیت علمی اور غیرت ایمانی کی وہ شاندار مثال قائم

☆ سینئر لکچرر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

کی جو آج کے عہد میں قصہ پارینہ معلوم ہوتا ہے۔ سید محمد مبارک ایک مرتبہ وضو کرنے کے لئے اٹھے تھے کہ اچانک زمین پر گر گئے اور ایک گھنٹے تک بیہوشی کی حالت میں رہے مگر جب ہوش میں آئے تو ان کے شاگردوں نے اس بیہوشی کا سبب دریافت کیا مگر بہت کوششوں کے بعد شاگردوں کو یہ معلوم ہوا کہ استاد نے تین دنوں سے کچھ نہیں کھایا اور فاقہ پر ہیں۔ جب شاگردوں کو یہ معلوم ہوا تو گھر سے عمدہ کھانے سجا کر لے آئے، استاد نے اپنے شاگردوں کی سعادت مندی پر خوشی کا اظہار تو کیا مگر ان کی غیرتِ ایمانی اور حمیت علمی نے یہ کہنے پر مجبور کر دیا:

"بہ اصطلاح فقراء این طعام راطعام اشراف گویند، ہر چند نزد فقہاء اکل آن جائز است و در شرع بعد از سہ روز میتہ حلال، اما در طریقہ فقراء اکل طعام اشراف جائز نیست"۔ دراصل آپ کا یہ بیان فقر و فاقہ اور عسرت و تنگدستی کی زندگی گزارنے کی مثبت دلیل ہے اور اسی فقر و فاقہ اور عسرت و تنگدستی سے حق گوئی اور بیباکی جنم لیتی ہے کیونکہ جو عسرت کی زندگی کا عادی ہو وہ کلمۂ حق کہنے کی پاداش میں سلطانوں کی طرف سے وظائف سے معتوب اور معاشی فارغ البالی سے محروم ہو کر بھی زندگی سے کوئی گلہ نہیں رکھتا۔ ہمارے علمائے متقدمین نے اسی طریقے کو احسن سمجھا اور ساری زندگی اسی راستے پر عمل پیرا رہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے ایک مرتبہ اہل مدارس کے ایک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: "آپ کے اسی گروہ کے اندر ان بوسیدہ کپڑوں اور نحیف جسموں میں "شیر خفتہ" بھی ہیں۔ آپ ہی کے اندر ایسے پاک نفس داعی اور ایسے بے لوث مصلح ہیں جن سے آپ (خود) بے خبر ہیں۔ میں انہی خوابیدہ صلاحیتوں کو اپنی اس کمزور اور ناتواں آواز سے دستک دے رہا ہوں۔ کاش کہ میری آواز ان دروازوں کے پار پہنچ جائے اور سونے والوں میں بیداری پیدا ہو اور آپ اپنی 'بیکراں صلاحیتوں' سے واقف ہوں"۔

دینی مدارس نے اپنے لئے نصاب تعلیم کو عصر حاضر کے تقاضوں اور اہم عنوانات و موضوعات کو ضرورت کے لحاظ سے انتخاب کیا ہے۔ ندوۃ العلماء کا نصاب دینیات کے ساتھ ساتھ عربی ادب اور عصری علوم پر ہے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کا نصاب دینی و دنیاوی دونوں طرح کے علوم و فنون پر مبنی ہے مگر دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں حدیث اور فقہ کے ساتھ تفسیر پر زیادہ توجہ مرکوز ہے اور دیگر علوم

وفنون کی حیثیت وسیلہ کی ہے جن میں ادب، معانی، معقولات اور عصری علوم وفنون شامل ہیں۔ ملا نظام الدین سہالوی جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے معاصر بزرگ تھے آپ نے درسِ نظامی میں صرف، نحو، منطق، حکمت، ریاضی، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، کلام، تفسیر اور حدیث کو شامل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس کا موجودہ نصاب درس نظامی کہلاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حرمین شریفین سے حدیث نبوی کا تحفہ لاکر دہلی میں اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں ایک نئے دبستان تدریس کی بنیاد رکھی تھی جس میں صحاح ستہ کا خاص اہتمام تھا، مگر اس دور میں علمائے ہند کے ذہنوں میں منطق وفلسفہ کے گہرے اثرات نے ولی اللہی نصاب کو زیادہ مقبول نہ ہونے دیا اور منطق وفلسفہ کا تناسب ایک پر دو کا ہی رہا۔ جبکہ دارالعلوم دیوبند کا نصاب درسِ نظامی اور درسِ ولی اللہی سے مرکب آمیزہ ہی رہا۔ کتاب "ہندوستان اسلامی عہد میں" اردو ترجمے میں شمس تبریز خان نے حواشی میں لکھا ہے "رجب ۱۱۴۵ھ میں حجاز سے واپسی کے بعد شاہ صاحب مدرسہ رحیمیہ میں درس دینے لگے پھر کوٹلہ فیروز شاہ کی مغربی جانب مسجد میں درس دینے لگے۔ طلبہ زیادہ ہوئے تو محمد شاہ نے شہر میں ایک بڑی حویلی نذر کردی جو ۱۸۵۷ء میں تباہ ہوئی (۱)۔

بہرحال یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ "تاریخ کے نشیب وفراز اور مختلف ادوار سے گزر کر علم کلام بھی اس وسیع تفکر اور زاویہ نظر کے قریب پہنچ چکا تھا جس کے لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کی ساخت اور تشکیل قرآنی اصولوں پر ہوسکتی تھی یہ عظیم کام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تقدیر میں تھا۔ انہوں نے دیگر علوم اسلامی کی طرح علم کلام کے ورثے پر بھی گہری نظر ڈالی اور اس کی افراط وتفریط پر بھی غور کیا نیز اس کے تاریخی مسائل سے بھی مکمل طریقے سے اجتناب کیا اور اس کے اصول وضوابط اور حدود کو دیگر علوم تک وسیع وعریض کردیا۔ یہ اپنے اصول قرآنی فکر سے بھی مطابقت رکھتے تھے اسی لئے ان اصولوں میں خاص طور سے توحید، آفاقیت، مقصدیت، تطبیق، منطقیت، توازن اور تدبر کی ایک عملی روح بھی کارفرما تھی۔ یہی مباحث ان کی تحریروں میں نئے

---

(۱) ہندوستان اسلامی عہد میں، تالیف: مولانا سید حکیم عبدالحی، مترجم اردو: مولوی شمس تبریز خاں، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۷۳ عیسوی ص ص: ۱۶۴، ۱۶۵۔

علم الکلام کی صورت لے کر جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کام اتنا اہم ہے کہ ہم اسے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ایک عظیم کارنامہ اور شاہکار ہی کہہ سکتے ہیں جو اس عہد اور اس کی معنویت کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔"(۱)

واقعات دارالحکومت دہلی میں جناب بشیرالدین احمد صاحب نے لکھا ہے: "یہ مدرسہ کسی زمانے میں نہایت عالی شان اور خوبصورت تھا اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ بادشاہی دور دورہ اور شاہ عبدالعزیز صاحب جیسا نامور عالم و فاضل اس کا مہتمم۔ محمد شاہ بادشاہ نے جناب شاہ ولی اللہ صاحب محدث کو پرانی دلی سے جہاں اب ان بزرگوں کے مزار ہیں شاہجہاں آباد یعنی موجودہ دہلی میں بلا کر ایک بڑا عالی شان مکان دیا تھا۔ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور اس مدرسے نے تعلیم دینیات میں وہ نام پایا کہ ہندوستان میں شہرہ ہو گیا۔ جب شاہ صاحب کے صاحبزادوں میں سے کوئی نہ رہا تو مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب نے مدرسے کی خدمت اپنے ذمے لی۔ ۱۲۵۶ھ میں آپ نے ہجرت کی تو مولانا مخصوص اللہ صاحب اور مولانا محمد موسیٰ صاحب خلف حضرت مولانا شاہ رفیع الدین اس کی نگرانی فرمانے لگے۔ ان حضرات نے بھی ۱۸۵۶ء میں انتقال فرمایا تو صرف مولوی محمد موسیٰ صاحب کے ایک صاحبزادے میاں عبدالسلام صاحب بہت صغرسن رہے اور ایک صاحبزادی رہ گئیں، خاندان بھر میں کوئی ایسا نہ رہا جو عبدالسلام صاحب کو پڑھاتا لکھاتا۔ غرض یہ سلسلہ جو کئی پشت سے اس خاندان میں جاری تھا بند ہو گیا۔ غدر میں مکانات لوٹ لئے گئے یا گرا دیئے گئے۔ کڑی تختے تک لوگ اٹھا لے گئے، خانہ خالی را دیو می گیرد، ایک شریف گردی تھی کہ الہی توبہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس، جس کا جس پر قابو چلا قابض ہو گیا۔ اب متفرق لوگوں کے مکان اس جگہ بن گئے ہیں مگر محلہ، شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسے کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے۔"(۲)

شاہ ولی اللہ صاحب کے مدرسے اور اس کے مختصر تعارف کے بعد عہد شاہ ولی اللہ صاحب میں تعلیم کی ابتدا اور رائج طریقے کا ایک مختصر جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں

---

(۱) ایضاً، حاشیہ ص: ۱۶۴۔

(۲) واقعات دارالحکومت دہلی، جلد ۲، بشیرالدین احمد دہلوی، شمسی پریس، آگرہ، ۱۹۱۹ عیسوی، آفسیٹ دہلی اردو اکادمی، دہلی ص ص: ۱۷۳، ۱۷۴۔

۵ر سال کی عمر میں بچے کو مکتب میں داخل کرادیا جاتا تھا جو ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں پرائمری تعلیم کے لئے آج بھی Five Plus تقریباً وہی عمر رائج ہے۔ ۷ر سال کی عمر سے روزہ و نماز شروع کرادئے جاتے تھے اور اسی ۷ تا ۸ سال کی عمر میں قرآن مجید بھی ختم کرادیا جاتا تھا۔ اس کے بعد فارسی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جو دس سال کی عمر میں شرح ملا جامی تک اس طرح جاری رہتا تھا کہ طالب علم میں عربی کتب کے مطالعے کی لیاقت پیدا ہو جائے اور آخر میں بیضاوی پڑھا کر مروجہ نصاب تعلیم کے کورس کی اہم کتابیں اس طرح پڑھائی جاتی تھیں:

حدیث شریف میں:

پوری مشکوۃ شریف (سوائے کتاب البیوع سے کتاب الآداب تک)، صحیح البخاری کتاب الطہارت تک، شمائل ترمذی (مکمل) تفسیر بیضاوی اور تفسیر مدارک کا ایک حصہ۔

علم فقہ میں: شرح وقایہ اور ہدایہ (مکمل)۔

اصول فقہ میں: حسامی اور توضیح وتلویح کا کافی حصہ۔

منطق میں: شرح شمسیہ (مکمل) اور شرح مطالع (کچھ حصہ)۔

علم کلام میں: شرح عقائد مع حاشیہ خیالی اور شرح مواقف (کچھ حصہ)۔

سلوک وتصوف میں: عوارف المعارف، رسائل تصوف وغیرہ۔

علم الحقائق میں: شرح رباعیات مولانا جامی، لوائح، مقدمہ شرح لمعات اور مقدمہ نقد النصوص۔

فن خواص اسماء وآیات میں: حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا مرتب کردہ مجموعہ۔

طب میں: موجز القانون۔

فلسفہ میں: شرح ہدایۃ الحکمۃ۔

نحو میں: کافیہ اور شرح ملا جامی۔

علم معانی میں: مطول اور مختصر المعانی۔

ہیئت وریاضی میں، مختلف رسائل: اس طرح حضرت شاہ ولی اللہ محدث صاحب کے عہد میں عربی مدارس میں مندرجہ بالا عناوین کے تحت کتب درسی شامل نصاب تھیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے عہد میں یہ دیکھا تھا کہ درس نظامی میں قرآن مجید اور اس کی تفسیر کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے اسی طرح حدیث کے علوم بھی شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد تقریباً فراموش ہو چلے تھے اور فقہ میں مذاہب اربعہ کی کشمکش اور تعصب کا دور جاری تھا اور ان سب کے علاوہ عوام الناس گمراہی اور توہم پرستی میں گرفتار تھے۔ حکومت متزلزل، معاشرہ گمراہ، اخلاقیات روبہ زوال اور علماء ومشائخ نہ صرف یہ کہ غفلت کا شکار تھے بلکہ وہ شریعت وطریقت دونوں سے کھلواڑ میں مصروف تھے۔ ان سب نامناسب وغیر اسلامی حالات میں شاہ ولی اللہ صاحب نے تجدید واصلاح کے لئے وہی طریقۂ کار منتخب کیا جو اُن سے قبل حضرت مجدد الف ثانیؒ نے عہد اکبری میں اختیار کیا تھا اور خود شاہ ولی اللہ صاحب نے انقلاب انگیز کتابیں لکھ کر جمود وقدامت اور توہم وگمراہی کے پردوں کو یکسر چاک کرنے کی سعی بلیغ کی مگر ان کے معاصرین نے شاہ صاحب کی اُس مثبت فکر کو نہ یکسر رد ہی کیا اور نہ آسانی سے قبول ہی کیا۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی ایک تصنیف ''الجزء اللطیف'' میں اپنے زمانے میں رائج مدرسہ رحیمیہ کا نصاب درج کیا ہے جس سے ان کے عہد میں مروجہ نصاب تعلیم کی اطلاع ملتی ہے ان کا نصاب اس طرح تھا:

کافیہ، شرح جامی، شرح شمسیہ (قطبی)، شرح مطالع، شرح ہدایۃ الحکمۃ، شرح عقائد نسفی مع حاشیہ جلالی، شرح مواقف، شرح وقایہ، بدایہ کامل وتامی، توضیح وتلویح (کسی قدر) مختصر ومطول، مشکوٰۃ المصابیح، شمائل ترمذی، صحیح البخاری (کسی قدر) مدارک، بیضاوی، عوارف المعارف، رسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی، مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص۔

اسی مذکورہ بالا نصاب سے علم منقول کے علمائے نامدار حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالغنی، شاہ محمد اسحٰق، مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا اسمٰعیل شہید جیسے بزرگ منظر عام پر آئے۔ بہادر شاہ اول اور محمد شاہ کے عہد میں حضرت شاہ ولی اللہ کے درس سے حضرت شاہ عبدالرحیم کے درس کو بڑا فروغ ہوا اور شاہ عبدالعزیز نے شاہ عالم ثانی کے زمانے سے اکبر شاہ ثانی تک اس درس کی کافی اشاعت کی''(۱)۔

---

(۱) ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ابوالحسنات ندوی، اعظم گڑھ ص ۶۴۔

اگر ہم مذکورہ بالا نصاب ولی اللہی کا ایک تقابلی مطالعہ بہادر شاہ اول کے عہد سے کریں تو ملا نظام الدین کا نصاب کچھ یوں ملتا ہے:

میزان، منشعب، صرفِ میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ، نحو میر، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح جامی، صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی مع میر سلم العلوم، میبذی، صدرا، شمس بازغہ، خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس) مقالہ اولیٰ، تشریح الافلاک، رسالہ توجیہ، شرح چغمنی باب اول، مختصر المعانی، مطول (کچھ حصہ) شرح وقایہ اولین و ہدایۃ آخرین، شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میر زاہد شرح مواقف، جلالین، بیضاوی، مشکوٰۃ المصابیح۔

ان دونوں نصابوں میں تقریباً ۷ کتابیں مشترک ہیں بقیہ دونوں نصاب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ درس نظامی میں ملا نظام الدین سہالوی کا زور منطق، فلسفہ یا علم معقولات کی طرف مائل ہے اور دہلی میں مدرسہ شاہ ولی اللہ کا نصاب قرآن واحادیث کی طرف یعنی منقولات پر مشتمل ہے۔ بہرحال دونوں نصابوں کی مشترک کتابوں میں:

(۱) کافیہ (۲) شرح جامی (۳) شرح وقایہ (۴) شرح مواقف (۵) بیضاوی (۶) مختصر المعانی اور (۷) شرح عقائد نسفی شامل ہیں۔

اسی مدرسہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ کے نصاب نے علم معقول کے مسلم الثبوت علماء ملا کمال الدین، علامہ عبدالعلی بحرالعلوم، قاضی مبارک، محب اللہ بہاری، ملا حمد اللہ سندیلوی اور علامہ عبدالحی جیسے علمائے نامدار پیدا کئے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریریں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ان کے عہد میں دو علوم زیادہ رائج تھے اول یونانی حکمت اور دوئم فقہ اور اسے سمجھنے کے لئے اصول فقہ اور اس کی تدوین سے متعلق یہ جاننا ضروری ہے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے آج تک جن جن اسلامی یا مسلم سلطنتوں میں اسلامی شریعت ملکی قانون کی حیثیت سے رائج رہی ہے وہاں فقہ کی گرم بازاری بدستور قائم رہی ہے۔ معین مذاہب کے وجود میں آنے سے قبل کسی خاص مکتب فکر کی فقہ ملک کا قانون نہ ہوا کرتی تھی لیکن جب فقہ کا ذخیرہ مدون ہو گیا اور مختلف فقہی مکاتب وجود میں آ گئے اور ان مکاتب کے متبعین

کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف تعصب بھی راہ پا گیا تو جس سلطنت کا امیر جس مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا اسی فقہ کو اپنی قلمرو میں ملکی قانون کی حیثیت سے رائج کر دیتا تھا ہندوستان میں چونکہ امراء سے عوام تک غالب اکثریت حنفی مکتب فکر رکھتی تھی اس لئے عہد غزنوی سے مغلیہ دور کے آخر تک یہاں کا ملکی قانون بھی فقہ حنفی کے مطابق تھا"(۱)۔

دوسری اہم بات یہ بھی تھی کہ فقہ حنفی پر جمود اس لئے بھی طاری تھا کہ عوام حنفی مذہب کے مطابق فتوی اور فیصلے چاہتے تھے نیز کسی نئے مجتہد کے اجتہادات کو قبول کرنا تو کیا وہ احناف سے ہٹ کر ائمہ ثلاثہ تک کی بات ماننے کے روادار نہ تھے۔ مزید شاہ صاحب نے جس فقہی مسلک کی بنیاد رکھی اسے مکمل شکل میں اور لوگ تو کیا قبول کرتے شاہ اسمٰعیل شہید کو چھوڑ کر خود ان کی اولاد تک نے قبول نہ کیا بھی پر نہ صرف عملی بلکہ فکری طور پر بھی حنفیت غالب تھی۔ فقہ کے تعلق سے یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ ہندوستان میں سلاطین دہلی کے عہد میں اکثر علماء صنعان، نیشاپور، غزنین، کاشان، بلخ، سجستان، خوارزم اور تبریز سے آئے تھے، ظاہر ہے یہ بھی علماء اپنے ساتھ فقہ حنفی لائے تھے، حجاز سے آنے والے علماء کی تعداد بہت کم رہی اسی لئے ہندوستانی فقہ میں عراقی اور ترکستانی اثرات زیادہ غالب رہے اور یہی فقہ ہندوستان میں رائج وشائع ہوئی جس کی اصولی تدوین ہمیں فتاویٰ تاتارخانی اور فتاویٰ عالمگیری میں دیکھنے کو ملتی ہے البتہ یہ امر بھی مسلم ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نصاب میں انہوں نے یہ کوشش ضرور کی تھی کہ تقلیدی فقہ کی جگہ تحقیقی فقہ کو رواج ملے اور انہوں نے اجتہاد و تقلید کی وضاحت کر کے کتاب وسنت کے اتباع کی دعوت بھی دی تھی۔

علم کلام میں شاہ ولی اللہ صاحب نے عہد شاہجہانی کے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی "الدر الثمین" اور عالمگیری عہد میں شیخ عبدالوہاب المخاطب بہ منعم خان قنوجی کی "بحر المذاہب" کے بعد "العقیدہ الحسنہ" اور حجۃ اللہ البالغہ" تصنیف کر کے علم کلام کی بحث کو کامل کرنے کی ایک کوشش ضرور کی تھی۔

جہاں تک علم حدیث کا منظر نامہ ہے اس میں سب سے مشہور کتاب امام حسن بن محمد صنعانی

(۱) اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، ڈاکٹر محمد مظہر بقا، بقا پبلیکیشنز، کراچی، پاکستان، ۱۹۸۶ عیسوی ص ص: ۴۸، ۸۵۔

کی ''مشارق الانوار'' ہے جو عہد قطب الدین ایبک میں لاہور کے قاضی تھے مگر آخر وقت میں بغداد تشریف لے گئے تھے اور وہیں خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کی خواہش پر ''مشارق الانوار'' لکھی تھی مگر یہ کتاب ہندوستان میں نہایت مقبول رہی اور یہ مدارس کے نصاب میں داخل رہی۔ ممتاز علماء نے مختلف ادوار میں اس کی ڈھائی ہزار سے زیادہ شروح اور اس پر حواشی لکھے ہیں بعد میں سولہویں صدی عیسوی میں مولانا علاء الدین علی نے ''کنز العمال'' لکھ کر حدیث شریف میں ایک گراں قدر اضافہ کیا۔ عہد اکبری، جہانگیری اور شاہجہانی میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حدیث پر تقریباً ۱۰ ارکتابیں لکھیں جن میں مشکوۃ کی فارسی شرح ''اشعۃ اللمعات'' سب سے زیادہ مقبول و معروف ہے۔ یہ چار جلدوں میں تقریباً ۲۶۵۵ صفحات پر محیط ہے اور ان ڈھائی ہزار صفحات میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مشکوۃ کی شرح کا محدثانہ حق پوری ذمہ داری سے ادا کر دیا ہے۔ اسی طرح حدیث میں مولانا مجد الدین فیروز آبادی کی سفر السعادت کی شرح بھی شیخ عبدالحق نے فارسی میں لکھی جو حافظ ابن قیم کی ''زاد المعاد'' کے برابر سمجھی جاتی ہے۔

مزید براں شیخ عبدالحق نے مشکوۃ کی عربی شرح ''لمعات التنقیح'' کے نام سے تحریر کی تھی مگر عوام و خواص تک اپنی بات کو زیادہ شدت سے پہنچانے کی غرض سے مشکوۃ کی فارسی شرح کی جو ''اشعۃ اللمعات'' کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اس طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے قبل شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے عہد میں دہلی کو علم حدیث کا دار الخلافہ بن جانے کا شرف حاصل ہے۔

پس اس سلسلے کی تکمیل حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصانیف سے ہوتی ہے جنہوں نے امام مالک کی کتاب موطا کی فارسی اور عربی میں دو مجتہدانہ شرحیں لکھیں اور صحیح بخاری کے تراجم کی شرح کی اور مزید ''ازالۃ الخفا عن تاریخ الخلفا'' ان کی ایک عظیم محدثانہ تصنیف ہے جس میں خلفائے راشدین کے مناقب بیان ہوئے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے عہد میں عملی اجتہاد کیا اور اپنے عہد کے امراء پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے انہیں مخاطب کر کے فرمایا تھا:

''اے امیرو! دیکھو کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے... کیا تم اعلانیہ شراب نہیں

پیتے اور پھر اپنے فعل کو تم برا بھی نہیں سمجھتے، تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لئے کھڑے کئے ہیں کہ ان میں زنا کاری کی جائے اور شرابیں ڈھالی جائیں، جوا کھیلا جائے لیکن اس میں دخل نہیں دیتے اور اس حال کو نہیں بدلتے... جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو اور قوی ہوتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو۔ تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانے کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو۔ اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف منعطف نہیں ہوتی کیا تم اپنے سر کو کبھی اللہ کے سامنے جھکاتے ہو؟ خدا کا نام تمہارے پاس اس لئے رہ گیا ہے کہ اپنے تذکروں اور قصے کہانیوں میں اس کو استعمال کرو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانے کا انقلاب ہے کیونکہ تم اکثر بولتے ہو خدا قادر ہے کہ ایسا کردے یعنی زمانے کے انقلاب کی یہ تعبیر ہے''(۱)

عہد وسطیٰ میں اتنی شدید تنقید کرنے کا حوصلہ عام طور پر علما کے پاس نہیں تھا۔ اسی طرح کا روّیہ حضرت مجدد صاحب الف ثانی نے بھی عہد اکبری میں اختیار کیا تھا اور احساسات اور جذبات کی شدت میں کافی حد تک مشابہت بھی درخور تحقیق ہے۔

تذکرہ ''اخبار الاخیار فی اسرار الابرار'' میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے معمولات میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے مدرسے میں دن میں دو مرتبہ جایا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ ان کے گھر سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ صبح جاتے اور دوپہر کے کھانے کے لئے گھر آتے تھے اور دوبارہ مدرسہ جاتے تھے۔ اس ایک اطلاع سے ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں مدارس میں رہائش اور کھانے کا انتظام نہیں ہوتا تھا جس کے باعث طلباء کو نہایت مشقت سے علم حاصل کرنا پڑتا تھا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ معمولی مدارس سے فراغت کے بعد تعلیم کے خاص شعبوں کی تکمیل کے لئے طلباء اکثر علماء کی رہائش گاہ پر حاضر ہوتے جہاں وہ بغیر کسی معاوضے کے خاص شعبوں کی تدریس کیا کرتے تھے۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں اپنی تعلیم انہی علماء کی صحبت سے مکمل کی تھی

(۱) تفہیمات الٰہیہ، مدینہ برقی پریس، بجنور، ۱۹۳۶ عیسوی، ص:۲۱۶۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم بدایوں میں حاصل کی اور تکمیل تعلیم کے لئے آگرہ آئے اور اپنے استاد مہر علی بیگ کے مکان پر قیام کیا اور وہیں تعلیم مکمل کی تھی۔ اس عہد میں فنونِ لطیفہ کی تعلیم مدارس میں رائج نہیں تھی۔ آئین اکبری میں ابوالفضل نے ''دانش اندوزانِ جاوید دولت'' کے عنوان سے اکبری عہد کے علماء کا حال تحریر کرتے ہوئے انہیں پانچ طبقوں میں منقسم کیا ہے:

۱۔ خدیوشناسئین: جن میں شیخ مبارک ناگوری، شیخ نظام نارنولی اور شیخ اللہ دیا تھے۔

۲۔ خداوند باطن: جن میں شیخ سلیم چشتی اور شیخ محمد غوث گوالیری تھے۔

۳۔ دانندۂ معقول و منقول: جن میں میر فتح اللہ شیرازی، میر مرتضیٰ، حافظ تاشقندی اور مولانا سعید ترکستانی تھے۔

۴۔ شناسائے عقلی کلام: جن میں مولانا نورالدین ترخان، مولانا پیر محمد اور مولانا عبدالباقی تھے۔

۵۔ پزشکان: جن میں حکیم ابوالفتح گیلانی، حکیم ہمام، حکیم شفائی اور حکیم لطف اللہ تھے۔ اس فہرست سے عہد اکبری کے علماء صوفیاء اور حکماء کا ایک خاکہ ضرور ملتا ہے جنہوں نے اپنے عہد میں علم و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی تھیں۔

تزکِ جہانگیری میں جہانگیر نے اکبرآباد کے بارے میں یہ اہم اطلاع درج کی ہے کہ یہاں کے باشندے تعلیم اور دست کاری میں فوقیت رکھتے ہیں اور ان کو تحصیل علم کا خاص شوق ہے متعدد علما مختلف مذہب و ملت کے اس شہر میں آباد ہو گئے ہیں اس سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ جہانگیر شہنشاہ ہونے کے ساتھ ساتھ شہروں کی تاریخی، سماجی اور ثقافتی اہمیت کا بھی رمز شناس تھا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے قرآن کا فارسی ترجمہ کیا تھا جس کا نام ''فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن'' رکھا تھا۔ عام طور پر یہ قرآن کا پہلا فارسی ترجمہ سمجھا جاتا ہے جبکہ شاہ صاحب نے اپنے ترجمے میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جب میں نے فارسی میں قرآن کریم کے ایسے ترجمے کی ضرورت محسوس کی جس کی زبان سلیس اور متداول ہو اور اس میں تکلف، تصنع اور قصص و توجیہات نہ ہوں تو میں نے تراجم کی تفتیش کی تاکہ اگر اس معیار کے مطابق کوئی ترجمہ مل جائے تو اسی کو رائج کروں مگر ان کا قول ہے: ''در بعض تطویل مخل یافت و در بعض تقصیر مخل و ہیچ یک موافق آن نیفتاد لاجرم عزم تالیف ترجمہ دیگر مصمم شد''(۱)۔

(۱) فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن، مطبع ہاشمی، میرٹھ ۱۲۸۵ ہجری، ص: مقدمہ، ا۔

درس نظامیہ میں بحیثیت مجموعی کچھ کمزوریاں راہ پا گئی تھیں جن کی طرف غالباً سب سے پہلے علامہ شبلی نعمانی نے توجہ کی اور ان کے نزدیک اس نظام میں درج ذیل اہم نقائص تھے:

ا۔ اس نصاب کتابیں تھیں نہ کہ علوم کی تفصیلات۔

۲۔ آزادانہ کے بجائے پابند نظر کی تخلیق اور علوم ذہنی اسی حد تک جو یونانیوں سے عربوں نے لئے تھے مگر اس کے بعد جو بھی ترقی ہوئی اس سے قطعی ناواقفیت۔

علامہ شبلی نعمانی کی یہ رائے نہایت اہم ہے اور یہ نقائص وہی بیان کرسکتا ہے جو بنظر دقیق اس نصاب سے گذرا ہو اور عملی طور سے اس نصاب پر اس کی مجموعی نظر بھی ہو۔

عصر حاضر کے ممتاز ترین عالم دین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم نے بھی اس نظام تعلیم کے مقصد میں ہونے والی کوتاہیوں کی جانب توجہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''کسی ادارے یا کسی زندہ جماعت کے لئے اپنی عمر میں صرف ایک بار حقیقت پسندی سے کام لینا، مادی نظام کے اندر ضروری تبدیلی پیدا کرنا اور اپنے آپ کو ہم آہنگ بنا کرنئی کوشش کرنا کافی نہیں ہے...... کسی ادارے کی افادیت، عملی زندگی میں اس کا مقام اور وہ رول جو وہ ادا کرتا ہے تنہا اس کی حیات کا ضامن ہے۔ تعلیم کی موجودہ دوئی غیر اسلامی اقتدار کے عہد کی بدعت ہے۔ پہلے ہمارا نظام تعلیم وجدانی اور سالمیت پر مبنی تھا۔ ہمارا قدیم نصاب تعلیم جس کی درس نظامی نمائندگی کرتا ہے مسلمانوں کے عہد حکومت میں ملک کا واحد نظام تعلیم اور ثقافت، ذہنی تربیت کا واحد ذریعہ تھا یہ جہاں محدث، فقیہ اور مدرس تیار کرتا تھا وہیں سول سروس کے عہدے دار اور ارکان سلطنت بھی مہیا کرتا تھا اس درس کی پیداوار جس طرح ملا محب اللہ بہاری اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی تھے اسی طرح علامہ سعد اللہ وزیر سلطنت بھی تھے''(۱)۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں یوپی گورنمنٹ نے مدارس عربیہ وفارسیہ کا ایک نصاب مرتب کروایا تھا۔ وہ ۱۹۵۱ عیسوی میں ۳۰×۲۰/۱۶ سائز کے ۳۲،۱۸۵ صفحات پر چھپا تھا جسے نہایت غور وخوض کے بعد مرتب کیا گیا تھا، مگر مولانا کی مصروفیات کے باعث ان کے سفارشی خط کے ساتھ حکومت کو بھیجا نہ جاسکا تھا اس میں مولانا نے کل مدت تعلیم ۱۶رسال رکھی تھی جس کی

(۱) عربی اسلامی مدارس کا نصاب تعلیم اور عصری تقاضے، سید اوصاف علی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۰

تقسیم اس طرح ہے:

درجۂ اولیہ: ۵؍سال۔

درجۂ ثانویہ: ۳؍سال۔

درجۂ عالیہ: [مولوی: ۳؍سال، عالم: ۳؍سال، فاضل: ۲؍سال اور علامہ: ۲؍سال]

اس نصاب کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ فلسفہ، ریاضیات اور اقتصادیات جیسے علوم کے ساتھ ایک پرچہ ان علوم کی مسلمانوں کے ہاتھوں پرورش کی تاریخ پر بھی مشتمل تھا یعنی اسلامی فلسفہ، اسلامی ریاضیات، اسلامی سیاسیات اور اسلامی اقتصادیات اور جغرافیہ میں ''جغرافیہ عالم اسلام'' کا ایک مزید پرچہ شامل کیا گیا تھا۔ فاضل کے درجے میں فاضل عقلیات، فاضل دینیات (شیعہ؍سُنّی) اور فاضل ادبیات کے لئے چار اختیارات۔

مزید علامہ کے درجے میں تفسیر، حدیث اور فقہ تین علوم کے اختیارات تھے، عہدِ وسطیٰ کے اسلامی مدارس کا عام نصاب تعلیم صرف ونحو، بلاغت، تفسیر، اصول حدیث، حدیث، عقائد وکلام، اصول فقہ، اصول جدل وخلاف، فقہ وفرائض، عربی نثر، عربی نظم، منطق، ہیئت، حساب اور ہندسے کی کتابوں کی تدریس پر مشتمل تھا جس میں خاص طور سے صرف حساب اور ہندسہ دو مضامین ایسے تھے جن میں عام طور سے دو کتابیں درج تھیں:

حساب میں: خلاصۃ فی الحساب (بہاؤالدین محمد الاملی)۔

ہندسے میں: تحریر اقلیدس (نصیر الدین محمد بن محمد الطوسی، متوفی ۶۷۲ ہجری)۔

عہدِ وسطیٰ کے نصاب پر عبدالسلام خاں، سابق پرنسل مدرسہ عالیہ، رامپور نے ''ہندوستان کے اسلامی مدارس پر ایک نظر'' میں ایک عالمانہ رائے دیتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''عموماً مدارس عربیہ میں اب ''الفیہ'' اور ''مفصل'' نہیں پڑھائی جاتیں، نحو کی آخری کتاب ''شرح جامی'' ہے، ''شافیہ بھی عام طور پر زیر درس نہیں ہے۔ تفسیر میں صرف ''جلالین'' اور کہیں ''مدارک'' و ''جلالین'' دو کی تعلیم کافی سمجھی جاتی ہے، ''بیضاوی'' کی ''انوار التنزیل'' کم مدارس میں رائج ہے۔ حدیث میں ''مشکوٰۃ'' اور آخر میں صحاح ستہ کا دور عام ہے جس پر یہ نصاب ختم ہوجاتا ہے۔ عقائد وکلام میں صرف ''شرح عقائد'' مروج ہے۔ اصول فقہ میں ''نورالانوار''

''اصول شاشی'' اور کہیں کہیں ''توضیح'' اور ''تلویح'' بھی زیر درس ہیں۔ فقہ میں ''الدر المختار'' اور ''مراقی الفلاح'' کا رواج بھی کم ہے۔ عربی نثر میں عموماً ''مقامات حریری'' اور ''نفحۃ الیمن'' کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ منطق میں عبداللہ یزدی کی ''شرح تہذیب'' ''قطبی'' زیادہ سے زیادہ ''سلم العلوم'' اور ''ملا حسن'' کا رواج ہے۔ حکمت میں ''ہدیہ سعیدیہ'' اور ''ہدایۃ الحکمۃ'' یا ''میبذی'' مروج ہے۔ ہیئت، حساب اور ہندسہ اب قریب قریب نصاب سے خارج ہو چکے ہیں۔ تاریخ خواہ وہ اقوام وممالک سے متعلق ہو خواہ علوم وفنون سے، نصاب کا لازمی جزو نہیں۔ بعض مدارس میں عرب کی جاہلی تاریخ یا اسلام کے قرونِ اولی کی تاریخ سے متعلق دو ایک مختصر کتابیں ادبی طور پر پڑھادی جاتی ہیں۔ سرکاری نگرانی میں جامعی یا تعلیمی مجالس کے تحت جو نصاب بنایا گیا ہے وہ عربی نثر ونظم اور تاریخ کے مفید اضافے کے ساتھ تقریباً انہی کتابوں پر مشتمل ہے لیکن اس نصاب کے تحت تعلیم حاصل کرنے کا مقصد طلبا کے نزدیک محض مقررہ امتحانات پاس کر لینا ہوتا ہے نہ کہ علم یا ذہنی تربیت حاصل کرنا، گویا عملاً نصاب اپنا حقیقی مقصد کھو چکا ہے''۔(۱)

آخر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نصاب اور اسلامی مدارس کے نصاب کے لئے عالم اسلام کے امیر الشعراء علامہ اقبال نے ان کی حالتِ زار پر اظہار افسوس اس شعر میں رقم کیا ہے:

بہ این مکتب بہ این دانش چہ نازی

کہ نان بر کف ندادو جان زتن بُرد

---

(۱) ایضاً ص: ۴۷، ۴۸۔

# امام شاہ ولی اللہؒ

ڈاکٹر رشید الوحیدی قاسمی ☆

اٹھارہویں صدی ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک انقلابی تبدیلی کی تاریخ ہے۔ سولھویں صدی میں بابر نے افغانی نسل کے لودی خاندان کو اکھاڑ کر جس مضبوط حکومت کی بنیاد رکھی تھی اب اس کے دن پورے ہو چکے تھے اور مغلیہ سلطنت کی اس حکومت کا سانچہ ٹوٹ رہا تھا، سیاسی و مالیاتی قانون وضابطہ کمزور پڑ چکا تھا۔ مرکز گریز طاقتوں میں بادشاہ کی ذات سے وفاداری کا عنصر ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ اورنگ زیب تک یہ بھرم پھر بھی کچھ قائم تھا اُن کے انتقال نے اس تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ چنانچہ دلی کے افق پر ایرانی تورانی افغانی اور ہندوستانی چپقلش اور مراہٹہ راجپوت، سکھ، جاٹ اور سید برادران کے درمیان سلطنتِ مغلیہ کی وراثت پر قبضے کے لئے تُرک تازیاں اور مہم جوئی شروع ہوگئی تھیں۔ اس مزاج کی فضا میں اجتماعی اور نجی اخلاق کو بھی گھُن لگ گیا۔

امراء عیش و عشرت میں ڈوب گئے۔ دربار میں ہر جماعت، ہر وزیر و امیر نے نئے آنے والے بادشاہ پر اپنا تسلط قائم رکھنے، اپنی مرضی و اقتدار کو باقی رکھنے میں تمام ضابطۂ اخلاق و قانون کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ عام باشندوں، کسان، کاریگر و تجار کی حالت بھی خراب تھی۔ وہ لوگ امراء و افسران اور حکومت کے کارندوں کے حد سے زیادہ مطالبات میں پس کر رہ گئے تھے۔ فوج پست ہمت ہو چکی تھی۔ تنخواہیں نہ ملنے سے بغاوت پر آمادہ تھی۔ افسران بدچلن ہو گئے۔ سوسائٹی کے

☆ سابق استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

اتحادی دھاگے کمزور پڑ چکے تھے۔ عوام میں بے ایمانی، بدچلنی، بدعقیدگی رسوم ورواج زورشور سے جاری تھے، علماء صوفیاء خود بھی راستے سے بھٹک گئے تھے اور عوام کو بھی گمراہ کر دیا تھا۔ علماء کا یہ ایک ایسا گروہ تھا جو خود پسند، اہل دماغ، دنیا پرست اور ریا کار تھا جنہیں اپنی ترقی سے مطلب تھا۔ انہیں اس کی پرواہ نہیں تھی کہ دین رسوا ہو رہا ہے۔

اسی طرح دنیا دار صوفیا خانقاہیں کھول کر بیٹھ گئے تھے جگہ جگہ اُن کی خانقاہیں اور تکئے قائم تھے، بھولے اور جاہل عوام ان کے گرد جمع تھے اور وہ سب کو بیوقوف بنائے ہوئے تھے۔ ایسے رند مشرب اوباش لوگ حلقۂ صوفیا میں داخل ہو گئے تھے۔ خرقۂ سالوس پہن لیا تھا۔ شریعت اور سنت سے خود کو آزاد کر لیا تھا، حقیقی تصوف کا یہ زوال ۱۸ رویں صدی میں اسلامی اصولوں کے زوال کی نشاندہی کرتا ہے۔

یہ تھے وہ حالات جن میں شاہ صاحبؒ کی پیدائش ہوئی، آپ ۱۷۰۳ء میں مظفر نگر ضلع کے قصبہ پھلت میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش کی بشارت خواجہ قطب الدین بختیار کا کیؒ نے آپ کے والد شاہ عبدالرحیم کو دی اور ساتھ ہی فرمایا بچے کا نام میرے نام پر رکھنا۔ والد کے ذہن سے یہ نصیحت فراموش ہو گئی۔ انہوں نے ولی اللہ نام رکھ دیا۔ بعد میں خیال آیا تو قطب الدین بھی رکھا والد کی طرف سے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے اور والدہ کی طرف سے حضرت موسیٰ کاظمؒ سے ملتا ہے آپ کا تاریخی نام عظیم الدین تھا۔ شاہ صاحب عالم تھے، صوفی تھے، مفسر، محدث، مصلح تھے اور ایک مجاہد تھے۔ وہ اپنے گردوپیش کے حالات سے ایک مخلص قائد کی طرح بے چین تھے۔ اور اس کی اصلاح کے لئے مجاہدانہ کردار پیش کر رہے تھے۔ مرہٹوں کی دلی پر یلغار، اور بربادی کو دیکھ کر وہ عملی میدان میں سامنے آ گئے۔ انہوں نے بادشاہوں امراء، حاکموں میں اتحاد اور مقابلے کی روح پیدا کرنی چاہی اور ناامیدی۔ ناکامی کی صورت میں روہیلے حاکم نجیب الدولہ کے ساتھ مل کر احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا کہ اب وہی آ کر مرہٹوں کی طاقت کو توڑے۔ نادر آیا اور مرہٹوں کی ٹڈی دل فوج کو کاٹ کر رکھ دیا۔ دلی کو لوٹا اور واپس گیا۔ اگر ابدالی اپنے پیش رو حملہ آوروں کی طرح دلی کے تخت پر بیٹھ جاتا تو ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ سیاسی اُتھل

پُھل کے ساتھ معاشرے میں جو اخلاق سوز کیفیت پیدا ہو گئی تھی شاہ صاحب نے ادھر بھی توجہ فرمائی بد قسمتی سے مسلمانوں پر آرام طلبی، دولت سے محبت، خود غرضی عام تھی۔ ہندوؤں کے اثر سے مسلمان بھی نکاح بیوگان کو عیب سمجھنے لگے تھے۔ شادی بیاہ میں مہر بھاری بھاری باندھتے، جہیز اور شادی میں جھوٹی شان و شوکت دکھانے کے لئے فضول خرچی کرتے، مرنے کے بعد کی رسموں میں تیجہ اور چالیسواں کا عام چلن تھا۔ آپس میں فرقہ بندی اور اس کے نتیجے میں تصادم اور ٹکراؤ، پیری مریدی کے نام پر زر اندوزی فواحش کا ارتکاب غرض ان تمام گمراہیوں سے مسلمانوں کو نکالنے کی پوری کوشش کی۔ علوم قرآن، حدیث، تفسیر پر نہایت قیمتی تصانیف، حاکمانِ وقت کی تنبیہ ایسے بڑے بڑے کاموں کے ساتھ مسلمانوں کی عام حالت کی طرف توجہ بڑی ہمت کا کام تھا سیاست پر شاہ صاحب کا ذہن اس امر میں صاف تھا کہ اخلاق سے گہرا رشتہ ہے۔

اخلاق کے انفرادی پہلو سے زیادہ اس کے معاشرتی پہلو پر زور دیتے تھے اور اخلاقیات میں عدل کو سب سے اونچا مقام دیتے تھے۔ انفرادی مثال میں ان کا خیال تھا کہ جس ذاتی کردار میں عدل داخل ہو جاتا ہے وہ مہذب برتاؤ، خوش خلقی اور آداب گفتار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ مالی معاملات میں عدل اقتصاد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں عدل شہری آزادی کو جنم دیتا ہے اور یہی عدل جب مساوات، باہمی اخوت اور انسانی برادری کی بنیاد بن جاتا ہے تو معاشرتی نیکی کا نام دیا جاتا ہے۔ عدل کی بنیاد پر نیک سوسائٹی کی تعمیر مرضی الٰہی ہے۔ گویا یہاں شاہ صاحب "اعدلوا ھو اقربُ للتقوی" کی عملی تفسیر پیش کر دیتے ہیں۔ مال و دولت میں عدل کی ضرورت پر شاہ صاحب کی تحریر سے نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دولت کی تقسیم میں بے اعتدالی ملکوں کو لے ڈوبتی ہے کیونکہ ملک کا اعلیٰ طبقہ، امراء اور درباری لوگ تعیش میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کے لئے بے تحاشہ ایسی دولت جمع کرتے ہیں جو ملک کے محنت کرنے والوں پر دباؤ ڈال کر جمع کی جاتی ہے۔ امیر: امیر تر اور غریب: غریب تر ہو جاتا ہے۔ ساری دولت اوپر ہی اوپر تقسیم ہو جاتی ہے۔ شاہی خزانہ خالی ہو جاتا ہے۔ حکومت کا مالیاتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اس کے دور رس نتائج سامنے آتے ہیں اخلاق میں بے راہ روی اور سیاست میں انتشار کے سائے لمبے ہو جاتے ہیں ملک نزاع کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح مستحکم سے مستحکم حکومت کا ستارۂ اقبال ایک دن زمین بوس ہو جاتا ہے۔

اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت کے تیزی سے زوال، دولت کے اسی غیر عادلانہ رویے کا مظہر ہے۔ شاہ صاحب قیصر و کسریٰ کی حکومت کے زوال میں اسی بدعنوانی کو بنیاد مانتے ہیں۔ اس کے علاج کے لئے شاہ صاحب کے یہاں ایک اصطلاح ملتی ہے "فک کل نظام" اُن کا خیال ہے جب ایسی صورت پیدا ہو جائے تو پورے نظام کو توڑ دیا جائے اور دوبارہ انسانوں کی خرابی کی غرض سے عدل پر مبنی نظام قائم کیا جائے جس سے آپس میں باہمی میل جول اور رواداری جنم لے سکے۔ شاہ صاحب اسلام کی عظمتِ رفتہ کو دوبارہ واپس لانے کے خواہشمند تھے۔ وہ دور جو آغازِ اسلام سے سقوط بغداد ۱۲۵۷ تک مسلمانوں کے فکری، ذہنی، سیاسی نشاط کا دور تھا، مسلمانوں میں مذہبی جوش ان کے اندر ولولہ اور امنگ تھی۔ علم و فضل کی ترقی عروج پر تھی۔ وہ غزالی، سینا، رازی، البیرونی کا دور اور ابوحنیفہ شافعی، طبری، مسعودی کا عہد تھا۔ کرۂ ارض کے بڑے حصے پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی۔ شاہ صاحب کا یہ خواب تو عام انداز پر پورا نہ ہو سکا تاہم انہوں نے جو کام کیے، جس انداز پر اور جس قدر کام کیے اور مسلمانوں کے معاشرے میں جو عظیم انقلاب ان کی ذات سے آیا اس نے قرونِ اول کی یاد دلا دی بلکہ شاید بعض چیزوں میں وہ متقدمین سے بھی بڑھ گئے۔

شاہ صاحب کی تصانیف آپ کے تبحر علمی کا مکمل ثبوت ہیں۔ قرآن پاک کو جس سے آپ کو خاص شغف تھا اور جس کا علم آپ نے اپنے والد شاہ عبدالرحیمؒ سے حاصل کیا تھا وہ اپنے تمام کمالات کی بنیاد مانتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"یہی میرے حق میں فتح عظیم کا باعث ہوا۔" اسی قرآن پاک کے مطالعے نے آپ کو علومِ شریعت کے اسرار و رموز کی گہرائی تک پہنچا دیا، ایسے ایسے نکتے بیان فرمائے جو آپ سے پہلے نظر نہیں آتے۔ آپ سے پہلے یا علماء ظاہر کا دور تھا یا محض باطن اور روحانیت کے دعویدار تھے۔ اس کے علاوہ فقہاء کے چار مذاہب میں خاصا اختلاف و نزاع تھا۔ شاہ صاحب نے اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی، قانون اور روحانیت، شریعت و طریقت کو ہم آہنگ کر دیا اور اس انداز پر یہ کام کیا جو طبع زاد اور انوکھا انداز تھا۔ اسی طرح مذاہب فقہ کے درمیان اتصال اور اتفاق پیدا کر دیا اور واضح فرما دیا کہ چاروں کے مقاصد ایک ہیں گو طریقے جدا جدا ہیں۔ آپ نے فقہ اور حدیث میں بھی موافقت کی راہ نکالی۔ تمام احکام و مسائل کو حدیث و حکمت سے مزین فرمایا اس کی بہترین مثال

آپ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے۔ لوگ عربی زبان سے ناواقف تھے۔ قرآن کو پڑھ لیتے تھے۔ اس کے معانی کی طرف ادنیٰ توجہ بھی نہ تھی۔ شاہ صاحب نے اپنے زمانے کی عوامی و سرکاری فارسی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا جس سے قرآن فہمی کی راہ آسان ہوگئی۔ اصول تفسیر اور اصولِ حدیث پر بھی آپ کی بلیغ اور منفرد کوشش عظیم کارنامہ ہے۔ الفوز الکبیر اصول تفسیر پر ایسا محیر العقول کارنامہ ہے جو اپنی وضاحت کے لئے ایک مستقل تصنیف چاہتا ہے۔ مختصراً اس موضوع پر آپ نے نہایت اچھوتے اور منفرد انداز پر تحقیق پیش کردی ہے جیسا کہ کتاب کے مقدمے میں خود فرماتے ہیں "اگر مفسرین، تفسیر کے مطالعے میں عمریں گذاریں تب بھی قرآن کو سمجھتے نہیں یہ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا، ایسا لگتا ہے کہ آپ کسی ایک آیت پر غور فرماتے تھے اور عین اُسی وقت اُن کے افق ذہن پر پورے قرآن کے مطالب و مقاصد کی تجلی کا ظہور ہوتا رہتا تھا۔ قرآن پاک کے مقاصد میں نفوس بشری کی تہذیب عقائد باطلہ اور اعمالِ فاسدہ کا رد آیتوں کے نزول کے لئے اپنے خاص انداز میں اسبابِ نزول کا تذکرہ، یہ چند مثالیں ہیں۔ ہیئت مناظرہ کیوں اتری متکلمین میں عقائد باطلہ کا شیوع تھا اس کو رد کرنا مقصود تھا۔ آیت احکام اعمال فاسدہ کی اصلاح کے لئے اتاری گئی۔ آیت تذکیر کے ذریعہ غفلت سے ہوشیار کرنا مقصود تھا۔ قرآن میں قصص ماضیہ کا تذکرہ عبرت و سبق کے لئے ہے۔ یہ وہ طرز تھا جو شاہ صاحب نے مطالعۂ قرآن سے اخذ فرمایا تھا جس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی علم حدیث میں تراجم بخاری کے علاوہ موطا امام مالک کی شرح عربی و فارسی میں تحریر فرمائی۔ مصفیٰ فارسی زبان میں ہے اس کا انداز متکلمانہ اجتہادی شان کا ہے اور مسوّیٰ عربی میں ہے اس میں غریب الفاظ و حدیث کی شرح اور اختلافِ مذاہب کا تذکرہ ہے۔ اجتہاد و تقلید کے موضوع پر عقد الجید نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اہل سنت والجماعت کی تائید و تشریح میں بدورِ بازغہ اور مقدمۂ سنیہ تحریر فرمائی۔ سیر و تاریخ میں ازالۃ الخفا ہے اس میں خلفا وار بعہ کی فضیلت اور فقہی تاریخ کا تذکرہ نیز اختلافی معاملات میں ایک معتدل راہ پیش کردی ہے۔ سلوک و تصوف میں خیر کثیر، تفہیمات، فیوض الحرمین اور دیگر کتب اس کے علاوہ عربی میں اشعار کا ایک دیوان آپ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ نے جمع کیا تھا۔

ظاہر ہے شاہ صاحب کی ساری تصانیف کا تذکرہ اور اس پر تبصرہ بہت عالی ہمت لوگوں کا کام

ہے اور بہت تفصیل کا طالب ہے۔ ہم جیسے چلتے پھرتے طفلِ مکتب اُن کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اُن پر گفتگو کرنا تو دور کی بات ہے ہم تو مختلف النوع میدان میں ان کی تگ ودو، ان کے کام کی کثرت، ہمت اور حوصلے کی بلندی ہی کا تذکرہ کر سکتے ہیں سو اپنی حد تک کر چکے۔ شاہ صاحب کے اخلاص کی برکت سے اُن کا فیض کہاں تک پھیلا اس پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ مذہبی اعتبار سے اسلامی ہند میں آج تک مسلمانوں کا سوادِ اعظم اہل سنت والجماعت کے ماننے والوں کا ہے۔ صحیح عقیدہ رکھنے والوں کا ہے یہ شاہ صاحب کا فیض ہے۔ ہندوستان میں دینی رجحان، اسلامی فکر و احساس کی بہار شاہ صاحب کی دین ہے، حدیث، قرآن، فقہ اور تصوف کا سلسلہ انہی کی ذات کا فیضان ہے، آج ملک میں کوئی ادارہ، حدیث کا کوئی عالم، علمِ حدیث کا کوئی مرکز ہو سب کا علمی سلسلۂ نسب شاہ عبدالعزیزؒ (شاہ صاحب کے صاحبزادے) کے وسیلے سے شاہ صاحب ہی تک پہونچتا ہے۔ دین کی تبلیغ وارشاد کا کام، اصلاحِ معاشرہ کی کوشش، فرقِ باطلہ کا ردّ، ۱۹۴۷ تک مجاہدین اسلام کی سیاسی جدوجہد اور اس جدوجہد کے نتیجے میں غلامی سے ملک کو نجات، سب کچھ شاہ صاحب کا فیض ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

# شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کی اصلاحی وسیاسی تحریک

مفتی جمیل الرحمٰن قاسمی ☆

حجۃ الاسلام حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۴ شوال ۱۱۱۴ھ مطابق ۱۷۰۳ء بوقت طلوع آفتاب قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ اختر شناسوں نے علوم نجوم کی روشنی میں شاہ صاحب کا زائچہ کھینچا ان کے حساب سے وہ سال شمس وعطارد کے قران کا سال تھا۔ اہلِ علم نے عظیم الدین تاریخ ولادت نکالی۔ پانچ سال کی عمر میں شاہ صاحب کو مکتب میں داخل کیا گیا۔ سات سال کی عمر میں انہوں نے قرآن کریم مکمل کیا۔ اور فارسی کی تعلیم شروع کی۔ دس سال کی عمر تک انہوں نے شرح جامی تک تعلیم پوری کی۔ اور صرف نحو اور ادب، اور لغت پر دسترس حاصل کی۔ پندرہ برس کی عمر میں علومِ عقلیہ اور نقلیہ کی تعلیم مکمل کی۔ اور کتاب وسنت کی اشاعت اور اصلاحِ معاشرہ کی تحریک شروع کی۔

آپ نے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، تصوف، عقائد، لغت ومعانی، منطق، فلسفہ، طب، علم ہیئت اور حساب کی بیشتر کتابیں اپنے والد مکرم حضرت عبدالرحیم شاہ صاحب اور شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد سلوکِ بیعت حاصل کیا۔ شاہ عبدالرحیم صاحب نے فنونِ متداولہ اور علومِ باطنی میں ان کا ذوق وشوق اور بلند وارفع مقام دیکھا تو شہر کے رؤساء۔ قضاۃ اور علماء کرام کی موجودگی میں ان کو علومِ متداولہ اور تصوف وسلوک کے درس کی اجازت دیدی۔ اور بعد میں اجازت بیعت وارشاد بھی مرحمت فرمائی۔

---

☆ مہتمم جامعہ رحمانیہ عربیہ، ہاپوڑ۔

حضرت شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب خاندانِ فاروقِ اعظمؓ سے ملتا ہے۔ آپ کے خاندان میں علم و فضل اور شجاعت و سخاوت کا دور دورہ رہا۔ دینی، عصری اور سیاسی علوم و کمالات کا جامع اس خاندان کو کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

آپ کے خاندان میں سب سے پہلے شیخ شمس الدین مفتی کی ہندوستان آمد کا ذکر ملتا ہے۔ آپ نے دارالسلطنت دہلی سے تیس میل کے فاصلہ پر شہر رہتک میں قیام فرمایا۔ اور اسلامی علوم وفنون کی اشاعت اور اصلاحی اور انقلابی تحریک کے مقصد کو سامنے رکھ کر وہاں ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ اس علاقہ میں ان کے مدرسہ کو دینی مرکزیت کا مقام ملا۔ اور دینی معلومات حاصل کرنے والوں اور اختلافی معاملات اور قضیوں کو طے کرانے والوں کا ہجوم وہاں لگا رہتا۔

شیخ محمود بن قوام الدین کے زمانہ تک منصب قضاء اور علوم دینیہ کا مرجع یہی خاندان رہا۔ شیخ محمود نے سپہ گری کے فن میں مہارت حاصل کی۔ اور شاہ ولی اللہ کے جدامجد تک اس خاندان نے میدان جہاد میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، اس خاندان نے ضیغانِ کفر و باطل کا قلع قمع کرنے اور اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے لئے جہاد جاری رکھا اور معاشرہ کو نظام عدل پیش کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ آپ کے جدامجد کا نام شیخ وجیہ الدین ہے۔ شیخ صاحب نے شجاعت اور دلیری میں محیر العقول کارنامے پیش کئے۔ اور سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں جامِ شہادت نوش کیا۔

شیخ وجیہ الدین کے تین صاحبزادے ہیں:

(۱) شیخ ابوالرضا محمد۔

(۲) شیخ عبدالحکیم۔

(۳) شیخ عبدالرحیم۔

شیخ عبدالرحیم صاحب دہلوی شاہ ولی اللہ کے پدر بزرگوار ہیں۔ شیخ عبدالرحیم صاحب ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ شیخ صاحب نے شیخ ابوالرضا محمد اور علامہ میر قمر زاہد الہروی سے علوم متداولہ کی تعلیم پائی۔ اور علم و فضل میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ انہوں نے سلطان بہادر اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں فتاویٰ عالمگیری کی تدوین و تنقیح میں نمایاں حصہ لیا اور فقہ و حدیث کی عظیم

خدمت انجام دی۔

اپنی اصلاحی اور انقلابی تحریک کو آفاقیت دینے کی خاطر ۱۱۱۲ھ میں شاہ عبدالرحیم صاحب نے چھتہ شیخ نزد مہندیان دہلی میں ایک دینی مرکز مدرسہ رحیمیہ کے نام سے قائم کیا۔ مدرسہ رحیمیہ رشد وہدایت کا مرکز اور علوم وفنون کا سرچشمہ تھا۔ جس میں ملک اور بیرون ملک بالخصوص، افغانستان، ایران، حجاز اور بخارا اور سمرقند کے ہزاروں طالب علم علوم دینیہ اور فنونِ عقلیہ حاصل کرتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب علم ظاہر اور علم باطن کے جامع اور سلسلہ چشتیہ ونقشبندیہ کے امام تھے۔ اسی لئے مدرسہ رحیمیہ میں علوم ظاہری کی تکمیل اور باطنی علوم ومعارف کی تحصیل کا نظم قائم تھا۔ جیسا کہ مولوی بشیرالدین احمد صاحب دہلوی رقم طراز ہیں:

> ''شیخ وجیہ الدین کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ عبدالرحیم صاحب نے درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور مدرسہ رحیمیہ قائم کیا۔ تمام دن قرآن مجید اور حدیث پاک کا درس دیتے، اور رات کو طالبانِ خدا کی توجہ دہی اور مراتبِ سلوک طے کرانے میں مشغول رہتے۔ اور ظاہری اور باطنی دونوں علموں کی تعلیم دیتے۔
> (واقعات دارالحکومت: ص: ۵۸۵)۔

۱۱۳۱ھ میں شاہ عبدالرحیم صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مدرسہ رحیمیہ میں بیٹھ کر تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور دعوتی وسیاسی میدان میں معاشرہ کی صلاح وفلاح کا کام کیا۔ چنانچہ مفتی عطاء الرحمٰن صاحب قاسمی الواح الصنادید حصہ اول میں لکھتے ہیں:

> ''حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب محدث دہلوی کے وصال کے بعد بھی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو سب نے متفقہ طور پر آپ کے والد مرحوم کی مسندِ صدارت درس سپرد فرمائی۔ جس کو آپ نے بڑی خوش اسلوبی اور اولوالعزمی کے ساتھ نہ صرف نبھایا۔ بلکہ اس کو شاہراہِ ترقی پر گامزن کیا۔

حضرت شاہ صاحب کی علمی خدمات بیان کرنے کے بعد ان کی سیاسی اور انقلابی تحریک پر نامور مؤرخ مولانا مفتی عطاء الرحمٰن صاحب قاسمی اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

مدرسہ رحیمیہ ابتداء ہی سے انقلابی تحریک کا مرکز رہا۔ یہاں کے فضلاء اور علماء نے

سامراجی قوتوں کا جم کر مقابلہ کیا اور انگریزوں کے لئے سم قاتل ثابت ہوئے۔شاہ عبدالرحیم صاحب کے بعد شاہ ولی اللہ نے رجوع الی القرآن کی دعوت دی اور انقلابی رجحان رکھنے والے فضلاء مدرسہ رحیمیہ کی ذہنی وفکری رہنمائی کی۔اور ان کے اندر صالح انقلاب برپا کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔(الواح الصنادید: حصہ اول ص:۴۵)۔

شاہ صاحب کے اس انقلابی مرکز، روحانی خانقاہ اور علمی تربیت کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے مولانا امداد صابری لکھتے ہیں:

"یہ مدرسہ صرف درسگاہ نہیں تھا۔ بلکہ برصغیر کی ایک انقلابی تحریک کا مرکزی ادارہ تھا۔جس نے پورے ہندوستان میں انگریزی سامراجیت کی جڑیں کمزور کرنے اور ان کا خاتمہ کرنے کے لئے عملی اقدامات کئے تھے۔اور ایک جال پھیلایا تھا۔اسے ایک خانقاہ کی بھی حیثیت حاصل تھی۔ جہاں لوگوں کے کردار و کیریکٹر بنائے جاتے تھے۔وہاں انسان ڈھالے جاتے تھے اور مجاہدین کی تربیت کی جاتی تھی۔(دہلی کے قدیم مدارس و مدرس: ص:۱۱۴)۔

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا یہ مرکز علم وعرفان ڈیڑھ سو برس تک ترقی کے مدارج طے کرتا رہا۔حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب۔اور ان کے اہلِ خاندان اور متوسلین نے اس سرچشمہ کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ مزید ترقیات سے چار چاند لگائے۔مدرسہ رحیمیہ کے علاوہ کلاں محل میں مدرسہ شاہ عبدالعزیز، اور شاہجہانی جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان اکبر آبادی مسجد میں شاہ عبدالقادرؒ کے نام سے بھی مراکز قائم کئے گئے۔جن میں علم ومعرفت اور شریعت وطریقت کا درس دیا گیا۔اور مجاہدین تیار کئے گئے۔مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا محمد اسماعیل شہید کی تعلیم وتربیت اکبر آبادی مسجد میں ہوئی۔اور یہیں سے ان کی تحریک جہاد کا آغاز ہوا جنہوں نے صوبۂ سرحد بالاکوٹ میں جامِ شہادت نوش کیا۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے سلطنت مغلیہ کا آخری زمانہ دیکھا۔جب ملک کے بیشتر حصوں میں شورش، فوضیت اور انارکی برپا تھی۔سماجی، اخلاقی، اور سیاسی سطح پر اضمحلال اور زوال کے آثار نمایاں تھے۔حضرت شاہ صاحب اس ظلمت آشام فضا میں آفتاب سحر کی طرح ہویدا ہوئے۔اور

ہوا وہوس اور نفاق وشقاق کے دبیز پردوں کو چاک کرنے میں مصروف ہو گئے۔

شاہ ولی صاحب کی ولادت ۱۷۰۳ء اور وفات ۱۷۶۲ء میں ہوئی۔ اس وقفہ حیات میں درج ذیل شاہان مغلیہ تخت شاہی پر رونق افروز رہے۔

(۱) اورنگ زیب عالمگیر ۱۶۵۸ء۔ ۱۷۰۷ء (۲) بہادر شاہ اول ۱۷۰۷ء۔ ۱۷۱۲ء
(۳) معزالدین جہاندار شاہ ۱۷۱۳ء۔ ۱۷۱۲ء (۴) فرخ سیر ۱۷۱۳ء۔ ۱۷۱۹ء
(۵) نیکوسیر ۱۷۱۹ء (۶) رفیع الدرجات ۱۷۱۹ء
(۷) محمد ابراہیم ۱۷۱۹ء۔ ۱۷۲۰ء (۸) محمد شاہ ۱۷۲۰ء۔ ۱۷۴۸ء
(۹) احمد شاہ ۱۷۴۸ء۔ ۱۷۵۴ء (۱۰) عالمگیر ثانی ۱۷۵۹ء۔ ۱۷۵۴ء
(۱۱) شاہ عالم ۱۸۰۹ء۔ ۱۷۵۹ء۔

اس قلیل مدت میں گیارہ سلاطین کی تبدیلی، نظم سلطنت کے غیر مستحکم ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ خودغرضی، ہوس پرستی اور طوائف الملوکی نے حکومت کی جڑیں کھوکھلی کر ڈالی تھیں۔ شاہ صاحب کی خواہش تھی کہ ایک صالح اور پُروقار معاشرہ تیار ہو۔ اور حکمرانوں کی خرمستی اور مدہوشی کا سلسلہ ختم ہو۔ شاہ صاحب نے ایک طرف اعیانِ سلطنت کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ اور ان کو حق پرستی اور نکوکاری کا درس دیا۔ دوسری جانب عوام کو اور والیانِ ریاست اور جاگیرداروں کو حکومت سے تعاون کرنے کی تلقین کی۔

شاہ صاحب کی تحریک ہمہ گیر اور آفاقی تھی۔ وہ ملک کے تمام باشندوں کے درمیان مساوات اور عدل وانصاف کا ماحول دیکھنا چاہتے تھے۔ ہر طبقہ کی فلاح وبہبود کے خواہش مند تھے، حکومت کے ضعف واضمحلال اور طبقاتی کشمکش سے ملک میں جو اقتصادی اور معاشی عدمِ توازن پیدا ہو گیا تھا، شاہ صاحب اس کی اصلاح اور سدھار کا جذبہ رکھتے تھے۔ البتہ انہوں نے اپنی اصلاح کی تحریک کا ابتدائی مرکز مسلمانان ہند کو بنایا۔

چنانچہ مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار کی وضاحت کے ضمن میں پروفیسر محمد سرور صاحب تحریر کرتے ہیں:

شاہ صاحب نے خوب سمجھ لیا تھا کہ شہنشاہیت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب اگر کوئی

حکومت بنے گی، تو اس کا اساس کوئی اور ہوگا، چنانچہ شاہ ولی اللہ نے جس تحریک کی داغ بیل ڈالی وہ ہمہ گیر تحریک تھی۔ ان کے پیش نظر پورا ہندوستان تھا۔ چونکہ مرکزی حکومت کی قیادت اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس لئے لامحالہ شاہ صاحب نے عام مسلمانوں سے خطاب کیا۔ لیکن شاہ صاحب کی دعوت کے اصول عام انسانیت کے اصول تھے۔ ان کا زور مذہب کی رسوم پر نہیں بلکہ مذہب کی روح پر تھا۔ قانون کی ظاہری شکل پر نہیں بلکہ قانون کی جان عدل وانصاف پر تھا۔ چنانچہ وہ تمام مذاہب کی اصل یہ چار اصول بتاتے ہیں:

اول: خدا پرستی دوم: عدل وانصاف سوم: صحت وصفائی چہارم: تربیت نفس۔

(سیاسی مکتوبات: ص: ۴۶)

مذکورہ بالا چار اصولوں کی بنیاد پر وہ ہندوستان میں ایسی مضبوط اور مستحکم حکومت دیکھنا چاہتے تھے۔ جو ملک کی مرکزیت اور وحدت کو بحال رکھ سکے۔ اور عوام کے جمہوری حقوق کی حفاظت کر سکے۔ اس وقت ملک میں سکھوں جاٹوں اور مرہٹوں کی تحریکیں بھی چل رہی تھیں۔ مگر ان میں ایسی ہمہ گیری، وسعت اور جامعیت نہ تھی جو ملک کی وحدت اور سلامتی کو برقرار رکھ سکتیں۔

کوتاہ بینوں نے شاہ صاحب کی ہمہ گیر جمہوری تحریک کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی مذموم کوشش کی ہے لیکن یہ حقیقت اور واقعات سے کھلی ناانصافی ہے۔ شاہ صاحب کی تحریک میں اصل الاصول جو بنیاد ملتی ہے وہ ملک کے اجتماعی اور سیاسی نظام میں تمام انسانوں کو بلاتفریق مذہب وملت۔ اور بلا امتیاز رنگ ونسل بقاء باہم اور معاشی استحکام کے یکساں مواقع عطا کرنا اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے استحصال سے نجات دلانا ہے۔ شاہ صاحب نے علاقہ اور زبان ومذہب کے نام پر منافرت کو نہ صرف ملک کی سلامتی کے لئے خطرناک بتایا بلکہ انسانی معاشرہ کی تباہی کا نقطۂ آغاز قرار دیا۔ پنجاب میں سکھوں نے صرف مغلیہ حکومت سے جنگ نہیں چھیڑی تھی بلکہ وہ مسلم قوم کے خلاف جنگ وجدل اور قتل وغارت گری کے لئے کھڑے ہو گئے تھے۔ مرہٹوں نے مغلیہ سلطنت کے اہل کاروں کو ہی قتل نہیں کیا، عام مسلمانوں پر بھی ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیئے تھے۔ ان حالات میں انسانی نقطۂ نگاہ سے شاہ صاحب نے مظالم کے خلاف آواز بلند کی۔ اور مسلمانوں کو منظم اور متحد ہونے کا مشورہ دیا۔

قوموں اور جماعتوں کی زندگی میں ایسے نازک مراحل آتے ہیں اور فوری طور پر اپنی حفاظت اور سلامتی کے لئے مؤثر تدابیر کو روبہ عمل لانا ناگزیر بن جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو سراپا مہر و محبت اور صلح و آشتی کے خوگر تھے۔ اپنے حواریوں اور مددگاروں کو تلوار سنبھالنے کا حکم دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کی جماعت کا مرہٹوں اور سکھوں سے برسرِ پیکار ہونا تقاضہ تھا، ان خاص حالات کا جن کی زد میں مسلمانوں کا بڑا طبقہ مبتلائے کرب و اذیت تھا۔ وہ عام انسانی معاشرہ کی اصلاح و فلاح کے لئے کام کرنا اپنا مقصدِ حیات اور اساسِ تحریک خیال کرتے تھے۔ ان کی جنگ عامِ انسانی اصولوں کی بنیاد پر تھی۔ یہ وہ اصول ہیں، جن کے ذریعہ ہندوستان نیا جنم لے سکتا تھا اور ترقی پذیر صالح معاشرہ کی بنیاد قائم ہو سکتی تھی۔

بہرکیف انگریزی سامراج نے نہ سکھوں کو کچھ دیا۔ نہ جاٹوں کو، اور نہ مرہٹوں کا راج رہا۔ زمانہ بدل گیا۔ زمانہ کی قدریں اور ملک کے حالات بدل گئے۔ اب ایسے اختلافی گوشوں کو تلاش کرنا، اور ان کو واقعات کی بنیاد بنانا نہ تاریخ کے ساتھ انصاف ہے اور نہ ملک اور قوم کے مفاد میں ہے۔ دشمنیوں کے اسباب نہ رہے تو دشمنیوں کا برقرار رکھنا محض بے عقلی ہے۔

شاہ صاحب تمام اہل مذاہب سے اصول اربعہ کی بنیاد پر اشتراک و یگانگت چاہتے تھے۔ اور سیاسی عدمِ مساوات اور معاشی عدمِ توازن کو مٹانے کے خواہش مند تھے۔

شاہ صاحب نے شہنشاہیت اور جاگیردارانہ نظام کو زہر ہلاہل سے تعبیر کیا۔ اور اس کے مفاسد سے معاشرہ کو آگاہ کیا۔

شاہ صاحب کے ذہن میں یہ بات کھٹکتی تھی۔ کہ قیصر و کسریٰ کی شہنشاہیت اور مظلوم عوام کے استحصال کا۔ فرسودہ اور ظالمانہ نظام جب دنیائے انسانیت کو اپنا تابع اور غلام بنائے ہوئے تھا، تو رسول اللہ ﷺ اور ان کے اصحابؓ کے ذریعہ اس طلسمِ استبدادیت کو توڑا گیا۔ اگر ملک کے فرماں رواؤں نے ان حالات کا ادراک نہ کیا اور قدرتِ الٰہی کی اس آواز کو نہ سنا، تو مغلیہ عہد کا خاتمہ ہو جائے گا، اور ملک کے عوام بیرون سامراج کے پنجۂ استبداد کی زد میں آجائیں گے۔

شاہ صاحب کی تعلیم و تلقین اور اصلاحِ معاشرہ کی جدوجہد کے نتیجہ میں ان کی تحریک اور مرکزِ تحریک کو ہمہ گیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ قصرِ شاہی کی مرکزیت برائے نام رہ گئی۔ عوام و خواص

کا مرکز توجہ حضرت شاہ صاحب اور ان کی تحریک تھی۔ قضایا اور اہم مسائل میں مرکز ولی اللہی قبلہ گہہ خاص و عام بن گیا۔ اور وہاں کی ہدایات کو واجب العمل قرار دیا جانے لگا۔ لیکن وسائل کے فقدان اور والیان ریاست کی کش مکش اور رسہ کشی نے وہ مقصدِ حقیقی حاصل نہ ہونے دیا۔ جو تحریک کا ثمرِ پُر اثر قرار دیا جاتا ہے۔

شاہ صاحب نے ملک کے تمام طبقوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ اور اصلاحِ حال کی طرف توجہ دلائی۔ طبقۂ امراء کو آپ نے اس طرح مخاطب فرمایا:

اے امیرو! دیکھو! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو، اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض، بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں۔ تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو۔ اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ کسی اور طرف منعطف نہیں ہوتی"۔

سپاہیوں اور فوجیوں کو تلقین فرماتے ہیں:

تم اعتدال کی راہ اپنے خرچ میں اختیار کرو۔ اور محض اتنی روزی پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ، جو بآسانی تمہیں اخروی زندگی کے نتائج تک پہنچاوے۔ دیکھو اپنے خرچ کو آمدنی سے کم رکھا کرو، پھر جو بچ جایا کرے اس سے مسافروں اور مسکینوں کی مدد کیا کرو، اور کچھ اتفاقی مصائب اور ضرورتوں کے لئے پس انداز بھی کیا کرو۔

نام نہاد صوفیاء اور مشائخ کو تنبیہ فرماتے ہیں:

ہم ایسے لوگوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو محض لوگوں کو اس لئے مرید کرتے ہیں تاکہ ان سے ٹکے وصول کریں۔

عوام کو جانفشانی اور کفایت شعاری کی تلقین کرتے ہیں:

اپنے مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو، اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کے حدود تک پہونچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ

اس کے بندے اس کی آسانیوں سے فائدہ اٹھائیں، اتنے کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہو جائیں۔

دوسروں کے سینوں کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ ان سے مانگ مانگ کر کھایا کرو۔

اے آدم کے بچو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو، جس میں وہ آرام کر لے، اتنا پانی جس سے سیراب ہو، اتنا کھانا جس سے سیر ہو جائے، اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے۔ ایسی بیوی جو اس کے رہن سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو۔ تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اس شخص کو مل چکی ہے۔ چاہیئے کہ اس پر خدا کا شکر کرے۔ (اقتباسات از القول الجلی)

اعیانِ سلطنت کو صنعت و حرفت کے فروغ دینے، اقتصادی ترقی کرنے، اور زیبائش و آسائش سے بچنے کا مشورہ دیتے ہیں:

اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل ترقی جاری ہے تو اس کی صنعت و حرفت اعلیٰ کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر حکمراں جماعت آرام و آسائش اور زینت و تفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنا لے تو اس کا بوجھ قوم کے کاریگر طبقات پر اتنا بڑھ جائے گا۔ کہ سوسائٹی کا اکثر حصہ حیوانوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگا۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔

معاشی وسائل کے فروغ پر توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

معاشی وسائل کو وسیلۂ کار بنانے کے لئے بنیادی اصول یہ ہے کہ جائز مال کو قبضہ میں لایا جائے۔ اور اس کو اس طرح ترقی دی جائے جس طرح ترقی دینا جائز ہے۔ مثلاً مویشیوں کی افزائش نسل، آبپاشی اور اصلاحِ زمین کے ذریعہ زراعت کرنا وغیرہ۔ لیکن اس باہمی تعاون سے معاشی وسائل حاصل کرنے کی شرطِ لازم یہ حصولِ ترقی۔ معاشرۂ انسانی میں ایک دوسرے کی معاشی زندگی تنگی کا باعث نہ بن جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ تمدن پر فساد پیدا ہو جائے۔ (حجۃ اللہ البالغہ: ص: ۱۰۲)

ملکیت کے بارے میں شاہ صاحب کا نظریہ، یہ تھا:

زمین کا مالکِ حقیقی اللہ ہے، باشندگان ملک کے لئے ساری زمین حقیقت میں مسجد

یا سرائے کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس میں سب برابر کے شریک ہیں، جس کے تصرف میں جو زمین پہلے سے ہے۔ وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔ اور ملکیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ (صاحبِ ملک) دوسروں کی بہ نسبت اس کو استعمال کرنے اور اس سے نفع حاصل کرنے کا زیادہ حق دار ہے۔ (باب ابتغاء الرزق: "حجۃ اللہ البالغہ" ص: ۳۱۱)

شاہ صاحب کے مجوزہ نظام میں افراد کی تبدیلی نہ تھی بلکہ اصول اور قانون کی تبدیلی تھی۔ ان کا جذبہ تھا کہ خاندانِ مغلیہ جس نے ہندوستان کو بہت کچھ دیا اور تعمیر و ترقی سے جنت نشان بنایا، وہ بدلتی ہوئی قدروں کو محسوس کر لے، اور ملک کے تمام فرقوں کو اپنے اعتماد میں لے اور خدا پرستی، عدل و انصاف، صحت و صفائی، اور تربیتِ نفس کے ذریعہ یکجہتی اور اتحاد و اعتماد کا ماحول قائم ہو۔ ان مقاصد کے لئے حضرت شاہ صاحب کے صاحبزادوں اور شاگردوں نے بھی جدوجہد کی اور تحریک کو تیز گام کیا۔

یہ ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریک اور ان کا اصلاحی مشن۔ کاش، اہل بصیرت اس کو سمجھیں۔ اور آگے بڑھائیں۔ و باللہ التوفیق۔

# زندہ جاوید تحریک حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مذہبی وسیاسی فلسفہ

خان عبدالودود خاں ☆

یقیناً اشاعت و تبلیغ دین کا پہلا مدرسہ مسجد نبویؐ سے ملحق ایک چبوترہ پر قائم ہوا جو صرف مدرسہ نہیں ایک تحریک تھا۔ اس کے بعد صرف تعلیم قرآن وحدیث کے اور دیگر دنیاوی علوم وفن حرب و تحقیق کے لاتعداد ان گنت مدارس گذشتہ ۱۴۰۰ سالوں میں قائم ہوئے ہیں مگر ان مدارس کی تعداد کم ہے جو نہ صرف ذریعہ تعلیم رہے بلکہ ایک تحریک بنے۔ جن کے اساتذہ نے نہ صرف دین کی حفاظت میں بلکہ انسانیت کی فلاح و بہبود میں اپنا سب کچھ تن من دھن بھی لگا دیا۔ دینی معاملات میں میرا علم بہت مختصر ہے میں نے کسی مذہبی دار العلوم یا ندوہ میں تعلیم نہیں پائی۔ میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں جس کی بنیاد ہی شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ نے رکھی تھی۔ سے تعلیم حاصل کی۔ اس لئے اگر میرے نظریات سے اختلاف ہو تو میری کم علمی کے اعتراف کے پیش نظر معاف فرمادیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا وہ مدارس جو تحریک بن گئے اس قسم کے مدرسوں میں پہلا مدرسہ برائے حفاظت دین کی بنیاد تو سیدنا امام عالی مقام حضرت حسینؓ نے نہ صرف اپنے بلکہ اپنی اولاد اور اپنے حامئین کے خون سے.....؟ رکھی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب خلافت کو خاندانی حکومت بلکہ ملوکیت میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔ جس کی اسلام نے بیخ کنی کی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں یزید کے لئے جبری بیعت سے جو انتشار و خانہ جنگی پیدا ہو رہی تھی جس کے نتیجے میں امت اسلامیہ اسلام کی درست راہ سے ہٹ رہی تھی اور اس کے خلاف حسینؓ خیر امت کی

☆ سابق ایم، ایل، سی۔ اترپردیش۔

طرف بڑھتے ہوئے اندھیرے میں روشنی کے دو مینار قائم کرنا چاہتے تھے جو اس امت کو ظلم وستم کے طوفان میں اخلاقی سہارا دے سکیں۔ (مولانا اخلاق حسین قاسمی)

میری ناچیز رائے کے تحت ہر دور جبر و تعدی میں ہر قسم کا جبر و تشدد برداشت کرکے بھی جن علماء وصوفیائے کرام نے حفاظت دین کی، وہی حسین اسلام کے اصلی وارث ہیں۔ مجھے تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ایسے مدارس کی تعداد کا پورا علم نہیں ہے لیکن اپنے ملک ہندوستان میں جب میں تاریخ کے دھندلکوں میں جھانکتا ہوں تو سب سے پہلے مدرسہ مجھے غیاث پور میں نظام المشائخ شیخ وقت حضرت خواجہ نظام الدین کا نظر آتا ہے۔ خواجہ صاحب نے جب حکومت وقت کے دربار امراء ورؤسا کے ایوانوں میں علی الاعلان خلاف دین حرکات کو ہوتے دیکھا، اور وقت کے حکمران ورؤسا کو ان پر نازاں پایا، نظام المشائخ خواجہ احمد نے نہ صرف ان رسومات کو بند کرایا بلکہ درس وتدریس کے علاوہ تبلیغ دین کا پہلا مدرسہ بھی قائم کیا۔ اتنا ہی نہیں نظام الدین جاری کیا۔ انہوں نے اس وقت کے دیگر برادران وطن کے دل سے احساس کمتری اور مسلمانوں کے دماغ سے احساس برتری کو دور کرکے محبت کا سبق دیا، دیگر برادران وطن کی دلجوئی کی اور اپنے سلسلہ چشتیہ کے مورث اعلیٰ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا راستہ اپنایا انہوں نے سوچا کہ ہندو گائے کی پوجا کرتا ہے اس لئے برادران وطن کی دل آزاری نہ کرنے کی نیت سے نہ صرف انہوں نے خود گائے کی قربانی سے پرہیز فرمایا بلکہ درگاہی دستر خوان پر ہر قسم کا گوشت حد یہ کہ لہسن اور پیاز کا استعمال بھی بند کردیا۔ یہ طریقہ آج بھی جاری ہے۔ اس طرح انہوں نے مسلمانوں میں صحیح دین کا جذبہ اور ایسا نظام تبلیغ قائم کیا کہ آپ صرف احمد نہیں دین کا نظام قائم کرنے والے نظام الدین کے لقب سے ملقب ہوئے آپ کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

مسلمانان ہند کے لئے دوسرا خطرناک دور اکبر کا تھا جب دین الٰہی کا خطرناک سیلاب قلعہ اسلام کو بہانے کو تیار تھا۔ اس وقت حضرت شیخ بدرالدین فاروقی مجدد الف ثانیؒ نے ہر قسم کی مصیبتیں و پریشانیاں اور قید وبند کی تکلیفات آئمہ اربعہ کی طرح ایمانی مسکراہٹ کے ساتھ برداشت کیں اور خدا نے آپ کو فتح عطا فرمائی۔ مگر یہ ضرور پیش نظر رکھا جائے کہ حضرت مجدد الف ثانی اکیلے نہیں تھے اس وقت کے نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگ حضرت خواجہ رضی الدین باقی باللہ جو

حضرت مجدد کے پیر بھی ہیں اور ہندوستان میں مشکوۃ شریف کا درس دینے کے لئے مدینہ طیبہ سے بھیجے گئے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ بھی اس جدوجہد میں شامل تھے۔ ان حضرات کا یہ کہنا تھا کہ چشمہ صافی اسلام دین شریعت میں جو کچھ گندہ پانی بدعات کا شامل ہو گیا تھا، اس کو صاف کر کے محفوظ بھی کرنا ہوگا۔

محی الدین اورنگ زیب کی عمر کے آخری حصہ میں ۱۷۰۳ء مطابق ۴ رشوال ۱۱۱۴ھ میں بروز بدھ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کو جو بذات خود بہت بڑے عالم تھے خدا نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی شکل میں وہ فرزند عطا فرمایا جس نے صرف تدوین دین ہی نہیں کی بلکہ ملک کو غیر ملکی غلامی میں جانے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش بھی کی۔ شاہ ولی اللہؒ کو مسلکی اور مذہبی تعصب سے بالاتر ہو کر سوچنے کی عادت اپنے والد شاہ عبدالرحیم سے ملی تھی۔ شاہ ولی اللہؒ صرف سولہ سال کے تھے کہ انہیں والد محترم کے انتقال کے بعد شاہ عبدالرحیمؒ کے عظیم منصب کو سنبھالنا پڑا۔ اس وقت اورنگ زیب کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے بعد صوبے درصوبے آزاد حکومتیں قائم ہو چکی تھیں جن کا مرکزی حکومت دہلی سے برائے نام تعلق رہ گیا تھا۔ صدیوں کی محنت سے بنی ہندوستان کی ایکتا اور یکجہتی خطرہ میں پڑ چکی تھی۔ شیرازۂ ملک بکھر رہا تھا۔ ریاستوں کے آپسی جھگڑوں کی بناپر غیر ملکی تاجر انگریز، پرتگالی اور فرانسیسی ملک پر قبضہ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو چکے تھے بلکہ کھلے عام اس ملک کی حکومت میں حصہ لینے لگے تھے۔ ملک کا ہر سردار، راجہ یا نواب اپنی حکومت چاہتا تھا اور اس سلسلے میں وہ غلط سلط راستہ اختیار کر لیتا تھا۔ صرف ذاتی مفاد سامنے تھا۔ ملک کی کسی کو فکر نہیں تھی۔ خود راجدھانی دلی میں محلاتی سازشیں عروج پر تھیں۔ تخت پر قبضے کے لئے خاندان مغلیہ کا سگا خون قتل، پھانسی اور لمبی سزاؤں کا سلسلہ جاری کر چکا تھا۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ اس دور کے ہندو یا مسلمان دونوں میں وہ سچا مذہبی جذبہ نہیں رہ گیا جو انسان کو انسان بنائے رکھتا ہے۔ ان میں ایک طرح کی لامذہبیت پیدا ہو چکی تھی جس کی وجہ سے وہ صرف اپنے یا اپنے گھرانے کے نجی فوائد کے بارے میں سوچ سکتے تھے۔ سماج یا ملک کے بڑے سے بڑے فائدہ کو ذاتی مفاد پر قربان کر دیتے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی صراحت اس طرح فرمائی ہے کہ اگر کسی قوم میں دھن دولت کی ترقی جاری ہے تو اس کی صنعت و حرفت اعلیٰ کمال پر پہنچ جاتی ہے۔

مزدور کاریگر طبقہ خوش حال ہوجاتا ہے۔ مگر جب حکومت کرنے والا طبقہ اپنا ذاتی فائدہ آرام و آسائش زینت و تفاخر کے لئے دولت خرچ کرنے کو اپنی زندگی کا معمول بنالے تو قوم کے مزدور کاریگر طبقہ پر اتنا بوجھ بڑھ جاتا ہے کہ عوام کا یہ بڑا طبقہ محنت کش حیوانوں جیسی زندگی گذارنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اور جب حکومتی طبقہ جبر کی بنا پر اس محنت کش طبقہ کو اقتصادی و مالی تنگی پر مجبور کردے تو انسانیت کے اجتماعی اخلاق برباد ہوجاتے ہیں ترقیات رک جاتی ہیں۔ جب انسانیت پر ایسی مصیبت آتی ہے تو پھر قدرت الٰہی انسانیت کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لئے کوئی ایسا راستہ الہام کرتی ہے جس سے اس انقلاب کا سامان پیدا ہوجاتا ہے کہ جو قوم کے سر سے اس بے جا حکومت کا بوجھ اتار دیتا ہے۔ شاہ صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ ''موجودہ مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا ہے کیونکہ اس سلطنت میں ایران و روم کے حکمرانوں جیسی خرابیاں پیدا ہوچکی ہیں۔ اس لئے مصلحت خداوندی یہی معلوم ہوتی ہے کہ اب اس نظام کو سرے سے ہی توڑ دیا جائے۔ اس وقت جب چند لوگوں نے شاہ صاحب سے پوچھا کہ جب سکھ اور مرہٹے آج کی مسلمان حکومت پر حملے کر رہے ہیں تو ایسی حالت میں ان کا مقابلہ کرنے کے بجائے ان خیالات کے اظہار کی کیا ضرورت ہے؟ شاہ صاحب کا جواب تھا۔ ''ان خرابیوں کی حامل کوئی حکومت صرف اس لئے اسلامی نہیں ہوجاتی کہ اس کا بادشاہ مسلمان ہے۔ اس کے مقابل انصاف کے سہارے چلنے والی حکومت بھی پسندیدہ ہوجاتی ہے جس کا بادشاہ مسلمان نہ ہو''۔

شاہ صاحب نے اس ملک میں ایسی جمہوری عوامی حکومت کا خواب دیکھا تھا اور لوگوں کو ترغیب دلائی تھی جس میں ہندو، مسلمان چھوٹے بڑے امیر غریب سب کا برابر کا حصہ ہو۔ جس میں بلالحاظ مذہب و ملت ہر طرح کے مزدور پیشہ افراد اور کاریگروں کو ان کے صحیح حقوق بھرپور دلائے جائیں۔ شاہ صاحب ہندوستان کو متحد ہی نہیں ایشیا کا سب سے طاقتور اور مضبوط ملک دیکھنا چاہتے تھے۔ شاہ صاحب نے دین کو نماز روزہ تک یا وظائف تک محدود کرنے والوں کے خلاف یہ عصری تعلیم دی۔ عربی سے عوام ناواقف تھے آپ نے کلام پاک کا ترجمہ فارسی میں کیا۔

میں نے وقت کے امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ کا مختصر سا تذکرہ کیا ہے۔ صدیوں کے مدوجزر کے بعد مجھ جیسا کم علم بو اخر العلوم کے ساحل سے چند خوبصورت سنگریزے ہی چن پایا

ہے۔ جب حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ پیغام انسانیت دیا جو صحیح اسلامی روح سے بھرپور ہے اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا بھر کو صداقت کا سبق ہے۔ جب کہ اس وقت یوروپ میں نہ جمہوریت کا تصور تھا نہ ترقی یافتہ یوروپ سوشلزم سماج واد سے واقف تھا۔ نہ کارل مارکس پیدا ہوا تھا اور نہ ہی لفظ سیکولرزم عالم وجود میں آیا تھا۔ شاہ صاحب کا یہی فلسفہ ہے جو ان ساری تحریکات کے وجود میں آنے سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے دنیا کے سامنے آچکا تھا۔ شاہ صاحب نے صرف لکھا ہی نہیں عملی طور پر ۵/مئی ۱۷۳۱ء کو اپنی ایک جماعت جمعیت مرکزیہ بھی بنائی تھی ان خیالات کے اظہار کے لئے ملک کے بہت سے حصوں میں اس کی شاخیں بھی قائم کی گئی تھیں۔ جن میں نجیب آباد کا مدرسہ، بریلی میں شاہ علم اللہ کا تکیہ سندھ کے شہر ٹھٹہ میں ملا محمد معین کا مدرسہ، مولوی نور اللہ برہانوی، مولانا محمد حسین پھلتی کے مدارس کے علاوہ مولانا محمد امین کا مدرسہ کشمیر مشہور مراکز تھے۔

یہی وجہ تھی کہ ۱۷۶۲ء میں حضرت شاہ صاحب کے انتقال کے زائد از سو سال بعد ۱۸۲۱ء میں سندھ کے ٹھٹہ نامی مقام میں پیدا ہونے والا بوٹا سنگھ شاہ صاحب کو پڑھ کر عبیداللہ سندھی بنا جو اپنے وقت کا بے مثل عالم ہی نہیں تھا بلکہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کی ہدایت پر اس وقت افغانستان میں پہلی آزاد حکومت بنا کر ہتھیار ہاتھ میں لے کر برطانوی سامراج سے ٹکرایا تھا۔ اس وقت اس جرم کی سزا صرف موت تھی۔ کاش میرے ملک ہندوستان میں کوئی غزنوی کوئی غوری کوئی ابدالی کوئی درانی نہ آتا صرف صوفیا اور اولیاء کرام، ولی اللہ اپنے نام کی مناسبت سے شاہ ولی اللہ ہی آئے ہوتے تو ملوکیت کی جس تلوار نے نفرت پھیلا کر ہزار سال میں اس ملک میں وحدانیت قائم نہیں ہونے دی۔ یہ حضرات وقت کے قمر اسلام بن کر اندھیروں میں بھٹکتی ظلم و جبر کی تاریکیوں میں چیختی سسکتی انسانیت کو صحیح وحدانیت تک پہنچا دیتے۔

شاہ ولی اللہؒ سے پہلے بھی وہ بزرگ جن کا تذکرہ میں نے کیا ہے۔ یہ راستہ دکھا چکے تھے مگر شاہ صاحب نے جو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ صرف درست دینی تعلیم ہی نہیں عصری تعلیم بھی دی۔ بلاشبہ شاہ صاحب بارہویں صدی میں ایک ایسے عظیم قائد پیدا ہوئے جن کے راستہ پر آج تقریباً تین صدیاں گذرنے کے بعد بھی یہ تحریک جاری ہے۔ میں یہاں حضرت حکیم الامت مجدد دوراں حضرت شاہ ولی اللہ کے سلسلہ میں حضرت سید سلیمان ندویؒ، سید محمد میاں، مولانا عزیز الحسن

صدیقی کے حوالہ جات سے عرض کردوں کہ:
شاہ صاحب نے ۱۴ رسال کی عمر میں اپنے والد مکرم سے بیعت کی اور اشغال میں منہمک ہو گئے۔ ان کی زندگی میں حجاز مقدس کا سفر اور ایک سال تک وہاں کا قیام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سفر میں انہوں نے علم حدیث کا مطالعہ کیا اور اس کی تکمیل کی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس سفر و قیام کے دوران فن حدیث کی تکمیل کو ان کے تجدید و اصلاح کے ایوان بلند میں حجر زاویہ (Corner Stone) بتایا ہے۔

## شاہ صاحب کا عہد:

شاہ صاحب کا دور یقیناً ایک پر آشوب عہد تھا۔ اس وقت پورا عالم اسلام انقلاب کے گہوارے میں جھول رہا تھا۔ ہندوستان سیکڑوں سال سے وسط ایشیائی قوموں کی جولان گاہ اور سیاسی طور سے ان کے زیر اثر رہ چکا تھا۔ اسی عہد میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا۔ احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر کئی حملے کیے اور ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو پچھاڑ کر تاریخ کو نیا رخ اور سلطنت مغلیہ کو سہارا دیا۔

شاہ صاحب کے زمانہ شعور و آگہی میں سلطنت عثمانیہ میں کئی سلاطین تخت اقتدار کے مالک بنے اور ہٹائے بھی گئے۔ حجاز بھی اس زمانے میں اتھل پتھل کا شکار رہا۔ ایران کی حالت بھی ایک بیمار کی سی تھی۔ یہی نہیں کہ سیاسی طور سے یہ ممالک پستی کی طرف جا رہے تھے بلکہ علمی و دینی اعتبار سے بھی یہ رو بہ زوال تھے۔ خصوصیت کے ساتھ ایران جس کی خاک سے بلند پایہ فقہاء و محدثین اٹھے۔ شیعی غلبہ والے حکمرانوں نے اس کو ایک شیعہ مملکت کی حیثیت دے دی اور سنی مذہب کو وہاں سے نیست و نابود کر دیا گیا نہ صرف ایران بلکہ عراق و ترکستان ہر جگہ فلسفہ و ریاضی کا دور دورہ تھا۔ ہندوستان بھی سیاسی و انتظامی اعتبار سے انحطاط پذیر تھا اور خصوصیت کے ساتھ مسلم سوسائٹی پوری طرح قعر مذلت میں پڑی تھی۔ سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں۔

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا۔ مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا۔ جھوٹے فقراء اور مشائخ اپنے بزرگوں کے مزارات پر چراغ جلائے بیٹھے تھے، مدرسوں کا گوشہ منطق

وحکمت کے ہنگاموں سے پر شور تھا۔ فقہ وفتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی۔ مسائل فقہ میں تحقیق وتدقیق، مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا، عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی ومطالب اور احادیث کے احکامات وارشادات اور فقہ کے اثر ومصالح سے بے خبر تھے۔

(مقالات سلیمانی صفحہ:۴۴)

شاہ صاحب کو جو دور ملا وہ ایسا تھا کہ بادشاہ سے فقیر تک اور تاجر سے صنعت کار تک سب کے سب بگڑے ہوئے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں بادشاہ ہوں یا وزیر، فوجی سپاہی ہوں یا تاجر وصناع، علماء ومشائخ ہوں یا ان کی جانشین اولادیں، واعظان کرام ہوں یا تارک الدنیا زاہد ایک ایک کی خبر لی ہے۔ اور پوری سوسائٹی کا تعاقب کیا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک نیچے سے اوپر تک اصلاح نہیں ہوگی اور مشین کا ہر پرزہ درست نہ ہوگا لیپا پوتی سے کام چلنے والا نہیں ہے۔ آپ نے اپنے سفر حج ۱۷۳۱ء سے واپسی کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ فلاح اسی میں ہے کہ دور حاضر کے تمام نظاموں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی جائیں اور ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے ''فک کل نظام'' کا نصب العین پیش کیا یعنی سیاسی وسماجی زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب۔ آپ نے یہ اصول اور نصب العین پیش کرنے کے بعد ایک دم سے تلوار ہاتھوں میں نہیں اٹھالی بلکہ پہلے اپنے نظریات کی تعلیم وتلقین کی اور تربیتی مراکز قائم کیے اور تپے تپائے افراد کو منتخب کر کے کام سپرد کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کی زندگی نے وفا نہ کی اور آپ کے مشن کی تکمیل آپ کے بلند فکر اور بلند حوصلہ صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور دوسرے پسماندگان مریدین ومسترشدین اور تلامذہ کے حصہ میں آئی۔

یقیناً شاہ صاحب کے پاس موجودہ دور کی طرح نشر واشاعت اور پریس کی طاقت نہ تھی، آج ہمارے اداروں اور جماعتوں کے پاس سرمایہ کی جو بہتات ہے اس کا عشر عشیر بھی ان کے پاس نہ تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے علوم اور ان کے افکار ونظریات پر مشتمل ہزاروں صفحات ان کے انتقال کے ڈیڑھ سو سال بعد دنیا کے سامنے آسکے۔

کیپٹل کے مصنف کارل مارکس سے ایک صدی قبل شاہ ولی اللہؒ نے محنت وسرمایہ کی کشمکش کا جو حل تجویز کیا تھا اور اقتصادیات وسیاسیات کے جو بنیادی اصول پیش کیے تھے ان کی اشاعت اگر

ان کے عہد میں ہی ہوتی تو شاید کارل مارکس، امیگلیس اور ان جیسے دوسروں کے چراغ جل بھی نہ پاتے۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ آپ نے دولت کی اصل بنیاد محنت کو قرار دیا۔ کھیت مزدور کے حقوق کو محفوظ کیا، امداد باہمی وموجود کو آپریٹو تحریک کے مماثل کو شہریت کی روح بتایا۔ جوا، سٹہ بازی اور عیاشی کے اڈوں کو ختم کرنے پر زور دیا اور کہا کہ جب تک یہ بیماریاں ختم نہیں ہوں گی دولت کی تقسیم کا صحیح نظام نہیں ہوسکتا۔ مزدوروں کو ملک کی دولت کا اصل مستحق گردانا۔ یہ بھی فرمایا کہ جو سماج محنت کشوں کو پوری اجرت نہ دے سکے اور مزدوروں اور کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے وہ سماج قوم کا دشمن ہے۔

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ شاہ صاحب کا زمانہ پرشور انقلابات کا زمانہ تھا۔ جنگ وجدال جاری تھا۔ حکومتوں کا ردوبدل اور الٹ پھیر روزانہ کا معمول تھا۔ پوری انسانی سوسائٹی کرپٹ ہوچکی تھی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے علوم وافکار پرسکون دریا کی طرح بہہ رہے تھے۔ آپ کے ذہن وفکر کی سطح پر کوئی طوفان نہیں تھا۔ دل کی دنیا میں تو یقیناً ایک طوفان اور ہلچل تھی مگر آپ کی فکر اور سوچ کے دھارے بالکل پرسکون تھے۔ آپ کے دل میں اسلام کا درد بھی تھا۔ مسلم حکومتوں کے زوال سے آپ فکر مند بھی تھے۔ آپ کی نگاہیں پوری دنیا کے نقشے پر مرکوز تھیں۔ آپ کو وطن عزیز کی بربادی پر بھی تشویش تھی یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی عظیم اصلاحی جدوجہد کا آغاز کردیا اور اپنی بات بے غل وغش حکومت اور عوام تک پہنچائی۔ دنیا کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ جب کسی مرد حق آگاہ نے سچ بات منہ سے نکالی ہے تو اس کو اس کی سزا ضرور دی گئی ہے۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ کے ساتھ بھی یہ معاملہ ہوا۔ آپ پر قاتلانہ حملے تک کئے گئے۔

سیاست اور نظام حکومت کے بنیادی اصول بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

(۱) زمین کا حقیقی مالک اللہ اور ظاہری نظام کے لحاظ سے اسٹیٹ ہے، ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حق انتفاع میں دوسروں کی دخل اندازی ممنوع ہے۔

(۲) سارے انسان برابر ہیں، کسی کو حق نہیں کہ وہ اپنے کو مالک ملک، مالک قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے۔

(۳) اسٹیٹ کے سربراہ کی وہی حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی۔ انسانوں کے بنیادی

حقوق کے ضمن میں فرماتے ہیں، روٹی کپڑا اور مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکے بلالحاظ مذہب و نسل ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

مذہب، رنگ یا نسل کے فرق بغیر باشندگان ملک کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف ان کے جان و مال کی حفاظت، حق ملکیت میں آزادی، حقوق شہریت میں یکسانیت ہر باشندہ ملک کا بنیادی حق ہے۔ (علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم صفحہ: ۸،۹)

زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر فرقہ کا بنیادی حق ہے۔ (علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم صفحہ: ۸۔۹)

ان بنیادی اصولوں کو بیان کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"ان حقوق کو حاصل کرنے کی شکل یہ ہے کہ خود مختار علاقے قائم کئے جائیں۔ یہ خود مختار اکائیاں اپنے معاملات میں آزاد ہوں گی۔ ان کا ایک بلاک ہوگا جو فوجی طاقت کے لحاظ سے اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو۔ اس کو یہ حق نہیں ہوگا کہ کسی مخصوص مذہب یا مخصوص تہذیب کو کسی یونٹ پر لاد سکے۔ اس کا یہ بھی فرض ہوگا کہ کسی قوم یا یونٹ کو یہ موقع نہ دے کہ کسی دوسری قوم یا مذہب یا تہذیب پر حملہ کر سکے۔ (علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم)

مذہبیات کے تحت شاہ صاحب صفائی کے ساتھ کہتے ہیں۔

(۱) داعیان صداقت ہر قوم اور ملک میں گذر رہے ہیں ان کا احترام ضروری ہے۔

(۲) سچائی اور دین کے بنیادی اصول تمام فرقوں میں تقریباً تسلیم شدہ ہیں البتہ اختلاف، عمل کی صورت میں ہے۔

(۳) ساری مہذب دنیا کے سماجی اصول اور ان کا منشاء و مقصد ایک ہے۔ اور آخری بات یہ فرماتے ہیں کہ جہاد ایک مقدس فرض ہے مگر اس کے یہ معنی ہیں کہ مقدس اصول کے لئے انسان اپنے اندر جذبہ فدائیت پیدا کرے یہاں تک کہ وہ اپنی ہستی ان اصولوں کے لئے فنا کر دے (علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم)

شاہ ولی اللہؒ کا وہ کارنامہ جو انہیں ۹۸۰ء سے نہ صرف ۲۳ ستمبر ۱۸۵۷ء تک بلکہ آج کی دنیا میں بھی ممتاز و منفرد مقام عطا کرتا ہے، ہندوستان میں کلام الٰہی کا فارسی ترجمہ کرنا ہے۔ مولانا

اخلاق حسین قاسمی نے بہت محتاط الفاظ میں حضرت مجدد الف ثانی، شیخ بدرالدین فاروقیؒ سرہندی کو مجدد وقت قرار دینے کے ساتھ ایک بہت درست حقیقت بھی پیش کی کہ حضرت مجددؒ کے پیر حضرت خواجہ رضی الدین باقی باللہؒ جن کی روحانی تربیت نے مجدد صاحب کو سنوارا اور مسجد نبوی میں درس حدیث دینے والے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کو ہندوستان جا کر درس حدیث دینے کا حکم ہوا تھا دراصل اس حکم میں یہ رمز بھی پوشیدہ تھا کہ اکبر کے فتنہ دین الٰہی کا مقابلہ کرنے میں معاون بنیں۔ یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ محدث دہلویؒ حضرت شیخ عبدالحق بھی "خواجہ باقی باللہؒ" سے بیعت تھے۔

مولانا قاسمی نے ان سب حضرات کو گیارہویں صدی ہجری کا طائفہ مجددین قرار دیا ہے مگر مولانا نے شاہ ولی اللہؒ کو بارہویں صدی ہجری کا مجدد قرار دیا ہے۔ میں عالم نہیں۔ میں نے کسی دارالعلوم یا ندوہ میں تعلیم نہیں پائی۔ ایک حقیر سا تجزیہ یا مضمون نگار ہوں اور اپنی کم علمی کے اعتراف کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ کو ہی مجدد وقت قرار دینے پر مجبور ہوں۔ اس کے ثبوت میں شیخ اکرام کی رودِ کوثر سے حضرت شاہ غلام علیؒ اور حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا نظریہ پیش کر رہا ہوں۔

"شاہ ولی اللہ کے دیدہ ور معاصرین بھی سمجھتے تھے کہ انہوں نے ایک نئے طریق کار کا آغاز کیا تھا۔ خاتم الاولیا کی نسبت شاہ غلام علیؒ کہتے تھے۔ ایشاں بسیار بزرگ بودند۔ وطریق نوآوردہ اند۔" (ملفوظات)

## حکیم الامت کے علمی کارنامے:

"ان احسانات اور انداز خیال کی خوبیوں کے علاوہ اصل چیز شاہ ولی اللہ کا علمی پایہ ہے۔ وہ نہ صرف ہندوستانی علماء کے صدر نشین ہیں بلکہ اسلامی دنیا کی اہم ترین ہستیوں مثلاً غزالی یا علامہ ابن تیمیہ کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے کے مستحق ہیں۔ ان کا ترجمۃ القرآن ہی ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اگر وہ کچھ نہ کرتے تب بھی انہیں ہمارے علمی محسنوں کی صف اول میں جگہ ملتی لیکن انہوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا انہوں نے علوم اسلامی کی ہر شاخ مثلاً حدیث، تفسیر تاریخ، فقہ، اسرار دین، تصوف کو لیا اور ان میں بلند پایہ اور بنیادی کتابیں تصنیف کر کے ان علوم کی ایک مستقل لائبریری یادگار

چھوڑ دی ہے۔ مولانا مودودی ایک مضمون میں شاہ ولی اللہؒ کی نسبت لکھتے ہیں: "انہوں نے اسلام کے پورے فکری، اخلاقی شرعی اور تمدنی نظام کو مرتب صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس میں وہ اپنے تمام پیشرووں سے بازی لے گئے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی تین چار صدیوں میں بکثرت ایسے آئمہ گزرے ہیں جن کے کام کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اسلام کے نظام حیات کا مکمل تصور رکھتے ہیں اور اسی طرح بعد کی صدیوں میں بھی ایسے محققین ملتے ہیں جن کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس تصور سے خالی تھے لیکن ان میں سے کسی نے بھی جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ اسلامی نظام کو بحیثیت ایک نظام کے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہ شرف شاہ ولی اللہؒ ہی کے لئے مقدر ہو چکا تھا کہ اس راہ میں پیش قدمی کریں"۔

مولانا موصوف شاہ صاحب کے مرتب کردہ نظام اسلامی کی تفصیلات دے کر لکھتے ہیں۔ "پھر وہ نظام شریعت عبادات احکام اور قوانین کو پیش کرتے ہیں اور ہر ایک چیز کی حکمتیں سمجھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس خاص مضمون پر جو کام انہوں نے کیا ہے وہ اسی نوعیت کا ہے جو ان سے پہلے امام غزالی نے کیا تھا۔ قدرتی بات ہے کہ وہ اس راہ میں امام موصوف سے آگے بڑھ گئے ہیں۔"

## ہماری قومی زندگی میں شاہ ولی اللہ کا مرتبہ:

شاہ ولی اللہؒ قومی زندگی کے ایک بڑے نازک دور میں پیدا ہوئے۔ ان کا ظہور اس زمانے میں ہوا جب اسلامی حکومت کی بنیادیں اکھڑ رہی تھیں اور اس ملک میں صدیوں جاہ وجلال سے حکومت کرنے کے بعد مسلمان اس قدر آرام طلب اور کمزور ہو گئے تھے کہ وہ مرہٹوں اور سکھوں کے مقابلے میں تساہل اختیار کرتے تھے۔ شاہ صاحب کو اس صورت حال کا افسوس ہوتا ہوگا لیکن جو شخص عملی کام کرنا چاہے، اسے اپنا دائرۂ عمل محدود اور معین کرنا پڑتا ہے۔ شاہ صاحب اپنے آپ کو اس امر کے لئے موزوں نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عملی زندگی میں دخل انداز ہو کر واقعات کی رو کو روکیں لیکن جس کام کے لئے وہ موزوں تھے اور جو کچھ کم ضروری نہ تھا (یعنی رسول اکرم کی خلافت باطنیہ) اس کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ وہ ان عیوب اور کوتاہیوں سے پوری

طرح واقف تھے جو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں گھر کر گئی تھیں اور جن کی وجہ سے انہیں یہ روز بد دیکھنا نصیب ہو رہا تھا۔ شاہ صاحب نے انہیں پوری طرح بے نقاب کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کا ازالہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے ذہنی اور روحانی اختلافات کا مٹانا ضروری ہے تاکہ وہ صحیح معنوں میں ایک جماعت بن جائیں۔

جن زہرہ شکن حالات سے شاہ ولی اللہؒ کو سابقہ پڑا ہندوستان میں مسلم حکومت کے آغاز کے بعد کبھی رونما نہ ہوئے تھے۔ شاہ ولی اللہؒ پر جو گزرتی ہوگی اس کا تصور کرنا مشکل نہیں۔ لیکن ٹھوس روحانی تربیت اور بلندی حوصلہ اور سلیم الطبعی کا فیض ہے کہ ان حالات کی ایک جھلک ان کی تصنیف میں نہیں۔ کوئی شکایت نہیں، کوئی رونا نہیں، کہ دوسری ہمتیں بھی کمزور ہوں اور واقعہ یہ ہے کہ جن کی صلاحیتیں تمام تر تعمیری ہوں۔ ان کے پاس آنسو بہانے کے لئے وقت کہاں؟ نتیجہ یہ کہ اپنی خاموش محنت سے قوم کے گرد وہ روحانی دیوار تعمیر کر گئے، جس پر زمانے کے تھپیڑوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ (رود کوثر: شیخ محمد اکرام، صفحہ ۵۸۴، ۵۸۵)

اب میں قارئین کرام سے اپنے نظریہ پر توجہ چاہوں گا کہ ہندوستان میں ہم تقریباً ہزار سالہ حکومت کے باوجود اس ملک میں وحدانیت قائم نہیں کر پائے۔ کیوں؟ ہم مکہ معظمہ و مدینہ طیبہ سے تقریباً پانچ سے چھ ہزار میل دور ہیں جبکہ جاوا سماٹرا۔ بورنیو، انڈونیشیا، ملائیشیا جو ہم سے بھی تقریباً چھ ہزار میل دور گویا سرزمین عرب سے بارہ ہزار میل کی دوری پر ہیں وہاں اسلام پوری طرح پھیلا حالانکہ ان ممالک اور جنوبی ہندوستان میں کوئی غزنوی، غوری، ابدالی و درانی تلوار نہیں پہنچی تھی وہاں اسلام کیسے پھیلا؟ خصوصیت سے جنوبی ہندوستان میں سب سے پہلے اسلام ۲۲ھ نبوی میں پہنچا۔ ملا محمد قاسم فرشتہ اور تحفۃ المجاہدین کے مطابق راجہ سامری مسلمان ہوا اور دربار رسالت میں حاضر بھی ہوا تھا۔ جس کی تصدیق ایک آریہ سماجی ہندو محقق لالہ ہنس راج نے اپنی تحقیق سے مالابار کے ایک مندر میں موجود سنسکرت میں لکھی ہوئی ایک تاریخ کے حوالہ سے کی ہے۔ اس کی پوری تفصیل اخبار اہل سنت والجماعت امرتسر یکم جون ۱۹۲۷ء میں چھپی تھی۔ سید عابد علی واجد الحسینی کی کتاب "ہندوستان اسلام کے سائے میں" کے صفحہ ۳۵، ۳۶، ۱۳۳ میں واضح کیا ہے کہ جنوبی ہند کی اس ریاست کدن کلور (کلانور) میں اسلام اسی وقت پہنچا جبکہ سرزمین حبشہ

میں پہنچا تھا اور نجاشی شاہ حبشہ کی طرح راجہ سامری بھی مسلمان ہوا تھا۔ اس طرح انگریز مورخین کی مرتب کردہ نفرت پھیلانے والی تاریخیں غلط ہو جاتی ہیں کہ ہندوستان میں اسلام غزنوی یا غوری تلواروں سے پھیلا۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جن ممالک میں کہ جہاں عرب تاجر مبلغ بن کر گئے اور اس ملک میں انہوں نے اس ملک کی زبان کو پڑھ کر پھر تعلیمات اسلام، قرآن کریم اور احادیث نبوی کا ترجمہ ان کی زبانوں میں کیا، وہاں درست اصلی اسلام پہنچا اور دلوں میں جاگزیں ہوا۔ وہاں کے باشندوں نے نہ صرف اسلام کو قبول کیا بلکہ خود بھی مسلمان ہو کر اشاعت اسلام میں حصہ لیا۔ اس پر بھی غور ضروری ہے کہ جزیرۃ العرب کے باہر دور نبویؐ میں پہلی مسجد بھی کدن گلور (کلانور) میں راجہ سامری کی ریاست میں بنی تھی۔ مگر پورے ملک پر ۹۸۰ء کے بعد اسلام پھیلا۔ شاہ ولی اللہ کو بھی یہ خیال کیوں نہ آیا کہ اس ملک کے برادران وطن کو درست اسلام ان کی زبان میں پیش کرتے۔ اولیائے کرام نے اپنے طرز عمل اور اس ملک کی زبان میں اپنے مواعظ حسنہ سے یہ پیغام ضرور پہنچایا مگر ملوکیت نے ایک نفرت قائم رکھی، مجھے تاریخ میں صرف بنگال میں حسین شاہی خاندان کی حکومت کے دور میں جو علاؤ الدین حسین شاہ نے قائم کی اس وقت کے ایک بزرگ سید سلطانؒ نے ۱۵۵۴، ۱۵۵۶ء میں سب سے پہلے واقعات رسول، قصص الانبیاء اور سیرت نبوی کی روایات بنگالی میں لکھیں۔ نور عرفاں (گیان پردیپ) شریعت نامہ، شب معراج، رسولؐ وجے، ابلیس نامہ، معرفتی گان بہت مشہور ہیں۔ حضرت سید سلطانؒ نے قرآن شریف کا ترجمہ بھی شروع کیا تھا۔ (اس کا ذکر صرف ایک جگہ پنڈت بشمبر ناتھ پانڈے نے کیا ہے) مگر سید سلطان کی مخالفت علمائے وقت نے کی تھی چونکہ اس وقت بنگال میں حسین شاہی خاندان کی حکومت تھی اور وہ ان بزرگ کی حمایت کر رہے تھے۔ اس لئے سید سلطان پر شاہ ولی اللہؒ کی طرح قرآن شریف کا ترجمہ فارسی میں کرنے پر حملہ نہیں ہوا۔ دراصل شاہ صاحب پر یہ حملہ بھی حکومت وقت کی ایما پر ہی ہوا تھا اور کچھ دن بعد وقت کے مسلمان حاکم اورنگ زیب کے صاحبزادے کے حکم پر نجف خاں کوتوال نے حضرت شاہ صاحبؒ کے پہنچے اتروا دیئے تھے تاکہ شاہ صاحب اور کچھ نہ لکھ سکیں۔ مگر شاہ صاحب کا کام رکا نہیں۔ شاہ صاحب کے مواعظ وہدایات کو ان کے شاگرد، قلمبند کرتے رہے۔ سید سلطان نے جب اس کی مخالفت ہوئی اپنی ان کتابوں سے

پہلے یہ حاشیہ لکھا تھا۔ (صفحہ:۵۰۰رود کوثر اور ۵۰۳)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے عرصہ میں یہ کام پورے طور پر چٹا گانگ (جواب بنگلہ دیش میں ہے) میں شروع ہوا جس کی بنا پر چٹا گانگ کے گردونواح اور قریبی جزائر مثلاً سندیپ وغیرہ میں عربی رسم الخط کو بنگال کے بقیہ حصوں سے زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی کچھ ایسے مخطوطے بھی ملتے ہیں جن سے بنگالی کو حروف قرآن میں لکھنے اور بنگالی میں لکھنے کی تحریک پر روشنی پڑتی ہے۔ اس علاقہ میں عربوں کی آمد کا سراغ برما کے علاوہ ارکان کی مقامی تاریخوں میں بھی ملتا ہے۔ ۷۸۱ء میں عربوں کے چند جہاز رمدی کے قریب ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اور یہ عرب ارکان کے اندرونی علاقوں میں بس گئے تھے۔ انہوں نے اشاعت دین شروع کی اور یہیں سے اسلامی اثرات اس علاقہ میں بڑھے۔ کیمبرج ہسٹری میں ہاروے نے اس کی وضاحت کی ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں آسام سے ملایا تک کے ساحل پر جابجا مسجد نما عمارتیں تھیں جنہیں بدر مکان (یا بدر مقام) کہا جاتا تھا جن عمارتوں کا مسلمان ہی نہیں چینی اور بدھ مت کے پیرو بھی احترام کرتے تھے لیکن اس پوری کوشش کا مرکز حضرت بدر اولیا یا بدرالدین اولیا سے تھا جن کا چٹا گانگ میں چلہ خانہ تھا۔ (آب کوثر صفحہ:۵۱تا۵۳)

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام یقیناً اولیائے کرام اور خصوصیت سے عربوں نے پھیلایا اور محبت سے پھیلایا۔ ابتداء ۷۸۱ء میں ہوئی اور تیرہویں صدی میں شرق الہند میں ملایا تک اسلام پہنچا۔ آج انڈونیشیا وغیرہ میں ۸۰ سے ۹۵ فیصد تک مسلمان ہیں۔ لیکن ہم ۹۸۰ء سے ۱۸۵۱ء تک اسلام اس ملک میں نہ پھیلا سکے۔ معاف فرمائیں گے میرے ان الفاظ کو جو حقیقت پر مبنی ہیں۔ اسلام دین فطرت ہے مگر اس لمبے عرصہ میں شریعت کو ایک کوزے میں بند رکھا گیا۔ حد یہ کہ حضرت مجدد نے بھی دیگر برادران وطن کو نہ صرف اسلام سے ایک اعتبار سے دور ہی رکھا جبکہ جس سے وقت کے نشہ میں چور مسلمانوں نے دیگر برادران وطن کو ذمی کہا۔ نظام المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا کہ یہ لوگ ذمی نہیں۔ ہم سب خدا کے ذمی ہیں۔

خواجہ صاحب کے پیر حضرت خواجہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے ایک مرید نے ایک مرتبہ انہیں قینچی پیش کی تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے قینچی مت دو سوئی دھاگا دو کہ قینچی جدا کرتی ہے، "من

برائے وصل آدم نہ کہ برائے فصل آدم'' دراصل کلام الٰہی کو آن ہی اولیائے کرام نے سمجھا کہ اللہ رب العالمین ہے اور قرآن شریف میں یاایھا الناس سے خطاب کیا گیا ہے۔ بہر حال عرب اور صوفیا و اولیائے کرام پہنچے اور وہاں کی زبان میں قرآن شریف اور احادیث مقدسہ کا ترجمہ عوام کے سامنے رکھا تو اس ملک کے عوام نے ہواؤں میں گونجتی ہوئی صدائے لا الہ الا اللہ کو نہ صرف سمجھا بلکہ اپنا لیا۔ اسی طرح ہندوستان کے بیشتر جنوبی شمال مشرقی اور مغربی حصوں خصوصیت سے کشمیر میں اسلام صوفیائے کرام کے ذریعہ پہنچا۔

مگر شمالی ہندوستان میں خصوصیت سے ہمارا سب سے بڑا کارنامہ یہ رہا ہے کہ بنیادی مسائل سے ہٹ کر ضمنی یا فروعی مسائل پر دست و گریباں ہو کر تنگ نظر علماء بجائے تاریکیوں میں چراغ جلانے کے ایک دوسرے پر کفر کے فتویٰ چسپاں کرنے میں لگے رہے ہیں۔ تبلیغ و اشاعت دین کی فرصت نہیں ملی۔ حضرت مولانا آزاد نے الہلال ۱۹۱۳ء میں لکھا تھا۔ معاف فرمائیں اگر میں کہوں کہ اسلام ہندوستان میں آکر اور تمام مقامات سے بہت زیادہ مسخ ہوا ہے ابھی ہندوانہ رسم ورواج کے بت سے نجات نہیں ملی تھی کہ تقلید فرنگ کا ایک نیا بت کدہ آباد کر دیا گیا۔ شامت اعمال اس پر مستزاد کہ دین کو صرف فرائض کی ادائیگی یا مشکل حالات میں مقابلہ کے لئے چند وظائف تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اسباب ظاہری کی فراہمی و سعی پر توجہ کم رہی۔ مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ امر بالمعروف کے بعد نہی عن المنکر پر کم توجہ رہی۔ حد یہ کہ قیامت پر مستحکم و مکمل یقین و اعتماد نہیں رہا۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں حضرت مجدد نے جو خدمات انجام دیں وہ اپنی جگہ منفرد ہیں۔ اس پر سب سے زیادہ توجہ صوفیائے کرام نے دی۔ علمائے حق بھی یقیناً رہے اور ہیں مگر زیادہ تعداد میں نہیں رہے اور اس معاملے میں تو سب ماسوائے چند علماء کے برادران وطن تک پیغام اسلام نہیں پہنچا سکے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ کسی نے بھی قرآن شریف اور احادیث کا ترجمہ یہاں کی زبانوں میں نہیں کیا۔ کیا سب ہی حکومت کے معجزانہ نظام کی پیداوار بن گئے تھے؟ یہاں مجھے حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ پہلی شخصیت نظر آتے ہیں، میں بہت سے حوالے پہلے دے چکا ہوں۔ یہ عجیب بات کہ شاہ صاحب نے ''اے آدم کے بچو کہہ کر تجاروں، زمینداروں، کاریگروں، کھیتی کیاری اور دیگر کام کرنے والے مزدوروں سے اور حکومتی طبقہ سے خطاب کیا۔

اس طرح "یاایہا الناس" کا قرآنی راستہ اختیار کیا" بچے بوڑھے تک سب مسلمان صرف ہل ہل کر قرآن شریف ضرور پڑھتے تھے مگر مطلب سے نابلد تھے۔ سوائے طلبا کے شاہ صاحب پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے اس پر توجہ کی۔ فارسی میں ترجمہ ہوا مگر اسی سے ابتدا ہوئی۔ آپ کے صاحبزادگان حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور حضرت شاہ رفیع الدینؒ نے یہ سلسلہ آگے بڑھایا۔

شاید جماعت اسلامی وہ پہلا ادارہ ہے جس نے ہندی میں قرآن شریف اور احادیث کا ترجمہ کیا۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۵ء تک انگلینڈ میں وہاں کے جو لوگ مسلمان ہوئے ان کی تعداد مشکل سے تیس سے پچاس تھی۔ مگر اب انگریزی ہی نہیں فرانسیسی، روسی، دلندیزی، جرمن زبان میں ترجمہ ہونے کی وجہ سے آج نہ صرف یوروپ بلکہ امریکہ میں بھی اسلام پھیل رہا ہے۔ مگر ہر طرح جب بھی کسی زبان میں قرآن شریف واحادیث شریف مقدسہ کا ترجمہ ہوگا اس کا ثواب حضرت شاہ ولی اللہؒ کو ضرور ملے گا۔ انشاء اللہ۔ حضرت شاہ صاحب نے نہ صرف اپنی حکومت اور اپنی قوم میں مذہب سے دوری کا اور صرف فروعی یا ملکی اختلاف کی بنا پر اس دور کے علما کا مقابلہ کیا اور صوفی اور مولوی کی صلح کی بنیاد ڈالی بلکہ انہوں نے اس ملک کے لئے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ انگریزی تسلط کے خلاف پہلی آزادی کی شمع جلائی جس کی روشنی کو ان کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ محمد اسحٰق، مولانا اسد اللہؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنیؒ اور اس دور کے دیگر علمائے کرام خصوصیت سے حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ نے چہار دانگ میں پھیلایا اور اسی شمع ولی اللہ سے اپنی مشعلیں جلائیں اور غلامی کی تاریکی میں سب کو راستہ دکھایا جس کی بدولت ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو صبح آزادی کا نورانی چہرہ دیکھ سکے۔

جیسا میں نے پہلے لکھا ہے شاہ صاحب نے مذہبی نفرت کو اس وقت ختم کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ دنیا ابھی لفظ سیکولرازم سے بھی ناواقف تھی۔ یہی دراصل صحیح پیغام اسلام ہے۔ حضرت مولانا تقی الدین مظاہری کے مطابق حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد علم حدیث کی طرف ہندوستانی علماء کی توجہ کی بنا پر اس ملک کو درس حدیث میں وہ مقام حاصل ہوا کہ شاہ صاحبؒ کے بعد سے اب تک تمام اسلامی ممالک پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔ بقول حضرت شاہ عبدالعزیزؒ میرے والد ہی مدینہ منورہ

سے علم حدیث لائے تھے۔ ۱۴ ماہ حرمین شریفین میں رہ کر آپ نے سند حاصل فرمائی (ملفوظات صفحہ:۹۳) شاہ صاحب کے استاد شیخ ابو طاہرؒ نے فرمایا کہ "یہ الفاظ کی سند تو مجھ سے لیتے ہیں مگر ان سے حدیث کے معنی میں حاصل کرتا ہوں" امیر الروایات کے مطابق یمن میں مولانا قاسم نانوتویؒ ایک معمر بزرگ حدیث سے ملے۔ ان محدث وقت نے پوچھا کہ تم کس کے شاگرد ہو؟ مولانا قاسم نے کہا "مولانا عبدالغنی مجددی کا" ان سے محدث صاحب نے ناواقفیت کا اظہار کر کے پوچھا وہ کس کے شاگرد تھے؟ جواب دیا "شاہ محمد اسحٰقؒ کے۔ ان محدث نے پوچھا وہ کس کے شاگرد تھے جواب دیا کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ابن حضرت شاہ ولی اللہ کے ان محدث نے کہا "میں ان کو جانتا ہوں شاہ ولی اللہؒ طوبیٰ کا درخت ہے جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں ہیں وہاں جنت نہیں ہے"۔ مصر کے مشہور و معروف عالم رشید رضا مرحوم نے مفتاح کنوز السنہ میں لکھا ہے کہ "ہمارے ہندوستانی بھائیوں میں جو علماء ہیں اگر حدیث کے علوم میں اس زمانہ میں ان کی توجہ نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا کیونکہ مصر، شام، عراق، حجاز میں دسویں صدی ہجری سے یہ علم ضعف کا شکار ہو چکا تھا اور چودہویں صدی کے اوائل تک ضعف کی آخری منزل تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے ۱۳۱۵ھ میں مصر میں ازہر کی مسجدوں کے خطیبوں کو دیکھا کہ وہ اپنے خطبوں میں ایسی حدیثیں پڑھتے ہیں جن کا پتہ نہیں۔ ان میں ضعیف، منکر و موضوع جعلی روایتیں بھی ہوتی تھیں۔ اور یہ حال واعظوں، مصنفوں اور مدرسوں سب کا تھا۔ علامہ موصوف نے اس طرح شاہ ولی اللہ کے علم حدیث کے کارناموں کا اعتراف کیا ہے۔ آج نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں جو علم حدیث کا زور و شور ہے اس کی ابتداء اور انتہا حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مخلصانہ مجاہدے کی بنیاد ہے اس پر تو علمائے وقت ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔ مگر سب سے اہم کام تو یہ ہے کہ ہم دیگر برادران وطن کو یہ بتائیں کہ دراصل درست اسلام تو ۲۰ ہجری یا ۷۹۰ء میں ہندوستان میں آیا تھا۔ ۹۸۰ میں ملوکیت کی تلوار آئی تھی۔ یہ سب حکمران مسلمان بادشاہ تھے۔ اسلامی نمائندے نہیں تھے۔ وہ مسلم حکومتیں تھیں اسلامی نہیں تھی۔ اور یہ بھی حضرت شاہ صاحبؒ اور علمائے کرام کی کوششیں ہی ہیں جو اس ملک کو آزادی دلا پائی ہیں مگر افسوس کہ ہم نہ صرف یہ تاریخ پیش نہ کر سکے بلکہ شاہ صاحبؒ نے کس طرح اپنی حکومت کی غلطیوں کی مخالفت کی تھی اس پر بھی توجہ نہیں دلا سکے۔ شاہ

صاحبؒ ہندوستان کو نہ صرف مضبوط ترقی یافتہ بلکہ ایشیا کا سب سے متمدن اور طاقتور بلکہ سربراہ دیکھنا چاہتے تھے وہ خواب ابھی ادھورا ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ جو راستہ شاہ صاحب نے دکھایا تھا اس کے تحت اس ملک کی ملکی زبان ہندی، علاقائی زبانوں اور انگریزی میں یہ کام ہونا چاہیئے۔ کاش میری درخواست پر غور فرما کر اس پر کام شروع کیا جائے۔

اس مضمون میں میں صرف شاہ صاحبؒ کے لئے کچھ عرض کرسکا ہوں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا مذہبی وسیاسی فلسفہ جو زندہ جاوید تحریک بن گیا اس کا سلسلہ اب حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے دارالعلوم دیوبند کے توسط سے آج تک جاری ہے۔ خدا کرے کہ میں اس کام کو جلد از جلد مکمل کرسکوں۔

# شاہ ولی اللہؒ کے تعلیمی نظریات

(مولانا) عقیدت اللہ قاسمی ایم، اے☆

مجدد ملت، مجتہد عصر، حجۃ اللہ والاسلام اور حکیم الامت والاسلام حضرت شاہ ولی اللہؒ کی نابغۂ روزگار شخصیت ملت اسلامیہ کی تاریخ میں اصلاح وتجدید کے امام کا عظیم مقام ودرجہ رکھتی ہے۔ آپ کی اصلاحات وتجدید کا دائرہ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے جس میں علمی وفکری رنگ غالب ہے۔ جس کی حدود میں حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کے مطابق تدریس وتصنیف، اشاعت کتاب وسنت، تطبیق بین العقل والنقل اور توفیق بین المذاہب الفقہیہ، اسرار ومقاصد شریعت کی توضیح، آنے والے عقلی دور کی رعایت، تربیت وارشاد، ہندوستان میں اسلامی اقتدار کی حفاظت، سیاسی تبدیلیوں اور ابھرتی ہوئی طاقتوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ اور ان میں ملت کے تحفظ اور تشخص کے بقا کی ممکنہ تدبیریں، علوم اسلامیہ میں مجتہدانہ فکر ونظر اور اس کی طبقہ علماء کی طرف منتقلی کی کوششیں سب شامل تھیں۔ (تاریخ دعوت وعزیمت پنجم ص:۱۲)

حضرت شاہ ولی اللہ کی ولادت باسعادت سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی وفات ۱۱۱۸ھ مطابق ۱۷۰۷ء سے چار سال قبل یعنی ۱۱۱۴ھ میں ہوئی۔ کسی بھی عظیم انقلابی شخصیت کی زندگی اس کی جدوجہد، اصلاحی وتجدیدی کوششوں اور کارناموں کو سمجھنے کے لئے اس کے عہد کے حالات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کلیہ سے شاہ ولی اللہ کی شخصیت بھی مستثنیٰ نہیں ہے، لہذا شاہ صاحب کے کارناموں اور افکار ونظریات کو سمجھنے کے لئے پہلے آپ کے دور اور زمانہ کے حالات

☆ سہ روزہ دعوت، مرکز جماعت اسلامی، نئی دہلی۔

پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

اورنگ زیب اس براعظم کا اس ملک کی معلوم و محفوظ تاریخ کی روشنی میں اور جیسا کہ پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر اوم پرکاش ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی شعبہ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی نے اپنی تاریخی، علمی و تحقیقی تصنیف اورنگ زیب ایک نئی درشٹی (ہندی ایڈیشن مطبوعہ خدا بخش لائبریری پٹنہ) میں نقشوں کے ذریعہ ثابت کیا ہے ہندوستان کا سب سے بڑا فرماں روا گذرا ہے۔ سمراٹ قرار دیئے جانے والے اشوک کی حکومت کی حدود بھی اورنگ زیب کے مقابلہ میں بہت کم اور مختصر ہیں۔ اورنگ زیب کی سلطنت ہندوستان میں قائم ہونے والی سلطنتوں میں سب سے زیادہ وسیع تھی جو موجودہ افغانستان کے غزنی و قندھار سے بنگلہ دیش کے چٹاگانگ تک اور کشمیر سے موجودہ کرناٹک سے بھی آگے تامل ناڈو اور کیرالہ کے بڑے حصہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ انگریزوں کے عروج سے پہلے ہندوستان میں کبھی بھی اور کسی کی بھی اتنی طویل و عریض حکومت قائم نہیں ہوئی۔ اس کے عہد میں اور اس کے ایماپر میر جملہ نے پہلی مرتبہ آسام کو جو اپنی زبان، تہذیب، مذہب اور نسل میں ہندوستان سے الگ ایک آزاد منطقہ رہا ہے فتح کر کے سلطنت مغلیہ میں شامل کیا۔

اورنگ زیب ایک بیدار مغز، مستعد، فرض شناس، امور سلطنت میں جزوکل سے واقفیت رکھنے اور نظم ونسق پر کلی طور پر حاوی رہنے والا حکمراں تھا۔ اس نے اس خداداد وسیع و عریض سلطنت میں اصلاحی و انقلابی کارنامے انجام دیئے، وہ آہنی عزم، فولادی جسم، حد درجہ کا احساس ذمہ داری اور خوف خدا رکھتا تھا۔ اس کی نظر جتنی ملکی کلیات اور مہمات سلطنت پر تھی اتنی ہی جزئیات پر تھی۔ وہ دکن میں تھا مگر شمال، مغرب اور مشرق کی خبر رکھتا تھا۔ اپنی ذاتی اطلاعات اور پرچہ نویسوں کی مدد سے امور انتظامی کی باریک سے باریک تفصیلات جانچتا تھا جس کی وجہ سے عمال سلطنت جہاں بھی رہتے چوکنا اور مستعد رہتے۔ وہ ادنی ادنی محرروں کا تقرر خود کرتا تھا، لیکن وائے حسرت! کہ اس کے بعد اس کے عظیم اور پر جلال تخت پر اس کی اولاد میں وہ لوگ آئے جنہوں نے اپنی تعیش پسندی، کاہلی و نااہلی، باہمی اختلاف و کشمکش، خود غرض و جاہ پسند ارکان سلطنت و وزرا پر کلی اعتماد اور امور سلطنت سے غفلت کے ذریعہ وہ باب وا کیا کہ اورنگ زیب نے سلطنت کے حدود میں جو

توسیع کی تھی، اس کے نظم ونسق کو اپنی بیدار مغزی، مستعدی اور فرض شناسی سے جو استحکام بخشا تھا، عوام اور فتنہ پردازوں پر جو اثر و رعب قائم کیا تھا، سب کا صفایا کر دیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی ۶۲ سالہ زندگی میں اورنگ زیب کے بعد گیارہ مغل بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا شاہ عالم بہادر شاہ اول اپنے برادر خورد محمد اعظم شاہ کو شکست دے کر تخت نشین ہوا جو عالمگیر کے مزاج و مسلک کی بالکل ضد تھا بلکہ پورے سلسلہ فرماں روایان سلطنت کے عقیدہ، مذہب اور طرز و مسلک کے خلاف تھا خود اپنی سلطنت کے مفاد و مصالح کے بھی منافی تھا۔ جہاں عالمگیر کا یہ حال تھا کہ وہ اورنگ آباد میں تھا تو دہلی کا کیا ذکر بہار اور بنگال میں بھی کارکنان سلطنت پر اس کی ہیبت طاری رہتی۔ وہ جزئیات سلطنت تک سے باخبر رہتا اور ہر وقت مناسب احکام جاری کرنے میں ذرا سی تاخیر سے کام نہ لیتا۔ اب اس کے جانشین کا یہ حال تھا کہ بقول مولوی ذکاء اللہ بادشاہ اپنے متصدیوں سے فرمایا کرتا ''سب اہل کار آپس میں مل گئے ہیں جو بہتر جانتے ہیں عمل میں لاتے ہیں ہمارا فقط اعتبار رہ گیا ہے''

(تاریخ ہندوستان: ج:۹ص:۳۳)

عالمگیر کے پہلے ہی جانشین کے زمانہ اور صرف چھ برس کی مدت میں عظیم سلطنت مغلیہ کی چولیں ہل گئیں اور اس کی وہ ساکھ ودھاک ختم ہوگئی جو مخالف طاقتوں، فتنہ پردازوں اور عوام وخواص کے دماغ پر بابر کے زمانہ سے بیٹھی ہوئی تھی۔ شاہ عالم کے مزاج پر خفقان کا غلبہ ہوا اور وہ دارالسلطنت لاہور میں جہان فانی سے رخصت ہوگیا۔

فرخ سیر کے زمانہ میں حسین علی خاں جسے امیر الامراء کا لقب دیا گیا تھا اور عبداللہ جو قطب الملک کے لقب سے ملقب تھا دونوں بھائیوں کا اقتدار بادشاہ اور پوری سلطنت پر قائم ہوگیا۔ فرخ سیر ان کے ہاتھ میں کھلونا تھا۔ بادشاہ پر عیاشی، خلوت نشینی اور بے دماغی کا غلبہ تھا۔ خلق اللہ کا کاروبار بند تھا کسی کا اصلاً اعتبار اور استقلال نہیں رہا تھا۔ آخر دونوں بھائیوں قطب الملک اور امیر الامراء نے اس کی آنکھوں میں سلائی پھیری، قید کیا، آخر وہ ۶ رسال چار ماہ حکومت کر کے دنیا سے رخصت ہوا۔ ان واقعات نے پورے ملک میں تخت مغلیہ کے جانشینوں کی بے احترامی اور سلطنت کی بے اعتباری پیدا کر دی۔ ایک اور قابل ذکر نااہل مغل بادشاہ محمد شاہ نے ۲۹ رسال چھ مہینے

حکومت کی۔ اس کا عہد حوادث اور واقعات سے پُر ہے۔ اس کے زمانہ میں دہلی پر نادر شاہ نے حملہ کیا مگر محمد شاہ کو اپنے عیش و عشرت کے مشغلوں میں ملکی معاملات پر توجہ دینے کی فرصت نہ تھی۔

اگر محمد شاہ کے زمانہ میں سلطنت مغلیہ کو اخلاقی وانتظامی طور پر زوال ہوا اور ہندوستانی معاشرہ اور طبقہ امرا کا رجحان الناس علیٰ دین ملوکھم کے اصول کے مطابق عیش و عشرت تن آسانی اور لذت اندوزی کی طرف تیزی سے ہوا تو شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں سیاسی زوال اپنے آخری مرحلہ تک پہونچ گیا۔ وہ دوسروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا رہا یہاں تک کہ انگریزوں کی اطاعت قبول کر کے اور ایک معاہدہ پر دستخط کر کے ان کا وظیفہ خوار ہو گیا۔

سیاسی انتشار، اجتماعی بدنظمی اور انحطاط کے باوجود یہ دور انفرادی طور پر علمی کمالات تصنیفی انہماک، روحانی یکسوئی، باطنی ترقی اور نفوس کے تزکیہ واصلاح کا دور تھا جس میں متعدد ایسی باکمال اور ممتاز شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کو اس دور انحطاط سے کوئی مناسبت نہ تھی اور جن پر حالات سے مایوسی دہراس کا کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے اس دور کا علمی اور روحانی پہلو اور اس دور انحطاط میں ایسی قد آور شخصیتوں کا ظہور ایک مریض اور برسر انحطاط و زوال معاشرے کی اندرونی قوت مقابلہ کا ثبوت اور اسلام کی مردم آفرینی اور آدم سازی کی صلاحیت کی دلیل ہے۔ وفور علم، ذہانت، قوت تدریس، حسن تصنیف، عالم، مدرس مصنف اور پوری پوری علمی تحریک اور سلسلۂ تدریس و تربیت، سلوک، تصوف اور طریقت کے بانی رجال واعیان اس صدی میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بڑے بڑے سرآمد روزگار اور فخر بلاد وامصار، نامور اہل کمال اور مسیحا نفس شیوخ کاملین کے باوجود ہندوستان کا مسلم معاشرہ خاص طور پر طبقہ امرا سلطنت کے اثر، سیاسی زوال، دولت کی فراوانی اور ایرانی تہذیب کے اثر سے اخلاقی زوال کے نقطۂ عروج کو پہونچ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اس کردار کے ادا کرنے سے قاصر تھا جو طبقہ امرا نے ہر دور میں انقلابِ سلطنت کے موقع پر ادا کیا ہے۔

اس معاشرتی اور اخلاقی پستی سے زیادہ خطرناک عوامی زندگی میں بکثرت پھیلی ہوئی وہ ضعیف الاعتقادی تھی جو خدا کی نصرت سے محروم اور حقیقی طاقت وقوت سے عاری کرنے والی تھی۔ بدعات کا زور اور ہندوؤں وشیعوں کی بہت سی رسوم وعادات کی تقلید عام تھی۔ شرک جلی کی ایسی

متعدد صورتیں بکثرت مقامات اور حلقوں میں پائی جاتی تھیں جن کی کوئی علمی توجیہہ ممکن نہیں کھلی قبر پرستی، مشائخ کے لئے سجدہ تعظیمی، مزارات اور ان کے قرب و جوار کا حرم کی طرح احترام، قبروں پر چادریں چڑھانا، منتیں ماننا، بزرگوں کے نام پر قربانیاں، مزارات کا طواف، وہاں میلوں کا انعقاد، تہوار منانا، گانا بجانا اور چراغاں کرنا حتی کہ انہیں قبلہ وکعبہ کے مساوی اور ملجا و ماوی سمجھنا کوئی ایسا واقعہ اور منظر نہ تھا جس کو دیکھنے کے لئے بہت دور جانے اور بہت دیر انتظار کرنے کی ضرورت ہوتی۔ شیخ سدو کا بکرا، سید احمد کبیر کی گائے، غازی میاں کے جھنڈے اور چھڑیاں، محرم کے تعزیے، غیر اسلامی تہواروں کو شان و شوکت سے منانا، بیماریوں کے دفع کرنے میں ارواح خبیثہ (بھوت پریت) اور بعض اوقات دیوی دیوتاؤں کی رضا مندی اور خوف، چیچک کی بیماری میں ہندوؤں کی دیوی ستیلا کی تعظیم، اولیا اور نیک بیبیوں کے نام سے روزے، صحنک، توشک وکونڈوں کی منت اور ان سے اپنی حاجت برآری اور مقاصد کی تکمیل کو وابستہ کرنا اور اس سلسلہ میں خاص دن، خاص کھانے اور خاص آداب کی پابندی یہ اور ایسے بہت سے عنوانات ہیں جن کے ماتحت توہمات، عقائد فاسدہ، رسوم جاہلیت اور التزامات و پابندیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔

عقیدہ توحید کا بڑی حد تک مشرکین مکہ اور ہندوستان کے برادران وطن کے عقائد کی طرح یہ مفہوم رہ گیا تھا کہ زمین و آسمان اور کائنات کا حقیقی خالق اور صانع بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ہے وہی معبود حقیقی ہے اور بڑے بڑے امور وہی انجام دیتا ہے لیکن اس نے سلاطین عالم کی طرح اپنی سلطنت کے بہت سے شعبے اور محکمے اپنے مقبول بندوں کے سپرد کر دیئے ہیں جو ان کے مالک مختار ہیں اور وہ اپنے حساب سے سیاہ و سفید کرتے رہتے ہیں۔ اب ان سے رابطہ قائم کئے بغیر اس سلسلہ میں کوئی کامیابی اور کار برآری نہیں ہو سکتی۔ شرک صرف یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور ہستی کو اس دنیا کا صانع و خالق اور مالک حقیقی سمجھا جائے اور اس کو براہ راست بلا توسل و شفاعت اور تعظیم کے خیال کے عبادت و سجدہ کا مستحق تصور کیا جائے۔ اگر چہ برصغیر کے بہت سے مسلمانوں میں یہ تمام باتیں آج بھی موجود ہیں لیکن اس زمانہ میں عام طور سے انہی کا ڈنکا بجتا تھا اور سکہ چلتا تھا۔ الغرض شاہ صاحب کے زمانہ کا ہندوستان، سیاسی انتظامی، اخلاقی اور بہت حد تک اعتقادی حیثیت سے پستی و انحطاط کے اس نقطہ پر پہونچ گیا تھا جو اسلامی ملکوں کے زوال اور مسلم معاشرہ

کی پستی کا افسوسناک اور خطرناک مرحلہ ہوتا ہے۔

ان حالات میں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے زندگی کے مختلف علمی و عملی میدانوں میں تجدیدی واصلاحی تحریکیں شروع کیں۔ تفہیمات الٰہیہ کے مطابق انہوں نے اپنے مکتوب سامی میں اپنے ہم عصر علما کو خطاب کرتے ہوئے جو کچھ لکھا اس سے شاہ صاحب کے تعلیمی نظریات کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ عوام پر بدعات، رسوم جاہلیت، غیر مسلموں کی تقلید اور غیر اسلامی شعائر اختیار کرنے کا بھوت سوار تھا غیروں کی تقلید اور غیر اسلامی شعائر کا جنون آج کے ترقی پسند دانشوروں پر زمانہ کے ساتھ چلنے یعنی دینی مدارس میں عصری علوم داخل کرنے کے نام پر چھایا ہوا ہے۔ شاہ صاحب کے زمانہ کے نصاب تعلیم کے اندر سے اصل اسلام کی صورت زیبا کا دیکھنا اس لئے مشکل تھا کہ تعلیمی وتدریسی حلقوں پر کہیں یونان سے آئے ہوئے یونانی علوم کا جنہیں وہ فنون دانشمندی کہتے تھے اور کہیں علوم آلیہ وفنون بلاغت اور علم کلام کا غلبہ تھا اور دونوں حلقوں میں علوم شرعیہ بالخصوص علم حدیث کے لئے کوئی خاص گنجائش نہیں رہ پائی تھی۔ جیسا کہ دور حاضر میں ہمارے دانشور دینی مدارس کو قریب جا کر اور اندر سے دیکھے بغیر اٹھتے بیٹھتے رات دن وہاں عصری علوم کو ٹھونسنے کی وکالت میں اپنی توانائیاں صرف کرتے رہتے ہیں ان کے مشوروں پر جن اداروں نے عمل کیا خواہ وہ آج کے دور میں قائم ہونے والے نئے ادارے ہوں یا انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں قائم ہونے والے ہوں ان کا حشر کھلی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے کہ دینی ادارے قرار پانے کے باوجود ان کے فارغین میں اہل قلم، ادباء، صحافی عربی ادب کے ماہرین، معاشیات واقتصادیات وغیرہ میں ممتاز مقام رکھنے والے تو ملتے ہیں کوئی فقیہہ، مفتی، محدث یا مفسر ایسا نظر نہیں آتا جو اپنے علم وفضل سے عالم اسلام میں مقام ومرتبہ حاصل کر سکتا۔ جبکہ تعلیمی معیار کے لحاظ سے اس گئے گذرے دور میں بھی قدامت پسند اداروں کے فارغین نے ہی ان میدانوں کو سنبھال رکھا ہے اور مسلمانوں کی ضرورتوں کو جس طرح بھی ہو وہی پورا کر رہے ہیں۔ شاہ صاحب نے علوم کی تقسیم دینی ودنیوی یا عصری اور قدیم کے نام پر تو نہیں کی تاہم اخروی اور دنیوی کے نام پر ضرور کی، اور دنیوی یا عصری علوم کو دینی مدارس میں داخل کرنے کے مشورہ پر عمل کرنے سے ان دینی مدارس کا آج بھی وہی حشر ہونا یقینی ہے جس پر فرط تاثر اور شدت تاسف میں شاہ صاحب نے لکھا تھا۔

''میں ان طالبان علم سے کہتا ہوں جو خود کو علما کہتے ہیں کہ اللہ کے بندو! تم یونانیوں کے علوم کے طلسم اور صرف و معانی کے دلدل میں پھنس کر رہ گئے۔ تم نے سمجھ لیا کہ علم اس کا نام ہے حالانکہ علم یا تو کتاب اللہ کی آیت محکم ہے یا رسول اللہ کی سنت ثانیہ۔ تمہیں چاہئے تھا کہ تمہیں یاد رہتا کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کیسے پڑھی؟ آپ وضو کیسے فرماتے تھے؟ قضائے حاجت کے لئے کس طرح جاتے تھے؟ روزہ کیسے رکھتے تھے؟ حج کیسے کرتے تھے؟ جہاد کیسے کرتے تھے؟ آپ کا انداز گفتگو کیا تھا؟ حفظ لسان کا طریقہ کیا تھا؟ آپ کے اخلاق عالیہ کیا تھے؟ تم آپ ﷺ کے اسوہ پر چلو، آپ کی سنت پر عمل کرو، اس بنا پر کہ وہ آپ کا طریق زندگی اور سنت نبوی ہے اس بنا پر نہیں کہ وہ فرض و واجب ہے۔ تمہیں چاہئے تھا کہ دین کے احکام و مسائل سیکھو، باقی سیر و سوانح اور صحابہ اور تابعین کی وہ حکایات جو آخرت کا شوق پیدا کریں تو وہ ایک تکمیلی چیز اور امر زائد ہے اس کے مقابلہ میں تمہارے مشاغل اور جن باتوں پر تم پوری توجہ صرف کرتے ہو وہ آخرت کے علوم نہیں ہیں، دنیوی علوم ہیں۔

خدا کی مرضی تو یہ تھی کہ تم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شروع سے اشتغال کرتے۔ اگر ان دونوں پر عمل کرنا تمہارے لئے آسان ہو تو کیا کہنے! اور اگر تمہاری فہم اس سے قاصر ہو تو پھر کسی سابق عالم کے اجتہاد سے مدد لو، اور جس کو زیادہ صحیح، صریح اور سنت کے موافق پاؤ اس کو اختیار کرو، علوم آلیہ سے اس ذہن کے ساتھ اشتغال کرو کہ وہ آلات و وسائل ہیں نہ ان کی مستقل حیثیت ہے اور نہ مقصود کا درجہ ہے، کیا اللہ نے تمہارے اوپر یہ واجب نہیں کیا کہ تم علم کی اشاعت کرو یہاں تک کہ مسلمانوں کے ملک میں شعائر اسلام ظاہر و غالب ہوں؟ تم نے شعائر کا تو اظہار نہیں کیا اور لوگوں کو زوائد میں مشغول کر دیا۔

(تفہیمات الٰہیہ بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ پنجم ص: ۱۸۷ تا ۱۸۹)

یہی شاہ ولی اللہ کا بنیادی تعلیمی نظریہ ہے۔ جس کا سب سے پہلا امتیاز اور نمایاں شعار، عقیدہ پر زور و اصرار اور سب سے پہلے اس کا مسئلہ حل کر لینے کی تاکید ہے، جس کے ذریعہ بہتر سے بہتر اخلاقی زندگی اور اعلیٰ سے اعلیٰ اسلامی کردار کا حامل، نیکی و صلاح، سلامت روی اور معقولیت کا زندہ پیکر اور مثالی مجسمہ ڈھل سکے۔ جس سے بہتر حکومت کا قیام، صالح معاشرہ کا وجود اور مفید

انقلاب کا ظہور ہو۔

شاہ صاحب جس نصاب و نظام کے راستہ سے بلند مقام پر پہونچے ایک نظر اس پر بھی ڈالتے چلیں۔ شاہ صاحب کے لئے نصاب تجویز کرنے میں ان کے والد ماجد اور استاذ حقیقی شاہ عبدالرحیم کے انتخاب واجتہاد کا بڑا دخل تھا۔ جن کے بارے میں خود آپ فرماتے تھے ”والد صاحب کی شفقت میرے حال پر ایسی تھی کہ کم ہی کسی باپ کی بیٹے پر، کسی استاد کی شاگرد پر اور کسی شیخ کی مرید پر ہوگی۔ حضرت شاہ عبدالرحیم کا انداز تعلیم وتربیت بڑا حکیمانہ تھا۔

شاہ صاحب کی عمر پانچ سال کی ہوئی تو مکتب میں داخل کئے گئے۔ قرآن کی تعلیم اور حفظ کا آغاز پہلے ہی گھر پر ہو چکا تھا۔ چنانچہ اسی سال کے آخر میں قرآن مجید کے حفظ سے فراغت حاصل کرلی، اور فارسی کتابیں نیز عربی کے مختصرات پڑھنے شروع کئے، کافیہ ختم کیا، دس سال کی عمر میں شرح جامی شروع کی۔ خود فرماتے ہیں کہ اس دوران میرے اندر بالجملہ مطالعہ کی استعداد پیدا ہوگئی۔ چودہ سال کی عمر میں بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا۔ پندرہ سال کی عمر میں ہندوستان میں رائج علوم متداولہ سے فراغت کی، اسی عمر میں والد صاحب سے مشکوۃ کا درس لیا۔ والد صاحب ہی سے صحیح بخاری، کتاب الطہارت تک شمائل ترمذی مکمل، تفسیر مدارک اور بیضاوی کا کچھ حصہ پڑھا۔

شاہ صاحب نے خود اپنے پڑھے ہوئے نصاب کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ۔ اصول فقہ میں حسامی اور توضیح وتلویح کا بڑا حصہ، منطق میں شرح شمسیہ مکمل اور ایک حصہ مطالع کا، علم کلام میں شرح عقائد مکمل خیالی کے حاشیہ کے ایک حصہ کے ساتھ اور کچھ حصہ شرح مواقف کا، سلوک میں ایک حصہ عوارف اور وسائل نقشبندیہ وغیرہ کا، حقائق میں شرح رباعیات مولانا جامی اور لوائح، مقدمہ شرح اللمعات، مقدمہ نقد النصوص، خواص اسماء وآیات میں وہ مجموعہ جو خاص اس موضوع پر ہے اور الفوائد المأۃ وغیرہ۔ طب میں موجز، فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ، معانی میں مطول کا بڑا حصہ اور مختصر المعانی کا وہ حصہ جس میں ملازادہ کا حاشیہ ہے۔ ہندسہ اور حساب میں بعض مختصر رسائل (الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف)۔

شاہ ولی اللہ کے تعلیمی نظریات کے عنوان سے جناب محمد نعیم صدیقی ندوی ایم اے علیگ رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ کا ایک مقالہ برہان دہلی کے اکتوبر ۱۹۷۷ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا

جس میں انہوں نے شاہ صاحب کا وصیت نامہ نقل کیا۔اس سے بھی شاہ صاحب کے نظریہ تعلیم کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ ''تجزیہ سے یہ ثابت ہوا کہ طریق تعلیم یہ ہونا چاہئے کہ پہلے صرف ونحو کے تین چار درسی رسائل طالب علم کی استعداد اور ذہن کے مطابق پڑھائے جائیں (واضح ہو کہ شاہ صاحب کے دور میں طلباء کو انفرادی طور پر تعلیم دینے کا رواج تھا) اس کے بعد تاریخ یا حکمت کی کوئی کتاب جو عربی زبان میں ہو پڑھائی جائے۔ تعلیم کے وقت معلم کتب لغت کا طریقہ اور اس کے مشکل مقامات کے حل سے طالب علم کو مطلع کرتا رہے۔ جب طالب علم کو عربی زبان پر قدرت ہو جائے تو موطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی پڑھا دی جائے اسے کسی حال میں نہ چھوڑا جائے کہ یہ علم حدیث کی اصل واساس ہے............۔

اس کے بعد قرآن عظیم کی تعلیم دی جائے اس طرح کہ بغیر تفسیر کے صرف ترجمہ پڑھایا جائے مگر جہاں کہیں شان نزول یا قاعدہ نحویہ میں کوئی مشکل پیش آئے وہاں رک جائیں اور پوری طرح اس مقام کو حل کیا جائے۔ اس کے بعد تفسیر جلالین بقدر ضرورت پڑھائیں۔ اس طرح پڑھانے میں بڑا فیض ہے۔ اس کے بعد ایک کتاب حدیث کی مثلاً صحیح البخاری یا صحیح مسلم وغیرہ اور کتب فقہ، عقائد وسلوک وغیرہ پڑھائیں اور دوسرے وقت کتب دانشمندی پڑھائیں۔ مثلاً شرح قطبی الا ماشاء اللہ۔ اگر ممکن ہو تو طالب علم ایک دن مشکوۃ پڑھے اور دوسرے دن شرح طیبی جس قدر پہلے دن مشکوۃ پڑھی تھی۔ یہ نہایت نفع بخش ہے۔

اہل نظر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان میں صحاح ستہ کی تدریس کا رواج اس وقت سے ہوا ہے جب شاہ صاحب اور ان کے نامور اخلاف نے اس کو اپنی محنت سے رواج دیا اور اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ اس راہ میں صرف کر دیا۔

اس موقع پر چند باتیں آج کے دینی مدارس میں رائج نصاب تعلیم کے حوالہ سے گوش گذار کرنا بیجا نہ ہوگا، ہندوستان میں ساتویں صدی ہجری سے جو نصاب رائج تھا اس میں نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ کے ملتان سے دہلی آنے پر علم کلام وبلاغت اور علم معقولات کی بعض کتابوں کا اضافہ ہوا۔ پھر دسویں صدی میں امیر فتح اللہ شیرازی کی ہندوستان آمد پر ایران کے علمائے متاخرین محقق دوانی وغیرہ کی تصنیفات شامل کی گئیں۔ بارہویں صدی ہجری

یعنی حضرت شاہ ولی اللہ کے دور میں آپ کے ایک کبیر السن ہم عصر لکھنؤ کے محلہ فرنگی محل کے خانوادہ فضل وکمال کے ایک نامور فرزند ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی نے اس نصاب میں بہت عظیم اضافہ کیا، یہ نصاب انہی کی نسبت سے آج بھی درس نظامی کہلاتا ہے۔ انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات سے ۱۵ ر سال قبل ۱۱۶۱ھ میں رحلت فرمائی، مقام حیرت ہے کہ دینی مدارس میں رائج درس نظامی پر تنقید کرنے والے عام طور سے اس کو چار پانچ سو سال پرانا بتادیتے ہیں حالانکہ ملا نظام الدین کی طرف نسبت کے باوجود اس میں ہر دور میں ترمیم وتبدیلی ہوتی رہی ہیں۔ اہل دانش تنقید وتنقیص میں فرق نہیں کرتے۔ جناب محمد نعیم صدیقی ندوی نے اس کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے ''آج بھی باوجود ترمیم واضافہ کے درس نظامی کے نام سے معروف ہے'' اور تھوڑا ہی آگے چل کر لکھتے ہیں: ''ڈھائی صدی قبل ملا نظام الدین نے جو نصاب درس رائج کیا تھا وہ اس طویل ترین مدت سے تقریباً جوں کا توں قائم ہے''، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ قدیم نصاب میں معقولات کی چوبیس پچیس کتابیں داخل تھیں بعد میں انہیں بھی ناکافی تصور کرکے مزید اضافہ کیا گیا'' اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ دانشور حضرات آخرت کی جواب دہی پر ایمان وعقیدہ رکھتے ہیں یا نہیں اور کذب بیانی ودروغ گوئی کو گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں یا کار خیر وعمل صالح؟

بہر حال ندوۃ العلماء کے نامور فرزند جناب نعیم صدیقی ندوی نے لکھا ہے کہ ''انیسویں صدی کے اواخر میں انجمن ندوۃ العلماء نے تعلیمی نظام کے ڈھانچے میں تغیر پیدا کرنے کے لئے اپنا دارالعلوم لکھنؤ میں قائم کیا۔ غالباً یہ پہلی کوشش تھی جس نے صدیوں کے جمود کو توڑا اور پرسکون سمندر میں ارتعاش پیدا کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ندوہ نے اپنے مقصد قیام کو بڑی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی لیکن اس اعتراف کے ساتھ یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اس ادارہ نے ادبیات عربی کو کچھ اس طرح اپنے نصاب میں فوقیت دی کہ وہ محض ایک رد عمل ہوکر رہ گیا یعنی قدیم نصاب میں عربی ادب سے بے اعتنائی اور معقولات سے شغف جس حد غلو تک پہونچا ہوا تھا بعینہ وہی صورت ندوہ کے نصاب میں عربی ادبیات کو حاصل ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اس مثالی درسگاہ اور مرکزی ادارے سے اہل قلم، ادباء صحافیوں اور عربی ادب کے ماہرین کی ایک پوری نسل تو تیار ہوکر نکلی لیکن اب تک اس کی زمین سے کوئی ممتاز فقیہ، محدث اور مفسر ایسا نہ پیدا ہوسکا جو

اپنے علم و فضل سے ایک عرصہ تک آسمان علم پر چھایا رہا ہو"۔ (ماہنامہ برہان دہلی اکتوبر ۱۹۷۷ء)

الغرض شاہ ولی اللہ کے تعلیمی نظریات میں قرآن وحدیث کی تعلیمات پر بنیادی اور خصوصی توجہ پائی جاتی ہے۔آپ کے نظریات کے تحت اگر دینی مدارس کے نصاب میں کوئی ترمیم کرنے کے بارے میں سوچا بھی جائے تو اس بنیادی اصول کو بہر حال پیش نظر رکھنا چاہیے۔جبکہ یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ مسلم دانشور دینی اداروں میں عصری علوم کو شامل کرنے کی بات تو کرتے ہیں مگر اس کا کوئی نقشہ پیش نہیں کرتے اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلم دانشوروں نے اسلامی اور مسلم نقطۂ نظر سے عصری علوم پر مبنی آج تک کوئی درسی کتاب تیار نہیں کی۔حتی کہ مسلم ممالک میں بھی عام طور سے صلیبیوں، صہیونیوں وثنیوں اور مستشرقین کی تصنیفات پڑھائی جارہی ہیں جن کے اثرات سب کے سامنے ہیں۔

# شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور خدمت حدیث

مولانا خورشید عالم سلفی☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على رسوله الأمين وبعد

بارہویں صدی کا وہ زمانہ بڑا ہی پُر کیف اور پُر بہار تھا جب سرتاج علم وفضل، سلطان علوم ومعارف محقق، کبیر، محدث جلیل، فقیہ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے ناخن تدبیر اور پُر حکمت انداز سے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ توحید وسنت پر پڑے شرک وبدعت کے گرد وغبار صاف کر کے اسلام کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے پیش کی۔ صدہا قسم کی بدعات وتوہمات میں مبتلا قوم میں کتاب وسنت کا حقیقی ذوق پیدا کیا۔ مذاہب اربعہ کے فقہی مسائل کی تحقیقات اور فقہ حدیث کی صحیح بنیاد رکھی۔ اسرارِ حدیث، مصالح احکام کو اس عمدگی سے پیش کیا کہ گویا یہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ عقائد تصوف وسلوک میں محققانہ تقریریں کیں اور اس فن کو صوفیائے متاخرین کی بدعات ومزخرفات سے پاک وصاف کیا۔

آپ کون تھے؟ رفعت وعظمت اور علوِ مرتبت کے کس مقام پر فائز تھے؟ اس کے متعلق نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ کے یہ الفاظ کافی ہیں جو ان کی زبان سے بے ساختہ نکل گئے تھے کہ "اگر وجود او درصدر اول درزمانہ ماضی می بود، امام الائمۃ وتاج المحدثین شمردہ می شد" یعنی انصاف یہ ہے کہ اس مقدس اور پاک نفس کا عزیز وجود اگر گذشتہ زمانہ میں ہوتا تو تمام مجتہدوں کا پیشوا اور مقتدی مانا جاتا بلکہ ان کا سرتاج بنایا جاتا اور امام الائمۃ کا وزنی اور قیمتی خطاب پاتا۔ (منقول از ولی اللہ اسماعیل گودھروی ص:۴۱)

☆ چیئرمین انڈین ایجوکیشن اینڈ ریسرچ سینٹر پھلواری شریف پٹنہ۔

نواب صاحب کے علاوہ بہت سارے علماء نے آپ کو خاتم المحدثین اور امام المفسرین کے القاب سے ملقب کرتے ہوئے امامِ فن، مجتہدِ وقت تسلیم کیا ہے۔ اور یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ اس ملک ہندوستان میں آپ کا کوئی ہمسر پیدا نہیں ہوا ہے، بقول شاعر:

فانک شمس والملوک کواکب

اذا طلعت لم یبد منهن کوکب

قابل مبارکباد ہیں حضرت مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب جنہوں نے ایسی نابغۂ روزگار ہستی پر سمینار کا انعقاد کر کے ہم عقیدت مندوں کو عقیدت ومحبت کے چند پھول نچھاور کرنے کا زریں موقع عنایت فرمایا۔ میں اس بطل جلیل، مجدد ملت کی زندگی کے جس گوشے پر چند سطور لکھنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں وہ ان کی حدیثی خدمات ہیں آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے، اور رب السماوات والارض ان کی لازوال و بے مثال ہمہ جہت قربانیوں کو شرف قبول بخشے۔ آمین۔

حضرات گرامی! تاریخ کا مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (جنہوں نے درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ اشاعتِ حدیث میں نمایاں کردار ادا کیا ہے) کے بعد کتاب وسنت کی بجھتی شمع کو فروزاں کرنے اور اس کی نورانی کرنوں سے فضائے ہند کو منور کرنے کا شرف جس عظیم الشان شخصیت کو حاصل ہے اسے دنیا شاہ ولی اللہ کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ یہی اللہ کا وہ بزرگ بندہ ہے جس نے پوری قوت ایمانی سے شرک وبدعات کے طوفان کو روکا اور اندھی تقلید کی بجائے کتاب وسنت کی اتباع کی دعوت عام کی، اور آج برصغیر میں جہاں بھی قال اللہ وقال الرسول کی آواز سنائی دیتی ہے وہ اسی خانوادۂ مقدس کی مرہون منت ہے اور ان ہی کی کوششوں اور کاوشوں کا مبارک ثمرہ ہے۔

(پاک وہند میں علماء اہل حدیث کی خدمات حدیث ص: ۲۴، ارشاد الحق اثری)

اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جس ترویج حدیث کی بنا ڈالی تھی شاہ صاحب نے اس کی دیواروں کو آسمان تک پہنچا دیا اور ہندوستان میں کتاب وسنت کا حقیقی ذوق پیدا کر دیا۔ فجزاہ اللہ عنی وعن سائر المسلمین خیر الجزاء۔

## طلب حدیث:

حضرت شاہ صاحب نے دو مرتبہ حدیث کی کتابیں پڑھی ہیں پہلی مرتبہ ہندوستان میں مولانا محمد افضل معروف بحاجی سیالکوٹی سے اور پھر ۱۱۴۳ھ میں مدینہ منورہ میں ابوطاہر مدنی سے جو اپنے وقت کے مشہور اور یکتائے روزگار محدث تھے۔ وہ ہمیشہ شاہ صاحب پر فخر کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ولی اللہ مجھ سے الفاظ کی سند لیتے ہیں اور میں ان سے معانی کی۔

(ولی اللہ اسماعیل گودھروی ص:۳۹)

آپ کے علم حدیث سے متعلق شاہ عبدالعزیز ارشاد فرمایا کرتے تھے علم حدیث پدر من از مدینہ آورد چاردہ ماہ در حرمین بودہ حاصل سند کردہ "یعنی میرے والد گرامی ہی علم حدیث مدینہ سے ہندوستان لائے چودہ ماہ حرمین میں رہ کر روایت حدیث حاصل کی۔ (ملفوظات عزیزیہ ص:۹۳)

جب شاہ صاحب ۱۱۴۵ء میں فیوض حرمین سے استفادہ کے بعد ہندوستان واپس ہوئے تو مدینہ منورہ میں اپنے استاذ حدیث شیخ الحدیث علامه ابوطاهر محمد بن ابراهيم الكردى المدنى کو الوداع کہتے وقت ارشاد فرمایا:

نسيت كل طريق كنت اعرفه إلا طريقا يؤدينى إلى ربعكم

گویا

جو لکھا پڑھا تھا نیاز نے سو وہ ایک دم میں بھلادیا

یعنی جو کچھ میں نے پڑھا تھا فراموش کر دیا سوائے علم دین یعنی علم حدیث کے۔

(ولی اللہ نمبر الفرقان بریلی ص:۱۷۷)

## درس حدیث:

علم حدیث کے حصول کے بعد شاہ صاحب کی فکری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا، اس علم میں انہماک کا یہ عالم ہوا کہ آپ کا سارا علمی اشتغال اسی سے وابستہ ہو کر رہ گیا چنانچہ والد بزرگوار کی وفات کے بعد جب مسند صدارت درس پر رونق افروز ہوئے اور درس و تدریس کا وہ سلسلہ جو

اپنے آبائی مکان (مدرسہ رحیمیہ مہندیان) میں شروع کیا، تو تشنگان علوم و معارف جوق در جوق آنے لگے اور زانوئے ادب تہ کرنے لگے۔ طلبۂ حدیث کی کثرت سے جگہ کی تنگی کی خبر تاجدار دہلی محمد شاہ رنگیلے کو ہوئی تو اس نے اندرون شہر ایک وسیع و عریض مکان شاہ صاحب کو واگذار کر دیا۔ جہاں آپ اپنے تلامذہ کے ہمراہ منتقل ہو گئے اس مدرسہ سے غدر تک علم و عرفان کے چشمے ابلتے رہے۔ غدر میں دہلی کے ساتھ یہ مکان بھی تباہ ہو گیا آج یہاں لوگوں کے مکانات بن گئے ہیں لیکن پھر بھی محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

(ماخوذ از واقعات دارالحکومت دہلی مؤلفہ مولوی بشیر الدین صاحب)

تقریباً بارہ سالوں تک آپ اس مسندِ درس و تدریس پر فائز رہے اور علومِ کتاب و سنت کے جواہر پارے بکھیرتے رہے۔ آپ کے فرزند ارجمند شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں، معمول والد ماجد آں بود کہ بعد ختم قرآن، درس حدیث می شد (ملفوظات عزیزیہ ص: ۷) یعنی والد ماجد کا یہ معمول تھا کہ وہ دورۂ قرآن کے بعد طلبہ کو دورۂ حدیث کراتے تھے۔

## تصنیف کتب حدیث:

شاہ صاحب کی ذات گرامی نے سب سے پہلے ہندوستان میں رائج زبانِ فارسی میں قرآن و حدیث کے تراجم کی بنیاد ڈالی جو اس ملک میں مسلمانوں کی علمی و دینی تاریخ کا سب سے مہتم بالشان کارنامہ تھا لیکن ظلمت پرست علماء نے ان پر کفر کے فتوے لگائے اور جہلاء نے مسجد فتح پوری کے دروازہ پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ اللہ کی نصرت شامل حال تھی کہ وہ دشمنوں کے نرغے سے بسلامت نکل گئے ورنہ اپنے جرم کا جرمانہ انہیں جان دے کر ادا کرنا پڑتا۔

آپ نے تدریس حدیث کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کا فارسی زبان میں ترجمہ اور موطا امام مالک کی عربی و فارسی زبانوں میں مختصر شرحیں لکھیں، احادیث نبویہ کی نشر و اشاعت، شروح و حواشی اور تراجم پر خصوصی توجہ مبذول کی، ان کا یہ عظیم اور نیک مقصد تھا کہ عربی اور اردو دونوں زبانوں کے جاننے والوں کا براہ راست تعلق سنت نبوی سے جوڑ دیا جائے تا کہ وہ صرف مشکوٰۃ المصابیح یا مشارقِ الانوار پر اکتفاء کے بجائے پوری کتب صحاح ستہ کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ اللہ

تعالیٰ برصغیر میں حریت فکر کے سب سے پہلے نقیب اور سنت کے مخلص خادم کو اپنے دامن رحمت میں جگہ عطا کرے۔ ذیل میں تصنیف و تالیف کے ذریعہ شاہ صاحب کی خدمات حدیث کی ایک جھلک پیش ہے جس سے یہ اندازہ ہوگا کہ اس مردِ حق آگاہ کی مساعی جمیلہ سے برصغیر کے مسلمان حقیقی معنوں میں سنت سے آشنا ہوئے اور ان کے اندر تقلید و جمود کی بجائے اتباع سنت کا جذبہ پیدا ہوا۔

ا۔ مصفّٰی شرح موطا، یہ فارسی زبان میں موطا امام مالک کی شرح ہے جس میں مجتہدانہ نکات بیان کئے گئے ہیں۔

۲۔ مسوّٰی شرح موطا، یہ عربی زبان میں موطا امام مالک کی شرح ہے جس میں غریب الفاظ کی وضاحت اور مختصراً اختلاف مذاہب کا تذکرہ ہے۔

اس کتاب موطا کی آپ کے نزدیک بڑی اہمیت تھی اس کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ "یہ علم حدیث کی اساس اور اصل ہے اور اس کے پڑھنے میں بہت سے فیوض ہیں اور ہمیں اس کا مسلسل سماع حاصل ہے" (وصیت نامہ ص: ۵۰، مطبوعہ شاہ ولی اللہ اکادیمی سندھ)۔

۳۔ شرح تراجم ابواب البخاری: امام بخاری کے تراجم کی اہمیت کے پیش نظر شاہ صاحب نے ان کی شرح عربی میں لکھی ہے، جو دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن سے ۱۳۲۳ھ میں طبع ہوئی ہے۔

ان کے علاوہ: اربعون حدیثا (چهل حديث) الفضل المبين في المسلسل من حديث النبي الأمين الإرشاد إلى مهمات الأسناد، الدر الثمين في مبشرات النبي الأمين، اتحاف النبيه فيما يحتاج اليه المحدث والفقيه، جیسی وقیع کتابیں تالیف فرمائی ہیں، اس ضمن میں اگر آپ کی شہرہ آفاق کتاب "حجۃ اللہ البالغہ کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ موضوع تشنہ رہ جائے گا، چونکہ فقہ حدیث میں یہ آپ کی بہترین کتاب ہے جس میں ایک فقیہ اپنے فقہی مسائل کو، ایک محدث اپنی مستند و صحیح احادیث کو اور ایک فلسفی اپنے فلسفیانہ دلائل کو اچھی طرح پالیتا ہے۔

اس کتاب عظیم سے متعلق یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ تیرہ سو برس میں آج تک اس فن میں اس پایہ کی کتاب نہیں لکھی گئی۔ نواب صدیق حسن خان رقم طراز ہیں کہ: "ایں کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست اما شرح احادیث بسیار دراں کردہ" (اتحاف النبلاء ص: ۱۷) "یہ کتاب گو علم

حدیث کے متعلق نہیں مگر اس میں بہت سی احادیث کی شرح کر دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی خدمات کا اعتراف بڑے بڑے مفکرین اور نقادان حدیث نے کیا ہے اور زمانہ ان خدمات جلیلہ کو فراموش نہیں کر سکتا۔ علامہ رشید رضا مصریؒ فرماتے ہیں: "ولو لا عناية أخواننا علماء الهند بعلوم الحديث فى هذا العصر لقضى عليها بالزوال من امصار الشرقه" (مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ: ص: ۲) یعنی اگر برادران علماء ہند کی توجہ علم حدیث کی جانب موجودہ دور میں نہ ہوتی تو اس علم کا مشرقی ممالک میں خاتمہ ہو جاتا۔ علامہ رشید کے اس قول سے متعلق علامہ مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں: کہ سب جانتے ہیں کہ یہ علماء ہند کی نہیں بلکہ براہ راست حضرت شاہ ولی اللہؒ کی خدمت کا اعتراف ہے اس لئے کہ ہندوستان میں حدیث کا جو کچھ بھی چرچا پچھلے دنوں ہوا سب کی انتہا بالآخر حضرت شاہ صاحب کے وجود باوجود پر ہوتی ہے۔

(تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ، علامہ گیلانی ص: ۲۸۷، مطبع نفیس اکیڈمی کراچی)

دراصل آپ کے اندر خدمت حدیث کا جذبہ اس خواب کے بعد پیدا ہوا جو آپ نے مدینہ منورہ کی اقامت کے دوران دیکھا تھا۔ جسے آپ نے درثمین میں تحریر فرمایا ہے: "كأن الحسن والحسين عليهما السلام نزلا فى بيتى و بيد الحسن رضى الله عنه قلم قد انكسر لسانه وبسط إلى يده ليعطينى وقال هذا قلم جدى رسول الله (ص) ثم قال حتى يصلحه الحسين فليس ما اصلحه الحسين كما لم يصلحه فاخذه الحسين رضى الله عنه واصلحه ثم ناولنيه فسررت به ثم جئ برداء مخطط فيه خط اخضر وخط أبيض فوضع بين يديهما رفعه حسين رضى الله عنه وقال هذا رداء جدى رسول الله ﷺ فوضعته على راسى تعظيما وحمدت الله تعالىٰ" یعنی گویا حسن وحسین میرے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں، اور حضرت حسن اپنے دست مبارک میں ایک قلم تھامے ہوئے ہیں جس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے، آپ نے مجھے وہ قلم عنایت کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور فرمایا کہ یہ میرے نانا رسول اللہ ﷺ کا قلم مبارک ہے، اور فرمایا حسین اسے درست کر دیتے ہیں تو دیتا ہوں پھر بولے یہ قلم جیسا حسین درست کر سکتے ہیں، دوسرا نہیں کر سکتا، پھر حضرت حسین نے وہ قلم لے لیا اور اسے درست فرما کر مجھے عنایت کر دیا ایک

دھاری سبز بنی ہوئی ہے اور دوسری سفید، یہ چادران دونوں حضرات کے سامنے رکھی گئی پھر حضرت حسین نے اسے اٹھایا اور فرمایا کہ یہ میرے نانا رسول اللہ ﷺ کی رداء مبارک ہے، پھر انہوں نے اسے مجھے اوڑھا دی۔ میں نے اسے تعظیما اپنے سر پر رکھ لیا اور اللہ کا شکرادا کیا۔

مختصر یہ کہ شاہ صاحب نے درس وتدریس تصنیف وتالیف کے ذریعہ ہندوستان میں علوم ومعارف کے دریا بہائے اور ایسا زبردست کام کیا کہ اس سے پیشتر بہت کم لوگوں کو اس کی توفیق ہوئی۔

پس میں حضرت شاہ صاحب سے عقیدت ومحبت کا دم بھرنے والے ارباب علم وفضل سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا ان کے اندر تصنیف وتالیف، درس وتدریس کے ذریعے حدیث کی نشرواشاعت کا وہ جذبۂ صادق موجود ہے جو شاہ صاحب کے سینے میں موجزن تھا؟

کیا انہوں نے اپنی زندگی میں سنتِ رسول کو رچا بسالیا ہے؟ اور کیا ان کے اندر عمل بالحدیث کی وہ اسپرٹ پیدا ہوگئی ہے جس کی طرف شاہ صاحب نے رہنمائی کی ہے۔؟ ہمیں اپنے اعمال کا جائزہ لینا ہے اور انوارِ رسالت سے لو لگانے کی کوشش کرنی ہے، وماتوفیقی إلا باللہ وعلیہ توکلت والیہ أنیب وصلی اللہ علیٰ نبیہ وسلم تسلیما کثیرا۔

# امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ

مولانا سید شاہ احمد حسین جعفری کریمی اصلاحی☆

حضرت مجدد الف ثانی کی وفات کے ۸۰ رسال بعد اور عالمگیر اورنگزیب کی وفات سے چار سال پہلے نواح دہلی میں شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے۔ ایک طرف ان کے زمانے اور ماحول کو اور دوسری طرف ان کے کام کو جب آدمی بالمقابل رکھ کر دیکھتا ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے کہ اس نازک عہد میں غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل یہ شخص کیسے پیدا ہو گیا۔

فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے تاریک زمانے میں نشو ونما پا کر ایسا مفکر اور عبقری منظر عام پر آتا ہے جو اپنے ماحول اور زمانے کی ساری بندشوں سے علاحدہ ہو کر سوچتا ہے۔ اندھی تقلید اور صدیوں کی قائم عصبیتوں کی قید و بند کو توڑ کر ہر مسئلہ زندگی پر محققانہ و مجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے اور ایسا ادب چھوڑ کر جاتا ہے جس کی زبان، انداز بیان، خیالات، نظریات، کسی چیز پر بھی ماحول کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی تصنیفات کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ کتابیں اس جگہ لکھی گئی تھیں جس کے گرد و پیش خود غرضی، قتل و غارت، ظلم و ستم، انتشار و بدامنی کا بازار گرم تھا۔

شاہ ولی اللہ، انسانی تاریخ کے ان مفکروں میں سے ہیں جو خیالات و نظریات کے الجھے ہوئے جنگل کو صاف کر کے فکر و نظر کی ایک سیدھی شاہراہ بناتے ہیں اور طبیعتوں میں حالات حاضرہ کے خلاف ایسی بے چینی اور تعمیر نو کا ایک ایسا دل آویز نقشہ پیدا کر کے چلے جاتے ہیں جس

☆ موجودہ سجادہ نشین خانقاہ کریمیہ سلون رائے بریلی

کی وجہ سے ناگزیر طور پر تخریب فاسد کے خلاف اور تعمیر صالح کے لئے ایک بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے مفکر اپنے نظریات کے مطابق خود کوئی تحریک اٹھاتے ہوں اور بگڑی ہوئی بھٹکتی دنیا کو اپنے ہاتھوں سے سنوارنے کے لئے میدان میں نکل آتے ہوں، تاریخ میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس طرز کے قائدین کا اصلی کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تنقید سے سیکڑوں برس کی قائم غلط فہمیوں کی اصلاح کر دیتے ہیں، ذہنوں میں اپنی جودت طبع سے نئی روشنی پیدا کر کے زندگی کے بگڑے ہوئے مگر پختہ سانچے کو توڑ دیتے ہیں اور کارخانہ ہستی کی دبی ہوئی پائیدار حقیقتوں کو نکال کر دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

یہ کام بجائے خود اتنا بڑا ہوتا ہے کہ انسان کو ان مشغولیتوں سے اتنی فرصت مشکل سے مل سکتی ہے کہ خود میدان میں آ کر تعمیر کا عملی کام بھی کر سکے، اگر چہ شاہ صاحب نے ایک جگہ تفہیمات الٰہیہ میں اشارہ کیا ہے کہ اگر موقعہ و محل کا اقتضاء ہوتا تو میں جنگ کر کے عملی اصلاح کرتا، مگر واقعہ یہی ہے کہ انہوں نے اس طرز کا کوئی کام نہیں کیا بلکہ خیالات وافکار پر مشتمل تصنیفات کے مسلسل بھاری کام نے شاہ صاحب کی ساری قوتوں کو اپنے اندر جذب کر رکھا تھا اور ان کو اس عظیم شغل سے اتنی مہلت بھی نہ ملتی تھی کہ اپنے قریب ترین ماحول کی طرف توجہ کر سکتے۔

شاہ ولی اللہؒ کی تصنیفات اور افاضات میں ان کے سیاسی خطوط کا ایک اہم مقام ہے جو انہوں نے اپنے دور کے افغان امراء کے نام لکھے تھے، ان خطوط میں شاہ صاحب نے افغان امراء کو ہندوستان کی ناگفتہ بہ حالات سے آگاہ کیا ہے اور ان کو اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری ادا کرنے نیز ہندوستان آنے کی دعوت دی ہے۔

## حالات زندگی:

احمد نام، اور ولی اللہ عرفیت ہے آپ کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم ابوالفیض ہیں۔ جو اپنے وقت کے جید علماء میں تھے، فتاوی عالمگیری کی تدوین میں آپ شریک تھے۔

شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب والد ماجد کی جانب سے حضرت عمر فاروقؓ تک اور والدہ کی جانب سے جناب موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہے آپ ۴؍شوال ۱۱۱۴ھ بروز چہار شنبہ دہلی میں پیدا ہوئے

آپ کی ولادت سے قبل آپ کے والد کو آپ کی پیدائش سے متعلق بشارت بھی ہوئی تھی (۱)۔

بچپن میں آپ شروع سے سادہ مزاج اور متین واقع ہوئے تھے۔ طبیعت میں نہایت ذہانت تھی۔ ۵ ربرس کی عمر میں مکتب میں قرآن مجید پڑھنے کے لئے بھیجے گئے، ساتویں سال قرآن مجید ختم کرلیا اس کے بعد آپ کے والد بزرگوار نے آپ کو نماز اور روزہ کی تاکید کی اور فارسی کی درسی کتب پڑھانی شروع کیں، ایک سال میں فارسی کی تعلیم مکمل کرانے کے بعد عربی کی ابتدائی کتب صرف ونحو آپ کو پڑھائی گئیں۔ دس برس کی عمر میں آپ کے والد ماجد نے علم نحو کی معرکۃ الآرا کتاب ''شرح ملا جامی'' آپ کو پڑھادی تھی اور عربی کتب کے مطالعہ کی استعداد آپ کے اندر پیدا کردی تھی۔ اس کے بعد معقولات اور فقہ وحدیث کی کتابوں کی طرف آپ کی توجہ ہوئی اور عمر کے پندرہویں سال تمام علوم متداولہ اور درسی علوم کی تکمیل کرلی۔ اس طرح چھوٹی سی عمر میں ارباب علم وفضل کے طبقہ میں آپ کا شمار ہونے لگا۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیم اکثر اپنے والد بزرگوار کے پاس ہوئی، ایک جگہ آپ نے خود فرمایا ہے ''علم حدیث میں مشکوۃ شریف تمام وکمال پڑھی لیکن چند روزہ علالت کی وجہ سے آخر حصہ نہ پڑھ سکا۔ صحیح بخاری شروع سے کتاب الطہارۃ تک پڑھی، شمائل ترمذی اول سے آخر تک، تفسیر بیضاوی اور تفسیر مدارک التنزیل کے کچھ حصے باقاعدہ پڑھے اور باقی حصوں کا خود مطالعہ کیا اس کے علاوہ کامل غور وفکر اور مختلف تفاسیر کے مطالعہ کے ساتھ والد ماجد کے درس قرآن میں حاضری کی توفیق ملی اور اس طرح کئی بار میں نے متن قرآن پڑھا اور میرے حق میں ''فتح عظیم'' کا باعث ہوا۔

شاہ صاحب کی عمر جب ۱۴ رسال کی ہوئی تو شادی کی صورت پیدا ہوگئی۔ آپ کے والد بزرگوار نے اس معاملے میں انتہائی عجلت سے کام لیا۔ سسرال والوں نے سامان شادی تیار نہ ہونے کا عذر کیا لیکن شیخ کے اصرار پر سسرال کے لوگ راضی ہوگئے اور اسی سال شادی ہوگئی شادی کی عجلت کی یہ حکمت ومصلحت بعد میں ظاہر ہوئی، چند روز بعد شاہ ولی اللہ کی خوشدامن اور ان کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔

---

(۱) تذکرہ شاہ ولی اللہ از مولانا مناظر احسن گیلانی۔

شادی کے ایک سال بعد پندرہ سال کی عمر میں آپ نے اپنے والد بزرگوار کے ہاتھ پر بیعت کی۔ انہوں نے آپ کو علوم باطنی کی طرف توجہ دلائی۔ آپ ان کی زیر نگرانی اشغال صوفیہ میں مصروف رہے، اسی دوران شاہ ولی اللہ صاحب نے بیضاوی شریف پڑھ کر نصاب تعلیم کو مکمل کرلیا، اسی خوشی میں شیخ عبدالرحیم صاحب نے بڑے پیمانے پر خواص وعوام کی شاندار دعوت کی اور اپنے ہونہار فرزند کی دستار بندی کی رسم ادا کی۔

اس دو تین سال کے عرصے میں شاہ ولی اللہ صاحب نے اشغال صوفیہ سے بھی فراغت کرلی اور آپ کے والد ماجد نے آپ کو بیعت وارشاد کی اجازت وخلافت عطا کی۔

۱۱۳۱ھ میں شاہ صاحب کے والد بزرگوار کا انتقال ہوگیا اور آپ مسند درس وارشاد پر جلوہ افروز ہوئے۔

آپ کے علم وفضل اور کمالات ظاہری وباطنی کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا ہر طرف سے تشنگان علم ومعارف جوق در جوق آتے اور زانوئے ادب تہ کرتے اپنے والد کے بعد بھی تقریباً ۱۲ سال تک آپ نے کتب دینیہ اور مروجہ علوم پڑھائے، اس دوران آپ کو ہر علم وفن میں غور کرنے کا موقعہ ملا، اسی زمانہ میں آپ نے مذاہب اربعہ کی فقہ اور ان کے اصول کی کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور ان احادیث شریفہ کو بدقت نظر دیکھا جن سے یہ حضرات ائمہ اپنے اقوال ومذاہب کی سند لاتے ہیں اور اسی وقت سے فقہائے محدثین کا طریقہ آپ کے دلنشین ہوا۔

آپ کا یہ زمانہ نہایت استغراق اور محویت کا گزرا ہے، آپ نے نہایت تحقیق وکاوش سے کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور رات دن انتہائی انہماک واستغراق کے ساتھ کتب بینی میں مشغول رہے۔

یہ شوق علم وتحقیق اس قدر بڑھا کہ آپ کو حرمین شریفین جانے کا خیال پیدا ہوا جس قدر علم حدیث کی ضرورت آپ محسوس کرتے تھے وہ دہلی میں حاصل نہیں ہوسکتا تھا، اس تحصیل وتکمیل کے لئے آپ کو حجاز کا سفر اختیار کرنا ضروری تھا تاکہ وہاں کامل اساتذہ کی صحبت اور اعلیٰ علمی کتابوں کے مطالعہ سے اپنی بصیرت اور روحانیت میں اضافہ کریں۔

چنانچہ اسی ارادے کے تحت ۱۱۴۳ھ کے آخر میں آپ حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوئے،

اس زمانہ میں ذرائع نقل وحمل کی کمی اور راستوں کے غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے سفر بڑا مشکل ہوتا تھا لیکن آپ نے زیارت حرمین کے شوق وولولہ اور علم تحقیق کی لگن سے مجبور ہوکر ان مصائب وتکالیف کو اختیار کیا اور نہایت عزم کے ساتھ حجاز روانہ ہو گئے۔

سب سے پہلے آپ مکہ معظّمہ پہنچے اور اسی سال حج سے فارغ ہوکر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے، کم وبیش ایک سال تک عالم اسلامی کے مختلف علماء ومشائخ سے دلچسپ صحبتیں رہیں اور علوم ظاہر وباطن کا اکتساب کیا۔

قیام حرمین کے زمانے میں شاہ صاحب نے متعدد علماء ومشائخ سے کسب فیض کیا پہلی مرتبہ شاہ صاحب نے ہندوستان میں شیخ محمد افضل المعروف بہ حاجی سیالکوٹی سے حدیث شریف پڑھی تھی پھر مدینہ طیبہ میں شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے حدیث شریف پڑھ کر سند واجازت حاصل کی۔ شیخ ابوطاہر شاہ صاحب سے بے انتہا عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ "ولی اللہ الفاظ کی سند مجھ سے لیتے ہیں اور میں معنی کی سند اُن سے لیتا ہوں"۔

شیخ ابوطاہر کے علاوہ شاہ صاحب نے شیخ وفد اللہ بن شیخ سلیمان مغربی کی درسگاہ میں شرکت کی اور موطا امام مالک اول سے آخر تک سنائی اور اس کے بعد شیخ محمد بن محمد سلیمان مغربی کی تمام مرویات کی سند لی۔ شاہ صاحب مفتی مکہ شیخ تاج الدین حنفی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور صحیح بخاری کے علاوہ صحاح ستہ کے بعض مشکل مقامات کی بھی سماعت کی، ان کے علاوہ موطا امام مالک اور موطا امام محمد، کتاب الآثار امام محمد اور مسند دارمی کی بھی سماعت کی، شیخ تاج الدین نے خصوصیت کے ساتھ شاہ صاحب کو تحریری اجازت وسند حدیث عطا کی۔

ان کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنے اس مبارک سفر میں دیگر بڑے مشائخ ومحدثین سے بھی استفادہ کیا۔ مثلاً شیخ سناوی، شیخ عبداللہ بن سالم بصری، شیخ احمد قشاشی، شیخ ابوطاہر فقط علم ظاہر کے حامل نہ تھے بلکہ علوم اسرار وباطنہ میں بھی ان کا پایہ بلند تھا۔ شیخ موصوف نے تمام طرق صوفیہ کا خرقہ خلافت بھی اس مبارک سفر میں شاہ صاحب کو عطا کیا ہے۔ القصہ حرمین شریفین میں کامل ایک سال کے قیام کے دوران شاہ ولی اللہ صاحب نے علمی صحبتوں عمیق مطالعۂ کتب اور امداد غیبی سے حدیث وفقہ میں مجتہدانہ کمال حاصل کیا اور ۱۱۴۴ھ کے آخر میں دوبارہ حج کیا۔ ۱۱۴۵ھ

کے شروع میں وطن کی طرف واپس ہوئے اور ٹھیک چھ مہینے کے بعد ۱۴ رجب جمعہ کے دن دہلی پہنچے، شہر کے باشندوں اور علماء و فضلاء نے آپ کا خیر مقدم کیا۔

دہلی آنے کے بعد شاہ صاحب نے گردو پیش کے حالات کا جائزہ لیا اور اپنے عزائم و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سب سے پہلے یہ قدم اٹھایا کہ پرانی دلی میں اپنے والد کے ایک چھوٹے سے پرانے مکان میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور وہ مدرسہ رحیمیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ جب آپ کے علمی کمالات کا شہرہ بڑھا تو چند دنوں میں اطراف و اکناف سے طلبہ کشاں کشاں آنے لگے اور وہ جگہ تنگ ہوگئی۔ بادشاہ وقت محمد شاہ (رنگیلے) نے یہ کیفیت دیکھ کر شاہ صاحب کو بلایا اور شہر میں ایک عالیشان حویلی دیدی، یہاں آپ نے دارالحدیث کا افتتاح فرمایا اور پرانی جگہ غیر آباد ہوگئی۔ یہ نیا مدرسہ بڑا عالیشان اور خوبصورت تھا جو اب دارالعلوم بن گیا تھا۔ آپ بڑے جوش و شوق سے درس و تدریس کے مشاغل رکھتے دور دور سے طلبا یہاں آکر قرآن و حدیث کے درس میں شریک ہوتے اور کسب فیض کرتے۔ یہ دارالعلوم عرصہ دراز تک قائم رہا شاہ صاحب کے بعد آپ کے چاروں صاحبزادوں نے یہی مشغلۂ درس حدیث یہاں جاری رکھا اور ان کے بعد دیگر اہل حضرات نے یہ خدمت انجام دی بالآخر ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ میں مدرسہ تباہ ہوگیا۔

حرمین شریفین سے واپسی کے بعد اس درس و تدریس کے زمانے میں شاہ صاحب نے اپنے اوقات عزیز کو تین اہم مشاغل میں صرف کرنے کے لئے مخصوص کرلیا تھا (۱) صبح کی عبادات و اوراد و وظائف سے فارغ ہوکر دو پہر تک حدیث کا درس دینا (۲) علم حدیث کے اسرار و رموز اور علوم نبوت کے حقائق و معارف کے دقائق و حقائق اور معرفت و تصوف کے اسرار و غوامض پر بھی تقریر فرماتے اور سامعین کو مستفیض فرماتے، (۳) تیسرا نہایت اہم مشغلہ آپ کا یہ تھا کہ جو وقت ان دونوں مشاغل سے بچتا اس کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہونے دیتے، بلکہ کچھ نہ کچھ لکھتے اس کے بعد آپ نے ہر فن کے لئے ایک شخص تیار کرلیا تھا جس وقت کا جو طالب ہوتا اس کو اسی فن کے استاد کے سپرد فرمادیتے، یہ معلم حضرات آپ ہی کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے۔

آپ کی مصروفیت اور استغراق کا یہ عالم تھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب بیان کرتے

ہیں "آپ وقت اشراق کے بعد بیٹھتے تو دوپہر تک زانو نہ بدلتے"۔

شاہ صاحب کے زمانے میں تعلیمی حالت بہت فرسودہ اور خراب تھی۔ آپ نے قدیم طریقہ تعلیم کو بالکل بدل دیا اور اپنے والد بزرگوار کے طریق و نصاب تعلیم کو جاری فرمایا، اس کا مختصر حال یہ ہے کہ پہلے صرف و نحو کے تین چار رسائل و کتابیں حسب استعداد طالب علم کو حفظ کرا دیتے، ان کے بعد حکمت یا تاریخ کی کوئی عربی کتاب پڑھادی جاتی۔ اس طرح اس کے علم لغت میں اضافہ ہوجاتا، عربی زبان پر قدرت حاصل ہوجانے کے بعد موطا امام مالک کا درس دیا جاتا، قرآن مجید کا ترجمہ بغیر تفسیر پڑھایا جاتا اس کے بعد تفسیر جلالین پڑھائی جاتی اس سے فراغت کے بعد کتب حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم اور کتب فقہ، عقائد و سلوک اور دوسری کتب منطق و فلسفہ پڑھائی جاتیں۔ اس نصاب تعلیم سے طلباء کا ذہنی جمود اور غور و فکر کا تعطل ختم ہوگیا اب وہ اندھے مقلد ہونے کے بجائے محقق اور فقیہ محدث بن گئے۔ شاہ صاحب کے زمانے میں قرآن مجید کی طرف کوئی توجہ نہ دیتا تھا۔ لوگ اس کو ریشمی جزدانوں میں محفوظ رکھتے تھے تاکہ بوقت ضرورت فال لینے یا حلف لینے کے کام آئے۔ علمی زندگی میں اس سے کوئی استفادہ نہ کیا جاتا تھا۔ حرمین شریفین سے واپسی کے بعد آپ نے یہ صورت حال دیکھ کر قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کرنا شروع کیا، سلسلۂ درس وارشاد کے ساتھ ساتھ اس ترجمۂ قرآن مجید کا آغاز ۱۱۵۰ھ میں ہوا اور ۱۱۵۱ھ میں اس کی تکمیل ہوئی پھر ۱۱۵۶ھ میں اس ترجمہ کی تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔

شاہ ولی اللہ صاحب پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے ساڑھے گیارہ سو برس کے بعد سرزمین ہندوستان میں قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا اور اس کے بعد ترجمۂ قرآن کی بنیاد پڑی۔ آپ کی پیروی میں آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ رفیع الدین نے قرآن مجید کا لفظی ترجمہ اردو میں کیا اور دوسرے فرزند حضرت شاہ عبدالقادر نے بامحاورہ اردو ترجمہ موضح قرآن کے نام سے کیا۔ الغرض قرآن مجید کے ترجمہ کا باب سب سے پہلے آپ نے کھولا اور اگر غور کیا جائے تو امت مسلمہ پر آپ کا یہ احسان عظیم ہے ورنہ ہم لوگ ترجمۃ القرآن سے اب تک محروم رہتے لیکن اس زمانے کے علمائے سوء بجائے آپ کے ممنون احسان ہونے "اور ہمت افزائی کرنے" کے آپ کے مخالف بن گئے اور عوام میں آپ کے خلاف شورش برپا کردی حتی کہ ایک دن نماز عصر

کے وقت مسجد فتحپوری سے نکلتے ہوئے ان معاندین اسلام نے چند شرپسندوں کو ہمراہ لے کر آپ کو گھیر لیا اور آپ پر حملہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کی، بعد میں یہ مخالفت آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوتی گئی اور آج یہ کیفیت ہے کہ ہم اسی کارنمایاں پر آپ کو ہدیہ تحسین پیش کر رہے ہیں اور ہمارا یہ خیال ہے کہ اگر آپ نے صرف یہی خدمت انجام دی ہوتی تو یہ آپ کا نام زندہ رکھنے کے لئے بہت کافی تھی۔

شاہ صاحب کے زمانے میں ذہنی انحطاط و جمود اس قدر غالب آگیا تھا۔ کہ حدیث و قرآن کا ذوق بالکل فنا ہو گیا تھا۔ ان کی جگہ فقہائے متأخرین کے فتاوے و تفریعات نے لے لی تھی۔ ہر طرف ان کا ہی شور و غلغلہ تھا۔ کتاب و سنت کی طرف کسی کی نظر نہ تھی۔ مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ترغیبات و نصائح کا اثر زائل ہو چلا تھا اور وہی آزمائشی دور دوبارہ لوٹ آیا تھا جس سے ان دونوں سابق الذکر بزرگوں کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ شاہ صاحب نے یہ صورت حال دیکھ کر علم کے اصل سرچشمہ قرآن و حدیث کی طرف توجہ دلائی اور اجتہاد کی روح کو زندہ کیا، آپ کی انتھک کوشش اور مخلصانہ جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اس ملک ہندوستان میں قرآن و حدیث کا چرچا دیکھتے ہیں۔ اسی بارے میں علامہ رشید رضا مصری مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ میں فرماتے ہیں:
"اگر ہمارے بھائی ہند کے علماء کی توجہ اس زمانے میں علوم حدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو اس علم کے زوال اور فنا کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔" شاہ صاحب کے کارنامے مستقل افادی حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ کی تصانیف سے علماء کا ایک بڑا طبقہ آج تک استفادہ کرتا چلا آرہا ہے اور ملک کی دینی و علمی حالت کا سدھار بہت حد تک آپ کا مرہون منت ہے۔ اگر آپ نے اس وقت علم کی شمع روشن نہ کی ہوتی تو نہ معلوم اس وقت کس قدر جہالت و تاریکی ہوتی، آپ کی نکالی ہوئی نہریں اور علم کے روشن چراغ سے ہم لوگ فیض پا رہے ہیں۔ آپ نے اپنے عہد کے ذہین اور مفکر لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان کو اپنی تعلیمات اور ارشادات سے بہرہ اندوز کر کے اس قابل بنا دیا کہ وہ آئندہ کسی زمانے میں ان کے مشن کے مطابق ایک انقلاب برپا کر سکیں ان ذی عقل اور صاحب فہم تلامذہ نے آپ سے پورا استفادہ کیا اور کچھ عرصے بعد آپ کی نسل مبارک سے شاہ اسماعیل شہیدؒ اٹھے اور دین کی گمراہیوں کو مٹانے کی خاطر علم جہاد بلند کیا۔

آپ کی منزلت علمی کے بارے میں کچھ لکھنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ آپ اسلام کے ان جلیل القدر علماء میں سے ہیں جن کی شہرت وعظمت زمان ومکان کے حدود سے آگے بڑھ چکی ہے۔ آپ کا شمار عبقرئین اور نوابغہ میں ہوتا ہے۔ آپ جیسی عالی پایہ شخصیتیں اور یگانہ روزگار ہستیاں بہت کم وجود میں آتی ہیں۔ آپ کا دور زوال وانحطاط کا دور کہا جاتا ہے اور اس دور ظلمت میں ایسی وسیع النظر دقیقہ رس اور ژرف نگاہ ہستی کا وجود میں آنا ایک قابل حیرت امر ہے، آپ نے اپنے ماحول سے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ آپ کی ذہنی سطح اور آپ کے علوم ومعارف اپنے ہم عصر علماء کی سطح سے بہت بلند ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم اپنی کتاب ''اتحاف النبلا'' میں فرماتے ہیں ''اگر وجود او در صدر اول در زمانہ ماضی می بود امام الائمہ وتاج المجتہدین شمردہ می شود'' یعنی اگر آپ کا وجود گذشتہ زمانے میں صدر اول میں ہوتا تو آپ تمام مجتہدوں کے پیشوا اور مقتدا مانے جاتے بلکہ ان کے سرتاج بنائے جاتے اور امام الائمہ کا گرانقدر خطاب پاتے۔

شاہ صاحب کے علمی وذہنی کمالات واقعی اسی تعریف وتوصیف کے لائق ہیں اور آج بھی امت مسلمہ آپ کو حکیم الامت اور مجدد ملت کے القاب سے یاد کرتی ہے، آپ کے خارق عادت علمی کارناموں اور غیر معمولی ذہانت ودینی خدمات جلیلہ کو دیکھ کر آپ کے ہم عصر علماء وفضلاء نے بڑی قدر ومنزلت سے آپ کا ذکر کیا ہے۔ حضرت مرزا محمد مظہر جان جاناں فرماتے ہیں ''حضرت شاہ ولی اللہ محدث رحمۃ اللہ علیہ طریقہ جدیدہ بیان نمودہ اند، در تحقیق اسرارِ معارف وغوامض علوم طرز خاص دارند بایں ہمہ علوم وکمالات از علماء ربانی اند مثل ایشان در محققان طریقہ صوفیہ کہ جامع اندر علم ظاہر وباطن وعلم کہ بیان کردہ اند چند کس گذشتہ باشند''۔

آپ کے معاصر مولانا فخر الدین فخر جہاں نے اپنے رسالہ ''فخر الحسن'' میں آپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ''شیخ صاحب المقامات العالیہ والکرامات الجلیلۃ الشیخ ولی اللہ المحدث سلمہ اللہ تعالیٰ وابقاہ۔'' امیر شاہ خان نے امیر الروایات میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دار العلوم دیوبند کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے ہندوستان کے علاوہ دیگر اقطاع عرب وعجم میں شاہ صاحب کی مقبولیت ومنزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس بارے میں امیر شاہ خاں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں، کہ مولانا نانوتوی کا جہاز دوران سفر حج یمن کی کسی بندرگاہ پر رک گیا۔ مولانا کو کسی

کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اس شہر میں کوئی معمر بزرگ ہیں۔ جب ملاقات ہوئی تو مولانا ان کے علم سے بہت متاثر ہوئے اور مسند حدیث کی اجازت چاہی۔ محدث بزرگ نے پوچھا کہ تم کس کے شاگرد ہو؟ مولانا نے اپنا سلسلۂ تلمذ شاہ عبدالعزیز شاگرد و فرزند شاہ ولی اللہ تک بیان کیا تو بزرگ محدث نے کہا کہ میں ان کو جانتا ہوں میرے نزدیک تو شاہ ولی اللہ گویا شجر طوبیٰ ہیں جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں ہیں وہاں جنت نہیں ہے اس طرح جہاں شاہ ولی اللہ کا سلسلۂ تلمذ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں ان کا سلسلۂ تلمذ نہیں ہے وہاں جنت نہیں ہے۔

ان کے علاوہ مولانا محمد عاشق پھلتی، نے مقدمہ خیر کثیر میں اور صاحب ''سیر الاخیار'' نے شاہ صاحب کے یکتائے روزگار اور مجتہد عصر، منبع علوم و اسرار دین اور مخزن کمالات وراثت محمدیہ ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد مولانا محسن بخاری اپنی کتاب ''الیانع الجنی'' میں خود اپنی شہادت بیان کرتے ہیں کہ ''ان کے شیخ مولانا فضل حق قبلہ کے ہاتھ شاہ صاحب کی کتاب ازالۃ الخفاء کا ایک نسخہ کہیں سے لگا، مولانا اس کے مطالعہ کے بڑے خواہشمند تھے اور جب بھی موقع ملتا تو بکثرت اس کتاب کے مطالعہ میں مصروف رہتے۔ مولانا نے اس کتاب کو پڑھ کر سب کے سامنے فرمایا کہ جس شخص نے یہ کتاب تصنیف کی ہے وہ ایک بحر بیکراں ہے جس کے ساحل کا پتہ نہیں چلتا ہے''۔

شاہ ولی اللہ صاحب کا مسلک علماء کے درمیان عرصہ سے متنازعہ فیہ موضوع رہا ہے، بعض لوگ آپ کو حنفی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بعض لوگ اہل حدیث، بعض حضرات مقلد بتاتے ہیں، بعض غیر مقلد بیان کرتے ہیں ہر گروہ آپ کو اپنے زمرہ اور فرقہ میں شمار کرنے کی سعی کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود آپ کو اس تفریق اور عصبیت سے سخت نفرت تھی اور آپ تمام عمر اس لعنت کو مٹانے کی کوشش کرتے رہے لیکن تعجب ہے کہ لوگوں نے آپ کی شخصیت ہی کو بحث کا موضوع بنالیا آپ کا طریقہ دراصل مجتہدانہ تھا، کسی مسئلہ کو آپ تقلیدی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے بلکہ کتاب وسنت کی روشنی میں غور کرتے اور پھر حنفی فقہ اور دیگر مذاہب فقہ میں تحقیق کرتے، جب

ہر طرح سے اسے ٹھیک و درست پاتے تو قبول کر لیتے، ورنہ متروک قرار دیتے تھے، گویا ہر معاملہ پر آپ ایک محقق کی حقیقت سے نظر ڈالتے تھے، کسی خاص مذہب کی جانب داری اور دیگر مذاہب سے عناد رکھنا آپ کی روش کے خلاف تھا۔ کسی مسئلے کی تائید فرماتے تو دلائل کی بنا پر اور مخالفت کرتے تو بھی بر بنائے دلیل، اس تائید و مخالفت میں کوئی عصبیت اور جانب داری کارفرما نہ ہوتی، بہت سے مسائل میں آپ نے مسلک حنفی کی پیروی کی ہے اور بہت سے امور میں آپ نے دوسرے مذاہب کو ترجیح دی ہے اور دوسرے ائمہ کا مسلک اختیار کیا ہے، بہت سے مقامات پر آپ نے مذہب حنفی و مسلک اہل حدیث کو جمع کیا ہے، جس مسلک کو اقرب الی السنۃ اور صحیح تر پایا اسے اختیار کیا ہے اپنے مسلک کی توضیح کرتے ہوئے ایک جگہ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''میں مذاہب اربعہ مشہورہ میں بقدر امکان جمع کرتا ہوں اور صوم و صلوٰۃ وضوء، غسل و حج کے مسائل اس وضع پر واقع ہیں جسے تمام اہل مذاہب جانتے ہیں جب جمع و تطبیق غیر ممکن ہو جاتی ہے تو میں اس مذہب پر عمل کرتا ہوں جو دلیل کی بناء پر زیادہ قوی اور حدیث کی بنیاد پر صحیح ہے کیونکہ خدائے قدوس نے مجھے اس قدر علم عطا فرمایا ہے کہ میں ضعیف و قوی میں اچھی طرح فرق کر سکتا ہوں، اور فتوی دیتے وقت مستفتی کے حال کی رعایت بخوبی کر سکتا ہوں، ہر مقلد مذہب کو اس کے مسلک کے مطابق جواب دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے مذاہب مشہورہ کی معرفت عنایت فرمائی ہے۔ انفاس العارفین میں تحریر فرماتے ہیں: ''بیشتر امور میں مذہب حنفی کے مطابق عمل کرتا ہوں لیکن بعض امور کو حدیث اور وجدان کے ذریعہ پرکھ کر دیگر مذاہب کے مطابق سرانجام دیتا ہوں مثلاً قراۃ سورہ فاتحہ خلف الامام اور قرأۃ فاتحہ در جنازہ''۔

شاہ صاحب نہایت سادہ طبیعت اور منکسر المزاج تھے، ہر شخص سے نہایت محبت اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ خلوت و جلوت میں کبھی کسی کی برائی بیان نہ کرتے اور دشمن کے حق میں بھی دعائے خیر کرتے۔ مزاج میں نرمی و نفاست تھی لیکن ریا، نمود اور ظاہری شان و شوکت سے پرہیز فرماتے تھے۔ نہایت بلند ہمت فراخ حوصلہ اور جفاکش تھے، مشکلات اور مصائب کے مواقع پر نہایت صبر و سکون سے قائم رہتے اور پایۂ استقلال میں جنبش نہ آتی۔ اظہار حق کے سلسلے میں آپ کو مختلف طریقے سے ستایا گیا لیکن آپ کے استقلال اور استقامت میں کوئی کمی نہ آئی، آپ کے زمانے میں شہر دہلی فتنوں اور خانہ جنگیوں کا مرکز بن گیا تھا، ایک مرتبہ بدامنی بہت بڑھ گئی تو دہلی

کے شرفاء نے ہندو رسم کے مطابق ''جوہر'' کا ارادہ کرلیا تا کہ اپنی عزت وناموس کی حفاظت کی خاطر سب آگ میں جل مریں اور حالات سے نجات حاصل ہو لیکن شاہ صاحب نے کربلا کے واقعات یاد دلا کر صبر وعزیمت کی تلقین کی جس سے متاثر ہو کر دہلی کے باشندے اس قبیح ارادے سے باز رہے۔

شاہ صاحب کے آخری دور میں دہلی میں ایک متعصب اور غالی امیر نجف علی خان کا تسلط ہوگیا تھا، یہ مغل دربار کا آخری امیر تھا، اس نے بہت سے علماء کو دردناک سزائیں دیں، امیر الروایات میں تذکرہ ہے کہ ''نجف علی خاں نے شاہ ولی اللہ صاحب کے پہونچے اتروا کر ہاتھ بیکار کر دیئے تھے تا کہ وہ کوئی کتاب یا مضمون تحریر نہ کرسکیں۔

آپ کی عمر اکسٹھ سال سے زائد ہو چکی تھی، مرض الموت نے کچھ عرصے تک آپ کو علالت میں مبتلا رکھا اور ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ کو آسمان علم واجتہاد کا یہ آفتاب دہلی میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا اور اپنے پیچھے بے شمار ستارے روشن کر گیا، آپ کی تاریخ وفات کا مصرعہ ''او بود امام اعظم دین'' ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے پیچھے چار یادگار بیٹے چھوڑے، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی ان میں ہر ایک آسمان علم وفضل کا روشن ستارہ اور درخشاں چاند ہے:

نواب صدیق حسن خاں قنوجی ''اتحاف النبلاء'' میں فرماتے ہیں ''ہر یکے ازایشاں بے نظیر وقت وفرید دہر ووحید عصر در علم وعمل وعقل وفہم وقوت تقریر فصاحت تحریر وتقوی ودیانت وامانت ومراتب ولایت بودو ہم چنیں اولاد اولاد ایں سلسلہ از طلائے نایاب است''۔

شاہ صاحب کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، ملک کے اطراف سے صدہا طالب علم آتے اور آپ سے مستفید ہوتے تھے، حرمین شریفین سے بھی کئی حضرات آپ کے پاس علم وحکمت سیکھنے آئے تھے، آپ کے تلامذہ کی فہرست ملنا مشکل ہے لیکن چند ممتاز شاگردوں میں آپ کے چاروں صاحبزادوں کے علاوہ شاہ نور اللہ، مولانا جمال الدین، شاہ امین کشمیری اور شاہ ابوسعید کے نام آتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ عصر حاضر کے تمام علمائے ہند آپ کے معنوی شاگرد ہیں تو کسی طرح بے جا نہ ہوگا، ہندوستان کے اکثر مدارس میں حدیث شریف کی سند اجازت کی روایت آپ سے کی جاتی ہے۔

ایک مصنف کی حیثیت سے شاہ صاحب کا درجہ نہایت بلند ہے، آپ نے مروجہ قدیم طرز تحریر اور اسلوب نگارش کو وسعت بخشی اور لفظی قافیہ بندی اور بیجا ثقالت کی حد بندی سے آزاد کر دیا اور حکیمانہ خیالات اور علمی مضامین کو بطریقِ احسن سادہ، جامع انداز میں پیش کرنے کی خدمت انجام دی، زمانۂ قدیم میں سب سے پہلے علامہ ابن خلدون نے عربی نثر کو نامانوس اور پرشکوہ الفاظ کے طلسم سے آزاد کیا تھا اور مقدمہ لکھ کر سادہ اور سلیس عربی نثر کا نمونہ پیش کیا تھا، ابن خلدون کے بعد شاہ صاحب ایک ایسے مصنف کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جنہوں نے باوجود عجمی اور ہندوستانی ہونے کے عربی فصاحت و بلاغت کا بے نظیر نمونہ پیش کیا اور اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ابن خلدون کے اسلوب نگارش کو پیش کیا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں ''شاہ ولی اللہ پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جن کی عربی تصانیف خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ میں اہل زبان کی سی روانی و قدرت اور اہل عرب کی عربیت ہے اور وہ ان بے اعتدالیوں سے پاک ہیں جو عجمی علماء کی عربی تحریر میں پائی جاتی ہیں''۔

آپ کے اسلوب نگارش اور جداگانہ طرز تصنیف کے بارے میں مولانا مناظر احسن گیلانی اپنی کتاب ''تذکرۂ شاہ ولی اللہ'' میں فرماتے ہیں ''عربی زبان میں شاہ صاحب نے جتنی کتابیں لکھی ہیں ان میں ایک خاص قسم کی انشاء کی جوان کا مخصوص اسلوب ہے پوری پابندی کی ہے، شاہ صاحب پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اپنی عبارتوں میں جوامع الکلم النبی الخاتم ﷺ کے طرز گفتگو کی پیروی کی ہے۔ حتی الوسع وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے مدعا و مقصد کا اظہار ان ہی لغات اور ان ہی محاورات سے کریں جو لسان نبوت اور زبان رسالت سے خاص تعلق رکھتے ہیں''۔

آپ کی تحریر میں ایجاز، وسعت نظر، سلاست بیان، قوت انشاء، رفعتِ خیال و دقت نظر پوری طرح موجود ہے، اسی طرح آپ کی تقریر نہایت موثر ہوتی تھی، دینی مجالس اور علمی محفلوں میں آپ کی خوش بیانی اور لذتِ تقریر سامعین پر محویت کا عالم طاری کر دیتی تھی، آپ کی فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی کا اعتراف آپ کے عہد کے تمام علماء کو تھا۔

شاہ ولی اللہ ان چند ممتاز مصنفین میں سے ہیں جن کی تعداد مصنفین اسلام کی بے نظیر کثرت کے باوجود بہت کم ہے، دنیا کے کسی مذہب کی علمی تاریخ اتنا وسیع معمور اور قیمتی کتب خانہ نہیں پیش

کرسکتی ہے جتنا اسلام نے پیش کیا ہے، لیکن اس موقع پر ہمارے سامنے عظمت کا معیار تصانیف کی کثرت، موضوع کا تنوع، کتابوں کی ضخامت، تصانیف کی مقبولیت، مضامین کا اشکال اور پیچیدگی، خیالات میں تعمق اور فہم یا تشریح مطالب میں موشگافی، متن کا اختصار اور مطالب کی تلخیص میں سے کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ سب کمالات اپنی جگہ مسلم ہیں اور یہ تمام علمی خدمات اپنے اپنے زمانے میں لائق احترام ہیں لیکن تجدید و امامت کا مقام اس سے بلند ہے، ہر مصنف امام وقت اور مجدد فن نہیں ہوتا ہے، اس مقام کے لئے شرط ہے کہ مصنف نے کسی ایسے موضوع پر لکھا ہو جس سے اس وقت تک کا علمی کتب خانہ خالی ہو، نئے علمی نظریات تازہ خیالات اور جدید تحقیقات پیش کی ہوں، اس کے یہاں جودت فکر ہو، ذہن کا اجتہاد ہو اور مضامین و مطالب میں اصلیت اور اولیت ہو، اگر تنہا یہی شرط ہے تو علامہ ابن خلدون ایسے مصنف کی بہترین مثال ہیں، لیکن اگر "فکر ارجمند" کے ساتھ "دل دردمند" اور عقل کے ساتھ عشق کا اجتماع ہو جائے اور مصنف کا قلم نغمہ زن کی انگلی کی طرح رباب دل کے تاروں کے ساتھ کھیلنے لگے تو وہ صرف مصنف نہیں رہتا ہے بلکہ ایک اخلاقی اور دینی مصلح بھی بن جاتا ہے، امام غزالی کی احیاء العلوم اور تہافت الفلاسفہ میں یہ رنگ پایا جاتا ہے لیکن اگر علم واستدلال کے ساتھ کسی صحیح دینی تحریک و دعوت میں کسی اصلاحی جوش اور کسی صالح انقلاب کی خواہش شامل ہو جائے اور اس کی تحریروں اور تصنیفات میں سے کسی نئے دور کا آغاز اور کسی نئی تحریک کے ظہور کا سامان ہو تو وہ مجدد کہلانے کا مستحق ہوتا ہے، امام ابن تیمیہ اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی اس کی روشن مثال ہیں، ہمارے نزدیک شاہ ولی اللہ ان حضرات میں سے اکثر کمالات کے جامع ہیں، اسلام کے باکمال مصنفین کی جتنی مختصر فہرست بنائی جائے شاہ صاحب کے نام کے بغیر وہ فہرست نامکمل رہے گی اور ترتیب و مراتب کے لحاظ سے آپ کا نام اتنا پیچھے نہیں رہے گا جتنا تاریخ کے لحاظ سے آپ کا زمانہ پیچھے ہے، شاہ صاحب نے خود ایک شعر فرمایا ہے:

وانی وان کنت الاخیر زمانہ

لآتٍ بما لم تستطعہ الاوائل

## خصوصیات تصانیف:

اسلامی مسائل میں عقل ونقل کی تطبیق اور ان کی حکیمانہ توجیہہ وتشریح، بارہویں صدی کے عالم کے لئے بالکل نیا موضوع نہیں تھا۔ خود شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمے میں امام غزالی، خطابی اور شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کا نام لیا ہے جنہوں نے احکام شرع کے حکم ومصالح بیان کئے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان بزرگوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی حیثیت اشارات ونکات سے زیادہ نہیں ہے۔ اسلام کے پورے نظام شرعی کی حکیمانہ تشریح ہمیں شاہ صاحب سے پہلے کہیں نہیں ملتی ہے، اس اہتمام، وسعت اور جامعیت کے ساتھ اس موضوع پر ہمارے علم میں حجۃ اللہ البالغہ پہلی تصنیف ہے اور پھر اس کے اکثر ابواب ومضامین بالکل نئے ہیں اور فلسفۂ علم کلام، قرآن وحدیث تصوف اور ذاتی غور ومشاہدہ اور قوت استدلال کی آمیزش شاہ صاحب ہی کا حق ہے۔

اصول تفسیر پر کوئی چیز عام طور پر نہیں ملتی ہے، صرف چند اصول اور قواعد تفاسیر کے مقدمے میں یا اپنا طرز تصنیف بیان کرنے کے لئے بعض مصنفین چند سطروں میں لکھ دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کی کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر بھی اگرچہ مختصر ہے لیکن پوری کتاب سراسر نکات وکلیات پر مشتمل ہے اور درحقیقت ایک جلیل القدر عالم کی ایک قیمتی اور نادر بیاض ہے جس کو فہم قرآن کی مشکلات کا عملی تجربہ ہے اور اپنے وجدان اور اصابت رائے پر اعتماد بھی ہے۔ اس موقع پر مناسب ہوگا اگر ہم شاہ صاحب کے ایک خصوصی امتیاز کی طرف بھی اشارہ کردیں جس میں شاہ صاحب نہ صرف اپنے زمانے میں بلکہ ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ میں منفرد ہیں۔ وہ خصوصیت شاہ صاحب کی عربیت اور عربی زبان میں ان کی قدرت تحریر ہے۔

ہمارے ملک میں عربی کا صحیح اور اعلی ذوق بہت نایاب رہا ہے، اگر جستجو کی جائے تو میر غلام علی آزاد بلگرامی صاحب سبحۃ المرجان، سید مرتضی زبیدی صاحب تاج العروس، شیخ احمد شروانی صاحب نفحۃ الیمن جیسے مصنفین کو چھوڑ کر جن کی زندگی کا بڑا حصہ عرب فضلاء کی صحبت اور عرب ممالک میں گزرا ہے، ایسے مصنفین کا ملنا مشکل ہے جن کی عربی تحریر ادبی سقم سے پاک اور عربی

ذوق کے مطابق سلیس اور رواں ہو۔

ہمارے یہاں کے نصاب درس کی مخصوص ساخت اور ہندوستان میں عربی نظم کی نمونوں کے زیادتی اور خوبی کی وجہ سے ہندی علماء کی نظم ان کی عربی نثر سے کہیں بہتر ہے۔

شاہ ولی اللہ پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جن کی عربی تصانیف بالخصوص حجۃ اللہ البالغہ میں، اہل زبان کی سی روانی، قدرت اور ادبائے عرب کی سی عربیت ہے اور ان تمام بے اعتدالیوں سے پاک ہے جو عجمی علماء کی عربی تحریر میں پائی جاتی ہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ابن خلدون کے مقدمے کے بعد ہمیں اگر کوئی تصنیف دین وحکمت کے علوم پر مشتمل ملتی ہے تو اس طویل مدت میں صرف اسی ہندوستانی عالم کی شاہکار تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہے۔ حدیث وفقہ کے مضامین کو سلیس عربی زبان میں ادا کر دینا، ایک عالم کے لئے بڑا کمال نہیں ہے، لیکن حجۃ اللہ البالغہ کا مبحث ثالث جس میں ارتفاقات یعنی تدابیر نافعہ کے ابواب ہیں، اسی طرح دوسرے مباحث جن کے لئے شاہ صاحب کے سامنے کوئی دوسرا نمونہ نہیں تھا، صاحب تصنیف کی عظمت اور عبقریت کی دلیل ہیں۔

شاہ صاحب کی تصانیف بے شمار ہیں، بعض مورخین دوسو سے زائد بیان کرتے ہیں، مصنف حیات ولی نے ان کی تعداد اکاون بتائی ہے، ہم یہاں صرف ان کتابوں کا ذکر کریں گے جو طبع ہو کر مشرق سے مغرب تک مشہور ہو چکی ہیں۔

۱۔ فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن: یہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے اور تاریخ اسلام میں بہترین ترجمہ ہے آج تک اس کا مقابل کوئی ترجمہ نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی خصوصیات پر شاہ صاحب نے خود مقدمہ فتح القرآن میں روشنی ڈالی ہے۔ ترجمے کے ساتھ جابجا فوائد بھی ہیں، جو نہایت مختصر ہیں لیکن جامعیت اور مشکلات کی گرہ کشائی میں بے مثل ہیں۔ یہ ترجمہ ہندوستان میں متعدد بار شائع ہو چکا ہے اور بڑا مقبول ہے۔

۲۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر: فارسی زبان میں اصول تفسیر پر مختصر اور جامع رسالہ ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے قرآن مجید کے علوم خمسہ، تاویل حروف مقطعات، انبیاء کے واقعات وقصص کے اسرار اور ناسخ ومنسوخ کے اصول پر نہایت مفید اور بصیرت افروز

مقالات لکھے ہیں، رسالہ کے اردو اور عربی زبان میں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

۳۔ فتح الخبیر لابد من حفظہ فی علم التفسیر: یہ عربی زبان میں آیات قرآنی کی تمام ماثورہ تفاسیر کا جو آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام سے منقول ہیں ایک مختصر اور جامع نمونہ ہے، اس میں شرح غریب القرآن اور اسباب نزول آیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، یہ کتاب الفوز الکبیر کے ساتھ طبع ہو چکی ہے۔

۴۔ تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء: انبیاء علیہم السلام کے مکذبین و منکرین پر جو غالب آئے اور رسولوں کے ذریعہ جن معجزات کا ظہور ہوا، کتاب میں ان کو فطرت کے مطابق ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ مخفی اسباب مادّیہ کے باعث ظہور میں آئے ہیں ان معجزات کا خارق عادت ہونا محض ہماری کوتاہ نظری کی بنا پر ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

۵۔ المسوی من احادیث الموطا: عربی زبان میں موطا امام مالک کی شرح ہے، اس میں آپ نے احادیث کو اپنے مذاق کے موافق نئی ترتیب سے مدون کیا ہے اور شرح میں وہ اسلوب اختیار کیا ہے، جو طالب علم کے لئے سہل اور دلنشین ہے، حدیث سے مستنبط مسائل اور امام مالک پر دیگر ائمہ کے مناسب تعقبات بھی نہایت لطیف اشاروں میں بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب گویا آپ کے اختیار کردہ طریقۂ درس حدیث کا نمونہ ہے، ہندوستان میں المصفٰی کے ساتھ طبع ہو چکی ہے۔ مکہ معظمہ سے بھی شائع ہوئی ہے۔

۶۔ المصفٰی شرح موطا: موطا امام مالک کی فارسی شرح ہے، اس میں آپ نے احادیث اور آثار کو الگ کر دیا ہے اور اقوال امام مالک کو مناسب طریقے سے بیان کیا ہے۔ دیگر فقہاء کے اقوال بھی نقل کئے ہیں اور احادیث پر مجتہدانہ طریق سے بحث کی ہے۔

۷۔ شرح تراجم ابواب بخاری: اس رسالے میں آپ نے امام بخاری کے قائم کردہ عنوانات ابواب کی تشریح اور توجیہہ اس طرح بیان کی ہے کہ ان کے ذیل میں دی ہوئی احادیث سے ابواب کی مناسبت صحیح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے اور کوئی اغلاق باقی نہیں رہتا ہے۔ یہ رسالہ عربی زبان میں ہے اور دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع

ہو چکا ہے۔ پاکستان میں صحیح بخاری کے ساتھ یہ رسالہ شائع ہوا ہے۔

۸۔ حجۃ اللہ البالغہ: یہ کتاب بجا طور پر آپ کا تصنیفی شاہکار کہی جا سکتی ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اس کے متعلق فرماتے ہیں: ''شاہ صاحب کی مایۂ ناز تصنیف آنحضرت ﷺ کے ان معجزات میں سے ہے جو آنحضرت کی وفات کے بعد آپ کے امتیوں کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے ہیں اور جن سے اپنے وقت میں رسول اللہ ﷺ کا اعجاز نمایاں اور اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہوئی ہے۔'' یہ کتاب دراصل اسی تعریف کے لائق ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے تعلیمات اسلام کو فطرت کے مطابق اور احکام دینیہ کو عدل پر مبنی قرار دیا ہے۔ ہر حکم الٰہی اور امر شریعت کے اسرار و مصالح نہایت بلیغ اور مدلل انداز میں بیان کیے ہیں جس سے ایک طرف تو متشککین اور دین میں تردد رکھنے والے حضرات کے شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے اور دوسری جانب معترضین کے احکام اسلام پر اعتراضات کا منہ توڑ جواب مل جاتا ہے، شاہ صاحب کو یقین تھا کہ کچھ عرصہ بعد عقلیت پرستی کا دور آنے والا ہے جس میں احکام شریعت کے متعلق اوہام و شکوک کی گرم بازاری ہوگی، اس خطرہ کو آپ نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا اور اس کے سد باب میں یہ بے نظیر کتاب لکھی۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے مابعد الطبیعی مسائل سے ابتدا کی ہے اور فلسفہ اسلام کو ایک مرتب شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، قدرت کے قانون مکافات کو حکمت کے انداز پر بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ارتفاقات یعنی تدابیر نافعہ کے زیر عنوان اقتصادیات اور سیاسیات کے مسائل پر بحث کی ہے، پھر اخلاقیات کا موضوع اٹھایا ہے، اور انسانی سعادت پر بحث کی ہے۔ اس کے بعد نظام شریعت کے عقائد و ارکان پر تبصرہ کرتے ہوئے، ان کے اسرار و حکم بیان فرمائے ہیں اور معاصی اور ان کے اسباب و علل پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کے بعد تاریخ مذاہب عالم پر تبصرہ کیا ہے اور تشریع اور قانون سازی کے بارے میں نہایت مفید نکات بیان کیے ہیں۔ آخر میں آپ نے حدیث سے استنباط کا صحیح طریقہ بتایا ہے اور فقہ سے متعلق بیش بہا معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ دوسری جلد میں آپ نے فقہی طرز پر

ابواب قائم کر کے شریعت کے جملہ احکام پر مفصل تبصرہ کیا ہے اور ہر حکم کی علت غائی، اس کی حکمت اور فوائد و مصالح بیان کئے ہیں، جس کی بناء پر کتاب کا پڑھنے والا ان احکام دینیہ پر علی وجہ البصیرت ایمان لے آتا ہے اور اس کے تمام شکوک و شبہات زائل ہو جاتے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں قنوجی "اتحاف النبلاء" میں تحریر فرماتے ہیں:

"ایں کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست، اما شرح احادیث بسیار دراں کردہ و حکم و اسرار آن بیان نمودہ تا آنکہ در فن خود غیر مسبوق علیہ واقع شدہ و مثل آن دریں دوازہ صد سال ہجری، ہیچ یکے از علمائے عرب و عجم تصنیفے موجود نیامدہ" یہ کتاب متعدد بار ہندوستان اور مصر سے شائع ہو چکی ہے، اس کے اردو ترجمے بھی چھپ چکے ہیں۔

۹۔ البدور البازغہ: اس دقیق کتاب میں فلسفہ و تصوف کے حقائق و معارف بیان کئے ہیں، بعض ابواب "حجۃ اللہ البالغہ" کے مضامین کا خلاصہ ہیں، یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور چھپ چکی ہے۔

۱۰۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء: حجۃ اللہ البالغہ کے بعد شاہ صاحب کی یہ دوسری معرکۃ الآراء تصنیف ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے خلفائے راشدین کی خلافت، قرآن مجید، احادیث، تفسیر اور تاریخ سے ثابت کی ہے اور شیعہ و سنی کے باہمی اختلافات کو نہایت عدل و انصاف سے حل کیا ہے جس سے جانبین کی غلط فہمیاں اور عصبیتیں دور ہو جاتی ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے ثبوت کے ساتھ ساتھ اس میں سیرت، تاریخ اور سیاست و خلافت کے بارے میں دیگر بیش بہا نکات بھی بیان فرمائے ہیں، مثلاً اسلام میں صحابہ کرام کا درجہ و مقام، ان کے حقوق و فضائل، خلافت خاصہ کی تعریف، اس کے اوصاف اور نبیؐ، خلیفہ، محدث اور صدیق کی تعریف، حضرت عمر فاروق کے شاندار کارنامے اور قابل قدر دینی خدمات، تاریخ اسلام کے مختلف ادوار اور ان پر ہر پہلو سے تبصرہ، اسلام کا تمدنی اور عمرانی نظام اور اصول سیاست وغیرہ پر سیر حاصل بحثیں۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی فرماتے ہیں: "اس موضوع پر پورے اسلامی لٹریچر میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں ہے، یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور شائع ہو چکی ہے"۔

۱۱۔ تفہیمات الٰہیہ: یہ کتاب بقول مولانا منظور نعمانی ''ولی اللّٰہی کشکول'' ہے، اس میں زیادہ تر تصوف وسلوک سے متعلق مقالات ہیں اور علوم شریعت کے بارے میں بھی مضامین ملتے ہیں، بعض مقامات پر معاشرے کے ہر طبقے کے افراد کو مخاطب کر کے اصلاح پر ابھارا ہے، کہیں ماوراء الطبیعی فلسفے سے متعلق باتیں کہی ہیں۔ کتاب کا کچھ حصہ عربی میں اور کچھ فارسی میں ہے۔ پوری کتاب دو جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

۱۲۔ عربی زبان میں آپ کے سوز وگداز سے معمور نعتیہ قصائد کا ایک مجموعہ دیوان ''اطیب النغم'' ہے اس مجموعے کو شاہ عبدالعزیز صاحب نے مرتب کیا ہے۔

۱۳۔ الخیر الکثیر: تصوف کے اسرار وحقائق پر مشتمل عربی زبان میں تصنیف ہے جو چھپ چکی ہے، اور اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔

۱۴۔ فیوض الحرمین: قیام حرمین کے دوران، فیوض وبرکات کا تذکرہ عربی زبان میں ہے، اردو ترجمہ کے ساتھ چھپ چکی ہے۔

۱۵۔ الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف: احکام شریعت کے متعلق صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین کے اختلافات کے اسباب کا تذکرہ ہے۔ ہر گروہ کی افراط وتفریط پر تنقید کی ہے، عربی زبان میں ہے، مصر سے بھی شائع ہوئی اور ہندوستان میں اردو ترجمہ کے ساتھ چھپ چکی ہے۔

۱۶۔ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید: عربی زبان میں آپ نے اجتہاد اور تقلید کے مسئلے پر نہایت محققانہ بحث کی ہے، اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

۱۷۔ انفاس العارفین: فارسی زبان میں شاہ صاحب نے اپنے بزرگوں کے حالات درج کیے ہیں۔

۱۸۔ البلاغ المبین یا تحفۃ الموحدین: دعوت توحید اور ردّ شرک میں رسالہ ہے۔ فارسی زبان میں یہ رسالہ لکھا تھا، اردو ترجمہ کے ساتھ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۱۹۔ القول الجمیل: تصوف کے اذکار و وظائف اور چاروں سلاسل کا تذکرہ ہے۔ کتاب عربی میں ہے، اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

۲۰۔ قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین: تفضیل شیخین کے متعلق فارسی زبان میں بہت عمدہ رسالہ ہے، چھپ چکا ہے۔

۲۱۔ سرور المحزون فی ترجمۃ نور العیون: ابن سید الناسؒ نے سیرت نبویہؐ پر ایک ضخیم کتاب ''عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر'' لکھی تھی پھر اس کا خلاصہ ''نور العیون فی سیر الامین والمامون'' لکھا تھا۔ شاہ صاحب نے بعض بزرگوں کے اصرار پر فارسی زبان میں سرور المحزون کے نام سے اس کا ترجمہ کیا جو کانپور اور حیدرآباد سے چھپ چکا ہے۔

۲۲۔ چہل حدیث: اسلام کے بنیادی اصول پر احادیث جمع کی ہیں، اردو ترجمہ کے ساتھ کئی بار چھپ چکی ہیں، اس کے علاوہ مکتوبات بھی ہیں۔

# تحریک احیائے دین اور شاہ ولی اللہ

ڈاکٹر شمس بدایونی ندوی ☆

عہد شاہ ولی اللہ میں تحریک احیائے دین کے علمی و فکری رجحانات کو سمجھنے کے لئے اس کے تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ناگزیر سا معلوم ہوتا ہے۔

اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مغلیہ سلطنت کے زوال کے محرکات و آثار جمع ہونا شروع ہو گئے تھے، جو ڈیڑھ صدی کی مدت میں بتدریج ۱۸۵۷ء کو مغلیہ حکومت کے خاتمہ پر منتج ہوئے۔ یہ تنہا حکومت کا خاتمہ نہ تھا بلکہ مستحکم اسلامی روایات، مغل تہذیب اور مضبوط اقدار کا خاتمہ تھا۔ ڈیڑھ صدی کی یہ مدت گیارہ مغل بادشاہوں کی تعیش پسندی، سیاسی اتھل پتھل، اندرونی سازشوں، بیرونی یلغاروں، اقتصادی تباہ حالیوں، اخلاقی انتشار و خلفشار، تہذیبی زوال کے مناظر اپنے جلو میں رکھتی ہے، اور مورخ کو یہ لکھنے پر مجبور کرتی ہے کہ حرکت و قوت سے محروم یہ صدی زوال پرستی کو ایک مسلک کے طور پر قبول کئے ہوئے ہے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ سیاسی انحطاط و انتشار کے باوجود مسلمانوں کی علمی زندگی مائل بہ زوال نظر نہیں آتی۔ عمومی سوچ اگرچہ تقلیدی، روایتی یا رسمی رہی لیکن خواص کے طبقہ میں ذہنی بالیدگی اور فکری توانائی بنی رہی۔ ان کا علمی مذاق اور مسابقت کی روش متاثر نہیں ہوئی۔ اس عہد میں بھی علم کے دو مرکز دہلی و لکھنؤ (خانوادۂ ولی اللہی۔ علمائے فرنگی محل) اصلاحِ دین اور اصلاح معاشرت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ بعض دوسرے شہر مدراس، کلکتہ، خیرآباد، بدایوں وغیرہ علمی شغف و انہاک کے نمونے پیش کر رہے تھے۔ اجتماعی طور پر کہیں کہیں انفرادی سطح پر شہر شہر، قریہ قریہ تعلیم و تعلم، تصنیف

☆ بریلی۔

وتالیف، رشد وہدایت، شعر وادب کے مشاغل کا سلسلہ جاری تھا۔

دراصل یہ عہد مسلمانوں کی ذہنی تاریخ میں اصلاح مذہب وتہذیب اور علوم کی نشأۃِ ثانیہ کا عہد ہے۔ قدامت پرستی، روایت پسندی، تقلیدی کوچہ گردی نے آزادی فکر اور اجتہاد کا جو دروازہ بند کر دیا تھا، وہ وا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ علماء دین کے احیا کے تصور کے ساتھ علم کو محفوظ کر رہے تھے۔ نئی فکر کی نئی روشوں کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ اس عہد میں عوام وخواص سبھی نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان کی مذہبی، معاشرتی، تمدنی، تعلیمی ترقی کا انحصار تمام تر ان کی اپنی کوشش اور جدوجہد پر منحصر ہے۔ یہ احساس آنے والے فکری انقلاب اور علمی جدوجہد کے لئے راہ ہموار کر رہا تھا۔

سیاسی زوال اور اخلاقی بحران کا جو سلسلہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد شروع ہوا تھا، اُس کو سب سے پہلے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء) نے محسوس کیا اور فکری علاج وتشخیص مرض کی تدبیر تلاش کی۔ ان کی چشم بینا، بیدار مغز، حساس قلب، مضطرب طبیعت نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ شہنشاہیت کے زیر اثر پروردہ نظام اور اس کی خامیوں کو اس وقت تک درست نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کے مقابل ایک ہمہ گیر اور مکمل نظام (جو زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہو) پیش نہ کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اصلاحی نظریات مرتب کئے جو اقتصادی، معاشی، سیاسی، مذہبی، فوجی اور معاشرتی معاملاتِ زندگی میں اثر ونفوذ حاصل کر کے ایک بہتر نصب العین کی راہ ہموار کریں۔ یہ ایک ذہنی وفکری انقلاب کی کوشش تھی اور بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (۱):

> ''جس میں اصلاح کے ساتھ ساتھ علمی وفکری رنگ بھی غالب تھا۔ اس کے حدود میں تدریس وتعلیم، تصنیف وتالیف تربیت واصلاح، معقول ومنقول کے درمیان تطبیق، مذاہب اربعہ کے درمیان اعتدال کی روش، اسرارِ شریعت کی تشریح اور مقاصدِ شریعت کی توضیح، علوم اسلامیہ میں جامد اور کورانہ تقلید سے محتاط انداز میں گریز اور مجتہدانہ فکر ونظر میں ملت اسلامیہ کے تشخص وتحفظ کی تدبیریں، ہندوستان میں اسلام اور اسلامی اقتدار کی بقا کی کوشش اور سب سے اہم آنے والے عصر کے عقلی رجحان کی رعایت رکھتے ہوئے ان تمام مسائل ونظریات کو طبقۂ علماء میں منتقل کرنے کی عملی جدوجہد شامل تھیں''۔

شاہ صاحب کی زندگی میں ان کے نظریات پریس کی عدم موجودگی کے سبب وقف عام نہ

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت جلد ۵ (لکھنؤ ۱۹۸۴ء) ص ۲۰۔

ہو سکے لیکن انہوں نے تربیت و تدریس کے جو مرکز (مدرسہ رحیمیہ دہلی، تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی) قائم کئے تھے۔ ان کے ذریعہ یہ نظریات دھیرے دھیرے ملک کے طول و عرض میں پھیلتے چلے گئے۔ شاہ صاحب کے جانشین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۷۴۶۔۱۸۲۴) نے ان نظریات اور اجتہادی فکر کو عملی طور پر نافذ کرنے کی کوشش کی۔ ان کا خانوادہ اس ہمہ گیر انقلاب کے تصور کو ملک کا ایک عام جذبہ بنانے میں کامیاب ہوا۔

یہ تحریک جو احیائے دین کے تصور کے ساتھ نظریاتی اور عملی صورت میں طبقۂ علما کو اپنے دور کی رعایت رکھتے ہوئے علم اور عمل کے ساتھ ملوکیت کے مقابل کھڑا کرنے میں کامیاب ہوئی اور فوج منظم نہ کرتے ہوئے بھی رضا کاروں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ ذہنی و فکری و علمی انقلاب کا موجب بنی۔ غالبؔ کے ماحول کی دہلی اور اس کے اطراف پر اس کا اثر کم و بیش نصف صدی رہا۔ اس تحریک کے اصلاحی و انقلابی حدود کی اگر درجہ بندی کی جائے تو اس کے پانچ محاذ قرار دیئے جا سکتے ہیں:

## پہلا ذہنی و فکری محاذ:

جو ایرانی اثرات، خواہ وہ علمی، ادبی، ثقافتی و تہذیبی فکر کے لحاظ سے ہوں یا صوفیانہ مسلک و طریق، مذہبی شدت کے لحاظ سے، ان کا دفاع اور صحت و اصلاح اس کا اہم پہلو تھا۔

## دوسرا فوجی محاذ:

جو جہاد کے اصول پر مبنی تھا جس کے تحت کسی مقدس اصول یا عظیم نصب العین کے لئے انسان اپنے آپ کو فنا کر دے۔ اس محاذ کو شاہ اسمٰعیل شہید (ف ۱۸۳۰ء) اور سید احمد شہید (ف ۱۸۳۰ء) کی سرکردگی میں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر اس کے اثرات انگریزوں سے نفرت اور جنگ کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ جس کا ثبوت ۱۸۵۷ء کی ناکام جدوجہد آزادی کے بعد بھی ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔

## تیسرا سیاسی محاذ:

جو اسلامی اصولوں پر ایک مستحکم حکومت کی راہ ہموار کرنا چاہتا تھا۔ پچھلی سیاسی تبدیلیوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر اور آنے والے زمانے کے لئے ممکنہ تدبیریں کرکے۔

## چوتھا اقتصادی محاذ:

جس کا عملاً نفاذ تو نہیں ہو سکا لیکن جو اسلام کے اقتصادی نظام کی تشریح و تعبیر کرتا تھا۔ بعد کو مارکس اور انجلز کے غیر مذہبی نظریہ سیاست میں ان کی جھلک نظر آتی ہیں۔

## پانچواں معاشرتی محاذ:

جس کا شیوع شاہ اسمٰعیل شہید کی کتب اور سید احمد شہید کی روحانی زندگی سے ہوا۔ گو اس کا سلسلۂ استناد شاہ ولی اللہ دہلوی سے ملتا ہے۔ لیکن یہ شاہ عبدالعزیز (ف ۱۸۲۴ء) شاہ محمد اسحٰق (ف ۱۸۴۶ء) کے واسطوں سے مولانا محمد قاسم نانوتوی (ف ۱۸۸۰ء) تک پہنچتا ہے۔ ان کی علمی و عملی کوششوں کے ذریعے مسلمانوں میں ایک خاص علمی و فکری مسلک کی بنیاد پڑی جو مسلک دیوبند کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ محاذ چونکہ مقامی رسوم و بدعات کے زیر اثر مروج ہونے والی شخصی تقلید، ظاہر پرستی، رجعت پسندی کے خلاف مستقل اعلانِ جنگ کی صورت رکھتا تھا لہٰذا علمائے وقت اور ان کے متبعین دو دھڑوں میں بٹ گئے، ایک دھڑا شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کی تحریزوں اور نظریات کا علمبردار تھا اور دوسرا ان کا مخالف۔

اس مخالف گروہ کو مولانا فضل حق خیر آبادی (۱۷۹۷، ۱۸۶۱ء) کے اُس مختصر سے رسالے "امتناعِ نظیر" سے علمی اختلاف کا جواز مل گیا جس میں تقویۃ الایمان (شاہ اسماعیل شہید) کی عبارت پر اعتراض کے بعد مسئلہ امکان و امتناعِ نظیر، کی بحث کا آغاز ہوا۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کے رسالے کے شائع ہوتے ہی مسئلہ تحریری و تقریری مناظرے کی صورت اختیار

کر گیا۔ غالبؔ کے عہد کی دلی میں یہ بحث بہت دنوں گرم رہی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تقویۃ الایمان اور اس کے مصنف کے حوالے سے تقریباً ایک صدی گرما گرم بحثیں رہی اور موافق ومخالف رسائل کا سلسلہ جاری رہا۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا(۱)۔

"اس عام علمی چہل پہل اور ادبی چہل پہل کے علاوہ ایک تحریک جس سے اس وقت دہلی کے گلی کوچے گونج رہے تھے، حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل کی تحریک اصلاح تھی۔ جسے سرسید احمد نے لوتھر کی تحریک ریفارمیشن کے مشابہ قرار دیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی میں تمام اہل الرائے اس تحریک کے طرف دار تھے یا مخالف۔ شاہ نصیر دہلوی نے جن کی مضحکہ خیز خوش اعتقادی کی کئی مثالیں آزادؔ نے آبِ حیات میں درج کی ہیں۔ اس تحریک کے رہنماؤں کے خلاف نظمیں لکھیں، برخلاف اس کے مشہور شاعر مومنؔ، مولانا سید احمد بریلوی کے مرید تھے، اور کلیاتِ مومنؔ کے کئی اشعار مولانا کی تعریف میں ہیں۔ غیر مقلدین کے سب سے نامور حامی شاہ اسماعیل اور سرسید احمد خاں تھے اور مقلدین کے پرجوش ترجمان مولوی فضل حق تھے"۔

اب رہے غالبؔ تو ان کا نقطۂ نظر بقول حالیؔ اسماعیل شہید سے ملتا تھا۔ یعنی وہ غیر مقلد اور توحیدِ خالص کے حامی تھے۔ جس طرح شاہ اسماعیل تقلیدِ شخصی میں تشدد اور تقلیدِ فقہی پر اصرار کو کتاب وسنت سے دوری کا سبب سمجھتے تھے، اسی طرح غالبؔ بھی تقلیدِ جامد کے مذموم اثرات کو آزادیٔ فکر کے لئے رکاوٹ تصور کرتے تھے، غالبؔ کا رویہ غیر مقلدانہ تھا، وہ آزادیٔ فکر کے مالک تھے ایسا قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ تحریک احیائے دین سے عملاً وابستہ نہ ہوتے ہوئے بھی فکری طور پر اس کے نزدیک تھے۔

کلیاتِ نظم فارسی (۱۸۶۲ء) کی چھٹی مثنوی جو مسئلہ امکان وامتناع نظیر کے موضوع پر ہے، اسے اگرچہ غالبؔ نے مولانا فضل حق کی فرمائش پر بوجہ دوستی لکھا تھا اور اس موافقت ومخالفت کے ماحول میں غالبؔ کی اس مثنوی کے پس منظر میں مولانا فضل حق کے نظریہ کی تائید وتوثیق کرنا لکھا جاتا رہا ہے لیکن یہ مثنوی ایک اتفاقی تخلیق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ موجود تحقیق کے مطابق اس مثنوی میں پیش کردہ مضمون اولاً مولانا محمد سالم نے نثر میں لکھا بعد ازاں غالبؔ نے اسے بہادر شاہ ظفر کی

(۱) غالب نامہ۔ شیخ محمد اکرام (بمبئی، بن ندارد) ص: ۴۹

فرمائش پر منظوم کیا اور یہ منظومہ ۱۸۵۲ء میں مطبع سلطانی دہلی سے شائع ہوا ہے (۱)۔

تحریک احیائے دین نے عہد غالب میں فلسفہ زدہ تصوف اور اس کے تحت پروان چڑھنے والے نظریات پر بھی ضرب لگائی۔ عہد غالب میں دہلی سلاسل طریقت کا مرکز تھا لیکن تحریک احیائے دین سے وابستہ علماء مجددیہ فکر کے حامل تھے۔ وہ ہمہ از اوست کے قائل و ناقل تھے اور ترجمان بھی۔ غالب ایرانی فلسفہ وادب کے تغلب کی وجہ سے کلیتاً ہمہ اوست، کے قائل تھے حالانکہ وہ عملاً نہ کسی خانقاہ سے وابستہ تھے اور نہ ان کی طبع کسی بھی تقلید کی پابند ہو سکتی تھی۔ ان کو ترک رسوم کے بعد اپنے موحد ہونے کا بھی دعویٰ تھا جس پر وہ تمام عمر قائم رہے۔

اس دور کا عام معاشرہ صوفیوں، قلندروں اور مجذوبوں وغیرہ سے متاثر تھا۔ کچھ سیاسی زوال، اخلاقی انحطاط، تہذیبی انتشار نے لوگوں کو ایسے افراد کی پناہ لینے پر مجبور کیا تھا اور بعض افراد نے تصوف کو ایک نظریے، طریقۂ فکر کی صورت میں علمی مذاق کے طور پر قبول کیا تھا۔ اہل علم اور شعرا کا طبقہ پوری طرح تصوف کا گرویدہ تھا۔ بظاہر تصوف مذہبی زندگی کے ظاہر و باطن کو درست کرنے، نیت اور عمل کو خالصتاً لوجہ اللہ کرنے اور دائمی و ابدی سعادت حاصل کرنے کا ایک قابلِ عمل علم تھا۔ لیکن ایرانی مزدکیت، یونانی فلسفہ، مسیحی رہبانیت، ہندی فلسفۂ ویدانیت اور بھکتی تحریک کے اثرات نے اس کو ایک فلسفہ اور ازم کی صورت دے دی اور اس کے متعدد اسکول اور مدارج متعین کر دیے۔ حالانکہ تلاش حقیقت و معرفت، اعمال شریعت سے الگ کوئی شے نہیں ہے۔ ظاہر باطن ایک دریا کے دو کناروں کی طرح ہیں، جنہیں الگ الگ کر کے علمی، نظری یا فکری نکتے کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ نتیجہ یہی ہوا کہ تصوف کی سمت سفر جو وحی الٰہی اور اُسوۂ رسول سے جڑی ہوئی تھی، نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ابو حفص کے قول کے مطابق ''تصوف جو اک باادب زندگی بسر کرنے کا وسیلہ تھا، ایک فکری، نظری چیز بن کر رہ گیا۔ اب اعتقاد اور عمل کا معیار ختم ہوا اور بقول اقبال ''فسانہ ہائے کرامات'' باقی رہ گئے۔

زندگی حرکتِ مسلسل کا نام ہے۔ زندگی پیش آمدہ تمام مسائل و حادثات، تصادم و مشکلات کو اپنے اندر جذب اور تحلیل کرتی جاتی ہے اور آخر میں ارتقا کے عمل سے جڑ جاتی ہے لیکن ہوا یہ کہ اس دور کے فلسفہ زدہ فکری تصوف نے یا اقبال کے لفظوں میں عجمی تصوف نے زندگی کی حرکت مسلسل کو

(۱) غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں، کالی داس گپتا رضا (بمبئی ۱۹۹۰) ص: ۱۱۰ تا ۱۱۸۔

ختم کر دیا اور سفر حیات کی سمت نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جہد پیہم کی جگہ سکون اور بہت کچھ قنوطیت کے رجحان کو تقویت ملی۔ روحانی تعلیم و تربیت کا وہ نظام جو توبہ، تسبیح، ذکر و فکر، مراقبہ، توکل، قناعت، غنا، فنا، فقر وغیرہم اوصاف کو جو انسانی وجود کو اس کی اہمیت اس کی ذمہ داریوں کے احساس، اس کی تہذیب نفس، اس کے تقویم اخلاق، اس کی بہیمانہ قوتوں سے نجات اور طاعات و اخلاق کا خوگر بناتے تھے، اس نے گوشہ گیری، خلوت نشینی، تعطل، جمود، فراریت اور مجہولیت کے قریب لا کھڑا کیا۔

عہد غالب کا یہ تصوف یا صوفیانہ رجحان جو اس دور کے اخلاقی زوال کی تیز دھار کو کند کر سکتا تھا اور معاشرہ میں فعالیت اور حرکتِ عمل پیدا کر سکتا تھا ظاہر و مظہر، بے ہمہ با ہمہ، شاہد و مشہود، ہمہ اوست، ہمہ از اوست، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی موشگافیوں میں الجھا رہا۔ یہ تصوف کہیں مسلک نظر آتا ہے کہیں عقیدہ، کہیں علم، کہیں فلسفہ اور کہیں برائے شعر گفتن خوب است اور کہیں نظریہ۔

اسلام جس کی اساس صرف تین عقاید پر تھی۔ عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت، عقیدۂ آخرت یہی تین عقائد تمام انبیاء کی دعوت کا بنیادی عنصر بھی رہے ہیں۔ اس میں عقیدۂ توحید، وحدۃ الوجود میں مبدل ہو گیا، اور عقیدہ کی جگہ نظریہ بن گیا۔ منطق اور فلسفے کی اصطلاحات اور نوفلاطونی نظریات کے تحت اس کی الگ الگ تعبیریں پیش کی گئیں اور کثرتِ تعبیر کے سبب یہ عہد غالب کا بھی ایک مسئلہ بن گیا۔

غالب کے پاس فکر تھی، ایک اخلاقی ذہن تھا اپنی بات سلیقہ سے کہنے کی صلاحیت تھی لیکن اسلامی احسان و تصوف کے قریب جانا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ انہوں نے مروجہ تصوف کے مسائل کو بالعموم اور نظریۂ وحدت الوجود کو بالخصوص بطور عقیدہ قبول ضرور کیا تھا۔ جس کا اظہار ان کی شاعری میں ہوا، لیکن ان کی عملی زندگی میں نہ تصوف کی حرکت تھی اور نہ صوفیوں کا زہد و ارتقاء، اس اعتبار سے وہ بہت کچھ اپنے عہد کی نمائشی اور بے عمل زندگی کی علامت بن گئے تھے۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ غالب کے عہد میں ادبیات ایران میں مرزا فتح علی آخوندزادہ (ف ۱۸۷۸ء) اور حاجی زین العابدین مراغہ ای (ف ۱۹۱۰ء) نے جو روش قدیم کے خلاف

تحریک چلائی اور مسائل حاضرہ کو نظم کرنے کی دعوت دی، اس سے غالبؔ ناواقف رہے اسی طرح تحریک احیائے دین جس نے علم اور عمل دونوں میں ایک انقلابی اسپرٹ پیدا کی تھی غالبؔ کے عقاید اور ان کے اعمال زندگی پر کوئی اثر مرتب نہیں کر سکی۔ حالانکہ اس کے اثرات عہد مابعد میں قائم رہے۔ ڈاکٹر ظ، انصاری نے صحیح لکھا ہے (۱):

"دہلی میں ہندوستانی مسلمانوں کی اس پیورٹین تحریک کا ذہنی محاذ انہیں اپنی طرف مائل نہ کر سکا...... اس طرح وہ مذہبی عصبیت اور اس کی 'دقنی رسوم' سے کترا کر نکل گئے۔ وہ اس گوں کے تھے ہی نہیں"۔

(۱) غالب شناسی: ظ، انصاری (بمبئی ۱۹۲۵ء) ص:۵۲۔

# شاہ ولی اللہؒ کی حیات مبارکہ اور آپ کی علمی خدمات

مولانا مفتی محمد میاں قاسمی ☆

حضرت الامام شاہ ولی اللہؒ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، آپ علمی بصیرت اور اسرار و حکم غوامض اور باریکیوں پر تفوق ہی نہیں رکھتے بلکہ بہت سے علوم کے امام اور ماہر فن تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے زمانے میں پیدا فرمایا کہ جس وقت مسلم معاشرے میں لادینی، ضعیف الاعتقادی، شرک جلی کی متعدد صورتیں، رسوم و بدعات کا دور دورہ تھا۔ ایرانی تہذیب نے مسلم معاشرے کو اخلاقی زوال کے نقطۂ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ طبقہ امراء گم کردہ راہ ہو چکا تھا اور عوام ان کی تقلید میں ان کے اختیار کردہ مذہب رسوم کو اصل مذہب سمجھ بیٹھے تھے۔ علماء ظاہر اور نام نہاد صوفیا ان رسوم و بدعات کو تقویت دے رہے تھے، اسلام کے صحیح نام لیواؤں کو بری نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ ایسے وقت میں آپ کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ (المتوفی ۱۱۳۱ھ) نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو خواب میں دیکھا، فرما رہے ہیں کہ اللہ تم کو فرزند دے گا اس کا نام میرے نام پر رکھنا۔ والد گرامی نے آپ کی پیدائش پر آپ کا نام ولی اللہ رکھا کچھ مدت بعد جب خواب ذہن میں آیا تو ان کا نام قطب الدین احمد تجویز کیا۔

آپ کی ولادت ۴ رشوال بروز چہار شنبہ ۱۱۱۴ھ میں ہوئی۔ آپ پدری سلسلۂ نسب کے لحاظ سے فاروقی النسب ہیں اور مادری سلسلہ امام موسیٰ کاظم تک بیان کیا جاتا ہے، ولی اللہ بن عبدالرحیم بن وجیہہ الدین بن معظم بن منصور۔

---

☆ مہتمم مدرسہ عربیہ کاشف العلوم، بریلی۔

آپ کے والد محترم حضرت عالمگیرؒ کے زمانے کے مشہور علماء میں سے تھے۔
پانچ سال کی عمر میں والد ماجد سے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا، ایک سال میں فارسی کی ابتدائی کتابیں نکالیں، دس سال کی عمر میں کافیہ کی شرح لکھنا شروع کی، چودہ سال کی عمر میں نکاح ہوا، اسی وقت والد ماجد سے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کی اور پچیس سال کی عمر میں ہندوستان میں رائج علوم متداولہ سے مکمل فراغت حاصل کی۔
والد محترم حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی وفات کے بعد مدرسہ رحیمیہ میں جس کی بنیاد والد بزرگوار ڈال گئے تھے منصب صدارت تدریس سنبھالا۔ یہ مدرسہ اسی مقام پر ہے۔ جہاں شاہ صاحب اور آپ کی اولاد کے مزار مبارکہ ہیں جو مہندیوں کے نام سے مشہور ہے۔ والد کے انتقال کے بعد بارہ سال تک تفسیر حدیث فقہ واصول، اور دیگر علوم دینیہ وعقلیہ پڑھاتے رہے۔
۱۱۴۳ھ میں شیخ عبداللہ اور شیخ محمد ی کی معیت میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں دو سال قیام فرمایا، علماء اور مشائخ سے استفادہ کیا، خصوصاً حضرت شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی شافعی کی خدمت میں رہ کر حدیث پڑھی۔ حضرت شیخ ابوطاہر فرمایا کرتے تھے کہ ولی اللہ مجھ سے لفظوں کی سند لیتے ہیں اور میں ان سے معنوں کی سند لیتا ہوں۔ دو سال کے بعد ۱۱۴۵ھ میں دہلی واپس تشریف لے آئے اور بقیہ عمر تدریس وتربیت میں بسر کی۔
آپ کی ذات بابرکت کسی کی تعریف اور تذکیر کی محتاج نہیں نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کے اہل علم آپ کے علوم رتبت اور تفوق علمی سے واقف ہیں۔ جتنے علمائے کاملین آپ کے بعد ہوئے وہ سب آپ کی مہارت کاملہ اور بصیرت تامہ کے معترف رہے مگر حق یہ ہے کہ آپ کے کمالاتِ علمیہ معلوم کرنے کے لئے کسی کی شہادت کے بغیر آپ کی تصانیف خود شاہد عدل ہیں کہ آپ اپنے دور کے یکتائے روزگار تھے۔ آپ کے تبحر علمی اور علمی بصیرت آپ کی تصانیف سے ظاہر ہیں: مثلاً:
(۱) فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن (۲) الزہراوین (۳) مصفی اور مسوی شرح موطا امام مالکؒ (۴) تراجم ابواب بخاری (۵) انسان العین فی مشائخ الحرمین (۶) قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین (۷) الانصاف فی بیان اسلوب الاختلاف (۸) عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید

(۹) البدور البازغہ (۱۰) الطاف القدس (۱۱) القول الجمیل (۱۲) الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ (۱۳) اللمعات (۱۴) شفاء القلوب (۱۵) الخیر الکثیر (۱۶) التفہیمات الالہیہ (۱۷) فیوض الحرمین (۱۸) تحفۃ الموحدین (۱۹) الدر الثمین (۲۰) تاویل الاحادیث (۲۱) انفاس العارفین (۲۲) سرور المحزون (۲۳) فتح الودود (۲۴) العطیۃ الصمدیہ (۲۵) الفوز الکبیر (۲۶) خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ اور (۲۷) ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء میں تو علمی کمالات، علی تحقیقات، استنباطات، اور اجتہادات، نیز دلائل وتوضیحات کے ایسے دلچسپ نکات موجود ہیں جو ایک سے ایک بڑھ کر کہ ایک کی لذت اور لطف اندوزی مکمل نہیں ہو پاتی کہ دوسرا نکتہ اس سے بڑھ کر سامنے آجاتا ہے گویا کہ یہ نخلستان ہے جہاں ایک سے ایک بڑھ کر لذت لئے ہوئے دوسرا پھل سامنے آجاتا ہے اس کے علاوہ آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں جو آپ کے جیتے جاگتے علم کا بین ثبوت ہیں بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن کے نام تک نہیں سنے گئے اور بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن کے نام رہ گئے۔

## مسلک:

حضرت شاہ صاحبؒ مقلد اور حنفی تھے۔ آپ کی تحریر آپ کے علم سے لکھی ہوئی صحیح بخاری کے نسخہ پر موجود ہے۔ جو نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے جو شاہ صاحبؒ کے درس میں رہا ہے اس سے آپ کے ایک شاگرد محمد ابن پیر محمد ابن شیخ ابوالفتح نے پڑھا ہے۔ تلمیذ مذکور نے درس بخاری کی ختم کی تاریخ ۶ رشوال ۱۱۵۹ھ لکھی ہے اور جمنا کے قریب جامعہ فیروزی میں ختم ہونا لکھا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے ہاتھ سے اپنی سند حضرت امام بخاریؒ تک لکھ کر شاگرد مذکور کو سند اجازت حدیث لکھی اور آخر میں اپنے نام کے ساتھ یہ کلمات تحریر فرمائے، العمری نسباً، الدہلوی وطناً، الاشعری عقیدۃً، الصوفی طریقۃً، الحنفی عملاً، الحنفی والشافعی تدریساً، خادم التفسیر والحدیث والفقہ والعربیہ والکلام، اس تحریر کے نیچے آپ کے فرزند ارجمند حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے یہ عبارت لکھی کہ بیشک یہ تحریر بالا میرے والد محترم کے قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ اس تحریر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ مسلکاً حنفی تھے۔

یہ جیتا جاگتا آفتاب وماہتاب اپنی تابانیاں دکھا کر اور ضیاء پاشی کرکے بعمر ۶۳ سال

۲۹؍محرم ۱۱۷۶ھ مطابق ۲۱؍اگست ۱۷۶۲ء میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر کے اس دنیا سے غروب ہو گیا اللہ تعالیٰ کروڑوں بار آپ پر رحمت کی بارش برسائے۔ آمین۔

شاہ صاحب کے کمالات کا راز، آپ کی سوانح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کس قدر شجاعت و فراست خوش انتظامی اور غیرت و حمیت دینی کے اوصاف سے متصف تھے کہ آپ کی چال ڈھال، نشست و برخاست سے کسی طرح خلاف سنت یا ضعف اور کسل مندی کا اظہار نہیں ہوتا تھا اس کی وجہ حضرت شاہ صاحبؒ نے خود ارشاد فرمائی کہ والد ماجد کی شفقت میرے حال پر ایسی تھی کہ کسی باپ کی بیٹے پر، کسی استاد کی شاگرد پر اور کسی شیخ کی مرید پر کم ہی ہوگی۔

آپ کی ذات کثیر الجہات اور جامع کمالات تھی اللہ تعالیٰ نے تجدید و اصلاح امت، دین متین کے فہم صحیح، علوم نبوت کی نشر و اشاعت، اور ملت کے لئے فکر و عمل میں ایک نئی زندگی اور تازگی پیدا کرنے کا جو عظیم الشان کام ان سے لیا ہے اس کا دائرہ اتنا وسیع اور اس کے شعبوں میں اتنا تنوع پایا جاتا ہے جس کی مثال کم نظر آتی ہے۔ ان سب کا تفصیلی اور تحقیقی جائزہ چند صفحوں میں لیا جانا کار دشوار ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ان کے تجدیدی کارناموں کو حسب ذیل عنوانات میں تقسیم کیا ہے: (۱) اصلاح عقائد و دعوت الی القرآن (۲) حدیث و سنت کی اشاعت، و ترویج فقہ، و حدیث میں تطبیق (۳) شریعت اسلامی کی مربوط اور مدلل ترجمانی، اسرار و مقاصد، حدیث و سنت کی نقاب کشائی (۴) اسلام میں خلافت کے منصب کی تشریح، خلافت راشدہ کے خصائص، اور اس کا اثبات، رد روافض (۵) سیاسی انتشار میں مجاہدانہ و قائدانہ کردار (۶) امت کے مختلف طبقات کا احتساب (۷) علمائے راسخین کی تعلیم و تربیت، غرض کس کس پہلو کو لیا جائے جس پہلو پہ نگاہ پہنچتی ہے زبان سے بے اختیار کا یہ شعر نکلتا ہے:

داماں نگاہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

تمہارے حسن کے پھول اتنے زیادہ ہیں کہ گلچیں آپ کی فصل بہاریں اپنی تنگ دامنی سے شکوہ کناں ہو جاتا ہے۔

## علم حدیث کی اشاعت:

آپ کو علم حدیث سے عشق اور فریفتگی کا تعلق تھا۔ اس کی اشاعت کو آپ نے اپنی زندگی کا مقصد اولیں قرار دے رکھا تھا۔ آپ کی مساعی سے اس ملک میں حدیث کا سکہ رائج الوقت کی طرح چلن ہو گیا کہ وہ نصاب درس کا جزء اور معیار فضیلت قرار پائی۔ درس حدیث کے حلقے قائم ہوئے۔ شروح حدیث کا دور شروع ہوا کہ دیکھتے دیکھتے ایک وسیع و عظیم حدیث کا کتب خانہ تیار ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ علوم یقینیہ کا معتمد علیہ سرمایہ اور فنون دینیہ کی اصل علم حدیث ہے کہ جس میں افضل الکائنات خاتم الانبیاء جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل یا کسی بات پر آپ کے سکوت کا ذکر خیر ہوتا ہے۔ یہ حدیثیں تاریکی میں روشن چراغ، رشد و ہدایت کا سنگ میل اور بدر منیر کامل کا حکم رکھتی ہیں جو شخص بھی ان پر عمل پیرا ہوتا ہے اور ان کی نگہداشت کرتا ہے وہ خیر کثیر سے فیضیاب ہوتا ہے۔

## خلافِ راشدہ کا اثبات:

آپ نے ارشاد فرمایا کہ توفیق الٰہی کے نور نے اس بندہ ضعیف کے دل میں ایک مستقل علم کو اس شرح اور بسط کے ساتھ القاء کیا کہ مجھے یقین کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ حضرات خلفائے راشدین کی خلافت کا اثبات اصول دین میں سے ایک اصل عظیم ہے جب تک اس کو پوری مضبوطی کے ساتھ تسلیم نہیں کیا جائے گا کسی مسئلہ کا استحکام نہیں ہوگا جو خلافت راشدہ کے اصول کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے، وہ حقیقت میں تمام فنون دینیہ کو منہدم کر دینا چاہتا ہے کیونکہ خلفائے راشدین حضور انور ﷺ اور آپ کی امت کے درمیان قرآن پاک کے اخذ و تلقی میں واسطہ ہیں۔

## شورش زمانہ اور انتشار میں بھی علمی کام کا انہماک:

شاہ صاحبؒ کے وقت میں زمانہ کے حالات، سیاسی تغیر و تبدل، مرہٹوں کی یلغار، جاٹوں کے حملے، سکھوں کی یورشیں، اور نادر شاہ کی ترک تازیاں، ہوش ربا مصائب اور زلازل کے باعث تھے۔ مگر شاہ صاحب ان حالات سے باخبر رہتے تھے، حالات اور واقعات اور اسباب پر

بھرپور گرفت کے باوجود درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تربیت طالبین، تزکیہ نفوس، دعوت الی اللہ، اس جمعیت خاطر اور اہتمام سے فرماتے تھے۔ گویا کہ معتدل اور پرسکون حالات آپ ایک گوشہ عافیت میں بیٹھے ہوئے علمی تحقیق، فکری رہنمائی، اخلاقی تربیت، اتباع سنت، اور احیاء ملت کے کام میں مصروف ہوں۔

## ارکان دولت سے خطاب:

فرمایا اے امیرو! دیکھو کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جارہے ہو، جن کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے، کیا تم اعلانیہ شرابیں نہیں پیتے، اور پھر اپنے فعل کو برا بھی نہیں سمجھتے، تم نہیں دیکھتے کہ بہت سے لوگوں نے اونچے اونچے محل اس لئے کھڑے کئے ہیں کہ ان میں زنا کاری کی جائے، شرابیں پی جائیں، جوا کھیلا جائے، لیکن تم اس میں دخل نہیں دیتے، اور اس کا حال نہیں بدلتے، جب کوئی کمزور مل جاتا ہے تو اسے پکڑ لیتے ہو، اور جب طاقت ور ہوتا ہے تو اسے چھوڑ دیتے ہو، تم لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے ہو، اور نرم وگداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے ہو، اچھے کپڑے اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف منعطف نہیں ہوتی، کیا تم نے اپنے سر بھی اللہ کے سامنے جھکائے، خدا کا نام تمہارے پاس صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ اپنے تذکروں اور قصے کہانیوں میں اس کو استعمال کرو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مراد زمانے کا انقلاب ہے، کیونکہ تم اکثر کہتے ہو خدا قادر ہے کہ ایسا کردے، یہ زمانہ کے انقلاب کی تعبیر ہے۔

یہ چند معروضات مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کی گئی ہیں حقیقت یہ ہے کہ خاندانِ ولی اللہی نے ہندوستان میں وہ کام کیا جو محمد ابن عبدالوہاب نجدی نے حجاز مقدس میں انجام دیا، جدید دنیائے اسلام کے مصنف ڈاکٹر یوتھراپ اسٹاڈرڈ نے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کو محمد ابن عبدالوہاب کی تحریک کا زائیدہ قرار دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ خاص ہندوستان اور اس سے متعلق علاقوں میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کی خدمات کے تحت انجام پذیر ہوئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے دائرہ تجدید کے کئی محاذ تھے، عقیدے کی تصحیح وتطہیر، قرآن

وحدیث کا صحیح فہم، خلافت اور منصب خلافت کی اہمیت، مسلم معاشرے کی اقتصادی وسیاسی، علمی وعسکری ضروریات ترجیحات اور حدود، یہ محاذ خود شاہ صاحب اور ان کے جانشینوں نے علمی وعملی سطح پر سر کیے، ہندوستان میں آج مسلک دیوبند کی صورت میں جو علمی تحریک زندہ ہے، وہ دراصل شاہ صاحب اور ان کے جانشینوں کی خدمات کے سبب ہم تک پہنچی ہے۔ حالانکہ شاہ صاحب کا دائرہ کار اس موجودہ تحریک کے دائرے سے خاصا وسیع تھا۔ وقت اتنی اجازت نہیں دیتا کہ تفصیل کے ساتھ آپ کی ہر خوبی کو سپرد قلم کیا جائے اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے اللہ رب العزت کے حضور دست بدعا ہوں کہ اللہ رب العزت حضرت موصوف پر اپنی رحمت کی بارش برسائے اور ہم اور آپ سب کو علم کی دولت سے مالا مال فرمائے اور اس پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے آمین۔

اور جن حضرات نے اس سلسلہ کو قائم فرمایا اور جس طرح کا بھی اس میں تعاون کیا اللہ ان کی عمروں میں برکت عطا فرمائے اور ان کی مساعی جدوجہد کو قبول ومقبول فرمائے۔ خصوصاً برادر گرامی حضرت مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب چیئرمین شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے ناچیز کو کسی لائق محسوس کرتے ہوئے سمینار میں شرکت کے لئے یاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ موصوف کے علم اور عمل میں ترقی وبرکت عطا فرمائے۔ آمین

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

# ROLE OF SHAH WALIULLAH AS A RENOVATOR OF ISLAM WITH SPECIAL REFERENCE TO *TASAWWUF*

Prof. Abdul Ali☆

The life of Shah Waliullah [1703-1762 AD],the most prominent Muslim thinker and scholar- revolutionary of pre-modern India coincided with the period of multiple crises,both political and socio-religious, that confronted the Muslim world in general and the Muslims of the Indian sub-continent in perticular. Apart from the process of steady and irreversible decline of the Muslim political power in India, various kinds of controversies and socio-religious ills such as bitter Shia- Sunni conflict, saint-worship, free thought, and dissensions arising from watertight compartmentalisation of Muslim socity into different juristic schools plunged the Muslim community into a state of unprecedented animosity by widening the gulf between its diffrerent groups and sects.

When Shah Waliullah appeared on the scene,he took up to himself the role of a renovator of Islam and socio- religious

☆ Deptt. of Islamic Studies, Aligarh Muslim University.

reformer in order to meet the various challenges of his time.In this respect he stands out as a unique figure among the long line of Indian Muslim thinkers.His pioneering achivement is that he gave Islamic thought a flexibility which enabled it to adapt itself to different trends of thought without compromising in any way on the fundamentals of Islam.He sought to achieve his main objectives as a religious-philosophical thinker by giving a rational interpretation of Islamic Shari'at as well as by emphasising the importance of *ijtihad* (derivation of fresh laws in the Quran and Sunnah).And his magnum opus Hujjatullah al-Balighah (The Convincing Proof of Allah) is perhaps the best book ever produced in India on religion-philosophical aspects of Islam. In it he discussed the secrets and philosophy of religion in a masterly way which he regarded as the most important of all religious sciences. He also successfully presented in it the highest philosophy of Islamic Shari'at in an intelligible and demonstrative form.

Another important feature of Shah Waliullah's contribution to religio-philosophical thoughts of Islam is that he has successfully brought home to the reader abstract speculation about spiritual and metaphysical matters by means of extensive use of simile and metaphors. His thought patterns are also marked by the use of abundance of terms alluding to analogy,figuration,model, image, and semblance[1]. This is evident from the following sentences, in which he has

1. M.K. Heramnsen: "The Current State of Shah Wliullah Studies" in *Hamdard Islamicus*, Vol. xi, no.3 (Autumn, 1998), Hamdard Foundation, Pakistan, p.21

elucidated the importance of the science of secrets of religion.

"إنّ أدق الفنون الحديثة بأسرها عندى..... هو علم أسرار الدين الباحث عن حكم الأحكام ولمياتها وأسرار خواص الاعمال و نكاتها فهو والله أحق العلوم بأن يصرف فيه من أطاقه نفائس الأوقات ويتخذه عدّة لمعاده بعد ما فرض عليه من الطاعات اذبه يصير الإنسان على بصيرة فيما جاء به الشرع وتكون نسبته بتلك الأخبار كنسبة صاحب العروض بدواوين الأشعار اوصاحب المنطق ببراهين الحكماء او صاحب النحو بكلام العرب العرباء او صاحب اصول الفقه بتفاريع الفقهاء وبه يأمن من ان يكون كحاطب ليل او كغائص سيل او يخبط خبط عشواء او يركب متن عمياء كمثل رجل سمع الطبيب يامر بأكل التفاح فقاس الحنظلة عليه لمشاكلة الاشباح وبه يصير مؤمنا بينة من ربه بمنزلة رجل أخبره صادق انّ السمّ قاتل فصدّقه فيما أخبره وبيّن ثم عرف بالقرائن إنّ حرارته ويبوسته مفرطتان وانّما تباينان مزاج الإنسان فازداد يقينا الى ما أيقن....."(1)۔

(The most subtle of the sciences of Apostolic Traditions,in my opinion,is the knowledge of the secret of religions which investigates the wisdom underlying the rulings,their rationale,and the secrets and points of the merits of actions.This,by Allah, is the most worthy branch of knowledge, in which the one who is competent should spend his precious time,and he should consider it a provision for his resurrection after those acts of worship which have been made incumbent upon him. Because it is only through this that man develops insight into the real purpose of the divine law,that his relationship with those reports becomes like that of the one who has mastered metrics to the collections of poetry, that of the one wellgrounded in logic to the proofs of the

1. Shah Waliullah, *Hujjat-Allah al-Balighah*, Vol.1 (Delhi: Kutub Khahnah Rashidiya, AH 1372), p.3.

philosophers,that of the grammarian to the speech of the pure Arabs,or that of the jurist to the deductions of the legal scholars.Through this he will be saved from becoming like a wood-gatherer in the darkness or like one who dives into a flood. He would not act in a reckless manner, nor ride on the back of a blind mount, nor be like the case of a man who heard the physician order him to eat apples, but he equated them with the bitter, wild colocynth on the basis of their similar shape. Through this discipline he will also become a believer on the basis of a clear evidence from his Lord like the one who is informed by a truthful person that poison is lethal,and he takes him to be true in his information, and then he recognises through contextual evidence that its heat and dryness are excessive,and that they conflict with the temperament of man.And with this knowledge his belief turns into convction.)

Next, while propounding his religio-philosophical ideas, the author never deviated from the basic tenets of Islam. He remained from the beginning till the end genuinely orthodox and traditional.But what may be said to be his chief contribution to Islamic thought in this context is that whatever premises he founded on the rulings of the Quran and Sunnah he invariably supported and corroborated them with evidence provided by reason and empirical observation, thereby implying that there exists no conflict between revelation, reason and empirical wisdom. As such he is credited with having provided a non-theological, secular foundation for the interpretation of the Shari'at and the scriptures of Islam.Thus he

made a successful attempt to revitalise the theory and practice of classical Sunni Islam in the modern environment of scientific progress and rational thought by demonstrating the relevance of its doctrine on the grounds of reason and empirical observation also.His standpoint in this respect accords fully with the vision and spirit of Islam, for the Quran itself is a wonderful blend of both religion and philosophy.This is clearly borne out by the Quranic verse: "The Quran was revealed in the month of Ramadan as a guidance for mankind along with clear proofs in support of its being a guidance as well as the criterion (of right and wrong)"[1]. It is clear from the verse that when one approaches the Quran with his faith in it as a source of guidance, one is in the realm of faith. But when one investigates in it the proofs of its being the guidance, one deals with science and philosophy.

Shah Waliullah also Justified and highlighted the need for further elucidating the inner motives of the commands of Shari'at. But while doing so he put a check on the growth of free thought in Islam by holding that reason by itself is not competent enough to interfere or tamper with any of the commands, as they are all based on reason as well as designed to promote human welfare. As such they are meant to be obeyed by every individual irrespespective of whether he undersands or not the real motives of the commands. He elaborated this point saying: 'Onemust obey them as they are, because the vision of the Prophet was decidedly deeper and

1. The Qur'an, II: 185.

higher than the vision of anyone of us, and his reason was illuminated by divine illumination. It is like a medicine, the real values of which is known only to the physician. If the sick person knows them, well and good; but if he does not know, he should not in any way worry over it. In fact, if the medicine is used according to the instructions of the physician, he would be cured; other wise he would suffer and meet with death".[1] This thrust of his thought is clearly discernible in his treatment of almost all religious matters discussed by him.

## Concept of *Tasawwuf*

As is well-known, the basis of *tasawwuf* is total devotion to the Almigty Allah aimed at spiritual uplift of the believer. It is also characterised by total submission of the individual's will to the will of Allah under all circumstances. But later, especially from the second Islamic century onwards, as rightly described by Ibn Khaladun when Muslims became more concerned with materialistic pursuits of life to the neglect of their spiritual consciousness and aspirations, those among them who still remained devout and pious by the yardstick of early Islam acquired the name of sufis.

The first important point which Shah Waliullah has mentioned in this regard is that allthough the term of *tasawwuf* was a later development in the history of Islam, its main objective has been almost the same as in the time of the

1. Fazle Mahmud, *A Study of life and Works of Shah Waliullah* (Lahore: Maktabah Rashidiya, 1972), pp.110-111.

Prophet Muhammad and his companions as well as their immediate successors, who could obtain perfection in their spirituality by their obedience of the laws of Shair'at in letter and spirit. He also distinguished between the external aspect of Islam and its internal spirit or essence. As far as the external aspect is concerned,it is mostly guarded and looked after by jurists and traditionists,while the internal spirit, which is identified by him with *ihsan,* becomes the principal concern of the sufis[1]. The term *ihsan,* is used here in the meaning as explained by the Prophet, saying: "Worship Allah with the conviction as if you are seeing Him before you, or at least He is seeing you".[2] He further held that the *salaf-e-salihin* (virtuous ancients) were true representatives of both external and internal aspects of the religion, while sufis sought perfection through their concentration on the internal aspect.It was mainly on these grounds that he held the instutution of *tasawwuf* as lawful in Islam on the condition of its remaining subservient to the commands of Shari'at.

Like what Shah Waliullah did in other fields of Islamic thought, particularly in jurisprudence, in *tasawwuf* also he acted as a pacifist and reconciliator between different sufi orders. In all this he was principally moivated by his intense desire to keep the Muslim *Ummat* unified as far as possible within the broad framework of accommodating Islam. His interpretation of the doctrines of *Wahdat al-Wujud* and *Wahdat*

1. *Shah Waliullah, Hama'at* tr. into Urdu by Prop. Mohd. Surur, (Lahore: Sindh Sagar Academy, (1946), p.27.
2. Ibic., p.28.

*al-Shuhud* is a sufficient proof of his renovative and reconcialatory approach to *tasawwuf* aimed at bringing about harmony between externalist theologians and internalist sufis on the one hand and between rival *sufi* orders on the other.

## Wahdat al-*Wujud*

In the time of Shah Waliullah sufi thinkers were divided into various groups and orders which were at loggerheads with one another, because each group of them claimed authenticity and truthfulness exclusively for itself. Besides, the rift between the theologians and the whole class of sufis had also widened because of the latter's excesses, extravagances and apparently blasphemous expressions consequent upon their deviations from the shari'at which met with outright condemnation from the fromer. Of the various controversial issues debated in religious circles in those days, the doctrine of *Wahdat al-Wujud* was the most burning topic of discussion. But as elsewhere, here also he attempted at their reconciliation with a view to impressing upon them the importance of concentrating on the main objective of *tasawwuf* culminating in establishing contact with the Ultimate Reality ,instead of dissipating their energies in futile polemical discussions on trivial matters.

The philosophical doctrine of *Wahdat al-Wujud* is a maked departure from the conventional Muslim belief about Allah, the Creator, and the world created by Him, according to which Allah is one and unique in His Essence and Attributes; He exists from eternity by His own Holy Essence; He created

all things from nothing; all things are dependent upon Him, while He Himself is not dependent upon anything. Thus the prevalant view was that the being of the created world was other than the being of Allah, thereby implying faith in some sort of duality of existence. But later, in opposition to this simple view of Muslims, the philosophical doctrine of *Wahdat al-Wujud* was propounded by the great sufi thinker Muhyiddin Ibn 'Arabi (d.1240 AD) which became to be known as the *Wujudiyah* school, to which the overwhelming majority of eminent sufis adhere. According to it, Allah is eternal and His ideas are also eternal and uncreated, and they cannot be separated from him. He calls the ideas of Allah as *al-A'yan al-Thabitah* which are the determinate forms of His Essence. These ideas or the forms exist in the mind of Allah and are one with Him, and they do not possess their own independent existence. He also holds that there is no creation *exnihilo.*[1] He further illustrates his point on the concept of creation by quoting the Quranic verse: إنما أمراهٔ إذا أراد شيئا ان يقول له كن فيكون (If Allah intends the creation of anything, He simply commands it to be and it is created).[2] He argues that the object which is commanded to be created is not a non-entity, and that the said object is nothing other than the idea that subsists in the mind of Allah from eternity. Thus the created things are only manifestations of the ideas of Allah which earlier, in the world

1. Mir Valiuddin: "Reconciliation Between Ibn "Arabi's Wahdat al-Wujud and the Mujaddid's Wahdat al-Shuhud" in *Islamic Culture*, Vol.xxv, no.2 (April 1952), Hyderabac, p.48.
2. The Quran xxxvi:82.

of Ibn 'Arabi, did not have the slightest taste of existence.[1] [ماشمّت رائحة الوجود In other words there is nothing in existence except Allah, and Allah is identical with the creation. He also substantiates his point in the light of the Quranic verse: "هو الأول والآخر والظاهر والباطن وهو بكل شئ عليم" (He is the First and the Last, and the Outward and the Inward; and He is Knower of all things].[2]

## Wahdat al-Shuhud

Ibn 'Arabi's doctrine was first challenged by Sheikh Ruknuddin 'Al' al-Dawlah al-Simnani (1261-1336 AD), who had settled in Baghdad and was a disciple of Sheikh Nuruddin. He held that the created object was a reflection *(in' ikas)* rather than a manifestation of the Divine Being, and the external existence was separate from Allah. His viewpoint was further expounded by Sheikh Ahmad Sirhindi (1564-1624 AD), who subsequently became the founder of the *Shuhudiyah* school. He holds that Allah is the Perfect Being, and that before, the existence of this world there was this Perfect Being along with all His perfect attributes and names. Now opposed to Allah's existence or *wujud*, there is absolute nothingness or *'adam-e-mahd*, and opposed to His life there is a form of *'adam* called death. Similarly, opposed to his knowledge there is a form of *'adam* called ignorance and so on. In this way there are only two things: perfections which are beings or *wujudat* and

1. Mir Valiuddin, po. cit., p.46.
2. The Quran LVII.3.

imperfections which are non-beings or *'adamat.*[1]

According to Sheikh Sirhindi, when Allah intended creation of the world, he cast a reflection of His *wujud* into its *'adam-e-mutaqabilah* (state of absolute nothingness) and there came into being finite existence, finite life, finite knowledege, finite power, etc. The sheikh also denounced *wujudiyat* or pantheism as the initial stage of consciousness in the part of spiritual progress which is followed by the stages of *zilliyat* [adumberation] and *'abdiyat* [servitude]. And at the final stage of spiritual progress the duality of the Creator and the Creation becomes manifest to the sufi. Now he realises that his earlier experiences were unreliable, and that Allah is far above the grasp of human faculty of reason and of intuition. To quote his words: "إنّ الله وراء ثم وراء الوراء" (Allah is beyond the beyond, and again beyond the beyond).[2]

## Shah Waliullah's Reconciliation

If a critical analysis is made of the above- mentioned two doctrines, it becomes evident that there does exist some substantial difference of fundamental nature between the two doctrines from the polemical viewpoint. In *Wahdat al-Wujud* Allah becomes identical with the creation, while in *Wahdat al-Shuhud* Allah and the created world are two different categories. As such the approach and philosophical implication of *Wahdat al- Wujud* cannot be said to be the same as those of

1. Mir Valiuddin, po.48.
2. Fazle Mahmud, A Stucy of life and works of Shah Waliullah (Lahore: Maktaba Rashidia, 1972), p.104.

*Wahdat al- Shuhud* by any flight of imagination. Shah Waliullah also must have been fully aware of this fact. Nevertheless, he sought to bring about harmony between the sufis of both groups by emphasising the common objective of both schools relating to the attainment of spiritual excellence through observance of the commands of Shari'at coupled with the practices of *tasawwuf* such as *ihsan* (the power given to man by Allah for perfection of the spiritual side of religion), *dhikr, awrad, waza'if, tawakkul,* muraqabah, etc. Throwing light on the commonalities between them, he maintained that both doctrines assigned reality to Allah alone, and that the origin of creation in both was the Essence of Allah, with the difference that in the one it was manifested, while in the other it was only reflected. He further held that if similes and metaphors were set aside, the difference between them appeared to be only verbal and not real. It is also so insignificant that it should not be taken into account. [1]

## His Impact

It would be no exaggeration to say that the renovatory religio-philosophical thought of Shah Waliullah characterised by his pacifist and reconciliatory approach had an indelible impact on the socio-religious milieu of Muslims of the Indian sub-continent. Although his interpretation and synthesis of the doctrines of *Wahdat al-Wujud* and *Wahdat al-Shuhud* was not accepted in toto by some of the eminent sufis of his time like

1. Ibid., pp. 106-70.

Khwaja Mir Nasir, Maulvi Ghulam Yahya, Mirza Mazhar Jan Janan, etc. , who wrote rejoinders to his explations, yet thanks to his reconciliatory efforts as well as to the overwhelming impact of his personality and the respect he enjoyed in different religious circles, the controversy which had intensified between the rival groups of sufis for about a hundred years died down slowly,[1] and it now came to be regarded almost as a non-issue. Thus the Shah succeeded to a great extent through his writings on the subject in paving the ground for the coming generations of sufis to address themselves straightaway to the main objective of *tasawwuf* for their enlightenment.

Secondly, Shah Waliullah, himself an accomplished theologian and sufi, effectively highlighted the interdependence of Shari'at and *Tariqat.* Just as he did not permit for the sufis any deviation from the commands of shari'at, similarly he demanded from the theologians that while performing their religious duties, they should also abide by the spirit behind the outward manifestations of Islam. As such he made the sufis acceptable to the theologians and the theologians well-disposed towards *tasawwuf.*

Thirdly, the thought of Shah Waliullah served as a guard in the sub-continent against the militant extremism which spread in the wake of the Wahabi movement launched by the followers of Muhammad Ibn 'Abd al- Wahhab (d. 1792 AD) of Najd, as they believed exclusively in Shari'at and there was hardly any scope in their system for accommodation of

1. Ibid., p.108.

*tasawwuf,* which they considered as anti- Islamic. Further, he toned down the rigidity of watertight compartmentalisation of the Muslim world into different religious sects by reviving the process of *ijtihad* as well as by allowing Muslims to choose on any point the ruling of any of the four great juristic schools. While doing so, he also gave the Apostolic Traditions primacy over the rulings of the jurists.

Lastly, the enduring impact of Shah Waliullah is clearly visible in a number of reform movements that were launched by Muslim 'Ulama and reformers in different parts of the country in their respective times. The Ahl-i Hadith 'Ulama, the Ulama of Deoband movemnet, the 'Ulama of Aligarh Movement, the 'Ulama of Nadwat al-Ulama movement etc. they were all said to have been inspired by his teachings and thoughts. The example of Nawab Siddiq Hasan Khan (1832-1890) of Bhopal is briefly mentioned below as a case in point.

It is important to note that Nawab Siddiq Hasan Khan, a destinguished Ahl-i Hadith scholar and reformet, claimed not only to have been inspired by Shah Waliullah, but also to have been a true follower of him. While writing his commentary on the *Treatise of Faith* written by the learned Shah, the Nawab expressed his complete agreement with his predecessor's religious views in the following words:

"فهذه عقيدتى بل عقيدة جميع أهل السنة والجماعة مع اختلاف يسير فى بعضها من بعض تعصّبا أَوْ إنصافا أدين الله تعالىٰ بها واعتمد فى الدين عليها ظاهرا إقرارا باللسان وباطنا تصديقا بالجنان فان كل ذلك مما وردت به الآيات والأخبار وشهدت به النصوص والآثار فمن اعتقد ذلك كان من

اهل الحق وعصابة السنة وفارق اهل الضلال وحزب البدعة......"(۱)۔

(My faith is exactly like this, i.e., like the faith of Shah Waliullah. Rather this is the faith of the entire Sunni community exceptiong difference of opinion in a few religious matters among some of them either out of partiality or out of fairness. I base my prayers on it as well as rely on it in my religious practices in both letter and spirit, as it is fully supported by the verses of the Quran and sayings of the Prophet. So whosoever builds his faith like this,he becomes a true follower of Islam....)

The impact of Shah Waliullah on the Nawab is clearly reflected in th latter's moderate religious stand and viewpoint about politically motivated, controversial issues in the House of Islam. For example, the caliphal issue regarding which there was some difference of opinion among the Companions of the Prophet, continues to be hotly debated, despite the fact that this has already caused a great deal of bloodshed and bitterness among Muslims. The Nawab was of the opinion that it was useless for believers to enter into such controversial issues. At the same time he enjoined upon them to keep mum in such matters and respect all the companions, irrespective of the sect to which they belonged.[2]

1. Nawab Siddiq Hasan Khan, *al-Intiqab al-Rajih*,p.56.
2. Nawab Siddiq Hasan Khan, *Hadrat al-Tajalli*, p.103

رپورٹ

# امام شاہ ولی اللہؒ نیشنل سمینار

تبریز عالم قاسمی

آئی سی سی آر، آزاد بھون، نئی دہلی میں شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ۲۳؍ مارچ ۲۰۰۱ء کو ایک عظیم الشان شاہ ولی اللہؒ نیشنل سمینار کا اہتمام کیا گیا۔ مولانا نثار احمد شمس کی تلاوت قرآن کے بعد سمینار کا باضابطہ افتتاح مفسر قرآن حضرت مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب نے کیا۔ سمینار کا آغاز صبح ساڑھے نو بجے ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت حضرت مولانا محمد سالم قاسمی (مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند) نے کی۔ جناب بابو چراغ الدین قریشی ایڈوکیٹ نے علماء، دانشوران ملت، مہمان ذی وقار، مقالہ نگاروں اور شرکا کا استقبال کرتے ہوئے سمینار کی غرض وغایت بیان کی، جناب ایس ایم خاں پریس سکریٹری صدر جمہوریہ ہند نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے افکار وخیالات ونظریات کو آج کے حالات کے تناظر میں دیکھنے اور ان سے استفادہ کرنے پر زور دیا۔ پروفیسر زاہد حسین زیدی وائس چانسلر روہیل کھنڈ یونیورسٹی نے شاہ ولی اللہ کی عبقری شخصیت اور آپ کے صاحبزادگان کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے موجودہ حالات میں ان کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی ممبر پارلیمنٹ سابق گورنر بہار ومغربی بنگال، مولانا احمد علی قاسمی جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، مولانا اسرار الحق قاسمی صدر تعلیمی ولی فاونڈیشن، مولانا حکیم محمد عرفان الحسینی کلکتہ، مولانا عمید الزماں کیرانوی کارگزار صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند، ڈاکٹر منظور عالم چیئرمین آئی او ایس، جناب فیضی عزیز ہاشمی ڈائریکٹر اطلاعات ونشریات حکومت دہلی، مولانا انجینئر خادم حسین نقوی (لکھنؤ) نائب صدر آل انڈیا

مسلم مجلس مشاورت، جناب خالد صابر صدر مسلم مجلس اتر پردیش، مولانا اصغر علی امام مہدی ناظم اعلیٰ جمعیۃ اہلحدیث، جناب عبدالودود خاں سابق ایم ایل سی اتر پردیش، جناب سراج الدین قریشی چیئرمین ہند گروپ اور جناب عبدالصمد صمدانی ممبر پارلیمنٹ نے شاہ صاحب کی حیات وخدمات کے مختلف گوشوں پر اپنے اپنے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی۔ مولانا عبدالکریم پاریکھ نے پنجاب وہریانہ کی تاریخی مساجد مؤلفہ مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی چیئرمین شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کا اجرا کیا، حضرت مولانا محمد سالم قاسمی نے خطبۂ صدارت میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تجدیدی کارناموں کی اہمیت اور معنویت پر تفصیل سے روشنی ڈالی، افتتاحی اجلاس کی نظامت مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی نے کی۔

افتتاحی اجلاس کے بعد دوسری نشست کا آغاز ہوا جس کی صدارت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی دارالعلوم دیوبند نے کی۔ جس میں پروفیسر عبدالعلی صاحب چیئرمین شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے تصوف کے حوالہ سے شاہ ولی اللہ کے تجدیدی کارنامے، پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے سلطنت مغلیہ کا زوال تجزیہ ولی اللہی، پروفیسر زبیر احمد فاروقی صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شاہ ولی اللہ دہلوی اور عربی زبان وادب میں ان کی خدمات۔ حضرت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی صاحب ڈائریکٹر مفتی الٰہی بخش اکیڈمی نے کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور اور اپنے ذاتی وخاندانی موروثی ذخیرہ میں موجود حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیفات کے قلمی نسخوں کا تعارف، ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری ڈائریکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ نے شاہ ولی اللہ کی تصانیف خدا بخش لائبریری میں محفوظ قلمی نسخے، حکیم ظل الرحمٰن دہلی نے شاہ ولی اللہ دہلوی: زندگی، عہد اور مملکت ہندوستان، اور دوحہ قطر سے تشریف لائے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز نے شاہ ولی اللہ کا تصور عالم مثال عنوانات پر اپنے گرانقدر مقالات پیش کئے۔ اس دوسری نشست کی نظامت کے فرائض جناب عظیم اختر (سابق ایڈیشنل مجسٹریٹ نے انجام دیئے) تیسری نشست کا آغاز مولانا حکیم محمد عرفان الحسینی کی صدارت میں ہوا، جس میں مولانا محمد ولی رحمانی سجادہ نشین خانقاہ رحمانی مونگیر کا مقالہ بعنوان تصوف اور حضرت شاہ ولی اللہ مولوی عبدالروف رحمانی نے پیش کیا۔ مولانا اصغر علی امام مہدی نے شاہ صاحب اور نظریہ توحید۔

پروفیسر ظفر احمد نظامی صدر شعبہ سیاسیات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت، مولانا محمد فہیم اختر ندوی (اسلامک فقہ اکیڈمی، نئی دہلی) نے فقہی اختلافات میں شاہ ولی اللہ کا معتدل موقف، پروفیسر بدر الدین الحافظ سابق صدر شعبہ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی نے شاہ ولی اللہ کی دعوت رجوع الی القرآن۔ مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی شیخ الحدیث مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ نے شاہ ولی اللہ اور ان کا عہد، مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی نے امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مولانا عمید الزماں کیرانوی نے شاہ ولی اللہ کی تجدیدی خدمات، مولانا عبد الکریم پاریکھ صاحب نے شاہ ولی اللہ اور آپ کے بلند پایہ صاحبزادگان کی قرآن فہمی، مولانا محمد سالم قاسمی نے فکر ولی اللٰہی کی روشنی میں ملت کی فرومایگی کا منفرد علاج، مولانا عقیدت اللہ القاسمی نے شاہ ولی اللہ کے تعلیمی نظریات، مولانا محمد کلیم صدیقی مہتمم جامعہ شاہ ولی اللہ پھلت نے حضرت شاہ ولی اللہ کا دعوتی مشن، ڈاکٹر علیم اشرف خاں لیکچرر شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی نے شاہ ولی اللہ اور نصاب تعلیم، مولانا مفتی جمیل الرحمٰن قاسمی مہتمم ومفتی جامعہ رحمانیہ ہاپوڑ نے شاہ ولی اللہ کی اصلاحی وسیاسی تحریک، پروفیسر عزیز الدین حسین صدر شعبہ تاریخ وثقافت جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شاہ ولی اللہ اور ان کا سیاسی عہد جیسے اہم عنوانات پر پرمغز تجزیاتی وتحقیقاتی مقالات پیش کئے یہ تیسری نشست ممتاز صحافی جناب منصور آغا صاحب کی نظامت میں ہوئی۔

مولانا سید انظر شاہ صاحب شیخ الحدیث دار العلوم وقف دیوبند (حضرت شاہ صاحب کی حدیث فہمی) پروفیسر نثار احمد فاروقی سابق صدر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی (شاہ ولی اللہ اور مفاہمت بین المذاہب الاسلامیہ) ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری (قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین کے مشتملات) پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی (شاہ ولی اللہ اور ان کا نظریۂ ارتفاقات) ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی (شاہ صاحب کا سیاسی وسماجی فلسفہ) مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی (شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) پروفیسر عبد الودود اظہر دہلوی (شاہ ولی اللہ دہلوی کا اقتصادی نظریہ) مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی (شاہ ولی اللہ کے فقہی رجحانات) ڈاکٹر شمس بدایونی (تحریک احیائے دین اور عہد شاہ ولی اللہ) مولانا خورشید احمد سلفی (شاہ ولی اللہ اور خدمت حدیث) اور ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی (شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات) کے مقالے آچکے تھے۔ لیکن اپنے

ذاتی مسائل کے سبب وہ خود سمینار میں شرکت کے لئے تشریف نہ لا سکے۔ یاد رہے کہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ ایک باضابطہ رجسٹرڈ ادارہ ہے، جو پروفیسر شکیل الرحمٰن سابق مرکزی وزیر حکومت ہند کی سرپرستی میں سرگرم عمل ہے۔ مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی چیئرمین، مولانا محمد اسلام قاسمی استاد حدیث دارالعلوم وقف دیوبند نائب چیئرمین مولانا تبریز عالم قاسمی سکریٹری اور محمد توحید عالم سکریٹری پروگرام ہیں، ادارہ چھوٹی بڑی متعدد قابل قدر کتابیں شائع کر چکا ہے، اور حال ہی میں مشہور محقق ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی مرحوم کی مایہ ناز تصنیف ضمائر القرآن اور الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم شائع ہوئی ہیں۔

اس امام شاہ ولی اللہ نیشنل سمینار سے پہلے شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ۲۳/مارچ ۱۹۹۹ء کو عہد وسطی کے تاریخی آثار کے موضوع پر بھی ایک باوقار سمینار منعقد ہو چکا ہے، یہ باوقار سمینار مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی چیئرمین شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے شکریہ پر بخیر وخوبی انجام کو پہونچا۔

بشکریہ
ماہنامہ ترجمان دارالعلوم
اپریل ۲۰۰۳ء

# شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی وغیرہ کی مطبوعات

| | | |
|---|---|---|
| ❖ الواح الصنادید حصہ اول | مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی | 100/- |
| ❖ الواح الصنادید حصہ دوم | // // | 100/- |
| ❖ دلی کی تاریخی مساجد حصہ اول | // // | 200/- |
| ❖ دلی کی تاریخی مساجد حصہ دوم | // // | 100/- |
| ❖ پنجاب وہریانہ کی تاریخی مساجد | // // | 200/- |
| ❖ ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (اردو) | // // | 20/- |
| ❖ ہندو مندر اور اورنگ زیب کے فرامین (ہندی) | // // | 20/- |
| ❖ نقوش خاطر (قلمی خاکوں کا مجموعہ) | // // | 70/- |
| ❖ دنیائے اسلام کی چند عظیم شخصیتیں | // // | 14/- |
| ❖ امام شاہ ولی اللہؒ اور ان کے افکار ونظریات | // // | 250/- |
| ❖ ترجمان القرآن کا تحقیقی مطالعہ | مولانا اخلاق حسین قاسمی | 200/- |
| ❖ ضمائر القرآن | ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی | 300/- |
| ❖ الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم | ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی | 350/- |
| ❖ مرزا غالب ہندو مغل جمالیات | پروفیسر شکیل الرحمٰن | 1000/- |

والمقامات الجليلة جميعها الا افرادا من كتاب البيع الى كتاب الادب
فانها بالاجازة وكذلك كتب قرأت عليه الهداية غالبها وطرفا من البيضاوي
وغيرها من الكتب المشهورة وهو تلميذ الامير محمد زاهد بن القاضي محمد اسلم
الحسيني الهروي وهو تلميذ ملا محمد فاضل تلميذ ملا يوسف القراباغي
تلميذ ميرزاجان تلميذ ملا محمود الشيرازي تلميذ مولانا جلال الدين الدواني
تلميذ ابيه مولانا سعد الدين الدواني تلميذ شريف الدين عبد الرحيم الحرمي الصديقي
روى مشكوة المصابيح عن العلامة امام الدين علي بن مبارك شاه الصديقي الساوجي
عن مؤلفه الامام ولي الدين محمد بن عبد الله الخطيب التبريزي رحمة الله
عليه قال ذلك بلسانه وكتبه بيده الفقير الى رحمة الله الكريم الودود
ولي الله احمد بن عبد الرحيم بن وجيه الدين بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود
عفى الله عنه وعنهم والحقه واياهم باسلافهم الصالحين العمري نسبا الدهلوي
وطنا الاشعري عقيدة الصوفي طريقة الحنفي عملا والحنفي والشافعي
تدريسا خادم التفسير والحديث والفقه والعربية والكلام وله في كل
ذلك تصانيف والحمد لله اولا وآخرا ظاهرا وباطنا ذي الجلال والاكرام
كان ذلك يوم الثلاثاء الثالث والعشرين من شوال سنة ١١٥٩

الى حفظ حضرت الدرر الكرامات
كما شبيه كتبه الفقير محمد رضا ...